درسِ قرآن

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے درسہائے قرآن

ترتیب و تحقیق
مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

درسِ قرآن

کتبہ عبدہٗ

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے درسہائے قرآن

ترتیب و تحقیق

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

دار الکتاب
کتاب مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور 7235094

ضابطہ

نام کتاب : درس قرآن (مولانا محمد منظور نعمانی کے درسہائے قرآن)

مرتب : مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

ناشر : دارالکتاب، کتاب مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

طابع : زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

سن اشاعت : جولائی 2004ء

قیمت : 220 روپے



قانونی مشیر ـــــــــــــــــــــــــ باہتمام

مہر عطاء الرحمٰن، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، لاہور — حافظ محمد ندیم

فون: 0300-4356144, 7241866

فہرست دروس وعنوانات بقید صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(درس-١٦)

سورہ بنی اسرائیل

(درس-١٧)

سورة الكهف

(درس-١٨)

(درس-۱۹)

سورۃ طٰہٰ

(درس-۲۰)

(درس-۲۱)

حضرت موسیٰ کو منصب نبوت عطا ہونے کا

عجیب وغریب واقعہ (۲)

سورۃ الانبیاء

(درس-۲۲)

سورۃ الحج

(درس-۲۳)

سورۃ المومنون

(درس-۲۴)

کامل فلاح یابی کے لئے خداوندی منشور

سورۃ الفرقان

(درس-۲۵)

سورۃ الاحزاب

(درس-۲۶)

سورۃ المومن

(درس-۲۷)

(درس-۲۸)

(درس-۲۹)

(درس-۴۰)

(درس-۴۱)

(درس-۴۲)

سورۃ البینۃ

(درس-۴۳)

سورۃ الزلزال

(درس-۴۴)

سورۃ العادیات

(درس-۴۵)

سورۃ القارعۃ

(درس-۴۶)

سورۃ التکاثر

(درس-۴۷)

سورۃ العصر

(درس-۴۸)

سورۃ الھُمَزۃ

(درس-۴۹)

سورۃ الفیل

(درس-۵۰)

سورۃ القریش

(درس-۵۱)

سورۃ الماعون اور سورۃ الکوثر

(درس-۵۲)

سورۃ الکوثر (درس-۵۲ مسلسل)

سورۃ الکافرون

(درس-۵۳)

سورۃ النصر

(درس-۵۴)

سورۃ اللھب

(درس-۵۵)

سورۃ الاخلاص

(درس-۵۴)

سورۃ الفلق اور سورۃ الناس

(درس-۵۷)

سورۃ الناس (درس-۵۷ مسلسل)

آخری بات



بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتّب

والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۴۱۷ھ ۱۹۹۷ء) کے درسہائے قرآن کا یہ مجموعہ جو آپ کے ہاتھ میں ہے، اس کو اشاعت کے لئے مرتب کرنے کی خدمت اپنے لئے وہ دوگونہ سعادت تھی کہ نامہ اعمال روشن ہونے کی امید بندھے۔ مگر ترتیب کے بعد اشاعت تک کے مختلف مرحلوں میں تعویق در تعویق کی جو عجیب عجیب صورتیں بنتی رہیں اور مسئلہ پے بہ پے برسوں پہ دراز ہوتا گیا، اُس سے ڈر ہونے لگا تھا کہ کہیں اس کی اشاعت کی آرزو حسرت ہی بن نہ ساتھ چلی جائے۔ صد شکر کہ یہ کھٹکا دور ہوا اور وقتِ سعید آ گیا۔

درسِ قرآن کا یہ مبارک سلسلہ سورہ الفاتحہ سے آخری سورہ الناس تک مکمل ہوا تھا۔ مگر یہ مجموعہ جو آپ کے ہاتھ میں ہے یہ اس کے بس اُس تھوڑے سے حصہ پر مشتمل ہے جو ماہنامہ ''الفرقان'' میں شائع ہو سکا۔ پڑھنے والے محسوس کریں گے کہ باقی بڑے حصہ کا اس مجموعہ میں شامل نہ ہونا بڑا خسارہ ہے۔ اور صحیح محسوس کریں گے۔ کیونکہ فہمِ قرآن کے سلسلہ میں اس درس کی اپنی خصوصیات ظاہر ہے اُنھیں دوسری جگہ نہ مل سکیں گی۔ ہر شخصیت کے اپنے طرز و مزاج کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جن سے اس کا کام ایک خاص امتیازی رنگ اختیار کرتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے ایک خاص افادیت پیدا ہوتی ہے۔ حضرت والدِ ماجد کی بھی کچھ خصوصیات تھیں جو ان کی تحریر و تقریر میں نمایاں رہتی تھیں۔ اور ان خصوصیات سے مناسبت رکھنے والے اور قدر پہچاننے والے ان کی تحریر و تقریر میں اپنے لئے بڑی افادیت پاتے تھے۔ ایک نمایاں ترین خصوصیت تھی کم سے کم الفاظ میں بات کو الم نشرح کر دینا۔ اور اس کا مطلب ہوتا ہے کہ آدمی بات کی تہ کو پہنچا ہوا ہے۔ افسوس اور ندامت کے ساتھ اعتراف ہے کہ قارئین کو محسوس ہونے والی اس کمی میں اس راقم سطور کا بھی کچھ حصہ ہے۔ والدِ ماجد تو اپنے مزاج سے اس کے عادی تھے ہی کہ اپنے کام بذاتِ خود ہی انجام دیں،

مگر میں جو اُس وقت (۱۹۷۵ء تک) قریب قریب ساتھ ہی رہنے کے درجہ میں تھا وہ بھی اپنی طرف سے اس کی کوشش نہ کر سکا کہ درسِ قرآن جیسی چیزوں کے قلمبند کئے جانے میں کچھ مددگار بنے۔ وہ خود ہی جتنا موقع پاتے تھے یادداشت سے الفرقان کے لئے تیار کر دیتے تھے۔ اور اسی کی بدولت یہ اتنا کچھ محفوظ ہو گیا۔ اللہ ان کو ان کی نیت اور مشقت کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ اور اہلِ ایمان کے لئے نافع بنائے۔

درس کا یہ سلسلہ ۱۹۸۵ء میں تمام ہو جانے پر آپ کو خیال ہوا کہ جو کچھ بھی الفرقان میں محفوظ ہو گیا ہے اس کو کتابی شکل کے لئے مرتب فرما دیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ آخرِ عمر کے عوارض نے گھیر لیا تھا۔ درس کی قسطیں فائل سے نکالنے کے لئے دفتر میں کہلایا۔ اور پھر جو کچھ نکال کر دیدی گئیں ان کی کتابت بھی آپ کے حکم سے کرادی گئی۔ اسی زمانہ میں اپنے اُن مضامین کی کتابت بھی آپ نے کرائی جو ''تحدیثِ نعمت'' کے نام سے (۱۹۹۷ء میں) شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ سب کام آپ کے ایسے ضعف کے حال میں ہوا تھا اس کی بنا پر ضرورت محسوس فرماتے تھے کہ ہم بھائیوں میں سے کوئی اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیکر تکمیل کو پہنچائے۔ قدرت نے قرعہ اِس گنہگار کے نام لکھا تھا۔ اس کا انہی دنوں میں آپ کی خدمت میں حاضری کے لئے سفر ہو گیا اور ظاہر ہے کہ مجھے تو وہاں آپ کی خدمت میں رہنے کے سوا کوئی اور ایسا کام ہی نہ تھا اس لئے مجھی پر اس خدمت کا زیادہ حق آتا تھا۔ دونوں کاموں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ''تحدیثِ نعمت'' کا کام اگرچہ لمبا ہے مگر درسِ قرآن والے کام کے مقابلہ میں آسان ہے۔ اس لئے پہلے اسی کو ہاتھ میں لیا۔ اور وہی کام اس وقت کے قیام میں ہو سکا، اور پھر درسِ قرآن کا کام اس وقت تک کے لئے مؤخر کرنا ناگزیر ہوا جب کہ دوبارہ (لندن سے) حاضری ہو۔ اس حاضری کی نوبت تقریباً ڈیڑھ سال بعد ۱۹۹۷ء کے شروع میں آئی۔ مگر مقدر نہ تھا کہ درسِ قرآن کا کام اس موقع پر بھی ہو سکے۔ بعض دوسرے کام جن کا ذکر ''تحدیثِ نعمت'' کے پیش لفظ میں آچکا ہے مقدم تھے۔ اور پھر اپریل میں مرضِ وفات شروع ہو گیا اور مئی ۱۹۹۷ء مطابق ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ میں زندگیٔ مستعار اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ رہے نام اللہ کا!

۱۹۹۷ء کے بعد سے اب جنوری ۲۰۰۴ء تک، جبکہ یہ سطریں لکھی جارہی ہیں چھ سال گزر چکے ہیں۔ اپنی حد تک کا کام تو مئی ۲۰۰۰ء میں کر دیا گیا تھا۔ اور یقین تھا کہ دو تین ماہ میں کتاب ان شاء اللہ پریس سے نکل آئے گی۔ مگر پھر وہ عجیب و غریب قسم کے عوائق و موانع سدِ راہ ہونا شروع ہوئے کہ ایسا لگا جیسے ''تحدیثِ نعمت'' کی اشاعت میں بظاہر ایک غیر ضروری تاخیر ''دیر آید درست آید'' کا

مصداق بن گئی تھی، ایسی ہی بات شاید اس درسِ قرآن کے سلسلہ میں بھی سامنے آنے کو ہے۔ بہر حال ایسا ہوا تو تأخیر پر افسوس کا مداوا ہو جائے گا۔ ورنہ ہم متعلقین میں سے جس کسی کی بھی سستی اور کوتاہی کا کوئی حصہ (خاص طور سے اس راقم کا) والد ماجد کے اس حق کی ادائیگی میں ہے اللہ اس پر گرفت سے درگذر فرمائے۔ اس تأخیر کے دوران میں ایک خیر کا تجربہ تو بہر حال ہو چکا ہے۔ اس وقت اس مجموعہ میں شامل دروس کی تعداد ۵۷ ہے، جبکہ والدِ ماجد نے جو کتابت شدہ دروس راقم کے سپرد کئے تھے وہ صرف گیارہ تھے۔ یہ اسی ناخوشگوار تاخیری سلسلہ کے ایک مرحلہ کا نتیجہ ہے کہ الفرقان میں مطبوعہ کُل دروس کی تعداد معلوم کرنے کے لئے تمام فائل از سرِ نو دیکھنے کا فیصلہ کیا گیا تو یہ گیارہ کا عدد ستاون میں تبدیل ہو گیا۔ اور صفحات ۱۰۰ سے بڑھ کر ۶۰۰ سو، فللہ الحمد۔

دروس کی ابتدا اور انتہاء

اس مجموعہ میں شامل درسوں کا سلسلہ سورہ النسآء کی آیت ۹۴ سے شروع ہو کر سورہ الناس پر تمام ہوتا ہے۔ مگر جیسا کہ دروس کی تعداد سے (جو کہ قرآنِ پاک کی سورتوں کی کل تعداد کا بھی نصف ہیں) ظاہر ہے، یہ سلسلہ النسآء کی اِن آیتوں سے سورہ الناس تک مسلسل نہیں ہے۔ بلکہ سورہ النسآء کے صرف تین درس ہیں، اسی طرح چند المائدہ کے، ایسے ہی الانعام کے، الاعراف کے اور دوسری چند سورتوں کی کچھ کچھ آیتوں کے درس اس مجموعہ میں آگئے ہیں۔ وہ سورتیں جن کے مکمل درس شامل ہوئے ہیں وہ المؤمن اور الفتح ہیں اور ان کے بعد پارہ عم کی سورہ البیّنہ سے سورہ الناس تک مسلسل۔ درس کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ سلسلۂ درس لکھنؤ کے تبلیغی مرکز میں شروع ہوا تھا اور بیشتر حصہ وہیں مکمل ہوا۔ کچھ حصہ رہ گیا تھا کہ والد ماجد کے لئے زیادہ نقل و حرکت دِقّت طلب ہو گئی تو باقی ماندہ حصہ محلّہ کی مسجد میں مکمل فرمایا۔

راقم مرتّب کا کام

(۱) الفرقان میں یہ درس جس طرح شائع ہوئے اُس میں ذیلی عنوانات شاذ و نادر تھے۔ راقم مرتب کو خیال ہوا کہ سلسلۂ بیان کے مختلف مضامین پر ذیلی عنوانات قائم کر دینے سے قارئین کے استفادہ کی صلاحیت بڑھ جاتی اور بات ذہن نشین ہونے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس لئے جو مقام بھی مناسب نظر آیا وہاں ذیلی سرخی قائم کر دی گئی ہے۔

(۲) اکثر درسوں میں کسی تاریخی یا حدیثی روایت کا کا ذکر آیا ہے۔مگر اس کے مأخذ کا حوالہ کم ہی جگہوں پر ہے۔راقم نے کوشش کی ہے کہ کوئی بھی روایت بغیر مستند حوالہ کے نہ رہنے پائے۔یہ حوالے بیشتر حاشیہ میں دیئے گئے ہیں۔اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری ظاہر کرنے کے لئے لفظ ''مرتب'' آخر میں لکھ دیا گیا ہے۔

(۳) بعض مقامات پر ضرورت محسوس ہوئی کہ کچھ مزید وضاحت ہو۔ایسے مقامات پر توضیحی حاشیہ بھی لکھا گیا ہے۔اس کے علاوہ بعض مقامات ایسے بھی آئے ہیں کہ اپنی کم علمی وکم مائیگی اور والد ماجد کی بلند مرتبی کے پورے احساس وادراک کے باجود ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چیز ان کی نظر سے اوجھل رہ گئی۔ایسے مقامات پر مستند تفاسیر سے مراجعت کر کے عنداللہ اپنی ذمہ داری بھی سمجھی گئی اور حضرت مرحوم کے قیمتی ورثہ کا حق بھی کہ مناسب حاشیہ دے دیا جائے۔یہ وہ کام تھا جس کا ہمارے یہاں رواج ذرا کم ہے۔بڑوں کی چیزوں کو جوں کے توں ہی شائع کرتے رہنا پسند کیا جاتا ہے۔اس لئے سوچنا بھی پڑا مگر اپنا رجحان یہی رہا۔اور یہی بہتر معلوم ہوا۔یہ حاشیے بس گنتی کے دو تین ہی ہیں۔

ان سطروں کے بعد اصل کتاب سے پہلے برادر عزیز میاں خلیل الرحمٰن سجاد کے قلم سے ''پیش لفظ'' کے چند صفحات آرہے ہیں۔اس کتاب کی خدمت کے لئے ہم بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہونے کے باوجود اصلاً وہی موزوں تر تھے۔انھیں علمِ قرآن کو بطورِ خصوص اساتذہ سے حاصل کرنے کا موقع ملا ہے اور والدِ ماجد کی فکری خصوصیات کو اخذ کرنے میں بھی میں ان کو اپنے سے آگے ہی دیکھتا ہوں۔پس جی چاہا کہ کم از کم درس کی خصوصیات پر انھیں کے قلم سے کچھ روشنی پڑ جائے تو وہ زیادہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ میں طبع آزمائی کروں۔الحمد للہ کہ یہ خواہش انھوں نے پوری کردی۔بسم اللہ اب ورق اُلٹئے اور قرآن پاک کی فضاؤں میں سانس لیجیے۔اور ہوسکے تو صاحبِ درس کو اپنی دعاؤں میں نہ بھولیے۔کہ وہ اپنے قارئین سے ہمیشہ اس احسان کے خواستگار رہے ہیں۔اور یہ عاجز بھی سراپا احتیاج ہے۔

راقمِ آثم

عتیق الرحمٰن سنبھلی

لندن۔۱۵/ذی القعدہ ۱۴۲۴ھ ۸/جنوری ۲۰۰۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

غذا، پانی، ہوا اور روشنی جیسی چیزوں کے علاوہ، جن کی ضرورت انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات کو بھی ہے، وہ چیز جس کی ضرورت انسان کو اپنے جوہرِ انسانیت کے تحفظ اور نشو ونما کے مقصد سے سب سے زیادہ پڑتی ہے وہ ہے اس طرز زندگی کی طرف رہنمائی جس کے مطابق زندگی گذار کر انسان ''سعادت'' اور ''فلاح'' حاصل کر سکے اور مختلف داخلی و خارجی رکاوٹوں کو عبور کر کے اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکے۔

انسان کی دوسری ضروریات کی طرح اُس کی سب سے اہم ضرورت کی تکمیل بھی وہی ہستی کر سکتی ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور جس نے اس کی فطرت میں متضاد قسم کی صلاحیتیں اور جذبے رکھ دیئے ہیں اور جو اُس سے اور اس کی اُن صلاحیتوں اور جذبوں سے، اور اس کی انسانیت کو کمزور و مضمحل کرنے کی کوشش میں ہمہ وقت سرگرم عمل اندرونی و بیرونی طاقتوں سے سب سے زیادہ واقف ہے نیز جس کی نظر ماضی، حال، مستقبل اور شمال، جنوب، مشرق، مغرب سب پر یکساں اور بیک وقت رہتی ہے --- اور اس سچائی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ اس ہستی نے انسان کے ساتھ ''ربوبیت'' والے اپنے مخصوص اور بے لوث رشتے کا حق ادا کرتے ہوئے پہلے ہی دن سے دوسری ''بنیادی ضرورتوں'' کے علاوہ اس اہم ترین ضرورت کی تکمیل کا انتظام بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد جیسے جیسے انسان کی مادّی ضروریات، آبادی میں اضافے اور تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئیں، زمین کی پیداوار اور معیشت کے اسباب میں بھی اسی رب العالمین کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی ربوبیت کا یہی رنگ انسان کی انسانیت کے تحفظ اور نشو ونما کے مقصد سے اتاری گئی اس کی رہنمائی میں بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ یہ انسان کرۂ ارض میں جہاں جہاں بستا رہا، اور جو جو زبانیں بولتا رہا، وہاں وہاں اور الگ الگ زبانوں میں اس کا شفیق رب اس کے پاس رہنمائی بھیجتا رہا۔

اس ازلی رہنمائی کے بنیادی خدوخال تو نہیں بدلتے تھے، مگر ہر جگہ اور ہر دور کے مخصوص مسائل اور جداگانہ مزاج کا لحاظ ضرور کیا جاتا تھا۔

پھر جب انسانی تمدن مختلف ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے اس نقطے پر پہنچ گیا جس کا تقاضا یہ تھا کہ الگ الگ علاقوں، قوموں اور زبانوں میں رہنمائی بھیجنے کے بجائے دنیا کے تمام انسانوں کے لئے ایک ہی رہنمائی بھیج دی جائے، تو اسی شفیق پروردگارِ عالم نے چھٹی صدی عیسوی میں کرۂ ارض کے بالکل درمیان میں واقع تاریخی شہر مکہ مکرمہ میں اپنی آخری کتاب قرآن مجید اتار دی اور قرآنی طرزِ زندگی کا ایک جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا نمونہ بنا کر سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج دیا۔ اور اس بات کا واشگاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اب رہتی دنیا تک جو انسان اپنے جوہر انسانیت کا تحفظ اور نشو ونما کرنا چاہے وہ اسی قرآن کی طرف رجوع کرے۔ اب رشد وہدایت اور فلاح وسعادت کی ازلی راہ یہیں سے ملے گی۔ بس سچی طلب شرط ہے۔ (إن هو الا ذكر للعالمين، لمن شاء منكم أن يستقيم)

قرآن مجید کی اس مخصوص حیثیت کا تقاضا تھا کہ:

۱- وہ ہمیشہ محفوظ رہے۔

۲- اسے عام طور پر درست طریقہ کے مطابق پڑھا جاتا رہے۔

۳- ہر دور میں اس کی تفسیر وتشریح کا سلسلہ بھی جاری رہے۔

چنانچہ نزول قرآن کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرما دیا تھا کہ ان تینوں کا انتظام اس نے پہلے ہی سے مقدر کر رکھا ہے۔ (ان علينا جمعه وقرآنه، فاذا قرأناه فاتبع قرآنه، ثم إن علينا بيانه) اس خداوندی اعلان کے دنیا کے سامنے آئے ہوئے تقریباً ساڑھے چودہ سو سال گذر چکے ہیں، اس پوری مدت میں یہ تینوں وعدے کس طرح پورے ہوئے، اور قرآن مجید کی حفاظت، اس کے پڑھنے پڑھانے اور اس کی تفسیر وتشریح کے لئے کیسی زبردست اور عدیم المثال کوششیں کی گئیں۔ اور جن لوگوں کو ان کاموں کے لئے منتخب کیا گیا انہیں کتنی صلاحیتیں، اور کیسے اوصاف بخشے گئے اس سب کی تفصیل کے لئے ضخیم جلدیں درکار ہیں۔ سر دست تو صرف اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ اس سب کی تھوڑی سی بھی تفصیل جاننے سے یہ بات بالکل الم نشرح ہو جاتی ہے کہ واقعۃً یہ کتاب یعنی قرآن مجید تمام انسانوں

کی رہنمائی کے لئے ان کے رب کی طرف سے اتاری گئی آخری کتاب ہے، نہ اسے کبھی بدلا یا مٹایا جا سکے گا، اور نہ اب کسی اور کتاب کی ضرورت پڑے گی۔

کرۂ ارض کا یہ خطہ جسے اب برصغیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس لحاظ سے بھی ایک امتیازی شان رکھتا ہے کہ یہاں قرآن مجید کے حفظ اور اصول تجوید کے ساتھ اس کے پڑھنے پڑھانے کے وہ انتظامات ہوئے جو بہت سے عرب ملکوں میں بھی کچھ عرصہ پہلے دیکھنے میں نہیں آتے تھے، اور اسی طرح قرآن مجید کے سمجھنے سمجھانے، اس کے مضامین پر غور وفکر کرنے اور اس کی تفسیر وتشریح کے سلسلے میں بھی جو خدمات، خصوصاً حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دور سے یہاں انجام دی گئیں اور جن کا سلسلہ الحمد للہ کہ ابھی جاری ہے وہ بھی، بعض پہلوؤں سے، عدیم المثال ہیں-- یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے یہ بھی اسی زریں سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ۵۳-۱۹۵۴ء سے لکھنؤ کی ایک مسجد کے جوار میں والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے سکونت اختیار کی اور وہیں سے دونوں حضرات کی تبلیغی، دعوتی، اصلاحی اور ملی سرگرمیوں کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، انہی کوششوں میں سے ایک درس قرآن کا ہفتہ واری سلسلہ تھا جو شروع میں حضرت مولانا علی میاںؒ کے ذمے رہا پھر بعد میں یہ ذمے داری حضرت والد ماجدؒ کے سپرد ہوگئی۔ اُن دنوں ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کا رواج تو تھا نہیں کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ کوئی صاحب درس قلمبند کرلیا کرتے تھے، اور حضرت والد ماجدؒ اس پر ایک نظر ڈال کر اسے الفرقان میں دے دیتے تھے اور زیادہ تر وہ خود ہی اپنی یادداشت کی مدد سے درس لکھ کر الفرقان میں شائع کر دیا کرتے تھے-- الفرقان کی فائلوں میں محفوظ متفرق درسہائے قرآن کی یہی امانت ہے جو اب کتابی شکل میں آپ تک پہنچائی جارہی ہے۔

''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست'' کے مصداق قرآن مجید کی جس تفسیر پر آپ نظر ڈالیں گے اس میں کوئی الگ ''رنگ وبو'' آپ ضرور محسوس کریں گے۔ اس درس قرآن کی چند اہم خصوصیات کے بارے میں ذیل میں یہ ناچیز راقم سطور کچھ طالب علمانہ معروضات پیش کرتا ہے، خصوصاً اس امید پر کہ جو اہل علم حضرات مساجد میں قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کی خدمت

انجام دے رہے ہیں شاید ان کے لئے ان معروضات کی روشنی میں اس درس قرآن سے بہتر طریقے پر استفادہ کی راہیں کھل جائیں۔

(۱) آپ کو ایک بات تو درس قرآن کے مطالعہ کے دوران یہ محسوس ہو گی کہ صاحب درس کی پوری توجہ ہر آیت کی تشریح کرتے وقت صرف اس نقطے پر مرکوز رہتی ہے کہ سننے والے کے دل و دماغ میں کلام الٰہی کا اصل پیغام اور مدعا اتر جائے۔ اپنے علم اور خطابت سے متاثر کرنا تو درکنار، یہاں تو غیر ضروری محققانہ بحثوں سے بھی مکمل گریز ہے۔ نہ رموز و اشارات ہیں اور نہ اسرار و نکات بس سیدھے سادھے دردمندانہ انداز میں اور پوری یکسوئی کے ساتھ ساری توجہ اس پر مرکوز ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ایمان و یقین اور خشیت و انابت کی وہ کیفیت پیدا ہو جائے جو کلام الٰہی کا اصل مقصود ہے، اور زندگیوں میں وہ تبدیلی آ جائے جو قرآن ہر ہر فرد کی زندگی میں برپا کرنا چاہتا ہے۔ کہنے میں تو یہ بات بہت آسان ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ گفتگو کو پٹڑی سے نہ اترنے دینا، اور نیت کو شروع سے آخر تک بالکل درست رکھنا، اور اصل مدعا پر پوری توجہ کو مرکوز رکھنا (خصوصاً تقریر میں) کوئی آسان کام نہیں، اس کے لئے بے پناہ اخلاص اور استغناء اور غیر معمولی قابو اور استحضار درکار ہے چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا، میرے ناقص خیال میں حضرت والد ماجدؒ کی تحریر اور تقریر ہی نہیں، بلکہ ان کی پوری شخصیت کو بے حد سادگی کے ساتھ غیر معمولی تاثیر کی جو خصوصیت ملی تھی اس کا اصل سرچشمہ بھی یہی باطنی اوصاف تھے۔ اور یہ سب فیضان تھا ان اللہ والوں کی نظر کا جن سے محبت اور جن کا اتباع انہوں نے اپنا شیوہ بنایا تھا۔

(۲) ہمارے زمانے میں مادیت کے غلبے اور ''جدیدیت'' کے رجحان کی وجہ سے فکر اسلامی کبھی کبھی عقائد کے سلسلہ میں مداہنت کی شکار نظر آتی ہے، اور کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ زیادہ تر توجہ دنیاوی مسائل کے حل اور دنیا میں غلبہ و اقتدار کے حصول کی طرف ہے اور آخرت میں نجات اور مغفرت کے حصول کو ثانوی حیثیت دے دی گئی ہے۔ جب کہ نبوی مزاج اور قرآنی اسلوب کے مطالعہ سے صاف نظر آتا ہے کہ عقائد کا مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اور پوری شریعت کا اولین مقصود ''آخرت میں نجات'' ہے۔ اس درس قرآن کے مطالعہ کے دوران آپ خود محسوس کریں گے کہ اس پہلو سے کیسی قابل رشک

مناسبت صاحب درس کو قرآنی ونبوی مزاج سے میسر تھی، توحید اور آخرت اور دیگر عقائد (مثلاً عقیدۂ حیات مسیح) کا جو بیان اس درس میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔ضرورت ہے کہ اس کو خصوصی توجہ سے پڑھا جائے اور اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔

(۳) قرآن مجید اور احادیث نبویہ کی تعبیرات کو سمجھنے میں جو مشکلات بعد کے دور میں پیش آئیں وہ مشکلات عہد نبوی میں نہیں پیش آتی تھیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جو خالص عربی تعبیرات استعمال ہو رہی تھیں ان کو اُسی خالص فطری انداز میں وہ لوگ سمجھتے تھے جو قرآن کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مخاطب تھے،ان کی نہ زبان عجمی تعبیرات سے متاثر ہوئی تھی اور نہ ذہنیت ہی ان پرتکلف فلسفیانہ اصطلاحات اور بحثوں سے آشنا ہوئی تھی جو عجمی تمدن، مثلاً یونانی یا رومی یا ایرانی تمدن کی پیداوار تھیں۔اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ذہن ودماغ میں وہ سوالات یا اشکالات ہی نہیں پیدا ہوتے تھے جو بعد کے دور میں نہ صرف یہ کہ پیدا ہوئے بلکہ صدیوں تک مسلکوں اور فرقوں کے وجود میں آنے کا سبب بنتے رہے۔اور ان کی وجہ سے علمی وعقلی قوتوں کا جس طرح استعمال ہوا اس نے بحیثیت مجموعی فائدے سے کہیں زیادہ نقصان پہنچایا--اہل نظر جانتے ہیں کہ اس صورت حال کا اثر قرآن مجید کی تفسیر پر کیا اور کتنا ہوا؟

جن حضرات کو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کے مطالعہ کا موقع ملا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ قرآن وحدیث کی تفسیر وتشریح میں ان بحثوں سے گریز اور عہدِ نبوت کے فطری انداز کی طرف واپسی کا جو رواج انہوں نے ازسرنو عام کیا وہ ان کے تجدیدی کارناموں میں سے ہے۔اور متعدد اہل نظر اس حقیقت کے گواہ رہے ہیں کہ والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ ان معدودے چند اہل علم میں سے تھے جنہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے بھرپور استفادہ کیا تھا، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا علمی ذوق ومزاج بڑی حد تک ان کے رنگ میں رنگ گیا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ ''درس قرآن'' ہو یا ''معارف الحدیث'' آپ ہر جگہ دیکھیں گے کہ قرآنی ونبوی تعبیرات کی تشریح بالکل فطری، سلیس اور بامحاورہ انداز سے ہو رہی ہے اور کہیں بھی کلامی اور فلسفیانہ بحثوں کو راہ نہیں مل رہی ہے--مزید وضاحت کے لئے ایک مثال پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں ایک تعبیر استعمال کی

ہے ''استویٰ علی العرش'' اس قرآنی تعبیر کے ترجمہ و تفسیر میں بہت ہی طول طویل بحثیں چھڑی ہیں، اور کسی بھی مفسر کے لئے ان بحثوں سے اپنا دامن بچانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مگر ان سطور کے ناچیز راقم نے حضرت والد ماجدؒ سے ایک سے زیادہ مرتبہ اس تعبیر کی جو تشریح سنی وہ کچھ اس طرح تھی کہ:

''جس طرح ہمارے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ فلاں بادشاہ ''تخت نشین ہوا'' تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس نے اپنی سلطنت میں زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لی، یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ''وہ اپنے تخت پر بیٹھ گیا'' اور نہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اس نشست کی کیا شکل و صورت تھی......؟ اسی مثال کی روشنی میں بلا تشبیہ سمجھئے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں یہ ''استویٰ علی العرش'' کی تعبیر آئی ہے اس سے پہلے زمین و آسمان کی تخلیق کا ذکر ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد زمام مملکت سنبھال لی اور نظم کائنات اپنے ہی ہاتھ میں رکھا، یہ اس مشرکانہ عقیدہ کی بھی تردید ہے جس کے مطابق زمین و آسمان کو پیدا تو اللہ ہی نے کیا، مگر نظم کائنات اس نے اپنے کچھ برگزیدہ بندوں کے سپرد کر دیا، اور اس میں اس یہودی عقیدے کی بھی تردید ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان وغیرہ کی تخلیق کے بعد تھک گیا، اور اس نے اس سے فارغ ہو کر آرام کیا۔''

بامحاورہ ترجمہ و تفسیر کی ایک مثال آپ سورۂ مائدہ کی آیت: اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ. کے ترجمہ و تفسیر میں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ حضرت والد ماجدؒ نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

''(مسلمانو!) تمہارا ولی (یعنی تمہاری مخلصانہ دوستی اور وفاداری کا مستحق) بس اللہ ہے اور اس کا رسول، اور وہ مومنین صادقین جو اچھی طرح نماز ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور (اللہ کے سارے احکام کے سامنے) سر تسلیم خم کرتے ہیں۔''

یہاں (وھم راکعون) کا ترجمہ ''سر تسلیم خم کرتے ہیں'' کیا گیا ہے، آگے اس کی تفسیر کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ:

''وھم راکعون کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف باتیں کہی ہیں، میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ اس کا مفہوم وہی ہے جس کو ہماری زبان میں سرِ تسلیم خم کرنا یا سر نیاز خم کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کا مطلب مکمل فرمانبرداری ہے۔''

ناچیز راقم سطور کا خیال ہے کہ قرآن مجید کے وہ بہت سے مقامات جن کے ترجمہ وتفسیر میں دشواریاں پیش آتی ہیں اور بسا اوقات تفسیر کی متداول کتابوں کے مطالعہ سے بھی ایک طالب علم جن کا تشفی بخش حل نہیں ڈھونڈھ پاتا، اگر حقیقت ومجاز اور متکلمانہ وفلسفیانہ اصطلاحوں میں الجھے بغیر خالص فطری، عربی اور بامحاورہ انداز اختیار کیا جائے تو شاید وہ زیادہ تر مشکلات خود ساختہ اور مصنوعی نظر آنے لگیں۔ اور یہ بھی ایک اہم پہلو ہے جو درسِ قرآن کے اس مجموعہ سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ دو مثالوں سے ظاہر ہے۔

(۴) ہر سورت اگرچہ مختلف ہدایات اور تعلیمات پر مشتمل ہوتی ہے مگر ان کے درمیان کوئی قدر مشترک ضرور ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کو کسی ایک مخصوص سورت میں جگہ دی گئی ہے، وہ قدر مشترک دراصل اس سورت کا مرکزی مضمون یا پیغام ہوتا ہے، جس کو سمجھ لینے سے آیات کے درمیان ربط کو سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اس درس قرآن میں آپ مختلف مقامات پر محسوس کریں گے کہ صاحب درس نے سورتوں کے مرکزی مضمون یا پیغام پر گہری نظر ڈالی ہے اور یہاں بھی ان کا فطری انداز برقرار رہا ہے۔ مرکزی مضمون کی تلاش میں کوئی تکلف یا بناوٹ نظر نہیں آتی۔ اسی طرح سورت کی مختلف آیتوں کے مابین اور مختلف سورتوں کے درمیان باہم ربط کا بیان بھی بڑے ہی فطری انداز سے کیا گیا ہے۔

(۵) یہ بات عام طور پر جانی جاتی ہے کہ قرآن مجید پورے کا پورا ایک ہی وقت میں نہیں اتار دیا گیا، بلکہ حالات اور واقعات کی رعایت سے جن ہدایات کی ضرورت پڑتی گئی، ان پر مشتمل آیات اور سورتوں کو اللہ تعالیٰ بھیجتا رہا۔ چنانچہ ہر سورت حالات کے جس پس منظر میں اتری اس کو جاننے اور پیش نظر رکھنے سے اس سورت اور اس کے مختلف اجزاء کی رہنمائی اور پیغام کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس درس قرآن کے مطالعہ سے آپ کو محسوس ہوگا کہ سورتوں کے پس منظر کا بیان بڑی اہمیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور اس سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ قرآن مجید کے سمجھنے سمجھانے کیلئے حدیث وسیرت کا کتنا علم درکار ہے؟ (مثال کے طور پر ملاحظہ فرمایئے سورۂ توبہ اور سورۂ فتح کے پس منظر کا بیان)۔

یہاں ایک پہلو کی طرف اور اشارہ ہو جائے تو اچھا ہے، وہ یہ کہ پس منظر کی حیثیت رکھنے والے حالات وواقعات کا بیان کبھی کبھی اس انداز سے ہونے لگتا ہے کہ سننے یا پڑھنے

والے کا ذہن صرف ماضی کے ان واقعات ہی میں اٹک جاتا ہے۔اور آج کے حالات میں خود اپنے لئے اور اپنے گردوپیش کے لئے کوئی ہدایت اخذ کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔اس درس قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ ایک طرف پس منظر کا بقدر ضرورت بیان ہے تو دوسری طرف بار بار اس طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش بھی ہے کہ آج کے دور میں ہمارے لئے ان ربانی ارشادات میں کیا رہنمائی ہے؟ --الغرض ''اسباب نزول'' کے سلسلے میں یہ معتدل موقف بھی اس ''درس قرآن'' کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

(۶) کسی طویل سورت کے پورے پیغام کو سمیٹ کر بیان کر دینا آسان نہیں ہوتا۔تاہم اگر اس میں کامیابی مل جائے تو طالبین ہدایت کے لئے اس سورت کی رہنمائی سے استفادہ میں آسانی ضرور ہو جاتی ہے۔سورۂ توبہ کا درس مکمل کرنے کے بعد ایک مستقل درس میں جو اس مجموعہ کے اٹھارہ صفحات میں آیا ہے، جس طرح اس عظیم الشان سورت کے اسباق کو دہرایا گیا ہے، اور جس طرح اس کا عطر کشید کر کے رکھ دیا گیا ہے، میرے ناچیز خیال میں وہ ایک شاہکار ہے۔امید ہے کہ اہل ذوق حضرات اس پر خصوصی توجہ دیں گے۔

(۷) ہر شخص کا اپنا ایک ذوق اور مزاج ہوتا ہے۔اور اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگوں کے اپنے اپنے ذوق و مزاج کا اثر قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح پر بھی پڑتا ہے۔اگر یہ بات معتدل حدود کے اندر رہے تو گوارا کی جا سکتی ہے۔مگر اگر یہ طبعی حدود سے آگے بڑھنے لگے تو بہت افراط یا تفریط ہونے لگتی ہے، جس کے بہت دور رس نقصانات بھی ہو سکتے ہیں۔اس کا حل یہی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے ذوق و مزاج کی اسیری سے نکل کر قرآنی اور نبوی ذوق و مزاج کو سمجھنے اور اس کے سانچے میں اپنے کو ڈھالنے کی شعوری کوشش کرے۔

مثال کے طور پر ایک طرف امت کی ذہنی تربیت کا وہ انداز ہے جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے اسبابی نظام کو بالکل نظر انداز کر کے تمناؤں اور تخیلات کی دنیا میں مست رہنے کی عادت پڑ رہی ہے، اور دوسری طرف اس کے برعکس وہ طریق کار ہے جس کے نتیجہ میں کارکنوں کا ذہن صرف مادّی، ظاہری اور سیاسی بن جاتا ہے۔اور وہ نبوی مزاج و منہاج کے بجائے خالص قومی و سیاسی انداز سے کوششیں کرنے اور ان سے اچھے نتیجوں کے برآمد ہونے کی امیدیں قائم کرنے لگتے ہیں--- مجھے اس درس قرآن میں جگہ جگہ یہ محسوس ہوا

کہ صاحب درس اپنے مخاطبوں کو معتدل قرآنی اور نبوی مزاج پر لانے کی بڑی شعوری کوشش کررہے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ چونکہ آج کل اس سلسلے میں بے اعتدالی اور افراط و تفریط بہت عام ہے اس لئے اس پہلو کی طرف بھی محترم قارئین کرام خصوصاً اہل علم حضرات کی توجہ دلا دینا مناسب ہے۔ اسی خیال سے اس پہلو کا میں نے ذکر کیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ مزید وضاحت کے لئے اس سلسلے کی ایک نمایاں مثال بھی یہاں پیش کر دی جائے۔

سورۂ نساء کی آیت (۱۰۱) اور (۱۰۲) میں میدان جنگ میں فرض نماز کی باجماعت ادائیگی کا ایک مخصوص طریقہ بتایا گیا ہے جسے ''صلوٰۃ خوف'' کہا جاتا ہے۔ ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے نماز کے اس طریقے کی وضاحت کے بعد صاحب درس نے اس نماز سے ایک نہایت اہم نکتہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''قرآن مجید کی ان آیتوں میں میدان جنگ کی نماز کے بارے میں جو ہدایت دی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اس پر عمل فرمایا، اس میں آپ کی امت کے لئے چند بڑے سبق ہیں۔ میرے نزدیک پہلا اہم سبق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو عالم اسباب بنایا ہے اور ہمارے لئے جائز نہیں ہے کہ ہم توکل کا نام لے کر اسباب وتدابیر کی طرف سے غفلت برتیں۔ اگر اس کی ذرا بھی گنجائش ہوتی تو یہ حکم ہوتا کہ میدانِ جنگ میں بالکل اسی طرح نماز ادا کی جائے جس طرح مسجد نبوی میں ادا کی جاتی تھی اور سارا لشکر ایک ساتھ حضورؐ کی اقتدار میں نماز پڑھے۔ کہا جاتا کہ دشمن ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اللہ ہماری حفاظت کے لئے کافی ہے، ہمیں کسی حفاظتی فکر اور تدبیر کی ضرورت نہیں، ہم نماز پڑھیں گے تو آسمان کے فرشتے ہماری حفاظت کریں گے لیکن یہ حکم نہیں دیا گیا بلکہ اسباب کی رعایت کرتے ہوئے جنگ کی ضرورت اور دفاع کی مصلحت سے نماز کا قانون بدل دیا گیا، نماز کے درمیان طویل نقل وحرکت کی اجازت دے دی گئی اور صراحت کے ساتھ حکم دیا گیا کہ مجاہدین اپنے پورے اسلحہ سے مسلح ہوکر نماز میں شریک ہوں، وہ ہتھیار بھی لگے ہوں جن سے دشمن پر حملہ کیا جاتا ہے اور وہ بھی جو دشمن کے حملے سے بچاؤ کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ (ولیاخذُوا حِذرَھُم وَاسلِحَتَھُم)
جس امت کو یہ ہدایت دی گئی ہو اور جس کے پیغمبر نے اسی کے مطابق عمل کیا

ہو اور یہی امت کو سکھایا ہو اس کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اسباب وتدابیر سے غفلت برتے اور اس کا نام ''توکل'' رکھے؟ بہر حال یہ ان آیتوں کا بڑا اہم سبق ہے۔

دوسرا اصولی سبق صلوٰۃ خوف کی اسی ہدایت سے یہ ملا کہ دنیا کے مادہ پرستوں کی طرح اسباب وتدابیر ہی کو سب کچھ نہ سمجھا جائے بلکہ مناسب حد تک اسباب وتدابیر کا لحاظ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت ہی کو فیصلہ کن سمجھا جائے اور اس کی نصرت اور رحمت کا استحقاق حاصل کرنے کی فکر وکوشش کو ہر چیز پر مقدم رکھا جائے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو فوج کے کسی حصہ کو بھی دشمن کے سامنے سے ہٹا کر نماز میں مشغول ہونے کی اجازت نہ دی جاتی۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کے بعض طبقے سخت افراط وتفریط میں مبتلا ہیں، اسلام کی روح اور اس کی تعلیمات سے مطابقت رکھنے والی بات وہی ہے جو صلوٰۃ خوف کے بارے میں قرآن مجید کی ہدایت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے معلوم ہوتی ہے۔''

آخر میں عرض ہے کہ درس قرآن کے یہ کچھ پہلو ہیں جن کی طرف اس کوتاہ بیں کی نظر گئی اور اس نے یہ مناسب سمجھا کہ اس کی طرف محترم قارئین، خصوصاً اہل علم کی توجہ مبذول کی جائے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اگر محترم بھائی صاحب مدظلہ (مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی) جن کے حصے میں بجا طور پر اس درس قرآن کی ترتیب کی سعادت بھی آئی اور برادر محترم مولانا محمد حسان نعمانی صاحب اور ہمشیرۂ محترمہ امۃ الرحمٰن کوثر صاحبہ کا سخت اصرار نہ ہوتا تو میں مخمل میں ٹاٹ کا یہ پیوند لگانے کی ہرگز جسارت نہ کرتا۔ بہر حال دعا ہے کہ اس درس قرآن کا فیض عام ہو، اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

رب اوزعنی أن اشکر نعمتک التی انعمت علی وعلی والدی وان اعمل صالحا ترضاہ وادخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین.

آپ سب کی دعاؤں کا محتاج اور سائل

خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ندوی

سورۃ النسآء

درس ۱ تا ۳

(درس-۱)

جہاد اور ہجرت سے متعلق سورہ نسآء کی چند آیات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ، وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ أَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَامُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔أَمَّابَعْدُ۔

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوْا وَلَا
تَقُوْلُوْا لِمَنْ أَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِناً،تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ
الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰہِ مَغَانِمُ کَثِیْرَۃٌ، کَذٰلِکَ کُنْتُمْ مِنْ
قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ فَتَبَیَّنُوْا، اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
خَبِیْراً ہ لَایَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ أُوْلِی الضَّرَرِ
وَالْمُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِأَمْوَالِھِمْ وَأَنْفُسِھِمْ، فَضَّلَ اللّٰہُ
الْمُجَاھِدِیْنَ بِأَمْوَالِھِمْ وَأَنْفُسِھِمْ عَلَی الْقَاعِدِیْنَ دَرَجَۃً،

وَكُلًّا وَّعَدَاللّٰهُ الْحُسْنٰى، وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى
الْقَاعِدِيْنَ أَجْراً عَظِيْماً٥ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً، وَكَانَ
اللّٰهُ غَفُوْراً رَّحِيْماً٥ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ، قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ، قَالُوْآ
اَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا، فَأُوْلٰٓئِكَ مَأْوٰهُمْ
جَهَنَّمُ، وَسَآءَتْ مَصِيْرًا٥ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ
وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَايَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا٥
فَأُوْلٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ، وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا٥
وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا
وَّسَعَةً،وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ
يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ، وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا٥

(النساء ۹۴_۱۰۰)

(ترجمہ) اے ایمان والو! جب تم خدا کی راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) نکلا کرو تو (عملی اقدام اور حملہ سے پہلے) اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو۔ اور جو تمہیں سلام کرے (اور اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے) تو اس کو دنیوی زندگی کے سامان کی خاطر یہ نہ کہو کہ تو مومن و مسلم نہیں ہے، اللہ کے پاس غنیمت کے بڑے سامان ہیں (لہٰذا تم اسی کے فضل پر نگاہ رکھو) پہلے تم بھی ایسے ہی حال میں تھے، اللہ نے تم پر فضل واحسان فرمایا تو تم (ایسے موقعوں پر) تحقیق ضرور کرلیا کرو، تم جو کچھ کرتے ہو اور کرو گے اس سے اللہ تعالیٰ اچھی طرح باخبر ہے۔

مسلمانوں میں اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والے اور بغیر کسی عذر اور مجبوری کے بیٹھ رہنے والے (یعنی جہاد نہ کرنے والے) درجہ اور مرتبہ میں برابر نہیں ہیں، جو اہل ایمان اپنے جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو جہاد نہ کرنے والوں پر ایک بڑے درجہ کی فضیلت بخشی ہے، یوں دونوں ہی طبقوں کے لئے (بشرطیکہ وہ ایمان میں مخلص ہوں) اللہ تعالیٰ کی طرف سے حسن انجام کا وعدہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ''مجاہدین'' کو

''قاعدین'' پر ایک عظیم اجر کی فضیلت دی ہے (ان کیلئے) اسکی طرف سے (بڑے بلند) درجات ہیں اور (خاص درجہ کی) بخشش و رحمت ہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔

جن لوگوں کی روح فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم ڈھائے ہیں (اور اللہ کے احکام و مطالبات کی ادائیگی میں سخت کوتاہیاں کی ہیں) وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہم اپنے وطن اور ماحول میں بالکل عاجز اور بے بس تھے (اس لئے مسلمانوں والی زندگی نہیں گزار سکتے تھے) فرشتے کہیں گے کہ کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم کسی طرف ہجرت کر جاتے! ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے البتہ وہ عاجز ولا چار مرد اور عورتیں اور بچے جوان حالات سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکتے اور کوئی راستہ نہیں پا سکتے ہیں (وہ معذور ہیں)۔

توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادے گا اور اللہ معاف فرمانے والا اور بخشنے والا ہے۔

اور جو کوئی راہ خدا میں ترک وطن کر کے نکلے (اس کیلئے اللہ کا فیصلہ ہے کہ) وہ اللہ کی زمین میں رہنے بسنے کے لئے وسیع میدان اور پوری گنجائش اور کشادگی پائے گا۔ اور جو کوئی چل نکلے اپنے گھر سے اللہ ورسول کے لئے ہجرت کر کے پھر آجائے اس کو (راستہ ہی میں) موت تو (صرف قدم اٹھادینے سے) اس کا اجر و ثواب ثابت ہوگیا اللہ تعالیٰ کے ہاں اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

تفسیر وتشریح

ان آیتوں کا پس منظر

یہ آیتیں جس سیاق اور پس منظر میں سورۂ نساء میں وارد ہوئی ہیں پہلے اس کو سمجھ لینا چاہئے، یہ بات آپ سب حضرات کو معلوم ہے کہ مسلمان اور خود رسول اللہ ﷺ مکہ معظمہ میں ۱۳ برس تک دشمنان دین یعنی مکہ کے کفار و مشرکین کے ظلم و ستم سہتے رہے اور آپ نے اپنے اصحاب و رفقاء کو مدافعت کے لئے بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دی، بلکہ مدینہ طیبہ ہجرت فرمانے کے بعد بھی شروع شروع میں کچھ دنوں یہی رویہ رہا کہ جب کبھی بعض جوشیلے مسلمانوں نے دفاع و مقابلہ کے لئے طاقت کے استعمال کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے ان کو

اجازت نہیں دی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ مسلمانوں کو یہی ہدایت اور تلقین فرماتے رہے۔ کہ كُفُّوْا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۔(سورہ النساء آیت ۷۶) یعنی صبر و برداشت سے کام لو، ہاتھ نہ اٹھاؤ، اور بس نماز وز کوٰۃ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کرتے رہو اور اپنے نفس و روح کی تربیت کرتے رہو۔

اب سے دو تین ہفتے پہلے جب یہ آیت (كُفُّوْا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ) اسی سورۂ نساء میں زیر درس آئی تھی تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ نماز اور زکوٰۃ اگر صحیح طور پر ادا کی جائیں تو روح اور نفس پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات مسلّمات اور مجرّب بات میں سے ہے کہ نفس کے تزکیہ اور روح کی تربیت اور اخلاص و للّٰہیت پیدا ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی دو عمل ہیں، بشرطیکہ صرف ان کی صورت نہ ہو بلکہ حقیقت ہو، اسی لئے تمام آسمانی شریعتوں میں نماز اور زکوٰۃ کا حکم رہا ہے۔

بہر حال میں کہنا چاہتا تھا کہ ہجرت کے بعد بھی کچھ دنوں تک مسلمانوں کو یہی تاکید کی جاتی رہی کہ اپنی حفاظت اور مدافعت کے لئے بھی طاقت کا استعمال نہ کرو۔

کچھ عرصہ کے بعد وہ وقت آ گیا کہ ظالموں کے مقابلہ کے لئے اور شرارت اور گمراہی کی قوتوں کو راستہ سے ہٹانے کے لئے طاقت کا استعمال کرنے کی اجازت مسلمانوں کو دے دی گئی اور جہاد و قتال کا حکم آ گیا، اس وقت بعض ایسے مسلمانوں نے جن میں کچھ کمزوری تھی اس خیال اور آرزو کا اظہار کیا کہ ابھی کچھ دنوں اور یہ حکم نہ آیا ہوتا تو شاید بہتر اور قرین مصلحت ہوتا، تو قرآن پاک میں انکو سخت سرزنش کی گئی اور رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ ان کی بالکل پرواہ نہ کیجئے اور اپنے اللہ پر بھروسہ کیجئے (فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ)۔(۱) اس کے بعد آپ کو مخاطب فرما کر ارشاد ہوا ہے:

---

(۱) افسوس ہے کہ دو تین ہفتہ پہلے کے جس درس میں یہ آیت آئی تھی وہ درس دستیاب نہیں ہے، پہلا درس جو دستیاب ہو سکا وہ یہی آیت ۹۴ تا ۱۰۰ کا ہے۔ مذکورہ بالا ارشاد جس آیت میں وارد ہوا ہے وہ آیت ۸۱ ہے۔ اور یہ اسی سلسلہ کلام کی آیت ہے جو آیت ۷۷ سے شروع ہوتا ہے، اس سلسلہ کلام میں کچے مسلمانوں اور منافقین کا ذکر کچھ ایسا ملا جلا چل رہا ہے کہ مفسرین کو ان دونوں کے درمیان امتیاز کرنے میں دشواری کا سامنا نظر آتا ہے۔ متعلقہ درس سامنے ہوتا تو شاید وہ بات واضح ہو جاتی جس کی بنیاد پر مذکورہ الفاظ کو کمزور اہل ایمان سے متعلق سمجھا گیا ہے، ورنہ یہ الفاظ بظاہر منافقین سے متعلق نظر آتے ہیں جو مسلمانوں ہی میں شمار ہوتے تھے۔ (مرتب)

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَاتُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَأْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَأْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا۔
(النساء ۸۴)

(ترجمہ) اے پیغمبر! (کوئی تمہارا ساتھ دے یا نہ دے) تم بذاتِ خود راہ خدا میں جہاد کرنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ تم پر صرف اپنی ذات کی ذمہ داری ہے اور ایمان والوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت و ترغیب دو۔ توقع رکھو کہ اللہ اپنی خاص مدد سے (تمہارے اور تمہارے ساتھ دینے والے اہل ایمان کے ذریعہ) کافروں کے دباؤ اور ان کے جنگی اقدامات کو روک دے اور اللہ بڑے زور والا اور (دشمنان حق کو) سخت عبرتناک سزا دینے والا ہے۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت کے مؤمنین صادقین کے دلوں میں اس آیت نے جہاد کا کیسا بے پناہ جوش بھر دیا ہوگا۔

مجاہدین کو ایک اہم ہدایت

اس آیت (۸۴) کے بعد آٹھ دس آیتوں میں بعض ان مسائل کے بارے میں ہدایات دی گئی تھیں جو جہاد کے سلسلہ میں پیدا ہو سکتے تھے یا ان کا جہاد سے قریب یا دور کا تعلق تھا، ان ہی میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ جہاد کے اقدامات میں اس کا بھی امکان تھا کہ دشمنوں کی کسی بستی پر حملہ کیا جائے اور وہاں کے کچھ لوگ یا ایک ہی آدمی دعوت اسلامی کو قبول کر چکا ہو اور خدانخواستہ وہ بھی حملہ کی زد میں آجائے، یا وہ مسلمانوں کے طریقہ پر سلام کر کے یا کلمہ توحید پڑھ کر اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے، اور اس وقت جہاد کے جوش میں اس پر اعتبار نہ کیا جائے اور دشمن قرار دے کر اس کو بھی نشانہ بنا دیا جائے۔

آج جو آیتیں میں نے تلاوت کی ہیں، ان میں سے پہلی آیت (یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا) کا تعلق اسی مسئلہ سے ہے، اس میں مجاہدین کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جب تم راہ خدا میں جہاد کے لئے نکلو اور دشمنوں کی کسی بستی یا علاقہ پر حملہ کا منصوبہ بناؤ تو امکانی حد تک اس کی پوری تحقیق کر لو کہ وہاں ایسا کوئی آدمی تو نہیں ہے، جس نے دعوتِ اسلام کو قبول کر لیا ہو اور اگر کوئی شخص سلام کے ذریعہ یا کلمہ پڑھ کے یا

کسی اور طریقہ پر اپنا اسلام اور اللہ و رسول کے ساتھ اپنی وفاداری ظاہر کرے تو تمہیں حق نہیں ہے کہ تم اس کو منافق اور تقیہ باز قرار دے کر اس کے ساتھ دشمنوں والا معاملہ کرو -- اس ہدایت کے ساتھ فرمایا گیا ہے "تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا" یعنی ایسی حالت میں اس کو دشمن قرار دے کر اس پر بھی حملہ کر دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم دراصل اس کے مال و اسباب کے طالب ہو اور اس کو "غنیمت" قرار دے کر ہتھیا لینا چاہتے ہو۔ اس کے آگے فرمایا گیا ہے۔ "فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ" یعنی اللہ کے پاس غنیمت کے بڑے ذخیرے ہیں، تم ان کے طالب بنو، اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے، "كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا" مطلب یہ ہے کہ تم یاد کرو کبھی تم بھی ایسے ہی تھے، یعنی کافروں کے بیچ میں اور کافروں کی بستیوں میں رہا کرتے تھے (۱) اس وقت اگر تم کو بھی کافروں اور دشمنوں میں سے سمجھ کر تمہارے ساتھ یہی معاملہ کیا جاتا تو تم پر کیا گزرتی اور تم اس کو کیا سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا تمہیں اس حالت سے نکال لیا، اس لئے اب تمہارا طریقہ کار یہ ہونا چاہئے کہ ایسے موقعوں پر پوری تحقیق سے کام لیا کرو، اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن سب جانتا ہے، تم جو کچھ کرو گے اور جس نیت سے کرو گے وہ اس سے مخفی نہیں، وہ اسی کے مطابق تم کو جزا یا سزا دے گا، (اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا)

اس آیت میں "تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا" کا یہ جملہ بڑی معنویت رکھتا ہے، اس میں صحابہ کرام کو بڑے ہی بلیغ اور مؤثر پیرایہ میں تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ ایسے موقع پر اسلام اور اللہ و رسول سے وفاداری کا اظہار کرنے والے شخص کی بات پر اعتبار نہ کرنے اور سہل انگاری اور بے احتیاطی سے اس کو دشمن قرار دے کر نشانہ بنا دینے کا منشا یہی ہوگا کہ تمہاری نگاہ اللہ کی رضا پر نہیں بلکہ اس بے چارے کے مال و اسباب پر ہے اور یہ بات جتنی دنی، جتنی گھٹیا اور شان ایمان سے جتنی دور ہے ظاہر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس آیت نے صحابہ کرام کی روحوں پر لرزہ طاری کر دیا ہوگا۔

---

(۱) اس کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ پہلے دن جب تم نے کلمہ پڑھا تب تم بھی بعینہ ایسے ہی تھے کہ کون جانے دل سے پڑھا یا بس زبانی۔ (مرتب)

اس معاملہ میں بے احتیاطی پر عتاب

احادیث وروایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض جنگی اقدامات میں اس طرح کے واقعات پیش آئے اور رسول اللہ ﷺ نے ان پر اپنی انتہائی ناراضی بلکہ غضب اور جلال کا اظہار فرمایا اور بعض موقعوں پر تو اس سلسلہ میں غلطی کرنے والوں کے لئے دعائے مغفرت کرنے سے بھی انکار فرمادیا۔

صحیح بخاری اور جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ بیان مروی (مذکور) ہے کہ قبیلہ بنو سُلیم کا ایک آدمی صحابہ کرام کے ایک عسکری دستہ کی زد پر آگیا (جبکہ یہ پورا قبیلہ دشمن تھا) اس آدمی نے اپنا اسلام ظاہر کرنے کے لئے مسلمانوں کے طریقہ پر سلام کیا، انھوں نے سمجھا کہ یہ ہمیں دھوکہ دینے کیلئے اور جان بچانے کیلئے ایسا کررہا ہے، چنانچہ اس کو بھی نشانہ بنا کے ختم کردیا اور اس کے سامان اور اس کی بکریوں کو مال غنیمت قرار دے کر اس پر قبضہ کرلیا اور لے آئے -- حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ سورہ نساء کی یہ آیت "يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰىٓ اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا۔" اسی واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی۔

اور صحیح مسلم میں ایک واقعہ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دستہ کسی دشمن قوم کے مقابلہ کے لئے بھیجا، جس میں حضرت اُسامہ بھی تھے، جب جنگ برپا ہوگئی تو دشمن کی طرف سے لڑنے والوں میں ایک آدمی تھا جو بلا کا لڑنے والا تھا، وہ جس مسلمان کی طرف رخ کرتا اس کو ختم کردیتا، اس طرح اس کے ہاتھ سے یکے بعد دیگرے کئی مسلمان شہید ہوگئے، حضرت اسامہ بن زیدؓ نے اس کو تاکا اور تلوار کے ساتھ اس پر جھپٹے جیسے ہی وہ حضرت اسامہ کی زد میں آیا اس نے کہا لا الہ الا اللہ لیکن اسامہ نے ہاتھ نہیں روکا اور یہ سمجھ کر کہ یہ جان بچانے کے لئے منافقانہ طور پر کلمہ پڑھ رہا ہے، وار کردیا اور وہ ختم ہوگیا۔ واپسی پر رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کی بھی اطلاع دی گئی۔ آپ نے عتاب کے انداز میں حضرت اُسامہ سے پوچھا کہ جب وہ کلمہ پڑھ چکا تھا تو تم نے اس کو کیوں قتل کیا؟ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت اس نے ہمارے فلاں فلاں ساتھیوں کو شہید کردیا اور جب اس نے میری تلوار اپنے سر پر دیکھی تو اس وقت اس نے

کلمہ پڑھا۔ آپ نے فرمایا "کَیْفَ تَصْنَعُ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اِذَا جَاءَ تْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ" کہ قیامت کے دن جب اس کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ فریادی بن کر آئے گا تو تم کیا کرو گے اور کیا جواب دو گے؟ حضرت اُسامہ نے عرض کیا۔ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اسْتَغْفِرْ لِیْ (حضرت میرے لئے دعا کر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میرا گناہ معاف فرمادے اور بخش دے) اس کے جواب میں آپ نے یہی فرمایا کہ "کَیْفَ تَصْنَعُ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اِذَا جَاءَ تْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ" (تم یہ بتاؤ کہ قیامت کے دن اس کے لا الٰہ الا اللہ کا تم کیا جواب دو گے؟ راوی کا بیان ہے کہ آپ بار بار یہی فرماتے تھے کہ کَیْفَ تَصْنَعُ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اِذَا جَاءَ تْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔

اور امام ابن جریر طبری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر سے ایک اور واقعہ عہد نبوی کا نقل کیا ہے، وہ تو بہت ہی لرزا دینے والا ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک صاحب محلم بن جثامہ کی سرکردگی میں کسی دشمن قبیلہ یا علاقہ کی طرف ایک دستہ بھیجا، ایک شخص عامر بن اضبط (جو غالباً کسی دشمن قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوگا) وہ سامنے آگیا اور اس نے اسلامی طریقہ پر سلام کیا (اور اس طرح اپنا مسلمان ہونا ظاہر کیا) محلم اور عامر ابن اضبط کے درمیان کبھی پہلے یعنی اسلامی دور سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں عداوت اور رنجش رہی تھی، محلم نے (غالباً اس پرانی رنجش کی وجہ سے بھی) اس کے اظہار اسلام کی پروانہیں کی اور اس کو اپنے تیر کا نشانہ بنادیا اور وہ خاک وخون میں تڑپ کر ختم ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ کو بے حد دکھ ہوا، آپ نے محلم کو طلب فرما کر سخت عتاب فرمایا، انھوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میرے لئے مغفرت اور معافی کی دعا فرمادیجئے۔ آپ نے انتہائی جلال کے انداز میں فرمایا:

لَا غَفَرَ اللّٰہُ لَکَ   اللہ تجھے معاف نہ کرے

وہ روتے ہوئے کھڑے ہوگئے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ آگے حضرت ابن عمر کی اسی روایت میں ہے کہ ان کو قاعدہ کے مطابق دفن کر دیا گیا، لیکن زمین نے ان کی لاش کو باہر پھینک دیا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ حضرت ایسا واقعہ ہوا ہے کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ بات نہیں کہ یہ محلم دنیا میں سب سے برا آدمی اور سب سے بڑا گنہگار تھا اس لئے زمین نے اس کو قبول نہیں کیا، زمین تو اس سے بہت زیادہ بروں، بڑے سے

بڑے ظالموں اور کافروں اور مشرکوں تک کو قبول کر لیتی ہے محلم کے ساتھ ہی یہ واقعہ صرف اس لئے ہوا ہے کہ تم لوگ اس سے سبق لو، اس کے بعد محلم کی لاش دو پہاڑیوں کے درمیان رکھ کر اس پر پتھر رکھ دیئے گئے۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا امام ابن جریر طبری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر سے اس واقعہ کی روایت کی ہے۔

ان روایات کی روشنی میں مقصود جہاد

ان احادیث وروایات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں کلمہ کا اور اللہ کے نام کا اور اظہار اسلام کا کتنا احترام ہے اور جو شخص محض بدگمانی یا کسی برے جذبہ کی وجہ سے بلا دلیل ایسے شخص کو مسلمان نہ مانے اور اس کے ساتھ کافروں والا معاملہ کرے وہ اللہ کی نظر میں کتنا بڑا مجرم ہے۔

یہ بات بھی بالکل کھلی ہوئی ہے کہ خصوصا جنگ کے موقع پر اس اصول پر عمل کرنا یعنی دشمنوں میں سے بھی جو اپنا مسلمان ہونا ظاہر کر دے اس کو مسلمان مان لینا اور اپنا بھائی بنا لینا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے اور اس سے کتنے بڑے بڑے نقصانات پہنچ سکتے ہیں اور دشمن کے جاسوسوں کے لئے ہماری صفوں میں آ جانا کتنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود سورۂ نساء کی اس آیت اور اس کی تفسیر وتشریح کرنے والی ان احادیث وروایات کا مطالبہ مسلمانوں سے یہی ہے کہ ان خطرات کے باوجود وہ اسی پالیسی کو اپنائیں، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام کا بنیادی نصب العین جہاد وقتال میں بھی بس یہ ہے کہ آدمیوں کو اللہ کا وفادار بندہ اور اپنا بھائی بنایا جائے اور یہ مقصد ہر دوسری مصلحت پر مقدم رہے۔

مجاہدین کا بلند درجہ

اس آیت ۹۱ میں جہاد کے موقع پر جس سخت احتیاط کا حکم دیا گیا ہے اور پھر اس بارہ میں غلطی کرنے والوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے جو انتہائی سخت رویہ اختیار فرمایا اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خاص قسم کی طبیعت اور خاص مزاج کے کچھ لوگ جہاد نہ کرنے اور اپنے

گھروں اور گوشوں میں بیٹھے رہنے ہی میں خیریت سمجھیں اور اسی کو احتیاط وتقوی اور خدا ترسی کا ایک تقاضا سمجھ کر تقاعد اور ''گوشہ نشینی'' کا رویہ اختیار کرلیں، فارسی کا مشہور مصرعہ ہے۔

''کنجے گرفت وترس خدارا بہانہ ساخت''

اس لئے اس آیت کے بعد متصلاً جہاد اور مجاہدین کی خاص افضلیت بیان فرمائی گئی اور بتایا گیا کہ جو اہل ایمان اپنے جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کریں ان کا درجہ اللہ کی نگاہ میں ان لوگوں کے مقابلہ میں بہت بلند ہے جو بغیر کسی عذر اور مجبوری کے جہاد میں حصہ نہ لیں اور گھر میں بیٹھ کر طاعات وعبادات کرتے رہیں۔

بخاری شریف میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ کسی شخص نے حضورؐ سے دریافت کیا یا رسول اللہ! ''أيّ الناس أفضل؟'' (حضرت! آدمیوں میں درجہ کے لحاظ سے کون لوگ سب سے افضل ہیں؟) آپ نے ارشاد فرمایا ''مؤمن يجاهد في سبيل الله بنفسه وماله'' (وہ ایمان والے بندے سب سے افضل ہیں جو اپنے جان ومال کے ساتھ راہِ خدا میں جہاد کریں) پھر آپ سے دریافت کیا گیا ''ثم من؟'' (ان کے بعد کن لوگوں کا درجہ ہے؟) آپ نے فرمایا ''مومن في شعب من الشعاب يتقي الله ويدع الناس من شره'' (وہ ایمان والے جو معاشرہ کی برائیوں، گندگیوں اور گناہوں سے محفوظ رہنے کیلئے سب سے الگ تھلگ کسی گھاٹی میں قیام کریں، وہاں تقوی والی زندگی گزاریں اور کسی بندے کو ان سے کوئی تکلیف وایذا نہ پہنچے) (۱) یہ حدیث گویا اسی آیت ۹۵ کی تفسیر ہے۔

اس آیت میں ایک بات یہ بھی فرمائی گئی ہے ''وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى'' یعنی جو اہل ایمان جہاد میں حصہ لیں اور جو جہاد میں حصہ نہ لیں اور گھر ہی پر اللہ ورسول کے حکم کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، اگرچہ ان کے درجات میں بہت بڑا فرق ہے لیکن جنت اور جنت کی نعمتوں سے محروم ان میں سے کوئی بھی نہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دونوں ہی طبقوں کے لئے جنت کا وعدہ ہے۔ اس بات میں بھی صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کی ایک صریح حدیث مروی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ''جو کوئی اللہ ورسول پر ایمان لائے یعنی دعوتِ اسلام کو قبول کرلے اور نماز روزہ وغیرہ احکام کی پابندی کرے تو خواہ وہ جہاد میں حصہ لے یا نہ

(۱) کتاب الجہاد باب دوم (مرتب)

لے اللہ تعالیٰ ایمان اور عمل صالح کے صلہ میں اس کو جنت ضرور نصیب فرمائے گا'' آگے اسی حدیث میں ہے کہ بعض صحابہ نے اس پر عرض کیا کہ حضرت! جب معاملہ اتنا آسان اور ارزاں ہے تو ہم اس کا عام اعلان کیوں نہ کر دیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جنت ایک ہی درجہ اور ایک قسم کی نہیں ہے اس کے سیکڑوں درجے ہیں۔ اور جو اہل ایمان جہاد میں بھی حصہ لیں گے وہی اس کے اعلیٰ درجات حاصل کر سکیں گے۔ یعنی اعلیٰ درجہ کی جنت جو مجاہدین فی سبیل اللہ کے لئے تیار کی گئی ہے وہ جہاد کرنے والوں ہی کو مل سکے گی۔

جہاد کب فرضِ عین ہے؟

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ عام حالات میں جہاد نماز وغیرہ کی طرح فرض عین نہیں ہے کہ اس کا ترک گناہ اور فسق ہو بلکہ وہ فرض کفایہ ہے اور سورۂ نساء کی اس آیت میں اسی کا یہ حکم بیان کیا گیا ہے۔ لیکن کبھی ہنگامی اور غیر معمولی حالات ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ جہاد ہر اس مسلمان پر جو جہاد کے قابل ہو نماز کی طرح فرض ہو جاتا ہے جس کو نفیر عام کہتے ہیں۔ اس صورت میں جہاد کے لئے نہ نکلنا سخت ترین گناہ ہے اور ایسے لوگوں کے لئے ''كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى'' کی بشارت ہرگز نہیں ہے۔

اس آیت میں ''غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ'' کا جو لفظ آیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کوئی بندہ بیماری یا کسی دوسری قسم کی معذوری اور مجبوری کی وجہ سے جہاد میں حصہ نہ لے سکے، مگر اس کی نیت اور آرزو ہے تو وہ جنت میں مجاہدین والے درجے بھی پائے گا۔ بخاری شریف میں حضرت انس کی حدیث ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ لشکر اسلام کے ساتھ غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے تو راستہ میں آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ مدینہ میں تمہارے کچھ ایسے بھائی ہیں جو اس جہادی مہم میں کسی مجبوری کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہیں جا سکے تھے، لیکن اللہ کی نگاہ میں وہ ہمارے ساتھ ہی رہے، ہم جس وادی یا گھاٹی سے گزرے یا جس منزل پر ہم اترے وہ ہمارے ساتھ رہے اور اللہ تعالیٰ ان کو وہی اجر و ثواب دے گا جو اس مہم میں ساتھ جانے والے تم لوگوں کو عطا فرمائے گا۔ یہ غالباً آپ نے اس لئے فرمایا کہ ساتھ والے مجاہدین میں احساس برتری نہ پیدا ہو اور معذوری کی وجہ سے مدینہ میں رہ جانے والوں کو

وہ اپنے مقابلہ میں کمتر نہ سمجھیں۔ واللہ اعلم۔ (کتاب المغازی۔ غزوۂ تبوک)

درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی کریمانہ قانون ہے کہ کوئی بندہ کسی بڑے سے بڑے عمل کی آرزو رکھے اور مجبوری اور بے بسی کی وجہ سے اسے نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ صرف اس کی نیت اور صادق آرزو کی وجہ سے اس کو وہی اجر عطا فرماتا ہے جو عمل کرنے والوں کو ملتا ہے۔ یہ ایسا کیمیا کا نسخہ ہے کہ ہم اور آپ جہاد اور حج جیسے اعلیٰ سے اعلیٰ اعمال کا ثواب ان کی نیت اور سچی آرزو رکھ کر حاصل کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ آخرت میں ہم اور آپ دیکھیں گے کہ اللہ کے لاکھوں بندے جنہوں نے حج نہیں کیا اور جہاد فی سبیل اللہ ''شہادت'' کا جنھیں موقع نہیں ملا مگر وہ حج اور جہاد و شہادت کی صادق آرزو اور سچی نیت رکھتے تھے وہ جنت میں حجاج اور مجاہدین و شہداء کے ساتھ ہوں گے، اللہ تعالیٰ کے اس قانونِ کرم سے فائدہ نہ اٹھانا بڑی محرومی ہے، ہاں صادق نیت شرط ہے۔

ہجرت اور اسکی فرضیت کا زمانہ

جہاد اور مجاہدین کی فضیلت سے متعلق ان آیتوں کے بعد پورا ایک رکوع ہجرت کے بارہ میں ہے جو ''اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ'' سے شروع ہو کر وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا پر ختم ہوا ہے۔

ان آیات کا مطلب اور موقع محل سمجھنے کے لئے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ نبوت ملنے کے قریباً ۱۳ سال بعد جس وقت رسول اللہ ﷺ نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ طیبہ گویا اسلام کا وطن اور آپ کی ہدایت و دعوت اور اسلامی تعلیم و تربیت کا مرکز بن گیا تو اس وقت مدینہ طیبہ کے سوا کوئی بستی روئے زمین پر ایسی نہیں تھی جہاں اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزاری جاسکے اور اسلامی زندگی دیکھی اور سیکھی جاسکے، اس لئے اسلام قبول کرنے والے ہر شخص کے لئے اس وقت ضروری تھا کہ وہ اپنا کافرانہ و مشرکانہ ماحول اور غیر اسلامی وطن چھوڑ کر مدینہ ہی میں آبسے۔ الغرض اس وقت ہجرت بھی نماز روزہ کی طرح ہر مسلمان پر فرض تھی۔ بلکہ گویا ایمان و اسلام کی لازمی شرط تھی، صرف وہی لوگ اس سے مستثنیٰ تھے جو کسی وجہ سے ہجرت کرنے ہی سے مجبور تھے۔

یہ حکم فتح مکہ تک جاری رہا، ۸ھ میں جب مکہ معظمہ پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوگیا جس کے بعد کفر کا زور سارے عرب میں ٹوٹ گیا اور ہر جگہ کے مسلمانوں کے لئے اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزارنا اور اسلام کے داعیوں اور معلموں کا ہر جگہ آنا جانا آسان ہوگیا تو ہجرت کی فرضیت کا حکم منسوخ ہوگیا اور خود رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمادیا "لا ھجرۃ بعد فتح مکۃ" (فتح مکہ کے بعد ہجرت کی فرضیت ختم ہوگئی) (۱)

سورۂ نساء کی یہ چار آیتیں "اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ" سے لے کر "اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا" تک اسی دور میں نازل ہوئی تھیں جب دارالکفر میں اسلام قبول کرنے والے ہر شخص کے لئے ہجرت کر کے مدینہ آجانا نماز کی طرح ایک دینی وایمانی فریضہ تھا۔ ان آیتوں میں ان لوگوں کو جنھوں نے کافروں کے علاقہ میں رہتے ہوئے اسلام قبول کرلیا تھا اور ہجرت کے حکم پر ابھی تک عمل نہیں کیا تھا بلکہ اپنے علاقوں ہی میں وہ رہ بس رہے تھے، نہایت مؤثر انداز میں ہجرت پر ابھارا گیا ہے اور ہجرت نہ کرنے کے نہایت سخت انجام سے ان کو ڈرایا گیا ہے۔

پہلی آیت "اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ۔ الآیۃ" میں بتایا گیا ہے کہ موت کے فرشتے جب ان لوگوں کی روح قبض کریں گے جو اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی کفر وجاہلیت کے ماحول میں رہ کر غیر اسلامی زندگی گزار رہے ہیں تو ان سے بطور عتاب کے پوچھیں گے فِیْمَ کُنْتُمْ (یعنی تم کس حال میں تھے اور کیسی زندگی گزار رہے تھے، کیا اسلام والی زندگی جس کو تم نے قبول کیا تھا یا کافروں والی غیر اسلامی زندگی جو تمہارے علاقہ اور ماحول کی زندگی تھی؟ تو فرشتوں کے اس سوال کے جواب میں یہ لوگ کہیں گے "کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ" یعنی ہم اپنے ملک اور اپنے وطن میں بالکل دبے ہوئے اور بے بس تھے، وہاں کے حالات میں اسلامی زندگی گزارنے کی ہمارے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، اس لئے مجبوراً اپنے اس غیر اسلامی ماحول کے مطابق ہی زندگی گزار رہے تھے، فرشتے ان کے اس عذر کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے اسی عتاب آمیز انداز میں ان سے کہیں گے۔ "اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا" کیا خدا کی

(۱) صحیح بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب (۱) فضل الجہاد (مرتب)

زمین تمہارے لئے وسیع نہ تھی کہ تم کسی طرف کو ہجرت کر جاتے اور ایسی کسی جگہ چلے جاتے جہاں اسلامی طریقہ پر زندگی گزار سکتے؟

آیت کے اس جزو سے صاف ظاہر ہے کہ فرشتوں کا یہ عتاب آمیز سوال و جواب ان لوگوں سے ہوگا جن کے لئے ہجرت کے امکانات تھے لیکن انہوں نے اس لئے ہجرت نہیں کی کہ اس میں انھیں مال و جائیداد کی جو قربانی دینی پڑتی اور ترک وطن کی وجہ سے جو تکلیفیں اٹھانی پڑتیں وہ ان کے لئے آمادہ نہیں ہوئے، یعنی ان کی عافیت طلبی اور مال و جائیداد وغیرہ کی محبت نے انھیں ہجرت سے روکے رکھا، ورنہ اگر وہ مومنین صادقین کی طرح ان سب باتوں سے بے پرواہو کر ہجرت کے لئے تیار ہو جاتے تو کر سکتے تھے۔ آگے کی آیت میں ان لوگوں کا یہ انجام بتلایا گیا ہے۔ "فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا" یعنی ان کے اس گناہ عظیم کی کہ انہوں نے امکان واستطاعت کے باوجود ہجرت نہیں کی اور دار الکفر کو اپنا وطن بنائے رکھا، آخرت میں سزا یہ ہوگی کہ معاذ اللہ جہنم ان کا ٹھکانا اور وطن بنے گا اور اس کا بے پناہ دکھ اور عذاب انھیں بھگتنا ہوگا۔

تنہا اسی ایک آیت سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس دور میں ہجرت کی کتنی اہمیت تھی، بعض علماء اور مفسرین نے لکھا ہے کہ اس دور میں ہجرت فرض و واجب ہونے کے علاوہ اسلام کا شعار بھی تھی اور اسی لئے ہجرت کے بغیر کسی شخص کو قانونی طور پر مسلمان نہیں مانا جاتا تھا، لیکن اگر یہ نہ بھی کہا جائے تو اتنی بات تو اس آیت سے بالکل ظاہر ہے کہ اس وقت ہجرت نہ کرنا شدید ترین معصیت تھی "فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا" ایسی وعید ہے کہ قرآن پاک میں زانیوں اور شرابیوں کو بھی غالباً اتنی سخت وعید نہیں سنائی گئی بلکہ قرآن پاک میں اکثر و بیشتر مقامات پر کافروں ہی کا یہ انجام بتایا گیا ہے۔

معذوروں کے لئے رعایت

اس کے بعد والی آیات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی کافرانہ علاقہ میں اسلام قبول کرنے والے جو لوگ اور جو عورتیں بچے اپنے خاص حالات کی وجہ سے ہجرت کرنے سے فی الواقع بالکل ہی مجبور ہوں اور ان کے لئے ہجرت کی راہیں بالکل ہی مسدود ہوں، وہ بے شک عند اللہ

معذور اور قابل معافی ہیں۔ ارشاد ہے۔ ''اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَایَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً وَّلَایَهْتَدُوْنَ سَبِیْلًا، فَاُولٰٓئِكَ عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا۔''

یعنی کفر وشرک یا الحاد کے ماحول میں دبے ہوئے جو مجبور و بے بس لوگ اور عورتیں اور بچے واقعتاً اس حالت میں ہوں کہ وہ ہجرت کر ہی نہ سکتے ہوں اور اپنے علاقوں سے نکلنے کے راستے ان کیلئے بالکل ہی بند ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم سے امید ہے کہ ایسے مجبور لوگوں کے ہجرت نہ کرنے کو وہ معاف فرمادے گا۔ کیونکہ قصوروں کا معاف کرنا اور مجرموں کو بخش دینا اس کی صفت اور شان ہے ''عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا'' اس آیت میں اگرچہ ان معذورین کو ہجرت نہ کرنے پر مواخذہ اور عذاب سے مستثنیٰ کیا گیا ہے لیکن اس استثناء کے لئے بھی انداز بیان ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے ہجرت کے حکم اور مطالبہ کی شدت اور اہمیت اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے، ان معذورین کے لئے یہ نہیں فرمایا گیا کہ یہ لوگ اپنی مجبوری و بے بسی کی وجہ سے عنداللہ معذور ہیں بلکہ فرمایا گیا ''عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ۔ الایۃ'' جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ قصوروں کو معاف کرنے والا اور گناہوں کو بخشنے والا ہے اور یہ اس کی خاص شان اور صفت ہے اس لئے اس سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ان معذورین کے ترک ہجرت کے قصور کو معاف کردے اور مواخذہ نہ فرمائے، گویا ان معذورین کو بھی سمجھنا چاہئے کہ ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے ہم قصوروار ہیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ کے دامنِ عفو ومغفرت ہی میں پناہ مل سکتی ہے۔

مہاجرین کیلئے دنیا وآخرت کے وعدے

اس کے آگے ہجرت کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ فرمایا گیا ہے اور گویا ضمانت دی گئی ہے کہ جب وہ اللہ کی رضا جوئی کے لئے اپنا کافرانہ وطن چھوڑ کر نکل کھڑے ہوں گے تو ان کے رہنے بسنے اور آزادی سے زندگی گزارنے کے لئے وسیع میدان بھی ملیں گے اور فراخی اور کشائش بھی نصیب ہوگی یعنی چھوڑے ہوئے کافرانہ وطن کی جگہ انھیں زیادہ اچھا اور وسیع وطن بھی ملے گا اور رزق وغیرہ اسباب حیات بھی فراوانی کے ساتھ

عطا ہوں گے۔ارشاد ہوا "وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً" (اور جو کوئی راہِ خدا میں ترک وطن کر کے نکلے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ وہ اللہ کی زمین میں آزادی سے رہنے بسنے کے لئے وسیع میدان اور پوری فراخی اور کشادگی پائے گا)

اس کے بعد اس سلسلہ کی آخری آیت یہ ہے "وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔"

اس آیت میں مہاجرین کو ایک بڑی خوشخبری سنائی گئی ہے، اوپر والی آیت میں ان کے لئے دنیاوی خوش انجامی کی ضمانت کا ذکر فرمایا گیا تھا۔ اس آخری آیت میں اخروی خوش انجامی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ ورسول کیلئے ہجرت کرنے والا صاحب ایمان بندہ جب ہجرت کی نیت سے پہلا قدم اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں مہاجر لکھ لیا جاتا ہے اور آخرت میں مہاجرین کے لئے جس ثواب عظیم اور جن بلند درجات کے وعدے ہیں انکا مستحق ہو جاتا ہے، منزل تک پہنچنا بلکہ آدھا یا چوتھائی راستہ طے کرنا بلکہ میل دو میل بھی اپنے گھر سے نکل جانا شرط نہیں ہے، اگر بالفرض گھر سے نکلتے ہی وہ مہاجر بندہ کسی حادثہ کا شکار ہو جائے اور اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کو آخرت میں وہ سب کچھ ملے گا جس کا مہاجرین کے لئے وعدہ ہے...... مثلاً حدیث شریف میں ہے "ان الھجرۃ تھدم ما کان قبلہ" (یعنی ہجرت کے عمل کی برکت سے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں) تو اس شخص کے بھی سارے گناہ معاف ہو جائیں گے، اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کی ان خاص الخاص رحمتوں اور عنایتوں کا مستحق ہوگا، جو مہاجرین کے لئے مخصوص ہیں اگرچہ اللہ کے اس بندے کا دارالکفر ہی میں انتقال ہو گیا ہو اور وہ وہیں دفن کر دیا گیا ہو لیکن ہجرت کی نیت سے پہلا قدم اٹھانے کے بعد وہ اللہ کے یہاں مہاجر لکھا گیا اور قیامت میں وہ مہاجرین ہی کے زمرہ میں اٹھے گا۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایسے بعض واقعات پیش بھی آئے۔ تفسیر معالم التنزیل میں امام بغوی نے نقل فرمایا ہے کہ ایک صاحب جُندُب بن ضَمرَہؓ تھے۔ یہ مکہ معظمہ میں اسلام قبول کر چکے تھے اور بہت بوڑھے اور ساتھ ہی مریض بھی تھے، انھیں کسی طرح سورۂ نساء کی یہ آیتیں پہنچیں تو انھوں نے طے کر لیا کہ میں ایک رات بھی مکہ میں نہ گزاروں گا اور اپنے

گھر والوں سے کہا کہ مجھے اٹھا کے کسی بھی طرح یہاں سے لے چلو اور رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ پہنچا دو، ان کے گھر والوں کو شاید ان کی حالت پر رحم آیا اور وہ ان کو اسی بیماری کی حالت میں لے کر چل دیئے، تنعیم مکہ معظمہ سے دو ڈھائی میل ہے، مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ جانے کے لئے تنعیم ہی کی طرف سے راستہ تھا، یہ بڑے میاں تنعیم ہی تک پہنچے تھے کہ وہیں انتقال ہو گیا۔ اسی طرح کے اور بھی بعض واقعات نقل کئے گئے ہیں۔ اس آیت کی بشارت کے مطابق ایسے سب لوگ جو اس زمانہ میں ہجرت کے لئے نکلے اور مدینہ طیبہ پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں انتقال ہو گیا اللہ کے یہاں مہاجرین میں ہیں۔

ہجرت کا قانون اور اس کا وسیع مفہوم

ابھی میں نے ذکر کیا تھا کہ ہجرت کی فرضیت کا حکم اس وقت ختم ہو گیا جب مکہ معظمہ پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو گیا اور اس کے بعد پورے ملک عرب میں کفر کا زور ٹوٹ گیا، اس وقت رسول اللہ ﷺ نے خود اعلان فرمادیا "لاھجرة بعد فتح مکة" (مکہ کے فتح ہو جانے کے بعد ہجرت کا حکم نہیں رہا) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب قیامت تک کبھی اور کسی حال میں بھی ہجرت فرض نہیں ہوگی بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جو خاص حالات تھے اور ان حالات کی وجہ سے جو ہجرت کا حکم تھا، ان حالات کے خاتمہ کے ساتھ وہ حکم بھی اٹھا لیا گیا، لیکن اگر دنیا کے کسی حصہ میں وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کے لئے کسی وقت ایسے حالات ہو جائیں کہ وہاں اسلامی طریقہ پر زندگی گزارنے کا امکان باقی نہ رہے تو وہاں کے مسلمانوں پر اسی طرح ہجرت فرض ہوگی جس طرح فتح مکہ سے پہلے مکہ وغیرہ میں اسلام قبول کرنے والوں پر فرض تھی۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ہمعصر ہیں اور شاہ صاحبؒ ان کو بیہقی وقت فرمایا کرتے تھے، ان کی "تفسیر مظہری" قدیم طرز کی تفسیروں میں بہترین تفسیر ہے اور اسی تفسیر سے ان کے علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اپنے مرشد حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے نام نامی پر اپنی تفسیر کا نام تفسیر مظہری رکھا ہے، اسی تفسیر مظہری میں ہجرت سے متعلق سورۂ نساء کی آیت "اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ۔ الآية" کی تفسیر فرماتے ہوئے حضرت قاضی صاحب نے لکھا ہے۔

ان الهجرة من دار الكفر علىٰ من قدر عليها فريضة محكمة بالاجماع غير منسوخة وهذه الاية دليل علىٰ وجوب الهجرة من موضع لاتمكن فيه اقامة شرائع الاسلام۔

یعنی دارالکفر جہاں اسلامی احکام کے مطابق زندگی نہ گزاری جاسکتی ہو، اس سے ہجرت کرنا فرض ہے، اس پر اجماع ہے یہ حکم قطعی ہے اور منسوخ نہیں ہوا ہے، اور یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جس ملک اور جس علاقہ میں احکام اسلامی پر نہ چلا جاسکے اور ان کے مطابق زندگی نہ گزاری جاسکے وہاں سے ہجرت کر جانا واجب ہے۔

اب سے قریباً ۵۰ سال پہلے جب روس میں بالشویک حکومت قائم ہوئی تھی تو وہاں کا حال مختلف ذریعوں سے ایسا ہی سنا جاتا تھا، بخارا وغیرہ کے لاکھوں مسلمان اسی لئے اپنے علاقوں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے، ان کی ایک بڑی تعداد ہندوستان بھی آئی تھی، ان کے بیانات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کی بالشویکی حکومت میں اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزارنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور سب سے زیادہ مستند بیان اس سلسلہ میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے رفیق خاص اور معتمد سکریٹری ظفر حسن ایبک کا ہے، جو اب سے ۴۵ سال پہلے مولانا مرحوم کے ساتھ ہی کابل سے روس گئے تھے اور دو سال تک وہاں رہے اور مولانا ہی کی ہدایت سے وہاں انھوں نے ایک سرکاری کالج میں داخلہ بھی لے لیا تھا، وہ الحمدللہ ابھی حیات ہیں، روس سے وہ ترکی چلے گئے تھے جہاں مولانا سندھی مرحوم ان سے پہلے پہنچ چکے تھے، پھر مولانا مرحوم تو ترکی سے حجاز چلے گئے اور چند سال وہاں رہ کر غالباً ۳۸ء میں قریباً ۲۵ سال کی جلاوطنی کے بعد ہندوستان آئے اور چند سال کے بعد سندھ ہی میں انتقال فرما گئے لیکن ان کے یہ رفیق خاص اور سکریٹری ظفر حسن ایبک ترکی ہی میں رہ گئے اور وہاں کی شہریت حاصل کر کے فوج میں لے لئے گئے، انھوں نے اپنے اور مولانا سندھی مرحوم کے اس پورے مجاہدانہ سفر کی (جو دراصل انگریزوں کے خلاف جہاد کے ایک منصوبہ کے تحت ۱۵ء میں شروع ہوا تھا) مفصل سرگزشت ''آپ بیتی'' کے نام سے لکھی ہے، اس کی دو جلدیں حال میں شائع ہوئی ہیں، پہلی جلد میں انھوں نے اپنی پہلی منزل کابل کے سات سالہ قیام کی سرگزشت لکھی ہے جو بڑی ہی عبرت آموز ہے، دوسری جلد میں روس کے قیام اور پھر وہاں سے ترکی پہنچنے کا ذکر ہے، یہ کتاب

اس لائق ہے کہ ہزار دو خواں خاص کر ہمارے عربی مدارس کے فضلاء اور کالجوں کے گریجویٹ اس کو پڑھیں، میں خود اس کتاب سے بہت متاثر ہوں۔

خیر یہ چند جملے تو میں نے ظفر حسن ایبک اور ان کی ''آپ بیتی'' کے تعارف کے طور پر کہہ دیئے، میں بتانا یہ چاہتا تھا کہ ظفر حسن ایبک نے روس میں اپنے زمانۂ قیام کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بیچارے نماز تک علانیہ نہیں پڑھ سکتے تھے اور کسی طرح چھپ کر پڑھتے تھے تو خطرہ رہتا تھا کہ کوئی جاسوسی نہ ہو جائے۔ مولانا سندھی مرحوم تو روسی حکومت کے سرکاری مہمان تھے، ان کے لئے تو کوئی پابندی نہیں ہوگی، لیکن ظفر حسن جنہوں نے مولانا کی ہدایت سے وہاں کے کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور ہوسٹل میں قیام تھا، ان کے لئے اس کا امکان نہیں تھا کہ کھلے طور پر نماز پڑھ سکیں یا کوئی ایسا اسلامی عمل کر سکیں، تحقیق نہیں کہ اب وہاں کے حالات اس لحاظ سے کیسے ہیں، سنا ہے کہ اب وہ پہلے جیسی سختیاں باقی نہیں رہی ہیں، پالیسی کچھ ڈھیلی ہو گئی ہے۔ واللہ اعلم۔ (۱)

اسی طرح چین کے متعلق بھی یہی معلوم ہوا ہے کہ وہاں اسلامی زندگی گزارنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب سے چند ہی سال پہلے جب کمیونسٹ چین نے تبت پر قبضہ کیا تو وہاں کے دیندار مسلمانوں نے بھی یہی محسوس کیا کہ وہ چین کی کمیونسٹ حکومت میں مسلمان رہ کر زندگی نہیں گزار سکیں گے، چنانچہ انھوں نے بھی بخارا کے مسلمانوں کی طرح وطن کو خیر باد کہا اور زیادہ تر تو ہندوستان ہی آئے۔ کئی خاندان تو آپکے شہر لکھنؤ، ہی میں آ بسے تھے، لیکن بعد میں ان میں سے زیادہ تر حجاز وغیرہ چلے گئے، مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ خدا کے ان بندوں نے اپنی اس ہجرت کی وجہ سے بڑی تکلیفیں اٹھائیں، ان میں سے جو حجاز گئے، ان بیچاروں کو بھی بہت مشکل سے اور کئی سال کے بعد وہاں قیام کی قانونی اجازت مل سکی۔

میں نے اس وقت روس اور چین کا ذکر تو صرف مثال کے طور پر کیا ہے ورنہ میں کہہ یہ رہا تھا کہ دین کے دوسرے احکام کی طرح ہجرت کا حکم بھی قیامت تک کے لئے ہے اور جب کبھی کسی ملک کے حالات ایسے ہوں کہ وہاں مسلمان اپنے دینی فرائض بھی ادا نہ کر سکیں اور مسلمانوں والی زندگی نہ گزار سکیں تو ان کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا اسی طرح فرض ہو جائے گا جس طرح فتح مکہ سے پہلے مکہ سے ہجرت کرنا فرض تھا۔

---

(۱) اور جس وقت یہ کتاب شائع ہو رہی ہے اس وقت یہ ظالم حکومت باقی ہی نہیں رہی ہے، اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ (مرتب)

موجودہ ہندوستان کے حالات اور ہجرت

اس موقع پر ایک صاحب نے اثناء درس ہی میں سوال کیا کہ ہمارے ملک ہندوستان کے بارے میں موجودہ حالات میں شریعت کا کیا حکم ہے، کیا یہاں سے ہجرت فرض نہیں ہے؟...... مولانا نے فرمایا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہاں کے نظام حکومت سے ہمیں بہت سی شکایتیں ہیں اور ان میں بعض شکایتیں بڑی سنگین قسم کی ہیں اور ہم ان شکایتوں میں بالکل حق بجانب ہیں اور ہم حکومت کو قصوروار سمجھتے ہیں اور ہماری جدو جہد جاری ہے، اور جاری رہے گی۔ لیکن خود ہم سے بھی حق وانصاف کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اس کو محسوس کریں اور اس کا اعتراف کریں کہ محدود ہی قسم کی جو آزادی خاص کر مذہبی امور کے بارے میں ہمیں یہاں اب تک حاصل ہے، آج کی دنیا کے بہت سے ان ملکوں میں بھی جو مسلمانوں کے ملک کہلاتے ہیں اس سے زیادہ آزادی حاصل نہیں ہے، ابھی چند روز ہوئے ایک ایسے ہی ملک کے ایک عالمِ دین کا جو نہایت صالح اور دین کے مخلص خادم ہیں اور میرے اور مولانا علی میاں کے خاص دوستوں میں ہیں، خط آیا تھا اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ آپ کے ملک میں تو مسلمان مظلوم ہیں اور ہمارے ملک میں بے چارہ اسلام مظلوم ہے۔

اس سوال وجواب کے بعد سلسلۂ درس جاری رکھتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

اب ہجرت کے سلسلہ میں مجھے صرف ایک بات اور ذکر کرنی ہے، اصل ہجرت اور حقیقی ہجرت تو وہی ہے جو کسی ایسے دارالکفر سے جہاں اسلامی زندگی نہ گزاری جاسکتی ہو کسی دوسرے ایسے علاقہ کی طرف کی جائے جہاں اسلامی ماحول ہو اور اسلامی زندگی گزارنے کی آزادی حاصل ہو، سورۂ نساء کی ان آیتوں کا تعلق اسی ہجرت سے ہے اور ظاہر ہے کہ ہمارے سامنے اس کا اس وقت کوئی سوال الحمدللہ نہیں ہے لیکن بعض احادیث سے علماء کرام نے سمجھا ہے کہ کسی بھی اچھے مقصد کے لئے وطن چھوڑ کر نکلنا اور سفر اور پردیس کی تکلیفیں برداشت کرنا یہ بھی ایک طرح کی ہجرت ہی ہے اور ان ہجرتوں کے راستے ہمارے اور آپ کے لئے آج بھی کھلے ہوئے ہیں۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا اور جو بہت

بڑے عالم دین محدث اور مفسر ہونے کے ساتھ اپنے وقت کے عارف کامل بھی ہیں، انھوں نے ہجرت سے متعلق سورۂ نساء کی ان آیات کی تفسیر سے فارغ ہوکر آخر میں لکھا ہے۔

"قالوا كل هجرة لطلب علم اوحج اوجهاد اوفرار الى بلد يزداد فيه طاعة اوقناعة او زهدا او ابتغاء رزق طيب فهي هجرة الى الله ورسوله۔"

مطلب یہ ہے کہ علم دین کی طلب میں یا حج کیلئے یا کسی دینی جدوجہد کے لئے وطن چھوڑ کر نکلنا بھی ہجرت الی اللہ ورسولہ میں شامل ہے، اسی طرح اپنا وطن چھوڑ کر دوسری کسی ایسی جگہ جانا جہاں رہنے سے طاعت وعبادت میں ترقی ہو اور قناعت اور زہد جیسے ایمانی اخلاق حاصل ہونے کی امید ہو (جیسے طالبین پہلے خانقاہوں میں مشائخ سے تربیت حاصل کرنے اور تزکیۂ نفس کے لئے جایا کرتے تھے)۔ الغرض اس طرح کے سارے سفر بھی ہجرت میں شامل ہیں اور آخری بات یہ ہے کہ کوئی شخص حلال روزی کی تلاش میں بھی اپنا گھر چھوڑ کر پردیس جائے اور اس کی نیت یہی ہو کہ وہاں جاکر حلال روزی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تو فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک درجہ کی ہجرت ہے۔

الغرض کسی بھی ایسے نیک مقصد کیلئے جو اللہ ورسول کو پسند ہو دیس چھوڑ کر پردیس جانا اور سفر کی صعوبتیں اٹھانا "ہجرۃ الی اللہ ورسولہ" کے وسیع مفہوم میں شامل ہے اور یہ ہجرت کی وہ شکلیں ہیں جن کے دروازے ہم سب کے لئے اس وقت بھی کھلے ہوئے ہیں۔ یہ بڑی محرومی کی بات ہے کہ جو نہ ہو سکتا ہو اس کی تو آرزو کریں اور جو ہو سکتا ہے اسے حقیر سمجھیں اور اس سے غفلت برتیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عقل سلیم نصیب فرمائے۔



(درس-۲)

حالت سفر اور میدان جنگ میں نماز

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطن الرّجیم۔ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ
الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا
لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا٥ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ
فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَعَكَ وَلْيَاخُذُوْآ أَسْلِحَتَهُمْ، فَاِذَا سَجَدُوْا
فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا
مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ
تَغْفُلُوْنَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَيْلَةً
وَّاحِدَةً ط وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّنْ مَّطَرٍ
أَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى أَنْ تَضَعُوْآ أَسْلِحَتَكُمْ ج وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ط
اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكَافِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا٥ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ
فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ
فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ج اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا
مَّوْقُوْتًا٥ (سورہ النسا آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳)

(ترجمہ) اور جب تم سفر میں نکلو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم نماز میں قصر کیا کرو، (یعنی چار رکعت والی نماز دو رکعت پڑھو) اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ اہل کفر تمہارے ساتھ کوئی شرارت اور فتنہ پردازی کریں گے، بیشک یہ کفار تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں (یہ ہرنا کردنی کر سکتے ہیں)۔ اور اے پیغمبر! جب تم (میدان جنگ میں) مجاہدین کے درمیان موجود ہو اور ان کو نماز پڑھاؤ (یعنی نماز میں ان کی امامت کرو) تو چاہئے کہ لشکرِ مجاہدین کا ایک حصہ (نماز پڑھنے کے لئے) تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے اور وہ اپنے اسلحہ ساتھ لے لے (یعنی پوری طرح مسلح ہو کر آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہو) پھر جب یہ لوگ سجدہ کرلیں تو یہ تمہارے پیچھے ہو جائیں اور (ان کی جگہ) لشکر کا وہ دوسرا حصہ آجائے جو نماز میں ابھی شریک نہیں ہوا تھا، وہ اب آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے اور یہ بھی (پورا) دفاعی سامان اور اپنے اسلحہ لے کر نماز میں شریک ہو، ان کافروں کی یہ دلی تمنا ہے کہ تم اپنے اسلحہ اور سامان سے ذرا غافل ہو تو یہ تم پر ایک دم ٹوٹ پڑیں۔ اور اگر (ایسی صورت ہو کہ) بارش (وغیرہ) کی وجہ سے یا بیماری کے سبب سے تمھیں تکلیف ہو (اور پورا سامان جنگ ساتھ لے کر نماز میں شرکت اور نقل وحرکت مشکل ہو) تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ (دشمن پر حملہ میں کام آنے والے) اسلحہ اتار دو (لیکن) دفاعی سامان ضرور ساتھ لے لو، اللہ تعالی نے ان کافروں کے لئے نہایت رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

پھر جب تم نماز (اس طریقہ پر) ادا کر چکو تو کھڑے بیٹھے اور لیٹنے کی حالت میں (یعنی ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے رہو (اور اس سے غافل نہ ہو) پھر جب تمہاری حالت اطمینان والی ہو جائے (یعنی دشمن کی طرف سے خطرہ نہ رہے) تو نماز کو (مقررہ طریقہ پر) خوب اچھی طرح اہتمام کے ساتھ پڑھو، نماز اہل ایمان پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض ہے۔ (اس لئے عام حالات میں ٹھیک وقت پر پورے سکون و وقار اور دل کی توجہ کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے)۔

تفسیر وتشریح

حالت سفر اور حالت جنگ کی نماز

یہ سورہ نساء کا پندرہواں رکوع ہے، اس سے پہلے رکوع میں ہجرت کی اہمیت بیان فرمائی گئی تھی، اور اس کے بارے میں ہدایات دی گئی تھیں، اور اس سے پہلے جہاد کا بیان چل رہا تھا۔ اس رکوع میں پہلے تو صرف ایک آیت میں بحالت نماز سفر میں قصر کرنے کا حکم بیان فرمایا گیا ہے اور اس کے بعد خاص میدان جنگ میں جب دشمن کے حملہ کا خطرہ ہو، نماز با جماعت ادا کرنے کا ایک خاص طریقہ بتایا گیا ہے جس کو ''صلوٰۃ الخوف'' کہتے ہیں، آپ میں سے اکثر بھائیوں نے غالباً اس صلوٰۃ خوف کا طریقہ نہ سنا ہوگا اور آپ کو تعجب ہوگا کہ کوئی نماز اس طرح بھی پڑھی جاتی ہے۔ رسول اللہ نے ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد مختلف غزوات میں اسی طریقہ پر نماز پڑھی اور پڑھائی، حدیثوں میں آپ کی ان نمازوں کا تفصیل سے ذکر آتا ہے۔ یہ طریقہ تو میں انشاء اللہ آیات کی تشریح کے ضمن میں ابھی بتاؤں گا، پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ جہاد اور ہجرت کے بیان کے ساتھ سفر اور حالتِ جنگ کی نماز کے احکام اور طریقہ بیان کرنے کی کیا خاص حکمت ہے۔ اس کی مختلف حکمتیں بیان کی گئی ہیں لیکن میرے نزدیک سب سے بڑی حکمت اس کی یہ ہے کہ مسلمان اچھی طرح سمجھ لیں کہ اسلام کے نظام زندگی میں نماز اتنی اہم چیز ہے کہ سفر کی بے اطمینانی کی حالت میں اور خاص میدان جنگ میں بھی جب دشمن کے اچانک حملہ کا خطرہ ہو اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ وہ وقت پر ادا کرنی ہوگی اور تا امکان جماعت کے ساتھ ادا کی جائے گی، اور یہ اس لئے کہ اسلامی جہاد کا مقصد دنیا کی دوسری قومی اور ملکی جنگوں کی طرح یہ نہیں ہے کہ مسلمان قوم یا کسی مسلمان ملک کو غلبہ اور اقتدار حاصل ہو اور دنیا میں اس کا بول بالا اور اس کا جھنڈا اونچا ہو، بلکہ جہادِ اسلامی کا مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، دنیا میں بندگی، خدا پرستی اور فرمانبرداری والی زندگی کا رواج ہو، شر و فساد ختم ہو، فسق و فجور کا خاتمہ ہو اور اس کی جگہ نیکی اور خدا ترسی کا دور دورہ ہو۔ اس بارے میں خود مسلمانوں کے ذہنوں اور ان کے انداز فکر کو صحیح رکھنے کے لئے اور صحیح اسلامی لائن پر ان کی

تربیت کے لئے یہ ضروری تھا کہ عین میدان جنگ میں دشمن فوج کے حملہ کے خطرہ کی حالت میں بھی نماز کا وقت آجانے پر وہ نماز ادا کریں اور ان کے دشمن بھی ان کو اس حال میں دیکھیں کہ وہ میدان جنگ میں بھی اللہ سے غافل نہیں ہوتے، اس کی عبادت کو ہر چیز پر مقدم رکھتے ہیں اور جب وقت آجاتا ہے تو اس کے حضور میں نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور رکوع وسجود کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کو دشمن کے حملہ کا خطرہ ہو۔

اس کے علاوہ یہ بھی امکان تھا کہ جن مجاہدین کی پوری تربیت نہ ہوئی ہو، شیطان سمجھائے کہ وہ تو سر سے کفن باندھ کر خدا کی راہ میں نکلے ہوئے خدا کے سپاہی ہیں، ان کا تو چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا حتیٰ کہ کھانا پینا اور سونا بھی عبادت ہے، ایسی حالت میں خاص کر جب لشکرِ اسلام ہتھیار بند ہو کر دشمن فوج کے سامنے صف بستہ ہو اور دشمن بھی کیل کانٹے سے بالکل تیار ہو تو ایسی صورت میں تو میدان جہاد کی یہ صف بندی نماز کی صف بندی کے قائم مقام ہو جانی چاہئے اور مجاہدین کو نماز میں مشغول ہونے کا حکم نہ ہونا چاہئے۔ یہ دفاع کی مصلحت کے بھی خلاف ہے۔ تو جہاد و ہجرت کی آیات کے ساتھ ہی ان آیات میں صلوۃ خوف کا بیان فرما کر اس طرح کے شیطانی وسوسوں کا بھی سد باب فرما دیا گیا اور واضح کر دیا گیا کہ جہاد جب ہی جہاد ہے جب اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ قائم رہے، اس کے احکام کی فرمانبرداری ہو، خاص کر نماز کا اہتمام ہو جو خدا کی بندگی اور اطاعت و فرمانبرداری کا رمز اور اس کی نشانی ہے، جو جنگ خدا کی رضا جوئی اور اس کے نماز جیسے احکام سے بے پروا ہو کر اور ان کو پامال کر کے لڑی جائے وہ اللہ کی نگاہ میں جہاد نہیں سراسر فساد ہے۔ ان آیات کا یہ سبق نہایت اہم ہے اور اس سے اسلام کی روح، اس کے بنیادی نقطۂ نظر اور اس کے نصب العین کو سمجھا جا سکتا ہے۔

ہمارے مولانا علی میاں کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم کو آپ میں سے اکثر حضرات نے دیکھا ہوگا، بالکل فرشتہ صفت انسان تھے، وہ بیان فرماتے تھے کہ اسی لکھنؤ میں مسلمانوں کے کسی قومی اور ملی مسئلہ کے سلسلہ میں کوئی میٹنگ بلائی گئی، ڈاکٹر صاحب بھی مدعو تھے اور شریک ہوئے، نماز کا وقت آیا تو ڈاکٹر صاحب نے انتظار کیا کہ خود داعی صاحبان ہی نماز کے لئے میٹنگ ملتوی کرنے کا اعلان کریں گے، جب کسی نے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا اور تاخیر زیادہ ہونے لگی تو ڈاکٹر صاحب نے خود ہی لوگوں کو توجہ دلائی، ایک صاحب نے بڑی

بے تکلفی سے فرمایا یہ بھی تو نماز ہی کا کام ہو رہا ہے۔

دراصل ہماری بربادیوں کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اسلام کے نام پر اسلامی احکام کو پامال کیا جاتا ہے۔

اب میں ایک ایک آیت کا مطلب بیان کرتا ہوں:

پہلی آیت ہے:

"وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ، اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا، اِنَّ الْکَافِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا۔"

اس کا سادہ ترجمہ یہ ہے کہ "جب تم سفر میں نکلو تو تمہارے لئے اس میں کوئی گناہ اور مضائقہ نہیں ہے کہ نماز میں "قصر" یعنی کمی اور تخفیف کر دو، اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کفار تمہارے ساتھ کوئی فتنہ پردازی اور شرارت کریں گے۔ یہ کفار تمہارے کھلم کھلا دشمن ہیں۔"

آیت کی تشریح طلب باتیں

اس آیت میں بحالتِ سفر نماز میں قصر کرنے کا حکم بیان فرمایا گیا ہے، اس میں کئی خاص باتیں خاص طور سے تشریح طلب ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس میں سفر کی کوئی حد نہیں بیان کی گئی یعنی یہ نہیں بتایا گیا کہ کم سے کم کتنی دور کا سفر کرنے والے کے لئے یہ سہولت اور رخصت دی جا رہی ہے، اسی طرح یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ قصر کس طرح کیا جائے گا۔ اور نماز میں کیا کمی اور تخفیف کی جائے گی۔ قرآن مجید کا یہ عام قاعدہ ہے کہ اس میں بطور متن کے اصولی حکم بیان فرما دیا جاتا ہے، اس کی تفصیلات امت کو رسول اللہ کے ارشادات اور آپ کے عمل سے معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً قرآن پاک میں جابجا نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کے بارے میں یہ تفصیل کہ نماز کیسے پڑھی جائے اور کن کن وقتوں میں پڑھی جائے، یہ سب رسول اللہ کے ارشادات اور آپ کے طرز عمل سے معلوم ہوا ہے، اسی طرح آپ کی احادیث اور آپ کے مستقل طرز عمل سے قصر کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ قصر کا مطب صرف اتنا ہے کہ چار رکعت والی نمازیں (یعنی ظہر، عصر، عشاء) دو رکعت پڑھی جائیں، فجر اور مغرب میں کوئی تخفیف نہیں۔

اسی طرح آپ کے اشارات اور طرز عمل سے امت کے ائمہ اور علماء نے اپنے اپنے فہم کے مطابق یہ سمجھا کہ کم سے کم کتنی مسافت کے سفر میں قصر کیا جائے گا۔

اسی طرح کی ایک دوسری تشریح طلب بات یہ ہے کہ اس آیت میں لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ (تم پر کوئی گناہ نہیں) کے لفظوں سے بہ ظاہر یہ مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں قصر کرنے کی صرف اجازت اور رخصت ہے اور قصر نماز پڑھنے والے کو کوئی گناہ نہ ہوگا اور اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ سفر میں بھی نماز پوری پڑھی جائے لیکن رسول اللہ نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد سفر میں ہمیشہ قصر ہی کیا، ایک دفعہ بھی آپ سے ثابت نہیں کہ سفر میں آپ نے ظہر، عصر یا عشاء کی چار رکعت پڑھی ہوں، پھر اسی کے مطابق تمام اکابر صحابہ کا عمل رہا اس لئے اکثر ائمہ کے نزدیک سفر میں ہمیشہ نماز قصر ہی پڑھی جائے اور وہی افضل ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ کے بارے میں وہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس آیت میں یہ لفظ بالکل اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح سورہ بقرہ کی آیت "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا" میں "لَاجُنَاحَ" استعمال ہوا ہے، اس آیت میں حج اور عمرہ کرنے والے کیلئے کہا گیا ہے کہ "لَاجُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا" (یعنی کوئی گناہ اور مضائقہ نہیں ہے کہ وہ صفا اور مروہ کی سعی کرے) حالانکہ یہ سعی مناسک حج میں سے ہے اور ضروری ہے۔ اسی طرح سورۂ نساء کی اس آیت میں لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فرما کر سفر میں قصر کا حکم دیا گیا ہے اور حضور کے طرزِ عمل سے معلوم ہوگیا کہ سفر میں ہمیشہ قصر ہی کرنا چاہئے اور ان دونوں حکموں کے لئے گناہ کی نفی کا انداز بیان اختیار کرنے میں ایک خاص نکتہ ہے جس کو عربی داں حضرات ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک اشکال اس آیت کے بارے میں یہ ہے کہ آیت کے آخری الفاظ "اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" سے مفہوم ہوتا ہے کہ قصر کا حکم اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ کافروں کی طرف سے کسی شرارت اور فتنہ پردازی کا خطرہ ہو، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر مسافر کو سفر میں اس طرح کا کوئی خطرہ اور اندیشہ نہ ہو اور امن وامان کی فضا ہو تو نماز میں قصر نہیں کیا جائے گا، حالانکہ رسول اللہ اور صحابہ کرام کا مستقل عمل یہ رہا کہ امن وامان اور پورے اطمینان کی صورت میں بھی سفروں میں ہمیشہ قصر ہی کیا گیا اور مسلم شریف میں

حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ میں نے ایک دفعہ حضورؐ سے پوچھا کہ اس آیت کے ان الفاظ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قصر کا حکم اسی صورت میں ہے جب کہ سفر میں دشمنوں سے خطرہ ہو، اور الحمد للہ اب خوف وخطر کا وہ زمانہ ختم ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کو غالب کر دیا تو اب کیا حکم ہے؟

حضور نے فرمایا "تَصَدَّقَ اللّٰہُ بِھَا عَلَیْکُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَہ" یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ کرم فرمایا ہے کہ حالتِ اطمینان میں بھی قصر ہی کا حکم ہے، تم اللہ تعالیٰ کی اس عنایت کو شکریہ کے ساتھ قبول کرو، یعنی امن واطمینان کی حالت میں بھی سفر میں قصر ہی پڑھو۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ حضور کا عمل ہمیشہ یہی رہا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے حجۃ الوداع میں (جبکہ قریب قریب پورے عرب پر اسلامی حکومت قائم ہوچکی تھی) مدینہ سے مکہ اور مکہ سے مدینہ تک کا سفر ایسی حالت میں فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ تھا (یعنی کسی دشمن کی طرف سے کوئی خطرہ اور اندیشہ نہیں تھا) آپ نے اس پورے سفر میں چار رکعت والی نمازیں دو ہی رکعت پڑھیں۔" (۱) بہر حال مسئلہ یہی ہے اور اس پر قریب قریب اجماع ہے (۲) کہ امن وامان کی حالت میں بھی سفر کی نمازوں میں قصر کیا جائے گا۔ "اِنْ خِفْتُمْ" کے الفاظ سے جو اشکال ہوتا ہے اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ یہ شرط احترازی (۳) نہیں ہے بلکہ آیت کے نزول کے وقت چوں کہ صورت حال ایسی ہی تھی اس لئے ان الفاظ میں اس صورتحال کا ذکر کر دیا گیا ہے اور قرآن مجید میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً فرمایا گیا ہے "لَا تُکْرِھُوْا فَتَیَاتِکُمْ عَلَی الْبِغَاءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّناً"۔ (نہ مجبور کرو اپنی باندیوں کو زنا کی کمائی پر اگر وہ پاکدامنی چاہیں) ظاہر ہے کہ "اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّناً" (اگر باندیاں پاکدامنی چاہیں) حکم کی شرط نہیں بلکہ صورت حال کی طرف اشارہ ہے، اگر اس کو شرط کہا جائے تو مطلب یہ ہوجائے گا کہ اگر باندیاں پاکدامنی نہ چاہیں تو ان کو زنا کی کمائی کے لئے مجبور کیا جاسکتا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ آیت کا مدعا ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ "اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّناً" صورت حال کی طرف اشارہ ہے بس اسی طرح "اِنْ خِفْتُمْ" کی شرط

(۱) مشکوٰۃ، باب صلوٰۃ السفر، بحوالہ بخاری۔

(۲) یعنی مجتہدین امت کا اتفاق۔

(۳) شرط احترازی: وہ شرطیہ الفاظ جو واقعۃً بطور قید بولے جائیں، جو کہ شرط کا اصل مفہوم ہوتا ہے۔ (مرتب)

کو سمجھنا چاہئے۔

بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ "اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" کا تعلق اگلی آیت سے ہے جس میں صلوٰۃ خوف کا بیان کیا گیا ہے، اس کی تائید بعض روایات سے بھی ہوتی ہے اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں اس کے بارے میں لکھا ہے "وَھٰذَا اِنْ کَانَ بَعِیْدًا مِنْ حَیْثُ النَّظْمِ لٰکِنَّہٗ قَرِیْبٌ مِنْ حَیْثُ الْمَعْنیٰ" یعنی یہ اگرچہ عبارت کے نظم اور نحوی ترکیب کے لحاظ سے بظاہر بعید ہے لیکن معنی کے لحاظ سے یہی قریب ہے کہ اس کو صلوٰۃ خوف کے حکم سے متعلق کیا جائے اور اسی کی شرط قرار دیا جائے۔

اس کے بعد دوسری آیت ہے وَاِذَا کُنْتَ فِیْھِمْ فَاَقَمْتَ لَھُمُ الصَّلٰوۃَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ مَّعَکَ وَلْیَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَھُمْ، فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَکُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِکُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَۃٌ اُخْرٰی لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَکَ وَلْیَاْخُذُوْا حِذْرَھُمْ وَاَسْلِحَتَھُمْ۔الآیۃ۔

صلوٰۃ خوف کا طریقہ

اس میں میدان جنگ کی خاص نماز (صلوٰۃ خوف) کا طریقہ بتایا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ جنگ کے میدان میں جب آپ خود بہ نفس نفیس مسلمان مجاہدین کے ساتھ موجود ہوں اور نماز کا وقت آجانے پر ان کو نماز پڑھائیں تو لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے ان میں سے ایک حصہ اپنے پورے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو جائے اور دوسرا حصہ دشمن کی فوج کے سامنے ہر خطرہ کے مقابلہ کے لئے تیار کھڑا رہے پھر جب آپ پہلی رکعت کا سجدہ کر کے ایک رکعت پوری کر لیں، تو لشکر کے جس حصہ نے آپ کے ساتھ یہ رکعت ادا کر لی، یہ اس جگہ سے ہٹ کر پیچھے کی جانب دشمن کے مقابلہ پر چلا جائے اور دفاع کی ذمہ داری سنبھال لے اور دوسرا حصہ جو نماز میں شریک نہیں ہوا تھا وہ اب آکر اس کی جگہ کھڑا ہو جائے اور دوسری رکعت میں آپ کے ساتھ شریک ہو جائے اور یہ لوگ بھی اپنے پورے اسلحہ کے ساتھ نماز میں شریک ہوں۔

قرآن مجید میں صلوٰۃ خوف کے بارے میں بس اتنی ہی اصولی اور اجمالی ہدایت دی گئی ہے اس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ لشکر کا ہر ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف ایک ایک رکعت پڑھے گا اس طرح ہر ایک کو حضورؐ کے ساتھ اور آپ کی اقتداء میں نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہو جائے گی اور دفاع کے فریضہ کی طرف سے غفلت بھی نہ ہوگی۔ قرآن مجید کی اس آیت سے یہ بات بھی واضح نہیں ہوتی کہ لشکریوں کی نماز ایک ہی ایک رکعت ہوگی یا وہ بعد میں اپنی اپنی جگہ دوسری رکعت پڑھ کر اپنی نماز پوری کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی ہدایت کے مطابق مختلف غزوات میں اسی طرح لشکر کو تقسیم کر کے نماز پڑھائی ہے، کتب حدیث میں ان نمازوں کی پوری تفصیل موجود ہے، ان میں سے اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لشکریوں نے ایک رکعت تو آپ کے ساتھ اور آپ کی اقتداء میں پڑھی اور دوسری رکعت بعد میں الگ پڑھ کر اپنی نماز پوری کی۔

بعض تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کے بعد صحابہ کے دور میں بھی کبھی کبھی اسی طریقہ پر صلوٰۃ خوف پڑھی گئی ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ کے مشہور شاگرد قاضی ابویوسفؒ کا مسلک یہ ہے کہ اس طریقہ پر صلوٰۃ خوف کا حکم صرف ان جنگوں کیلئے تھا جن میں رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس شریک ہوئے تھے۔ آپ کے نہ ہونے کی صورت میں دو جماعتیں الگ الگ ہونی چاہئیں اور آیت کے پہلے لفظ "وَاِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ" سے اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اس میں آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ جب آپ مجاہدین کے ساتھ ہوں اور نماز پڑھائیں تو اس طریقہ پر پڑھائیں، ان الفاظ کا ظاہری تقاضا یہی ہے کہ یہ حکم آپ کے ساتھ مخصوص ہو، اور یہ اس لئے کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہر مسلمان کی لازماً یہی خواہش ہوگی کہ وہ نماز آپ کی اقتدا میں پڑھے، کوئی بھی اس سعادت سے محرومی پر راضی نہ ہو گا، اس لئے ایسا طریقہ تجویز کر دیا گیا کہ ہر شخص آپ کے پیچھے نماز بھی پڑھ لے اور دفاع سے غفلت بھی نہ ہو۔

ان آیتوں کے چند اہم سبق

قرآن مجید کی ان آیتوں میں میدان جنگ کی نماز کے بارے میں جو ہدایت دی گئی

ہے اور رسول اللہ ﷺ نے جس طرح اس پر عمل فرمایا۔ اس میں آپ کی امت کے لئے چند بڑے سبق ہیں، میرے نزدیک پہلا اہم سبق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو عالم اسباب بنایا ہے اور ہمارے لئے جائز نہیں ہے کہ ہم توکل کا نام لے کر اسباب وتدابیر کی طرف سے غفلت برتیں۔ اگر اس کی ذرا بھی گنجائش ہوتی تو یہ حکم ہوتا کہ میدان جنگ میں بالکل اسی طرح نماز ادا کی جائے جس طرح مسجد نبوی میں ادا کی جاتی تھی اور سارا لشکر ایک ساتھ حضور کی اقتدا میں نماز پڑھے۔ کہا جاتا کہ دشمن ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اللہ ہماری حفاظت کیلئے کافی ہے، ہمیں کسی حفاظتی فکر اور تدبیر کی ضرورت نہیں، ہم نماز پڑھیں گے تو آسمان کے فرشتے ہماری حفاظت کریں گے لیکن یہ حکم نہیں دیا گیا بلکہ اسباب کی رعایت کرتے ہوئے جنگ کی ضرورت اور دفاع کی مصلحت سے نماز کا قانون بدل دیا گیا، نماز کے درمیان میں طویل نقل وحرکت کی اجازت دے دی گئی اور صراحت کے ساتھ حکم دیا گیا کہ مجاہدین اپنے پورے اسلحہ سے مسلح ہو کر نماز میں شریک ہوں، وہ ہتھیار بھی لگے ہوں جن سے دشمن پر حملہ کیا جاتا ہے اور وہ بھی جو دشمن کے حملہ سے بچاؤ کے لئے استعمال ہوتے ہیں (وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ)۔

جس امت کو یہ ہدایت دی گئی ہو اور جس کے پیغمبر نے اسی کے مطابق عمل کیا ہو اور یہی امت کو سکھایا ہو اس کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اسباب وتدابیر سے غفلت برتے اور اس کا نام توکل رکھے؟ بہرحال یہ ان آیتوں کا بڑا اہم سبق ہے۔

دوسرا اصولی سبق صلوٰۃ خوف کی اسی ہدایت سے یہ ملا کہ دنیا کے مادہ پرستوں کی طرح اسباب وتدابیر ہی کو سب کچھ نہ سمجھا جائے بلکہ مناسب حد تک اسباب وتدابیر کا لحاظ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت ہی کو فیصلہ کن سمجھا جائے اور اس کی نصرت اور رحمت کا استحقاق حاصل کرنے کی فکر وکوشش کو ہر چیز پر مقدم رکھا جائے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو فوج کے کسی حصہ کو بھی دشمن کے سامنے سے ہٹا کر نماز میں مشغول ہونے کی اجازت نہ دی جاتی۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کے بعض طبقے سخت افراط وتفریط میں مبتلا ہیں، اسلام کی روح اور اس کی تعلیمات سے مطابقت رکھنے والی بات وہی ہے جو صلوٰۃ خوف کے بارے میں قرآن مجید کی ہدایت اور رسول اللہ ﷺ کے عمل سے معلوم ہوتی ہے۔

صلوٰۃ خوف کے اس حکم کا تیسرا اہم سبق یہ ہے کہ اسلام میں باجماعت نماز کی اتنی

اہمیت ہے کہ میدان جنگ میں سنگین خطرہ کے وقت بھی مسلمانوں کو جماعت سے نماز ادا کرنے کا مکلف کیا گیا اور اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ لوگ اپنی سہولت کے مطابق انفرادی طور پر ادا کرلیں۔

دشمن سے غفلت روا نہیں

آگے ارشاد ہے "وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَيْلَةً وَّاحِدَةً" اس میں بتایا گیا ہے کہ میدان جنگ کی نماز کا جو یہ خاص طریقہ مقرر کیا گیا اور نماز کی حالت میں بھی ہر طرح کے ہتھیاروں سے مسلح ہونے کی جو ہدایت کی گئی اس کا سبب یہ ہے کہ تمہارے دشمنوں کا یہ پلان اور منصوبہ ہے کہ تم اپنے ہتھیاروں وغیرہ سے اور دفاع کی طرف سے ذرا بھی غافل ہو تو وہ ایک دم تم پر ٹوٹ پڑیں۔ اسی اندیشہ کی وجہ سے یہ احکام دیے گئے ہیں۔

آگے فرمایا گیا ہے "وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ بارش وغیرہ کی وجہ سے یا بیماری جیسی کسی مجبوری سے سارے ہتھیاروں کے بوجھ کے ساتھ نماز ادا کرنا اگر مشکل ہو تو اس کی اجازت ہے کہ حملہ میں کام آنے والے اسلحہ اتار کر نماز پڑھ لو لیکن دفاع اور بچاؤ والے ہتھیاروں سے بہر حال مسلح رہنا ضروری ہے، ان کو الگ رکھنے کی اجازت نہیں۔ "اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا" آیت کا تتمہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے یہ دشمن اللہ کے دشمن ہیں، تم پوری ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرو، اللہ دنیا میں تم کو ان پر غالب کرے گا اور آخرت میں ان کے لئے اس نے رسوا کن عذاب تیار کیا ہے۔

آگے ارشاد ہے "فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا" یعنی ... تم ... بتائے ہوئے طریقہ پر

نماز ادا کرلو، تو اس کے بعد کھڑے بیٹھے اور لیٹنے کی حالت میں بھی یعنی ہر حالت میں اللہ کے ذکر کا خاص اہتمام کرو (یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ جب نماز اس طرح پڑھی جائے گی جس میں خوب نقل وحرکت بھی ہوگی اور سارے ہتھیار بھی لگے ہوں گے تو قدرتی طور پر حضور قلب اور خشوع کی کیفیت میں بہت کمی رہے گی، اسی کسر کے جبر اور اسی کمی کے پورا کرنے کے لئے فرمایا گیا کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہر حالت میں اللہ کے ذکر کا زیادہ اہتمام کرو) آگے فرمایا گیا کہ پھر جب دشمن اور اس کے حملہ کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے، امن واطمینان کی فضا قائم ہوجائے تو پھر پورے اہتمام سے اور ظاہری وباطنی تمام آداب کی رعایت کے ساتھ ہر وقت کی نماز ادا کیا کرو۔ نماز اہل ایمان پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے اور وہ اللہ کا خاص الخاص فریضہ ہے اس لئے اس کا حق ہے کہ بندے اس کو اچھے سے اچھے طریقہ پر ادا کرنے کی کوشش کریں۔

رسول اللہ ﷺ کے احکام قرآن ہی کے احکام ہیں

اس آیت کے آخری جزو میں فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں پر نماز اوقات کے تعیُّن کے ساتھ فرض ہے، یعنی ہر نماز کا وقت معین اور مقرر ہے کہ فلاں وقت سے شروع ہوتا ہے اور فلاں وقت پر ختم ہوتا ہے۔ اس سے ایک اصولی بات یہ معلوم ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے شریعت کے جو تفصیلی احکام بتائے ہیں جو قرآن مجید میں بیان نہیں ہوئے ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں، یہ بات اس طرح معلوم ہوئی کہ نماز کے جن معین اوقات کا اس آیت میں حوالہ دیا گیا ہے وہ قرآن مجید میں کہیں بھی بیان نہیں ہوئے ہیں بلکہ رسول اللہؐ کے ارشادات اور آپ کے طرز عمل سے معلوم ہوئے ہیں، اور قرآن مجید کی اس آیت میں انھیں اوقات کا حوالہ دیا گیا ہے، یہ اس کی صریح دلیل ہے کہ آپ کے یہ احکام بھی گویا اللہ تعالیٰ ہی کے احکام ہیں۔



(درس-۳)

شرک ناقابل مغفرت گناہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

إِنَّ اللّٰہَ لَایَغْفِرُأَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ،
وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِیْدًاo إِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِہٖٓ اِلَّآ إِنٰثًا، وَّإِنْ یَّدْعُوْنَ إِلَّا شَیْطَانًا مَّرِیْدًاo لَعَنَہُ اللّٰہُ وَقَالَ
لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِکَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًاo وَّلَأُضِلَّنَّھُمْ وَلَأُمَنِّیَنَّھُمْ
وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَیُبَتِّکُنَّ اٰذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰہِ،
وَمَنْ یَّتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا
مُّبِیْنًاo یَعِدُھُمْ وَیُمَنِّیْھِمْ وَمَا یَعِدُھُمُ الشَّیْطٰنُ إِلَّا غُرُوْرًاo
أُوْلٰٓئِکَ مَأْوٰھُمْ جَھَنَّمُ، وَلَایَجِدُوْنَ عَنْھَا مَحِیْصًاo وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْأَنْھٰرُ
خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ أَبَدًا، وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا، وَّمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًاo

(سورۃ النساء آیت ۱۱۶ تا ۱۲۲)

(ترجمہ) بے شک اللہ تعالیٰ اس جرم کو کبھی نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور اس سے نیچے کے گناہ بخش دے گا جس کے لئے چاہے گا، اور جس نے اللہ کے ساتھ

شرک کیا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ یہ مشرک اپنی حاجتوں کے لئے پکارتے ہیں، بس زنانیوں کو (یعنی دیویوں کو) اور (فی الحقیقت) پکارتے ہیں صرف سرکش شیطان کو۔ اس پر خدا کی پھٹکار ہے، اور اس (سرکش ملعون) نے (خدا سے) کہا تھا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقررہ حصہ لے کر رہوں گا اور ان کو (تیری راہ سے) گمراہ کر کے چھوڑوں گا، اور میں ضرور انھیں (غلط اور جھوٹی) آرزؤں میں مبتلا کرتا رہوں گا اور انھیں سکھلاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان چیرا اور کاٹا کریں گے اور ان کو سمجھاؤ نگا تو وہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت میں تبدیلی کریں گے ،اور جس نے خدا کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا آقا بنایا تو وہ یقیناً کھلی ہوئی نامرادی میں جا پڑا۔ شیطان ان کو وعدوں کے بہلاوے دیتا ہے اور آرزؤں کے سبز باغ دکھاتا ہے، اور شیطان کے وعدے فریب اور دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں ان سب کا ٹھکانا دوزخ ہے اور یہ آتش دوزخ سے فرار کی کوئی جگہ نہ پاسکیں گے اور (اس کے برعکس) جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ان کو ہم بہشتی باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ وعدہ ہے اللہ کا بالکل حق۔ اور اللہ سے زیادہ بات کا سچا کون ہوسکتا ہے۔

تفسیر و تشریح

یہ سورۂ نساء کا اٹھارہواں رکوع ہے، اس میں بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ شرک کی شناعت، خباثت اور نامعقولیت بیان کی گئی ہے اور واشگاف طور پر اعلان فرمایا گیا ہے کہ شرک ناقابل مغفرت گناہ ہے اور اس کا مجرم ہرگز نہیں بخشا جائے گا۔ آگے بیان فرمایا گیا ہے کہ شرک کرنے والے خواہ کچھ سمجھتے ہوں لیکن دراصل وہ شیطان کے پرستار ہیں اور اس کی انگلیوں پر ناچ رہے ہیں۔ اور شیطان چونکہ بنی آدم کا ازلی دشمن ہے اس لئے وہ ان کو شرک کے راستہ پر ڈال کر بس جہنم میں پہنچا دینا چاہتا ہے۔

شرک کیا ہے؟ اور کیوں بُرا ہے؟

آیتوں کی تشریح سے پہلے میں دو باتوں کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ شرک کی حقیقت کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کی نگاہ میں وہ کیوں اتنا خبیث، شنیع اور مبغوض ہے کہ ہر اور گناہ ہوا کیا تو بخشش ہوسکتی ہے لیکن اس کی بخشش نہیں ہوسکتی۔

جو شرک میں مبتلا ہیں اور اس کو اپنا دین دھرم بنائے ہوئے ہیں وہ تو اس کو مقدس چیز جانتے ہیں اور اسی میں اپنی بھلائی اور نجات سمجھتے ہیں، لیکن ان کے علاوہ بہت سے لوگ جو خود شرک میں مبتلا نہیں ہیں، ان کی بھی نگاہ میں شرک کی اتنی شناعت نہیں ہے جتنی چوری، ڈاکہ زنی، خون ناحق اور زنا جیسی ان بدفعلیوں کی ہے جن کا تعلق انسانوں سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں انسانی فطرت سے تو واقفیت ہے لیکن اللہ کی معرفت حاصل نہیں ہے۔ زنا اور چوری جیسے گناہوں کو ایک عامی بلکہ کافر و مشرک بھی اس لئے قابل نفرت سمجھتا ہے کہ ان گناہوں میں انسان کی سخت حق تلفی اور توہین ہے۔ جس کی برائی کو ہر انسان آسانی سے محسوس کر لیتا ہے، لیکن شرک دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ بُرائی اور بہت بڑی برائی ہے مگر اس کو وہی محسوس کر سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو۔ پھر وہ اس کو بھی سمجھ سکتا ہے کہ شرک کیوں ناقابل مغفرت گناہ ہے۔ ایک بردبار اور شریف شوہر عورت کی ہر غلطی اور نافرمانی کو نظر انداز کر سکتا ہے لیکن اگر اسے معلوم ہو جائے کہ جس نگاہ سے وہ مجھ کو دیکھتی ہے وہ کسی دوسرے اپنے آشنا کو بھی دیکھتی ہے تو یہ بات اُس کے لئے قابل برداشت نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی مثال نہیں، لیکن شرک باللہ کی شناعت اور خباثت کو کسی حد تک بیوی اور شوہر کی اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اب شرک کی حقیقت کے بارے میں سنئے! شرک کا انکار اور اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک ماننا اسلام کی پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ کلمہ ''لا إلٰہ إلاّ اللّٰہ'' کا یہی مطلب ہے، اس لیے ضروری ہے کہ شرک کے بارہ میں ہر مسلمان کا ذہن بالکل صاف ہو، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بہت سے مسلمان شرک و توحید کے معاملے میں بھی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔

ایسے مشرک تو غالباً ہماری اس دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں ہیں جو کہتے ہوں کہ اللہ کے برابر کا یا اس کے درجہ کا خالق و پروردگار کوئی اور بھی ہے، عرب کے مشرک بھی یہ نہیں کہتے تھے۔ خود قرآن مجید میں جابجا ان کے بارے میں یہ موجود ہے کہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ صرف اللہ ہی سب کا خالق ہے، اور وہی کائنات کے اس کارخانے کو چلا رہا ہے، اور کوئی دوسری ہستی اس کے برابر نہیں ہے۔ ان کا شرک بس یہ تھا کہ وہ کچھ روحانی ہستیوں دیویوں اور دیوتاؤں کو خدا کا ایسا مقرب اور لاڈلا سمجھتے تھے جن کو اس تقرب ہی کی وجہ سے اختیارات حاصل تھے۔ ان

کا عقیدہ تھا کہ یہ ہمیں نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں، ہمارے کام بنا اور بگاڑ سکتے ہیں، ہماری فلاں فلاں قسم کی حاجتیں پوری کر سکتے ہیں، اس لیے وہ ان سے دعائیں کرتے تھے، اپنی حاجتیں مانگتے تھے ان کی رضامندی اور عنایت حاصل کرنے کے لیے ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے، نذر و نیاز اور چڑھاوے چڑھاتے تھے۔

اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک تو وہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات اور اسکے افعال میں اپنے ان دیوتاؤں اور معبودوں کو شریک مانتے تھے اور اسکے علاوہ ان کی عبادت اور ان سے دعا و استعانت کرتے تھے۔ حالانکہ یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے۔ عرب کے مشرکوں کے علاوہ بھی دنیا میں یہی شرک زیادہ تر رائج رہا ہے اور قرآن مجید نے خاص طور سے اسی شرک کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ شرک کا ہر دروازہ بند کرایا گیا

رسول اللہ ﷺ چونکہ آخری نبی تھے اور آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی آنے والا نہیں تھا اس لیے آپ نے توحید و شرک کے مسئلہ کو اتنا صاف کیا اور ایسا نکھارا ہے، جس کے بعد کسی کے لیے گمراہ ہونے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، جن چیزوں سے شرک کا شبہ ہو سکتا تھا، آپ نے ان کو بھی ممنوع قرار دے دیا، اور جن دروازوں سے شرک چوری چھپے بھی آ سکتا تھا ان کو بھی آپ نے بند کر دیا۔ مثلاً نماز اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے لیکن طلوع آفتاب کے وقت، غروب آفتاب کے وقت اور جس وقت آفتاب نصف النہار پر ہو، نماز سے منع فرما دیا گیا۔ صرف اس لیے کہ کسی دیکھنے والے کو بھی آفتاب پرستی کا شبہ نہ ہو۔ آپ کا معمول تھا کہ جب مہینے کا نیا چاند دیکھتے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے۔ "اَللّٰھُمَّ اَھِلَّهُ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ۔" جس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ چاند امن اور ایمان کا اور سلامتی اور اسلام کا چاند ہو۔ اس کے بعد چاند کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے فرماتے کہ "رَبِّیْ وَرَبُّكَ اللّٰهُ" (میرا اور تیرا رب اللہ ہے) اس دعا میں آپ کبھی اس طرح ہاتھ نہ پھیلاتے جس طرح ہاتھ پھیلا کے دعا کی جاتی ہے، بلکہ چاند کی طرف کلمہ والی انگلی سے صرف اشارہ کرتے، یہ اس لیے کہ کسی ناواقف اور کم عقل آدمی کو یہ شبہ نہ ہو جائے کہ آپ چاند سے کچھ مانگ رہے ہیں جس طرح چاند سورج وغیرہ کے پجاری مانگتے ہیں۔ آپ کے

اس طرزِ عمل سے سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ اس معاملہ میں کتنے محتاط تھے۔

شرک سے متعلق سب سے بڑا خطرہ آپ کی امت کے لیے یہ ہو سکتا تھا کہ جس طرح عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ان کے خاص معجزات کی وجہ سے خدا کا بیٹا اور خدائی میں شریک بنالیا۔ اسی طرح آپ کے ان سے بھی بڑے کمالات اور معجزات کی بنیاد پر آپ کو بھی ایک خدا اور خدائی میں شریک بنالیا جاتا۔ اسی کو روکنے کے لیے آپ نے صراحت کے ساتھ اپنی امت کو وصیت اور تاکید فرمائی۔

''لَاتُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسٰی بْنَ مَرْیَمَ فَاِنَّمَا أَنَا عَبْدُاللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُاللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ۔''(۱)

(ترجمہ) تم میرے بارے میں اس طرح کے غلو سے کام نہ لینا اور میرا درجہ اس طرح حد سے نہ بڑھانا جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کے معاملہ میں کیا، خوب سمجھ لو میں بس اللہ کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہوں، اس لیے مجھے بس اللہ کا بندہ اور پیغمبر ہی کہو۔ (بخاری و مسلم)۔

بعض پیغمبروں کے امتیوں نے ایسا بھی کیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد ان کی قبروں پر سجدے کرنے لگے، رسول اللہ ﷺ نے اس بارہ میں بھی امت کو سخت آگاہی دی اور فرمایا کہ ''تم سے پہلی بعض امتوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا، خبردار تم ہرگز ایسا نہ کرنا'' ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ایسا کرنے والوں پر خدا کی لعنت ہے اور اپنے آخری مرض میں اللہ تعالیٰ سے خاص طور پر دعا فرمائی۔

''اللّٰھمّ لا تجعل قبری وثناً یّعبَد''

اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنانا جس کی پوجا کی جائے۔(۲)

اسی طرح پکی اور شاندار قبریں بنانے اور ان پر عمارتیں بنانے اور چراغاں کرنے سے بھی آپ نے اسی لیے ممانعت فرمائی کہ یہی چیزیں جاہلوں اور شرک پسند طبیعتوں کے لیے قبر پرستی کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔ الغرض آپ نے شرک کا دروازہ بند کرنے کے لیے ان باتوں سے بھی ممانعت فرمادی جو بذاتِ خود شرک نہیں ہیں لیکن ان سے شرک کا شبہ ہو سکتا ہے یا جو کسی درجہ میں شرک کا وسیلہ اور ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اس معاملہ میں آپ لفظی بے احتیاطی کو بھی

(۱) بخاری و مسلم (مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب المفاخرۃ)۔(مرتب)
(۲) مشکوٰۃ، کتاب الصلوٰۃ، باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ (مرتب)

برداشت نہیں فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی موقع پر ایک صحابی کی زبان سے نکل گیا "ماشاء اللہ وشئت" (یعنی جو اللہ چاہے گا اور جو آپ چاہیں گے وہی ہوگا) آپ نے برہم ہو کر فرمایا۔

"جعلتنی للہ نداً بل ما شاء اللہ وحدہٗ"

تم نے مجھے اللہ کا ہمسر بنا دیا (اس طرح مت کہو) یوں کہو "جو تنہا اللہ چاہے گا وہ ہوگا"۔(۱)

صحابۂ کرام اور شرک و توحید

الغرض شرک کے معاملہ میں آپ نے کسی کے لیے گمراہی اور غلط فہمی کی ذرہ برابر گنجائش بھی نہیں چھوڑی۔ آپ کی ان ہدایات اور آپ کے اسی طرز عمل کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ کرام کا ذہن توحید و شرک کے مسئلہ میں اتنا صاف تھا جس کی نظیر دوسری امتوں میں نہیں مل سکتی۔ حضورؐ کے وصال پر صدیق اکبرؓ نے مسجد نبوی میں صحابہ کرام کے سامنے جو پہلا خطبہ دیا وہ توحید کا شاہکار ہے، اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و تربیت نے صحابہ کو توحید کے کیسے گہرے رنگ میں رنگا تھا۔ فضا یہ تھی کہ حضورؐ کی وفات کے صدمہ سے صحابہ حواس باختہ تھے، فاروق اعظمؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ وصال کی بات سننا نہیں چاہتے تھے اور انھیں اصرار تھا کہ ہرگز حضورؐ کا وصال نہیں ہوا ہے، ابھی تو آپ اس دنیا میں بہت سے کام انجام دیں گے۔ اس فضا میں صدیق اکبرؓ کھڑے ہوئے اور آپ نے حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا:

"مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّداً فَإِنَّ مُحَمَّداً قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللهَ فَإِنَّ اللهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ ۔الخ"

تم میں سے جو محمدؐ کی پرستش کرتا ہو اور اسی کو اپنا دین و ایمان سمجھتا ہو اسے معلوم ہو جانا چاہئے کہ آپ وفات پا گئے اور جو اللہ کا پرستار ہو وہ مطمئن رہے کہ اللہ زندہ اور باقی ہے۔ اس کے لئے کبھی فنا نہیں۔(۲)

---

(۱) یہ حدیث عام طور پر انھیں الفاظ میں نقل کی جاتی ہے، مرتب کو ماٰخذ کی تلاش میں اس کے لئے نسائی شریف کا حوالہ ملا مگر یہ حدیث اسے نہ مل سکی، البتہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری (کتاب الایمان والنذور) میں اس کو مسند احمد کے حوالے سے نقل فرمایا ہے، جس میں "نِدّاً" جگہ "عِدلاً" ہے، معنی دونوں کے ایک ہیں۔

(۲) البدایہ والنہایہ ج۵ ص۲۴۲ بحوالہ مسند احمد

اس کے بعد صدیق اکبرؓ نے قرآن مجید کی وہ آیات تلاوت فرمائیں جن میں حضورؐ کی وفات کی پہلے ہی اطلاع دے دی گئی تھی۔ اس نازک وقت اور ایسی جذباتی فضا میں صدیق اکبرؓ کا یہ موحدانہ خطبہ انکی صدیقیت اور تمام صحابہ میں ان کی امتیازی عظمت کی دلیل ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے فاروق اعظمؓ کے اس مشہور واقعہ پر غور کیجئے کہ ایک دفعہ حج کے موقع پر جب حرم مکہ حجاج سے بھرا ہوا تھا، آپ نے قاعدہ کے مطابق حجر اسود کا استلام کیا یعنی اس کو ادب کے ساتھ چوما۔ لیکن سب کو سنانے کے لیے اس کی طرف اشارہ کر کے بلند آواز سے فرمایا:

"وَایْمُ اللّٰہِ اِنَّکَ حَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ وَلَوْ لَا اَنِّیْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُقَبِّلُکَ مَا قَبَّلْتُکَ"۔

خدا کی قسم تو ایک پتھر ہے، نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ ضرر، اگر میں نے رسول اللہؐ کو تجھے چومتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو ہرگز تجھے نہ چومتا۔ (۱)

یہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمِ توحید ہی کا اثر تھا کہ فاروق اعظمؓ نے حجر اسود جیسی مبارک اور مقدس چیز کے بارہ میں اتنی صفائی اور بے باکی سے حجاج کے بھرے مجمع میں اعلان فرمایا کہ تو اپنی اصلیت کے لحاظ سے صرف ایک پتھر ہے، نہ کسی کی بگڑی بنا سکتا ہے اور نہ بنی کو بگاڑ سکتا ہے، چونکہ رسول اللہؐ تجھے چومتے تھے اور حج کے ایک عمل کے طور پر تجھے چومنے کا حکم ہے صرف اس لئے ہم تجھے چومتے ہیں۔

اور آج امت کا حال

اللہ کی پناہ! جس پیغمبر کی تعلیم نے یہ نمونے تیار کیے تھے اس کی امت میں شیطان کی کوششوں سے وہ شرک گھس آیا جس کو دنیا سے مٹانا آپ کی بعثت کا اولین مقصد تھا۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ مشرکین عرب جس شرک میں مبتلا تھے وہ یہ تھا کہ وہ کچھ روحانی ہستیوں کو جن کے انھوں نے بت بنا رکھے تھے خدا کا مقرب اور لاڈلا سمجھتے ہوئے ان کے لیے کچھ تصرفات کا اختیار مانتے تھے اور اسی بنا پر ان سے اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے، نذریں اور چڑھاوے چڑھاتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے۔ آج مسلمانوں کے بعض حلقوں کا حال قریب قریب

(۱) مشکوٰۃ، باب دخول مکۃ والطواف بحوالہ بخاری و مسلم

یہی ہو چکا ہے، وہاں جو کچھ بتوں کے سامنے کیا جاتا تھا وہ یہاں بزرگانِ دین کے مزارات پر کیا جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ صدیق اکبرؓ یا فاروق اعظمؓ کو کسی بھی صحابی کو یا ان سے کسی فیض یافتہ تابعی کو دوبارہ زندگی دے کر اس دنیا میں بھیج دے اور وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ یا خواجہ علاء الدین صابر کلیریؒ یا ایسے ہی کسی اور بزرگ کے مزار پر ''مسلمانوں'' کے مشرکانہ اعمال کو دیکھیں تو وہ کبھی باور نہ کر سکیں گے کہ یہ لوگ حضرت محمدؐ کے امتی اور ان کا لایا ہوا کلمہ پڑھنے والے اور قرآن پاک کو خدا کی کتاب ماننے والے ہیں۔ یوں تو امت میں اعمال و اخلاق کی لائن کی بڑی سے بڑی معصیتیں اور گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ شرک والی گمراہی اس امت کا سب سے بڑا جرم ہے۔ اس کے بارے میں قرآن پاک کی انہی آیتوں میں صاف صاف اعلان فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں یہ گناہ ناقابل معافی ہے، اس جرم کے مجرموں کو اللہ تعالیٰ ہرگز نہیں بخشے گا۔ فرمایا گیا ہے کہ: ''إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ ـ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيْدًا۔ (۱۱۶)

ان آیات کا پیغام

یہ اس رکوع کی سب سے پہلی آیت ہے، اس میں شرک اور مشرکوں کا انجام بیان فرمایا گیا ہے، کہ وہ ربِّ غفّار کی مغفرت سے قطعاً محروم رہیں گے۔ اس کے بعد شرک کی شناعت اور اس کے خلافِ عقل ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ ان مشرکوں کا اصل معبود اور مرشد فی الحقیقت شیطان ملعون ہے وہی ان کو اپنی انگلیوں پر نچا رہا ہے اس نے تخلیق آدم کے وقت ہی اپنے اس منصوبہ کا اظہار کر دیا تھا کہ میں اولادِ آدم سے طرح طرح کے شرک کراؤں گا اور ان کو اپنے ساتھ لے لوں گا۔ ارشاد ہے۔

''إِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ إِلَّا إِنٰثًا، وَإِنْ يَّدْعُوْنَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيْدًا (۱۱۷) لَعَنَهُ اللّٰهُ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا، (۱۱۸) وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا، (۱۱۹) يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا

غُرُوْرًا، (۱۲۰) أُولٰئِكَ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا۔ (۱۲۱)

عرب کے مشرک عام طور سے دیویوں کی پوجا کرتے تھے، اسی لیے ان کے زیادہ تر بتوں کے نام عورتوں کے سے تھے۔ مثلاً لات، منات، نائلہ، عزّیٰ، وغیرہ۔ وہ ان کو خدا کی لاڈلیاں سمجھتے تھے۔ یہ ان کی انتہائی حماقت اور سفاہت تھی کہ خدا کے ساتھ شریک کرنے کے لیے انھوں نے ان زنانیوں کو منتخب کیا تھا۔ انہی سے مرادیں مانگتے تھے اور انہی کی پوجا کرتے تھے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا ہے۔ ''إِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِلَّا إِنٰثًا'' یعنی یہ مشرک اپنی حاجتوں کے لیے زنانی دیویوں کو پکارتے ہیں اور انہی کی پوجا کرتے ہیں۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ اگر چہ مشرک اپنے خیال میں ان دیویوں کی پرستش کرتے ہیں اور اپنی حاجتوں میں ان کو پکارتے ہیں اور ان کی دہائی دیتے ہیں لیکن فی الحقیقت ان کا معبود شیطان ہے، جس کی سرشت میں سرکشی اور تمرّد ہے، ان دیویوں سے اگر کوئی کرشمہ اور عجوبہ ظاہر ہوتا ہے تو وہ دراصل شیطان کا تصرف ہوتا ہے، اس بنا پر دیویوں کے ساتھ یہ جو کچھ کرتے ہیں دراصل وہ شیطان کراتا ہے اس لیے فی الحقیقت ان کا سارا شرک شیطان ہی کے حساب میں ہے۔ ''إِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِلَّا إِنٰثًا، وَإِنْ يَّدْعُوْنَ إِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا'' آگے فرمایا کہ یہ وہی شیطان ہے جس پر خدا کی لعنت ہے ''لَعَنَهُ اللّٰهُ'' اس میں اشارہ ہے کہ ان مشرکوں کی بد بختی کی یہ انتہا ہے کہ انھوں نے شیطان کو اپنا معبود اور مرشد بنالیا ہے، جس پر خدا کی لعنت اور پھٹکار ہے۔ آگے فرمایا کہ یہ شیطان جس وقت خدا کے مقابلہ میں تمرد اور سرکشی کی وجہ سے مردودِ بارگاہ اور ملعون ہوا تھا، اسی وقت اس نے اپنا یہ شیطانی منصوبہ ظاہر کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ سے برملا کہا تھا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک حصہ کو ضرور ہتھیالوں گا، یعنی تیری بندگی سے ہٹا کر اپنے راستہ پر لگالوں گا ''وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا'' اور میں ان کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا اور ان کو طرح طرح کی غلط آرزوؤں میں پھنساؤں گا اور ان کو تعلیم دوں گا، جس کے نتیجہ میں وہ مشرکانہ توہم پرستی کے تحت جانوروں کو بتوں کے ناموں پر چھوڑا کریں گے اور نشانی کے طور پر ان کے کان چیرا اور کاٹا کریں گے۔ اور اللہ کی بنائی ہوئی ساخت میں تبدیلی کیا کریں گے۔ (وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ) مطلب یہ ہے کہ یہ

مشرکین آج جن خام خیالیوں میں مبتلا ہیں اور جن غلط آرزوؤں میں پھنسے ہوئے ہیں اور جانوروں کے کان کاٹ کے بتوں کے نام پہ چھوڑنے کی جیسی جو مشرکانہ حرکتیں کر رہے ہیں یہ سب ان سے شیطان کرار ہا ہے، وہی سارے مشرکانہ اوہام وخیالات اور شرکیہ اعمال کا سر چشمہ ہے، اس نے تخلیق آدم کے وقت کہا تھا کہ میں تو لعنتی ہو ہی گیا ہوں، اس آدم کی اولاد کے بھی کم از کم ایک حصہ کو میں لعنتی بنا کے چھوڑوں گا، ان سے اس اس طرح کے مشرکانہ لعنتی کام کراؤں گا، پس اب جو لوگ اس طرح کے مشرکانہ اوہام وخیالات یا اعمال وافعال میں مبتلا ہیں وہ دراصل شیطان کے جال میں پھنس چکے ہیں اور اگر چہ بظاہر وہ بتوں کے پجاری ہیں لیکن فی الحقیقت ان کا معبود اور آقا شیطان ہے اور یہ اسی کے چیلے ہیں۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَاناً مُّبِيْنًا۔

جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا آقا بنالے وہ بڑی نامرادی میں جا پڑے گا اور بجائے کچھ حاصل کرنے کے اپنا سب کچھ کھو دے گا۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے: ”يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ اِلَّا غُرُوْرًا“ یعنی شیطان اپنے ان متبعین کو جھوٹی آرزوؤں کے سبز باغ دکھاتا ہے اور وعدوں کے بہلاوے دیتا ہے اور انہی پر یقین کر کے یہ سارے مشرکانہ کام کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیطان کے سارے بہلاوے اور اس کے دکھائے ہوئے سبز باغ صرف فریب ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں۔ آگے واضح الفاظ میں ان کا انجام بتایا گیا ہے: ”اُولٰئِكَ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا“ یعنی شیطان کی راہ پر چلنے والے ان سب بدبختوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور یہ آتشِ دوزخ سے فرار کی کوئی جگہ نہ پاسکیں گے۔ پھر آگے ان خوش نصیب بندوں کا انجام بیان فرمایا گیا ہے جو شیطان کی بتائی ہوئی شرک وکفر کی راہ سے ہٹ کر اللہ اور اس کے رسولوں کی بتائی ہوئی ایمان وعمل صالح کی شاہراہ ہدایت پر چلیں۔ ارشاد ہے: ”وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا، وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا“ اور جو بندے ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں یعنی اللہ ورسول کی باتوں کو حق مانیں اور عملی زندگی میں ان کی ہدایت کی پیروی کریں (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) ہم انکو ان بہشتی باغوں میں بسائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ہمیشہ

ابدالآباد تک ان باغوں میں رہیں گے۔آگے ارشاد ہے کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے بالکل حق اور اٹل، جس میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں۔اور اللہ سے زیادہ بات کا سچا کون ہوسکتا ہے۔

خلاصۂ درس

اوپر کی آیتوں میں شرک پر اور مشرکین کے طرز عمل پر جو تبصرہ کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہوا کہ اول تو یہ بات نہایت احمقانہ اور مضحکہ خیز ہے کہ انھوں نے خدا کا شریک بنانے کے لئے کچھ زنانیوں کو منتخب کیا ہے۔

اُس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ ان زنانیوں یعنی دیویوں کا تو صرف نام ہے۔ دراصل یہ شیطان کے پرستار ہیں، اسی ملعون نے ان کو اس راہ پر لگایا ہے۔تخلیق آدم کے وقت جب وہ اپنی سرکشی اور شیطنت کی وجہ سے مردود بارگاہ ٹھہرایا گیا تھا تو اسی وقت اس نے کہا تھا کہ میں تو لعنتی ہوا ہی ہوں اس آدم کی اولاد کو بھی میں لعنتی بنانے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔ میں ان سے معبودانِ باطل کے ناموں پر چوپایوں کی نذریں چڑھواؤں گا، یہ ان چوپایوں کو نشانی کے طور پر کان کاٹ کر بتوں کے ناموں پر چھوڑا کریں گے۔اور میں ان کو "خلق اللہ" کی تبدیلی کے راستہ پر لگاؤں گا۔وہ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدل ڈالیں گے۔ مفسرین نے "تغییر خلق اللہ" کی بہت سی قسموں اور شکلوں کا ذکر کیا ہے۔میرا خیال ہے کہ اس لفظ میں بہت وسعت ہے اور اس کی سب سے زیادہ سنگین اور اللہ کے نزدیک مبغوض ترین قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی جو فطرت بنائی ہے جس کی بنیاد پر آدمی کو موحد اور مومن و مسلم اور خدا کا فرمانبردار ہی ہونا چاہئے اس کو بدل ڈالا جائے۔ دوسری جگہ قرآن پاک ہی میں فرمایا گیا ہے: فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَةَ اللهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ اس آیت میں توحید اور دین حق کو "فطرۃ اللہ" فرمایا گیا ہے اور اسی کے بارہ میں ارشاد فرمایا گیا "لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللهِ"، تو خلق اللہ کی تبدیل وتغیر کی سب سے زیادہ سنگین قسم یہ ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی انسانی فطرت اور ساخت کے لحاظ سے انسان کی زندگی کا جو خدا پرستانہ رخ اور رویہ ہونا چاہئے اس کو بدل ڈالا جائے اور اس کے بجائے شرک وکفر کی راہ اختیار کرلی جائے۔ شیطان نے جو یہ کہا تھا کہ "وَلَاٰمُرَنَّهُمْ

فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ'' تو اس کا اولین مطلب یہی تھا کہ میں اولاد آدم کو ایسی گمراہانہ تعلیم دوں گا جس کے نتیجہ میں وہ اپنی فطری راہ صراط مستقیم کو چھوڑ کر دوسری غلط شرک و کفر کی راہوں پر چلیں گے۔

الغرض مشرکین کے بارے میں پہلی بات تو ان آیتوں میں یہ کہی گئی کہ ان احمقوں اور عقل کے دشمنوں نے خدا کا شریک بنانے کے لئے بھی زنانیوں کو منتخب کیا ہے۔ اس کے بعد بتایا گیا کہ اس شرک کا اصل مؤسس اور بانی دراصل شیطانِ لعین ہے، اس نے شروع ہی میں اپنے اس منصوبہ کا اعلان کر دیا تھا، اب جو لوگ شیطان کے راستہ پر چل رہے ہیں، انھوں نے دراصل شیطان کو اپنا پیشوا اور مرشد بنالیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو کوئی شیطان کو اپنا سرپرست اور مرشد بنالے اس کا انجام صرف نامرادی ہوگا اور ایسی کھلی نامرادی جسے ہر آنکھ دیکھے گی۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ دراصل شیطان نے جو انسانوں کا ازلی دشمن ہے انھیں بےوقوف بنایا ہے انھیں کچھ سبز باغ دکھائے ہیں اور وعدوں کے کچھ بہلاوے دیئے ہیں جو سراسر فریب ہیں اور انجام کار جہنم کی آگ کے سوا ان کے ہاتھ کچھ بھی نہ آئے گا۔ اور وہ کبھی اس سے رہائی نہیں پاسکیں گے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس کے برعکس جن لوگوں نے شیطان کی پیروی چھوڑ کے اللہ کی بندگی اور ایمان و عمل صالح والی زندگی کو اپنایا ان کو اللہ تعالیٰ اپنے جوارِ رحمت بہشتی باغوں میں بسائے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔

جنت کی نعمتوں کا بیان مجمل کیوں ہے؟

قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر جنت کے بارہ میں بس اتنا ہی کہا گیا ہے جتنا اس آیت میں ہے، اور بعض مقامات پر وہاں کی بعض نعمتوں کی کچھ مزید تفصیل بھی بیان فرمائی گئی ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے ''فِیْهَا مَاتَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ'' جنت میں وہ سب کچھ ہے جس کو تمہارا جی چاہے اور جس کو دیکھ کر آنکھوں کو سرور و لذت حاصل ہو۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ہے ''فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ''

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جنتی بندوں کے لئے جنت میں جو بیش بہا نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو سب کی نظروں سے مخفی ہیں ان کا یہاں کسی کو پتہ ہی نہیں ہے۔ یہ جنت کی نعمتوں کی دراصل صحیح تعریف ہے۔ اگر اس دنیا میں ان نعمتوں کے بارہ میں تفصیل سے بتایا بھی جائے تو کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ایک حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "فِيهَا مَالَاعَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَاخَطَرَ عَلىٰ قَلْبِ بَشَرٍ" یعنی جنت میں وہ نعمتیں اور لطف و سرور کے وہ سامان ہیں جنھیں کبھی کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی کان نے ان کا ذکر نہیں سنا اور نہ کسی آدمی کے دل میں اس کا خیال ہی آیا۔

اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے، جنت میں جو کچھ ہے وہ انشاء اللہ وہاں جا کر ہی دیکھا جاسکے گا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو بندے ایمان و عمل صالح کا سرمایہ لے کر اللہ کے حضور میں پہنچیں گے۔ ان کو اللہ تعالیٰ اس جنت کا مکین بنادے گا اور ان کے لئے ابدی زندگی کا فیصلہ فرمادیا جائے گا نہ وہ کبھی فنا ہوں گے، نہ جنت فنا ہوگی اور وہ ہمیشہ اس جنت میں رہیں گے اور وہاں کی نعمتوں اور لذتوں سے اور اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص عنایتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔



سورۃ المآئدہ

درس ۴ تا ۸

(درس-۴)

دین سے غداری کرنے والے نام نہاد مسلمانوں کو سخت ترین انتباہ

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم- بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِ اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۝ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۝

(المائدۃ: ۵۴-۵۵-۵۶)

(ترجمہ) مسلمانو! تم میں سے جو لوگ اپنے دین سے پھر جائیں تو (اللہ کو ان کی کوئی پرواہ نہیں، ان کی جگہ) وہ دوسرے لوگ پیدا کرے گا جن سے اس کو محبت ہوگی اور وہ اس کے چاہنے والے ہوں گے۔ وہ نرم دل اور فروتن ہوں گے اہل ایمان کے لئے، اور سخت مزاج اور زور آور ہوں گے کافروں کے مقابلہ میں، پوری جدو جہد اور جانبازی کریں گے راہ خدا میں، اور بالکل پروا نہ کریں گے (اس کے راستہ میں) کسی ملامت گر کی ملامت کی، یہ اللہ کا فضل وانعام ہے وہ اس سے نوازتا ہے جس کو چاہتا ہے۔

(مسلمانو!) تمہارا اولی (یعنی تمہاری مخلصانہ دوستی اور وفاداری کا مستحق) بس اللہ ہے اور اس کا رسول، اور وہ مومنین صادقین جو اچھی طرح نماز ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اور (اللہ کے سارے ہی احکام کے سامنے) سر تسلیم خم کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی ولایت (یعنی مخلصانہ دوستی اور وفاداری) کا تعلق قائم کر لیں اللہ سے، اس کے رسول سے اور سچے اہل ایمان سے تو (وہ حزب اللہ یعنی اللہ کی جماعت میں شامل ہیں اور) یہ خداوندی جماعت ہی انجام کار غالب ہونے والی ہے۔

تفسیر و تشریح

آیتوں کا پس منظر

یہ سورۂ مائدہ کے آٹھویں رکوع کی آخری تین آیتیں ہیں، پچھلے ہفتہ جب یہ رکوع شروع ہوا تھا تو میں نے اس صورتحال اور پس منظر کا ذکر کیا تھا جس میں سورۂ مائدہ کا یہ حصہ نازل ہوا ہے۔

میں نے بتایا تھا کہ جس زمانہ میں اس سورت کا یہ حصہ نازل ہوا ہے، مدینہ طیبہ کے لوگ عام طور سے اسلام قبول کر کے رسول اللہ ﷺ کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے لیکن ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اسلام قبول کرنے کے بارے میں پورے مخلص نہیں تھے، قرآن پاک میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کم سے کم دو طرح کے تھے، ایک تو وہ جو اندر سے اسلام اور مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے اور انہوں نے صرف فریب کے طور پر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے ہی کے لئے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا تھا، اس قسم کے منافقوں میں عبداللہ بن اُبَی ابن سلول کا نام بہت مشہور ہے۔

دوسری طرح کے منافق وہ تھے جنہوں نے اسلام کو وقت کی ایک مقبول دعوت اور کامیاب تحریک دیکھ کر اور اس سے وابستگی کو اپنے لئے نفع بخش سودا سمجھ کر قبول کر لیا تھا اور مسلمانوں میں شامل ہو گئے تھے، لیکن انھیں اسلام کے بارے میں وہ اذعان و یقین اور شرح صدر بالکل نہیں تھا جو مومنین صادقین کو ہوتا ہے اس لئے ان کا اسلام ان کی مفاد پرستی کا تابع تھا

اور انھیں اسلام سے زیادہ اپنے مفادات عزیز تھے لیکن انھیں اسلام اور مسلمانوں سے وہ عناد بھی نہیں تھا جو عبداللہ بن ابی جیسے نمبر ایک کے منافقین کو تھا۔ بلکہ یہ دراصل غرض پرست اور مفاد پرست قسم کے لوگ تھے۔

سچے مخلص مسلمانوں اور دو قسم کے ان منافقوں کے علاوہ ایک چوتھا مستقل عنصر وہاں یہودیوں کا تھا مدینہ کے آس پاس میں ان کی مستقل بستیاں تھیں، یہ لوگ عام طور سے خوشحال اور دولت مند تھے، پڑھے لکھے بھی تھے، "اہل کتاب" تھے، ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو مذہبی بزرگ اور پیشوا مانے جاتے تھے ان کا پورے علاقہ میں بڑا وقار تھا اور اپنے دائرہ میں ان کو ایک طرح کی مذہبی و روحانی حکومت و سیادت حاصل تھی۔

جب مدینہ طیبہ میں اسلام کو عام مقبولیت حاصل ہوگئی اور وہاں کے قریب قریب سب ہی لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تو ان یہودیوں میں اور خاص کر ان کے لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں میں حسد کے جذبات بھڑک اٹھے، وہ اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف طرح طرح کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں کرنے لگے اور مسلمانوں میں سے وہ مفاد پرست اور غدار قسم کے لوگ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا، انکے آلۂ کار بن گئے، وہ ان یہودیوں سے خاص خلا ملا رکھتے تھے اور وہ یہودی ان کو خوب استعمال کرتے تھے۔ مسلمانوں میں ایسے مفاد پرست غدار ہمیشہ رہے ہیں اور آج بھی بہت بڑی تعداد میں ہیں۔

اس رکوع میں "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ سے اگر چہ خطاب بظاہر عام مسلمانوں سے کیا گیا ہے لیکن دراصل اسی غدار طبقہ کو تنبیہ کرنا اور آگاہی دینا مقصود ہے جو اللہ اور رسول اور دین کے مقابلہ میں اپنے مفادات کا زیادہ وفادار تھا اور جو دشمنانِ اسلام یہودیوں کا آلۂ کار بن جاتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ سیدھے مسلمان بھی اپنی سادہ لوحی سے یہودیوں کے ساتھ ایسے مخلصانہ روابط رکھتے ہوں اور یہ نہ سمجھتے ہوں کہ یہ یہودی اس لائق نہیں ہیں کہ ان سے ایسے تعلقات رکھے جائیں اور نادانستہ طور وہ یہودیوں کے آلۂ کار بھی بن جاتے ہوں۔

بہر حال مسلمانوں میں سے جو لوگ اپنی منافقانہ ذہنیت یا سادہ لوحی کی وجہ سے یہودیوں کے ساتھ ایسے تعلقات اور روابط رکھتے تھے جن کی وجہ سے وہ ان کے آلۂ کار بن جاتے تھے، دراصل انہی کو تنبیہ کرتے ہوئے اس رکوع کی پہلی آیت میں فرمایا گیا تھا۔

"يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَاتَتَّخِذُوْا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَآءَ" (اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو اپنا ولی نہ بناؤ) یعنی ان سے ایسے روابط نہ رکھو جو ہم مقصد اور معتمد دوستوں کے درمیان ہی ہوتے ہیں، اس حکم کی تشریح اور تفصیل میں پچھلے ہفتہ کے درس میں کر چکا ہوں اور یہ بھی بتا چکا ہوں کہ غیر مسلموں سے تعلقات اور روابط کا مسئلہ زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اٹھائیسویں پارہ میں سورۂ ممتحنہ میں بیان فرمایا گیا ہے:

زیرِ تلاوت آیات کی تشریح

آج اس وقت میں نے اس رکوع کی جو آخری تین آیتیں آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان میں بھی اسی طبقہ کو اور اس طرح کے تمام لوگوں کو خواہ وہ کسی زمانہ میں اور دنیا کے کسی حصہ کے ہوں بڑے جلال کے انداز میں سخت آگاہی دی گئی ہے اور آخری درجہ کی تنبیہ اور آگاہی ہے اور اس کے ایک ایک لفظ سے جلال ٹپک رہا ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِ اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَايَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔

اے مسلمانو! تم میں سے جو لوگ مرتد ہو جائیں، یعنی اسلام سے باغی ہو جائیں اور اس کو چھوڑ کر دوسرا کوئی دین و مذہب اختیار کر لیں تو خدا کا اور اسلام کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ وہ خود ہی محروم اور مردود ہو جائیں گے اور اللہ ان کی جگہ دوسرے بندوں کو دین کی نصرت اور خدمت کے لئے کھڑا کر دے گا۔ جن میں یہ اوصاف ہوں گے، يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ۔ ان کو خدا کی محبت اور اس کا پیار حاصل ہوگا، اور وہ دل و جان سے خدا سے محبت کریں گے، اس لئے ان کی دوستی اور دشمنی اور نرمی اور گرمی صرف اللہ کے لئے ہوگی۔ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ : اہل ایمان کیلئے یعنی خدا، اس کے رسول اور ان کے دین کے ماننے والوں کے سامنے وہ بالکل عاجز و بیچارے نرم دل اور ان کے خدمت گزار ہوں گے۔ "أَذِلَّةٍ" ذلیل کی جمع ہے، اس کے معنی یہاں نرم اور متواضع کے ہیں، ذلت اگر خدا کی طرف سے یا دشمنوں کے دباؤ سے ہو تو مصیبت و نقمت ہے اور اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے اور

رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں میں اس سے پناہ مانگی گئی ہے۔اور اگر بندہ اپنے ارادہ اور اختیار سے اپنے کو دوسروں کے سامنے اللہ کے لئے پست اور نرم کردے اور اپنے کو ان سے نیچا اور کمتر سمجھے تو یہ بڑا کمال ہے۔رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں میں ہے آپ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے تھے ”وَفِي نَفْسِي لَكَ فَذَلِّلْنِي“ اس آیت میں اللہ کے جن محبوب ومقبول بندوں کا ذکر ہے، ان کے کردار کا ایک رخ تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ مومنوں اور اللہ کے وفادار بندوں کے سامنے ”أَذِلَّةٍ“ یعنی پست اور نرم ہوں گے۔اور دوسرا رخ یہ بتایا گیا ہے۔کہ ”أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ“ یعنی خدا کے باغیوں، منکروں اور دین کے دشمنوں کے مقابلہ میں وہ زور آور سخت اور گویا فولادی انسان ہوں گے۔اسی کو قرآن پاک میں دوسری جگہ ان لفظوں میں بیان فرمایا گیا ہے ”أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ“۔ (سورہ الفتح)

آگے ان کی تیسری اور چوتھی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ:

”يُجَاهِدُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ“ وہ اللہ کے راستہ میں اپنے امکان بھر جدوجہد اور جانبازی کریں گے اور اللہ اور اس کے دین کے ساتھ سچے عشق کی وجہ سے اس راہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی مطلق پرواہ نہیں کریں گے۔

یہ ان بندوں کے اوصاف بیان ہوئے جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اگر مسلمانوں میں سے کچھ بدنصیب اور مفاد پرست مرتد ہو جائیں تو اللہ کو ان کی کوئی پرواہ نہیں، وہ خود محروم ومردود ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے دین کی نصرت وخدمت کے لئے اور لوگوں کو اٹھائے گا جن میں یہ اوصاف ہوں گے، وہ خدا کے محبوب اور دل وجان سے اس کے محب ہوں گے۔ایمان والوں کے لئے یعنی اللہ کے وفادار بندوں کیلئے نہایت نرم ومتواضع اور اس کے باغیوں کافروں کے مقابلہ میں مردِ آہن اور بے لچک ہوں گے۔اللہ کے دین کی راہ میں بے دریغ جدوجہد کریں گے اور ہر قسم کی قربانی دیں گے اور کسی ملامت گر کی ملامت ان کے قدموں میں لغزش نہیں پیدا کر سکے گی۔

آگے فرمایا گیا ہے ”ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ“ یعنی ان ایمانی اوصاف کا کسی بندہ کو عطا ہونا اور دین کی نصرت وخدمت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو منتخب کیا جانا اور اس کی توفیق ملنا، اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل وانعام ہے۔اس عظیم نعمت اور دولت سے

وہی بندے نوازے جاتے ہیں جن کو خدائے علیم وحکیم نوازنا چاہتا ہے۔

آخر میں فرمایا گیا "وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" یعنی اللہ تعالیٰ کے خزانے بے انتہا وسیع اور لامحدود ہیں جو بندے اپنے کو اس فضل وانعام کا مستحق بنالیں وہ ان سب کو بھرپور عطا فرمائے گا۔ لیکن وہ علیم کُل اور ہمہ داں ہے اس لئے وہ کسی کو عطا فرمانے یا محروم کرنے کا فیصلہ اندھادھند نہیں کرتا بلکہ اس کے سارے فیصلے علم محیط کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔

یہ میں نے آیت کے اجزا کی مختصر تشریح کی ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، اس آیت میں "یآایھا الذین آمنوا" کے الفاظ سے بظاہر عام مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے لیکن فی الحقیقت ان منافقانہ ذہنیت رکھنے والے مسلمانوں کو آگاہی دی گئی ہے جو اللہ ورسول اور اسلام کی وفاداری میں پورے مخلص اور یکسو نہیں تھے بلکہ اپنی مفاد پرستی کی وجہ سے دشمنان اسلام سے بھی یارانہ گانٹھے ہوئے تھے اور ان سے ایسے روابط اور تعلقات رکھتے تھے جو صرف ہم مقصد اور ہم مشرب رفیقوں کے درمیان ہی ہونے چاہئیں۔ اس آیت میں ان کو سنایا گیا ہے کہ خدا کو اور اس کے دین کو تمہاری بالکل ضرورت نہیں۔ اگر تم بالفرض مرتد ہو کر دشمنوں کی صفوں میں شامل ہوجاؤ جب بھی تم کچھ نہیں بگاڑ سکو گے، اور اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دین کے مخلص جانباز سپاہی پیدا کریگا اور تم مردود ہو جاؤ گے۔ لہٰذا اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو اور خدا کی رحمت اور عنایت سے محروم ہونا نہیں چاہتے تو اللہ ورسول اور دین کے پورے وفادار ہو جاؤ۔ اپنے اندر حنیفیت کی شان پیدا کرو اور خدا کے دشمنوں سے ایسے تعلقات نہ رکھو اور ان کے آلۂ کار اور ایجنٹ نہ بنو بلکہ اپنی وفاداری کو اللہ ورسول اور مومنین صادقین کے لیے خاص کرو۔ چنانچہ آگے فرمایا گیا ہے۔ "إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ" ولی کے معنی یار وفادار، معتمد رفیق اور قریبی تعلق والے کے بھی ہیں، سرپرست اور مددگار کے بھی ہیں۔ مثلاً فرمایا گیا ہے "اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" اور خود اس زیر درس آیت میں فرمایا گیا "إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ" اور کہیں مومن بندوں کو اللہ کا ولی کہا گیا ہے، مثلاً فرمایا گیا ہے "اَلَا إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" اور کہیں مسلمانوں کو مسلمانوں کا اور کافروں کو کافروں کا ولی کہا گیا ہے مثلاً فرمایا گیا ہے "اَلْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ"

اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے "وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ" یہاں مائدہ کی اس آیت میں یہ لفظ "یار وفادار" کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ سچا دوست جس کا حق، ہو کہ دل وجان سے اس کی وفاداری کی جائے اور اس معاملے کو اپنا معاملہ سمجھا جائے۔

"وَھُمْ رَاکِعُوْنَ" کی تفسیر

آیت کے آخری جزء "وَھُمْ رَاکِعُوْنَ" کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف باتیں کہی ہیں، میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ اس کا مفہوم وہی ہے جس کو ہماری زبان میں سر تسلیم یا سر نیاز خم کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کا مطلب مکمل فرمانبرداری ہے۔ اس بنا پر آیت کا مطالبہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ ان کی "یاری وفاداری" بس اللہ کے لیے اس کے رسول کے لیے اور ان اہل ایمان کے لئے ہو جو اللہ اور اس کی شریعت کے ہر حکم کے لیے سر تسلیم خم کرتے ہوں، پورے فرمانبردار اور اطاعت گزار ہوں، خاص کر اہتمام سے نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہوں، کیونکہ یہ دونوں ایمان کی نشانی اور اسلام کے اولین ارکان ہیں۔

اٹل تقدیر

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ" یعنی جو لوگ اللہ، اس کے رسول اور مومنین کو اپنا ولی بنالیں اور اپنی "ولایت" یعنی "یاری وفاداری" کا تعلق ان کے لئے خالص کرلیں، وہ اللہ کے لشکر کے سپاہی اور خدائی پارٹی "حزب اللہ" کے ارکان واعضاء ہیں اور یہ خدائی پارٹی اور یہ اللہ کا لشکر انجام کار دشمنوں پر غالب آنے والا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ اور اس کی اٹل تقدیر ہے۔

آیتوں کا ابدی پیغام

یہاں تک میں نے ان آیتوں کا سادہ مطلب بیان کردیا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی بتایا تھا ان آیتوں کے نزول کے وقت ان کا خاص روئے سخن اس مخصوص طبقہ کی طرف تھا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا۔ لیکن فی الحقیقت ان آیات میں ہر دور کے ان مسلمانوں کے لیے بڑا سخت انتباہ ہے، جو اپنے دنیوی مفادات اور نفس کی خواہشات کے مقابلہ میں اللہ ورسول کے

احکام اور دین کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔اور کھلی ہوئی بات ہے کہ آج کی ''مسلمان قوم'' میں (جس کو لوگ ناواقفی سے ''خیر امت'' کہہ دیتے ہیں) ۹۰ فیصدی سے زیادہ کا حال یہی ہے۔ بہر حال یہ آیتیں ان سب مسلمانوں کو سنا رہی ہیں کہ خدا کو اور اس کے دین کو تمہاری کوئی ضرورت اور حاجت نہیں، اگر تم اپنی بدبختی سے اس نافرمانی اور جزوی ارتداد کی حالت سے آگے بڑھ کے بالکل مرتد بھی ہو جاؤ تو اللہ کو کوئی پروا نہیں۔ (اللہ تمہاری جگہ دوسروں کو لائے گا اور ان سے دین کی خدمت کا کام لے گا۔اور پھر ان پر اس کا فضل وانعام ہوگا۔)

اس آخری آیت نے یہ بھی صاف بتا دیا کہ ہر مسلمان کہلانے والا اللہ کے لشکر کا سپاہی اور اللہ کی پارٹی ''حزب اللہ'' کا رکن نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمان کہلانے والی کسی قوم کے لیے نصرت اور غلبہ وفتحیابی کا وعدہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ وعدہ صرف ان اہل ایمان کے لیے ہے جنہوں نے اپنی وفاداری کو اللہ ورسول اور مومنین صادقین کے لیے خالص کر لیا ہو اور ان کی عملی زندگی اس کی شہادت دے رہی ہو، وہی اللہ کے لشکری اور ''حِزْبَ اللّٰہِ '' کے رکن ہیں، انہی کے لیے فرمایا گیا ہے ''فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔''

آج کل دنیا کے مختلف حصوں میں اور مختلف ملکوں میں مسلمانوں اور غیر مسلم طاقتوں کے درمیان جو ٹکراؤ ہو رہے ہیں۔ان کی نوعیت ہرگز یہ نہیں کہ ایک طرف اللہ کے دوست اور وفادار بندے ہوں اور دوسری طرف اس کے دشمن، ایک طرف ''حزب اللہ'' ہو اور دوسری طرف ''حِزْبَ الشَّیْطَان ''، بلکہ اس لحاظ سے جو صورتحال ہے وہ بالکل کھلی ہوئی ہے اور اس میں کسی کو غلط فہمی کی بھی گنجائش نہیں ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی اس غیبی مدد اور نصرت کا کوئی استحقاق نہیں ہے جس کا وعدہ اس آیت میں اور قرآن پاک کی دوسری آیتوں میں کیا گیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ دنیا کے اکثر حصوں میں مسلمانوں کی اجتماعی عملی زندگی قریب قریب اتنی ہی گندی ہو گئی ہے جتنی کہ نزول قرآن کے وقت بنی اسرائیل کی تھی جس پر قرآن پاک میں جا بجا سخت تنقید کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ اس زندگی کی وجہ سے ان پر خدا کی لعنت ہوئی اور وہ نعمتوں سے محروم کئے گئے...... میں نے اس درس میں بار بار آپ سے کہا ہے کہ قرآن پاک میں ''بنی اسرائیل'' کا ذکر اتنی کثرت اور اتنی تفصیل سے جو کیا گیا ہے اس کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ہم مسلمان اس کے آئینے میں اپنے چہرے دیکھتے رہیں اور اس سے سبق حاصل کرتے رہیں۔

(درس-۵)

دُنیا اور آخرت میں فیروز مندی کی شرط ایمان وتقویٰ اور خداوندی ہدایت کی پیروی

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ
وَلَاَدْخَلْنَاهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ
اَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ، وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ۔
(المائدہ۔ آیت ۶۵۔ ۶۶)

(ترجمہ) اور اگر یہ اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ والی زندگی اختیار کرتے تو ہم ان کے (پچھلے) گناہ معاف کر دیتے اور آخرت میں ان کو جنات نعیم (چین وآرام کے بہشتی باغوں) میں داخلہ دے دیتے (جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی وہ سب نعمتیں بھرپور پاتے جن کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولوں کی زبانوں پر وعدہ کیا گیا ہے۔)

اور اگر وہ توراۃ وانجیل کی اور اس (مقدس کتاب) کی جو ان کے رب کی طرف سے ان کے لیے اب اتاری گئی ہے (یعنی قرآن پاک کی) پابندی کرتے (اور ان کی

ہدایات پر ٹھیک چلتے) تو اپنے اوپر سے اور نیچے سے (یعنی ہر طرف سے) اللہ کا رزق پاتے۔ (لیکن صورتحال یہ ہے) کہ ان میں (تھوڑے سے لوگوں کی) ایک جماعت تو (افراط وتفریط کے بغیر) ٹھیک راستے پر چلنے والی ہے اور اکثریت ان میں سے ایسی ہے کہ اس کا کردار بہت برا ہے۔

ماقبل کی آیتوں کا خلاصہ

یہ سورۂ مائدہ کے نویں رکوع کی آخری آیتیں ہیں۔ ان سے اوپر کی آیتوں میں اہل کتاب خاص کر یہودیوں کی روحانی گراوٹ اور صلاح وسعادت سے محرومی کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا گیا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی میں انھوں نے اخلاق اور انسانیت کی ساری حدوں کو توڑ ڈالا ہے۔ حد یہ ہے کہ اذان جیسی مقدس چیز کو (جس میں اللہ کی توحید وکبریائی کا اعلان اور نماز جیسے بابرکت عمل کی دعوت ہے) انھوں نے تمسخر واستہزا کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کی نقل اتارتے اور منہ چڑاتے ہیں۔ (وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا)۔

اس کے بعد فرمایا گیا تھا کہ ان میں اس قدر بگاڑ آ گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ معصیتیں ان میں عام ہو گئی ہیں، بلکہ ان کی حالت یہ ہے کہ "اِثْمٌ وَّعُدْوَان" اور "اَکْلِ سُحْت" یعنی گندے غلیظ گناہوں سے اور بندگان خدا پر ظلم وزیادتی کرنے اور حرام کمانے اور کھانے سے ان کو خاص دلچسپی ہو گئی ہے۔ اور یہ سب لعنتی اعمال ان کے مرغوب ومحبوب مشاغل بن گئے ہیں، وہ دن رات انہی میں منہمک رہتے ہیں اور اس چیز نے ان کی روحوں کو بالکل مسخ کر دیا ہے۔ (تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْهُمْ یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَکْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔)

اس کے بعد خصوصیت سے ان کے مذہبی پیشواؤں کے بارہ میں فرمایا گیا تھا کہ انھوں نے مداہنت کا مجرمانہ رویہ اختیار کر لیا ہے۔ وہ ان خبیث اعمال کو گوارا کرنے لگے ہیں۔ روک ٹوک بالکل نہیں کرتے۔ (لَوْ لَا یَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَکْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ۔)

اس کے بعد فرمایا گیا تھا کہ ان کی روحیں اب اتنی مردہ ہوگئی ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی میں یہ خدا کی شان میں بھی گستاخیاں کرتے ہیں۔ استہزا اور تمسخر کے طور پر کہتے ہیں "یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ" (مسلمانوں کے اللہ میاں کا ہاتھ آج کل تنگ اور خالی ہوگیا ہے اس لیے ان کے پیغمبر اپنے آدمیوں سے چندوں اور صدقوں کی اپیل کرتے رہتے ہیں) معاذ اللہ! اس کے بعد فرمایا گیا تھا کہ یہود اپنی ان گستاخیوں اور زبان درازیوں کی وجہ سے رحمت الٰہی سے محروم کردیئے گئے ہیں، اور خداوند قہار کی لعنت کا نشانہ بن گئے ہیں (وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا)۔ پھر اس لعنت خداوندی کے ان کی زندگی پر جو اثرات پڑے ہیں ان کو بیان کرتے ہوئے آخر میں فرمایا گیا تھا۔ "وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَاداً، وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ" یعنی اب ان کی حالت یہ ہے کہ ان کی ساری تگ ودو اور دوڑ دھوپ بگاڑ اور فساد کے لیے ہو رہی ہے۔ یہ اگرچہ اپنے کو دنیا کی برگزیدہ نسل کہتے ہیں اور اللہ کے مقدس نبیوں سے نسبت جوڑتے ہیں، لیکن ان کا کردار یہ ہے کہ اللہ کے سارے پیغمبر جس صلاح کے پھیلانے کے لیے آئے تھے، یہ اس کے خلاف فساد پھیلانے کی مہم چلا رہے ہیں اور ہدایت کی اس روشنی کو بجھا دینا چاہتے ہیں جو سارے نبی اپنے اپنے وقت پر لائے تھے اور جو مکمل شکل میں خدا کے یہ آخری نبی لے کر آئے ہیں۔ اور ایسے لوگ کبھی خدا کی محبت وعنایت اور اس کے پیار کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ بلکہ یہ محروم ہی رہیں گے (وَاللّٰہُ لَایُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ)۔

زیر تلاوت آیتوں کا مفہوم

یہ میں نے گزشتہ ہفتہ کے درس کا خلاصہ بیان کردیا ہے۔ اس کے بعد متصلاً یہ آیتیں ہیں جو میں نے اس وقت آپ کے سامنے تلاوت کیں۔ ان میں مشفقانہ اور خیرخواہانہ انداز میں فرمایا گیا

۴۔ "وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْکِتَابِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَکَفَّرْنَا عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاَدْخَلْنٰھُمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ"۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان اہل کتاب سے کوئی عناد نہیں ہوگیا ہے بلکہ انہوں نے خود اپنے پر ظلم کیا ہے اور ایمان کے بجائے کفر کی راہ اختیار کرکے اور صلاح وتقویٰ کی جگہ نفسانیت اور معصیت کا راستہ اپنا کے خود ہی اپنے کو اللہ تعالیٰ کی ابدی رحمت اور جنت سے محروم

کرلیا ہے۔ اگر یہ لوگ اللہ کے پیغمبر پر ایمان لاتے اور تقویٰ والی زندگی اختیار کرتے جس کی دعوت اللہ کے سارے پیغمبر اور اللہ کی طرف سے آنے والی ساری کتابیں اور سارے صحیفے دیتے رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے قانون رحمت کے مطابق ان کے پچھلے گناہ قصور سب معاف کردئے جاتے اور آخرت میں یہ اللہ کے جوار رحمت جنت میں جگہ پاتے۔ ''لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ'' اور اگر آخرت پر ایمان ہو تو کسی بندہ کی سب سے بڑی خوش بختی اور کامیابی یہی ہے کہ اس کے گناہ قصور معاف کردئے جائیں، ان کا کوئی حساب نہ ہو اور دار آخرت میں جنت نصیب ہو جائے۔

اس کے بعد فرمایا گیا کہ اگر اہل کتاب اللہ کے اور اس کے پیغمبروں کے بتائے ہوئے راستہ پر ٹھیک چلتے تو آخرت میں مغفرت اور جنت کے علاوہ، اس سے پہلے اس دنیا میں بھی یہ ہر طرح کی نعمتوں اور برکتوں سے نوازے جاتے، ارشاد فرمایا گیا ہے۔

''وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔''

اور یہ اہل کتاب اگر تورات وانجیل کی تعلیمات پر اور اس ہدایت پر ٹھیک چلتے جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے لیے اب نازل کی گئی ہے۔ یعنی قرآن پاک تو اوپر سے اور نیچے سے، ہر طرف سے رزق پاتے اور زمین وآسمان کی برکتوں کے دروازے ان کے لئے کھول دئے جاتے، ان پر اوپر سے بھی نعمتوں کی بارش ہوتی اور زمین بھی ان کے لیے رزق الٰہی کے خزانے اگلتی۔

ان دو آیتوں سے اوپر کی آیتوں میں بلکہ پچھلے کئی رکوعوں میں اہل کتاب خاص کر ان میں سے یہودیوں کی بداعمالیوں اور اس کے نتیجہ میں ان پر اللہ کی لعنت وغضب کا ذکر کیا گیا تھا اور ان کا انداز ترہیبی تھا۔ ان آخری دو آیتوں کا انداز ترغیبی ہے۔ ان میں فرمایا گیا ہے کہ یہ اہل کتاب اگر کفر وعصیان کے بجائے ایمان اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے اور اپنے گندے جذبات اور نفسانی خواہشات کی اتباع کے بجائے اللہ کی مقدس کتابوں توراۃ وانجیل اور قرآن حکیم کی ہدایات کی پیروی کرتے تو آخرت میں ''جنات النعیم'' کے وارث بنائے جاتے، اور وہاں کبھی نہ ختم ہونے والی نعمتوں سے فیض یاب ہوتے، اور آخرت سے پہلے اس دنیا میں بھی

ان پر اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوتا کہ زمین سے بھی ان کو فراوانی سے رزق ملتا اور آسمان سے بھی ان پر رحمتوں اور برکتوں کی بارش ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جو نعمتیں زمین سے حاصل ہوتی ہیں وہ بھی ان کو ملتیں اور جن نعمائے الٰہیہ کا نزول آسمان سے ہوتا ہے وہ ان سے بھی بہرہ یاب ہوتے۔

میرے نزدیک ان دونوں آیتوں کا مدعا اور پیغام یہ ہے کہ ان اہل کتاب کے لئے جو الحاد و انحراف اور بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے محروم ہو گئے ہیں، اب بھی دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگر یہ اپنی اصلاح کر لیں، کفر و عصیان کا طریقہ چھوڑ کے ایمان و تقویٰ کا راستہ اختیار کر لیں اور نفسانی خواہشات اور گندے جذبات کی غلامی کے بجائے خداوندی ہدایت کی پیروی کو اپنا شعار بنا لیں، تو دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور رحمتوں سے اب بھی پورا پورا حصہ لے سکتے ہیں۔

یہ قانون عام ہے

یہ بات اگرچہ یہاں اہل کتاب کے بارے میں اور ان میں سے بھی خاص کر یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرمائی گئی ہے لیکن دراصل یہ اللہ تعالیٰ کا عام قانون اور اس کا ازلی دستور ہے۔ سورۂ اعراف میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کی قوموں کا یہ حال بیان فرمانے کے بعد کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں پر ایمان لانے اور ان کی ہدایت پر چلنے کے بجائے کفر و نافرمانی کا راستہ اختیار کیا اور ان پر خدا کا غضب اور عذاب نازل ہوا...... فرمایا گیا ہے۔

"وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰىٓ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاۗءِ۔"

(اور اگر ان بستیوں والے کفر و نافرمانی کے بجائے ایمان و تقویٰ کا راستہ اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے) اس آیت سے اور زیادہ صراحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا عام اور ہمہ گیر قانون اور ازلی ابدی سنت اللہ ہے کہ جو قوم اور امت ایمان اور تقویٰ والی زندگی اختیار کر لے وہ آخرت میں جنت کی نعمتوں کے علاوہ اس دنیا میں بھی زمین و آسمان کی برکتوں سے نوازی جائے گی۔

جس زمانہ میں مسلمانوں کی عام زندگی ایمان اور تقویٰ والی تھی، ان کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح زمین وآسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ شروع شروع میں تو ابتلائی اور امتحانی دور رہا جو ایمان والوں کی تربیت کے لیے ضروری ہوتا ہے، لیکن اس مرحلہ کو طے کر لینے کے بعد ان پر ہر طرف سے نعمتوں کی بارش ہی بارش تھی۔ اور چیزوں کے علاوہ زمینی پیداوار میں برکت کا یہ حال تھا کہ ابوداؤد شریف جو صحاح ستہ کی اہم کتابوں میں سے ہے۔ اس کے مؤلف اور جامع امام ابوداؤد نے خود اپنا مشاہدہ لکھا ہے۔ (۱) کہ زمین کی پیداوار میں ایسی برکت تھی کہ مصر کے بازار میں میں نے ایسے کھیرے دیکھے جن میں سے ایک کو میں نے اپنے بالشت سے ناپا تو وہ تیرہ بالشت تھا۔ اسی طرح انہوں نے لکھا ہے کہ وہیں میں نے ایسے لیموں دیکھے جن کو بیچ سے دو حصے کر کے ایک حصہ کو اونٹ کی پیٹھ پر ایک جانب اور دوسرے حصہ کو دوسری جانب لادا جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت امام احمد بن حنبل نے بیان فرمایا کہ انھوں نے ایسے گیہوں دیکھے جن کا ایک دانہ بصرہ کی کھجور کی گٹھلی کے برابر تھا۔

یہ دراصل "لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ" کا ایک ظہور تھا، لیکن کسی قوم اور امت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ اسی وقت ہوتا ہے جب اس کی زندگی اجتماعی اور عمومی طور پر ایمان اور تقویٰ کی ہو، نفاق اور فسق و فجور اگر ہو بھی تو بالکل دبا ہوا ہو۔ لیکن اس کے برعکس اگر کسی قوم اور امت کی حالت یہ ہو کہ اس میں آخرت سے بے فکری، اللہ ورسول کی نافرمانی اور فسق و فجور عام ہو تو اگر چہ اس میں کچھ صالح اور متقی لوگ اور اولیاء اللہ بھی ہوں تو وہ قوم اجتماعی حیثیت سے ان نعمتوں اور برکتوں کی مستحق نہیں رہتی۔ سورۂ مائدہ کی جو آیتیں اس وقت زیر درس ہیں ان کے آخری حصہ میں یہ بات بھی بڑی صراحت کے ساتھ فرمادی گئی ہے، اہل کتاب کی محرومیوں کے تذکرہ کو ان الفاظ پر ختم کیا گیا ہے۔

"مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ، وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ۔"

یعنی ان اہل کتاب کی حالت یہ ہے کہ ان میں ایک چھوٹا سا گروہ اور ایک تھوڑی سی تعداد تو بے شک ایسی ہے کہ اس کی روش ٹھیک ہے اور وہ راست پر ہے یعنی اس میں خدا ترسی اور فکر آخرت ہے اور وہ لوگ خداوندی ہدایت کی پابندی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے

(۱) سنن ابی داؤد۔ کتاب الزکاۃ۔ باب زکوٰۃ الزرع (مرتب)

ہیں، لیکن ان میں کی بڑی تعداد بداعمالیوں اور بدکرداریوں میں مبتلا ہے۔ ''وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَايَعْمَلُوْنَ''۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ جب کسی امت کی حالت یہ ہوجائے کہ اس کی اکثریت کی زندگی نافرمانی اور فسق وفجور کی ہو تو اگر اس میں کچھ بندے اعلیٰ درجہ کے صالح اور متقی اور اولیاء اللہ بھی ہوں تو امت اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتوں اور برکتوں سے محروم ہی رہے گی۔

بعینہٖ یہی حال آج مسلمانوں کا ہے

ہم مسلمان آج بالکل اسی حال میں ہیں، قرآن پاک میں ان اہل کتاب کے حق میں فرمایا گیا تھا ''مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَايَعْمَلُوْنَ'' یہ لفظ بہ لفظ آج کے مسلمانوں پر صادق ہے اور یہ کسی مخصوص علاقہ یا کسی خاص ملک کے مسلمانوں کا حال نہیں ہے، بلکہ پورے عالم اسلامی کی حالت یہی ہے ''مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَايَعْمَلُوْنَ'' ان الفاظ میں قرآن پاک نے زمانۂ نبوت کے اہل کتاب کی تصویر کھینچی تھی۔ آج یہ امتِ مسلمہ کی زندگی کی تصویر ہے۔ ''مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَايَعْمَلُوْنَ''۔

بے شک اس امت میں آج بھی اصحابِ صلاح وتقویٰ اور اولیاء اللہ کی ایک خاصی تعداد ہے لیکن چونکہ اکثریت بلکہ غالب ترین اکثریت، خداوندی ہدایت سے بے پرواہوکر من مانی زندگی گزار رہی ہے اس لئے امت ان نعمتوں اور برکتوں سے محروم ہے جن کے دروازے ایمان وتقویٰ والی قوموں کے لئے کھولے جاتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ بیان فرمایا کہ آخری زمانہ میں مسلمانوں پر ایسے بُرے حالات آئیں گے اور وہ اس طرح تباہ وبرباد کئے جائیں گے، تو امہات المومنین میں سے غالباً حضرت اُمِ سلمہؓ نے عرض کیا کہ حضرت کیا اس زمانہ میں امت صالحین سے خالی ہوجائے گی؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس وقت بھی امت میں اللہ کے کچھ صالح بندے ہوں گے۔ انہوں نے عرض کیا۔ أَنُهْلَكُ وَفِيْنَا الصَّالِحُوْنَ يَارَسُوْلَ اللهِ؟

حضرت کیا ہم ایسی حالت میں بھی ہلاک و برباد کردیئے جائیں گے جب کہ ہم میں اللہ کے کچھ صالح بندے بھی ہوں گے؟

آپ نے ارشاد فرمایا۔ نَعَمْ إِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ۔

ہاں جب خباثت یعنی فسق و فجور کا امت میں غلبہ ہوگا تو صلحاء کے ہوتے ہوئے بھی ہلاکتیں اور بربادیاں آئیں گی۔(۱)

اس وقت پورے عالم اسلامی میں مسلمان جن ذلتوں سے دوچار ہورہے ہیں اور جس کی سب سے زیادہ تکلیف دہ مثال اسرائیلی حکومت اور عربوں کے معرکہ میں سامنے آئی ہے(۲) اس کا حقیقی اور بنیادی سبب یہی ہے کہ امت کی موجودہ زندگی نے اس کو خدا کی نصرت سے یکسر محروم کردیا ہے، ایمانی نقطۂ نظر سے بنیادی اور حقیقی سبب یہی ہے، ظاہری اسباب وتدابیر کے لحاظ سے جو کوتاہیاں ہیں وہ دراصل اس کے ثمرات ونتائج ہیں، اور علاج صرف یہی ہے کہ پھر سے ایمان وتقویٰ کی زندگی امت میں عام ہو، اللہ تعالیٰ کا ازلی ابدی منشور ہے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرىٰ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ۔



(۱) بخاری، کتاب الفتن عن زینب بنت جحش (مرتب)

(۲) ۱۹۶۷ء کی جنگ کی طرف اشارہ ہے (مرتب)

(درس-۶)

محشر میں سارے پیغمبروں سے ان کی اُمتوں کے بارے میں خداوندی سوال

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال وجواب کی تفصیل

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم ط

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا
اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۝ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ
اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ
تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا، وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ
وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰاةَ وَالْاِنْجِيْلَ، وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ
كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ
الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ وَاِذْ
كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۝ وَاِذْ اَوْحَيْتُ
اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ
بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ۝ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ هَلْ

يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ
قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ قَالَ
عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ
تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ
الرّٰزِقِيْنَ ۝ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ
فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝
(المائدہ۔ ع ۱۵۔ آیات ۱۰۹۔ ۱۱۵)

(ترجمہ) قیامت کے اس دن کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ سارے پیغمبروں کو جمع فرمائے گا پھران سے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب دیا گیا؟ (یعنی تمہاری دعوت اور تعلیم و ہدایت کے بارے میں تمہاری امتوں کا طرزِ عمل کیا رہا؟) وہ عرض کریں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں، غیب کی باتوں کا پورا علم آپ ہی کو ہے۔

تصور کرو اس وقت کا جب اللہ تعالیٰ (اپنے پیغمبر مسیح سے) فرمائے گا، اے مریم کے بیٹے عیسیٰ یاد کرو ان انعامات اور احسانات کو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ (مریم) پر کئے۔ جب میں نے روح القدس سے تمہیں تائید اور تقویت بخشی، تم لوگوں سے کلام کرتے تھے گہوارہ میں (شیر خوارگی کے ایام میں) اور سن کہولت میں بھی (اُن سے پیغمبرانہ اور معجزانہ خطاب کرتے تھے) اور یاد کرو جب میں نے تم کو کتاب وحکمت اور خاص کر توارۃ وانجیل کا علم دیا، اور یاد کرو جب تم بنا دیتے تھے مٹی کے گوندے سے پرندہ کی سی صورت میرے حکم سے، پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو (اُس میں حیات پیدا ہو جاتی تھی اور) وہ حقیقۃً پرندہ بن جاتا تھا میرے حکم سے، اور تم مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتے تھے میرے حکم سے، اور جب تم مُردوں کو زندہ کر کے (قبروں سے نکال کے) کھڑا کر دیتے تھے میرے حکم سے اور یاد کرو وہ واقعہ جب میں نے بنی اسرائیل کے شر کو روک دیا تم سے، جب تم آئے تھے ان کے پاس کھلی نشانیاں اور روشن معجزے لے کر، تو ان میں سے کافروں نے کہا تھا کہ یہ تو بس صریح جادو ہے (اور پھر وہ تمہیں ختم

کر دینے کے درپے ہو گئے)۔

اور (اے عیسیٰ بن مریم) یاد کرو (وہ واقعہ بھی) کہ جب میں نے حواریوں کے دل میں ڈالا کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول (عیسیٰ بن مریم) پر، تو وہ بول اٹھے کہ ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔

اور یاد کرو اس واقعہ کو بھی جب حواریوں نے کہا تھا کہ اے مریم کے فرزند عیسیٰ کیا تمہارا خداوند ایسا کر سکتا ہے کہ ہمارے لئے آسمان سے مائدہ (کھانے کا خوان) اتار دے تو عیسیٰ نے ان سے کہا تھا کہ اگر تم مومن ہو تو خدا سے ڈرو (اور ایسی باتیں نہ کرو جو مومنین کیلئے زیبا نہیں) ان حواریوں نے کہا کہ (اس سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ آپ کی صداقت یا خدا کی قدرت کا امتحان لیں) ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ (اللہ کے اتارے ہوئے) اس آسمانی خوان سے ہم کھائیں (اور اس پاک نورانی کھانے کی برکتیں ہمیں حاصل ہوں) اور ہمارے قلوب کو اطمینان کی دولت نصیب ہو اور ہم (اس ذاتی تجربہ اور مشاہدہ سے) جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ فرمایا تھا اور پھر ہم اس کی گواہی دینے والے بنیں۔ عیسیٰ بن مریم نے دعا کی "اے اللہ ہمارے پروردگار! تو ہم پر آسمان سے مائدہ (کھانے کا خوان) نازل فرما جو ہمارے لئے ایک یادگار بن جائے ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے اور تیری طرف سے ایک معجزہ اور نشانی ہو، اور تو ہمیں رزق عطا فرما، تو بہترین عطا فرمانے والا ہے، اللہ نے فرمایا میں یہ خوان تمہارے لئے اتار تو دوں گا، لیکن اس کے بعد جو کوئی تم میں سے کفر کرے گا تو اس کو میں وہ سخت سزا دوں گا جو دنیا میں کسی کو بھی نہ دوں گا۔

تفسیر وتشریح

اہل کتاب پر اتمام حجت

یہ سورۂ مائدہ کا خاتمہ یعنی اس کا بالکل آخری حصہ شروع ہوا، آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ اس سورۃ کے اکثر مضامین اہل کتاب خاص کر یہود و نصاریٰ سے متعلق تھے۔ اس آخری حصہ کا روئے سخن بھی خصوصیت سے اہل کتاب ہی کی طرف ہے اور ان میں سے بھی خاص طور سے تثلیث پرست عیسائی اس کے مخاطب ہیں اور ایک غیر معمولی انداز میں ان کی مشرکانہ گمراہیوں کے انجام سے انھیں مطلع کیا گیا ہے اور ایک طرح سے آخری طور پر ان پر حجت تمام

کر دی گئی ہے، سب سے پہلے فرمایا گیا ہے۔

" یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوۡلُ مَاذَاۤ اُجِبۡتُمۡ قَالُوۡا لَا عِلۡمَ لَنَا اِنَّکَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ "۔

یعنی آنے والے اس ہولناک دن کا تصور کرو جب اللہ اپنے سارے پیغمبروں کو میدانِ حشر میں جمع فرمائے گا جہاں اس دنیا کے سارے انسان جمع ہوں گے۔ اگلی پچھلی ساری امتیں قومیں اور سب مذہبی گروہ اور فرقے حاضر ہوں گے، تو سب کے سامنے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو جمع فرمائے گا اور ان سے پوچھے گا " مَاذَآ اُجِبۡتُمۡ " (تمھیں کیا جواب دیا گیا) یعنی ہر نبی سے پوچھا جائے گا کہ تم جن کی ہدایت و اصلاح کیلئے بھیجے گئے تھے ان کا رویہ کیا رہا؟ انھوں نے کس حد تک تمہاری بات مانی اور تمہاری پیروی کی؟ تو یہ سب پیغمبر اللہ علام الغیوب کے علم محیط کے مقابلہ میں اپنے محدود اور صرف ظاہری علم کو کالعدم اور منفی قرار دیتے ہوئے اور ادب کے تقاضے سے عرض کریں گے " لَا عِلۡمَ لَنَا اِنَّکَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ " یعنی آپ علام الغیوب ہیں، کوئی بات آپ سے مخفی اور آپ کے علم سے باہر نہیں۔ ہماری دعوت و تعلیم کے بارے میں امتوں کا جو رویہ رہا اس کا پورا اور صحیح علم آپ ہی کو ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں جو آپ کے حضور میں عرض کر سکیں۔

میدان حشر میں پیغمبروں سے اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پوچھا جائے گا اور وہ اس کا جو جواب دیں گے یہ اُس کا نہایت اجمالی بیان ہے۔ آگے صرف اس سوال و جواب کو کسی قدر تفصیل سے ذکر فرمایا گیا ہے جو عیسیٰؑ سے ان کی امت کے بارے میں کیا جائے گا اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی نبی کے بارے میں اس کی امت نے اتنا مشرکانہ غلو نہیں کیا جتنا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں کیا، اور کسی نبی کی امت نے اپنے پیغمبر کی تعلیم کو اتنا مسخ نہیں کیا جتنا کہ عیسائی امت نے حضرت عیسیٰ کی تعلیم کو مسخ کیا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ قیامت میں سب کے سامنے ان کا بیان تفصیل سے دلوائے گا اور قرآن مجید میں اس کو تفصیل سے اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ نبی آخرالزماں اور اللہ کی آخری کتاب کے ذریعہ عیسائی امت پر آخری حد تک حجت تمام ہو جائے اور انھیں معلوم ہو جائے کہ قیامت کے دن عیسیٰؑ ان کے مشرکانہ عقائد و اعمال سے کس طرح اپنی برأت ظاہر کریں گے، اور پھر جن کے دلوں میں آخرت کی فکر اور خدا کے خوف

کی کوئی رمق باقی ہو وہ مشرکانہ عقائد سے توبہ کر کے اس توحید کو اختیار کریں جس کی عیسیٰ نے حقیقتاً تعلیم دی تھی اور جس کی دعوت اللہ کے آخری نبی اور آخری کتاب کے ذریعہ دی جا رہی ہے، آگے ختم سورت تک تفصیل سے یہی بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن عیسیٰ (علیہ السلام) سے اللہ تعالیٰ اس بارے میں کیا فرمائے گا، کیا پوچھے گا اور وہ اس کے جواب میں کیا عرض کریں گے۔

معجزانہ نعمتوں کے بیان میں حضرت عیسیٰؑ کی بندگی کا اظہار

آگے کی آیتوں میں بیان فرمایا گیا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو اپنے وہ انعامات و احسانات یاد دلائے گا جو اس کی طرف سے ان پر اور ان کی والدہ مریم صدیقہ پر کیے گئے اور جن کی وجہ سے ان کو دنیا میں عظمت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان انعامات کے تذکرہ سے یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جائے گی کہ حضرت عیسیٰ میں جو بھی کمال تھا وہ خدا کا عطیہ تھا اور ان سے جو معجزات ظاہر ہوئے وہ ان کی اپنی ذاتی روحانی طاقت سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت سے ظاہر ہوئے۔ یہاں تک کہ جو حواری ایمان لا کے ان کے پیروکار اور ان کی دعوت کے علمبردار بن گئے ان کو بھی خدا ہی نے ایسا بنایا اور اس کی توفیق دی۔ ارشاد فرمایا گیا:

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا۔

یعنی اُس وقت کا تصور کرو جب اللہ تعالیٰ میدانِ حشر میں اولین و آخرین کے پورے مجمع کے سامنے اپنے پیغمبر عیسیٰؑ کو مخاطب کر کے فرمائے گا۔ کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! میرے ان انعامات و احسانات کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کیے۔ میں نے روح القدس سے تمہیں تائید دی جس کا پہلا ظہور یہ تھا کہ تم لوگوں سے گہوارہ میں یعنی شیر خوارگی کے زمانہ میں معجزانہ اور حکیمانہ باتیں کرتے تھے، اور پھر ادھیڑ عمر میں جب ایک پیغمبر کی حیثیت سے تم لوگوں کو خطاب کرتے تھے تو وہ بھی روح القدس کی تائید کا ظہور تھا۔

رُوح القدس کا مطلب

روح القدس کے ذریعہ عیسیٰؑ کی تائید کا ذکر ان کی ایک امتیازی فضیلت اور ان پر اللہ تعالیٰ کے ایک خاص انعام کی حیثیت سے قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر کیا گیا ہے۔

تیسرے پارے ''تلک الرسل'' کے بالکل شروع میں خاص خاص پیغمبروں کی امتیازی فضیلتیں بیان فرماتے ہوئے عیسیٰؑ کے بارے میں فرمایا گیا۔ ''وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ۔''

اکثر مفسرین نے روح القدس سے حضرت جبرئیل امین کو مراد لیا ہے۔ اس بنا پر مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت عیسیٰؑ کو جبرئیل امین کی خصوصی تائید ورفاقت حاصل تھی، اور بعض حضرات نے روح القدس سے ایک روحانی قوت مراد لی ہے، اس بنا پر مطلب یہ ہوگا کہ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص روحانی قوت حاصل تھی اور وہ ان پر اللہ تعالیٰ کا مخصوص انعام تھا۔ بہر حال میدان حشر میں اللہ تعالیٰ عیسیٰؑ کو سب سے پہلے اپنا یہ احسان یاد دلائے گا کہ میرے ہی حکم سے تم کو روح القدس کی قوت اور تائید حاصل تھی۔ اور تم نے گہوارہ میں شیر خوارگی کے زمانہ میں جو معجزانہ باتیں کیں، اور اسی طرح اپنی نبوت کے زمانہ میں جو پیغمبرانہ باتیں لوگوں سے کیں وہ میرے اس انعام واحسان کا طفیل تھا کہ میں نے روح القدس کی تائید تم کو دی تھی تمہارا کوئی ذاتی کمال نہیں تھا۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے:

''وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ''

یعنی اے عیسیٰ بن مریم! میرے اس انعام واحسان کو بھی یاد کرو کہ تم کو میں نے کتاب وحکمت کا علم عطا فرمایا اور خاص کر تورات وانجیل کا علم دیا...... حضرت عیسیٰؑ کا سب سے بڑا علمی کمال یہی تھا کہ انھیں کتاب وحکمت اور بالخصوص اللہ کی مقدس کتابوں تورات وانجیل کا علم حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو یاد دلائے گا کہ یہ بھی میرا فضل واحسان تھا۔ تمہارا کوئی ذاتی کمال نہیں تھا۔ آگے ارشاد ہوا ہے:

وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي۔

اور اس کو بھی یاد کرو کہ میں نے تمہارے ہاتھ پر بڑے بڑے معجزے ظاہر کرائے۔ تم مٹی کے گوندے سے بالکل پرندہ کی سی صورت بنا دیتے تھے۔ یہ تمہارے ہاتھ سے میں ہی کراتا تھا پھر تم اس پر پھونک مارتے تھے تو اس میں حیات آجاتی تھی اور وہ حقیقۃً اڑنے والا پرندہ ہو جاتا تھا۔ یہ سب میرے ہی حکم سے اور میری ہی قدرت سے ہوتا تھا، تمہارا کوئی ہنر اور کمال نہیں تھا۔ آگے فرمایا گیا ہے۔

وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۔

تم مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو ہاتھ پھیر کے اچھا کر دیتے تھے اور زمین میں دفن

شدہ مُردوں کو زندہ کر کے قبروں سے نکال کے کھڑا کر دیتے تھے، یہ سب میرے ہی حکم سے ہوتا تھا۔ تمہارا اپنا کوئی کمال نہیں تھا...... آگے ارشاد فرمایا گیا ہے:

"وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ عَنكَ إِذْ جِئْتَهُم بِٱلْبَيِّنَٰتِ فَقَالَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ"۔

اور میرے اس انعام واحسان کو بھی یاد کرو جب تم بنی اسرائیل کے پاس یہ کھلے معجزے اور روشن نشانیاں لے کر آئے تو انھوں نے تمہیں جادوگر قرار دیا اور تمہارے قتل کرانے اور سولی پر چڑھوا دینے کی سازش کی اور اپنی جدوجہد سے تمہاری گرفتاری اور اس کے بعد سولی پر لٹکوا دینے کا آخری حکم بھی حکومتِ وقت سے حاصل کر لیا تو میں نے ہی اپنی قدرت سے تم کو بچا لیا۔ وہ تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکے یہ میرا ہی فضل واحسان تھا کہ تمہارے دشمنوں کی ساری اسکیم ناکام ہوگئی۔

معجزے اور کرامت کی حقیقت

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بر سرِ محشر حضرت عیسیٰ کو اپنے یہ سب انعامات واحسانات یاد دلائے گا۔ اور انھیں عیسیٰ ابن مریم کہہ کے مخاطب فرمائے گا، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان گمراہ عیسائیوں کی تردید ہوگی جنھوں نے ان معجزات کو حضرت عیسیٰ کی ذاتی روحانیت کا کرشمہ قرار دے کر ان کو خدا یا خدا کا بیٹا یا خدائی میں شریک بنایا اور نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ اور ان کے لائے ہوئے قرآن کی توثیق ہوگی جنھوں نے عیسیٰؑ کو خدا کا برگزیدہ بندہ اور اس کا رسول بتایا اور ان کے معجزات کو خدا کی قدرت کا کرشمہ اور اس کا فعل قرار دیا۔ اور کہا کہ عیسیٰؑ کے یہ سارے معجزے باذن اللہ تھے، قرآن پاک میں جابجا فرمایا گیا ہے کہ معجزے جو پیغمبروں کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں وہ دراصل اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتے ہیں، پیغمبر ان کا صرف مظہر ہوتے ہیں۔ عقائد اور کلام کی کتابوں میں معجزے کی حقیقت یہی بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، اس طرح کرامت کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ دراصل خدا کا فعل ہوتا ہے اور ولی اس کا صرف مظہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ معجزہ نبی کا اور کرامت ولی کا اپنا فعل ہوتا ہے اور ان کا ظہور نبی اور ولی کے اختیار میں ہوتا ہے تو وہ سخت گمراہ ہے اور ایک درجہ کے شرک میں گرفتار ہے، عیسائیوں کی گمراہیوں کی بنیاد یہی تھی کہ انہوں نے عیسیٰ کے معجزوں کو ان کا اپنا فعل اور ان کی روحانیت کا کرشمہ سمجھا۔ قرآن مجید نے ان کے

معجزوں کی تصدیق کی لیکن بتایا کہ ان میں سے ہر معجزہ باذن اللہ تھا۔

آگے اس سلسلۂ کلام پاک میں فرمایا گیا ہے:

"وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ قَالُوْا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ۔"

یعنی اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے اپنے انعامات کی یاددہانی کے سلسلہ میں یہ بھی فرمائے گا کہ میرے اس فضل واحسان کو بھی یاد کرو کہ میں نے حواریین کے دل میں یہ بات ڈالی اور اس کی توفیق دی کہ وہ تم پر ایمان لائیں۔ چنانچہ میری ہی اس توفیق کے نتیجہ میں وہ تم پر ایمان لائے، اور انھوں نے کہا۔ "اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ" (خداوندا ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم نے اسلام یعنی تیری فرمانبرداری کے طریقہ کو اپنا مذہب ومسلک بنالیا۔)

حواریانِ عیسیٰؑ کا دین ومذہب

عیسائیوں نے جس طرح حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں غلو کیا اور ان کو خدا، خدا کا بیٹا، اور خدا کا شریک "ثَالِثُ ثَلٰثَة" ٹھہرایا۔ اسی طرح انھوں نے حضرت عیسیٰ کے حواریوں کے بارے میں بھی سخت غلو اور افترا کیا اور اپنے مشرکانہ عقائد وخیالات کو انہی کی طرف منسوب کیا۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قیامت میں عیسائیوں کی اس افترا پردازی کا پردہ چاک کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ برسرِ محشر حضرت عیسیٰ سے فرمائے گا کہ حواری جو تم پر ایمان لائے تو یہ بھی تمہارا کارنامہ اور تمہارے کسی روحانی تصرف کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ میں نے ان کے دل میں ڈالا تھا کہ وہ ایمان لائیں چنانچہ وہ ایمان لائے اور انھوں نے خدا کو گواہ بنا کے کہا تھا کہ اے اللہ گواہ رہ کہ ہم تیرے مسلم بندے ہیں۔ (وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ) اس میں یہ بھی واضح کردیا گیا کہ حواریوں کا دین اسلام تھا۔ وہی اسلام جس کی دعوت اللہ کے سارے پیغمبروں نے دی۔ حضرت عیسیٰ بھی اسی کے داعی تھے، انھوں نے حواریوں کو اسی کی دعوت دی تھی اور اللہ کی توفیق سے حواریوں نے اسے قبول کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا تھا "وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ۔"

غیر نبی کی طرف وحی کا مطلب

یہاں ایک یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں حواریوں کی طرف اللہ کے وحی

کرنے کا جو ذکر ہے (وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ) تو اس سے وہ اصطلاحی وحی مراد نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیوں کی طرف ہوتی ہے بلکہ یہاں یہ لفظ عام لغوی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے اور اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی۔

قرآن پاک میں حضرت موسیٰ کی والدہ کے بارے میں بھی یہ لفظ ان ہی معنوں میں کئی جگہ استعمال فرمایا گیا ہے "وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی" (ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ اپنے نومولود بچہ کو اس طرح دریا میں ڈال دے) بلکہ ایک جگہ قرآن مجید میں یہی لفظ شہد کی مکھی کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ "وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ۔" یعنی شہد کی مکھی جس طرح اور جس ہنرمندی سے پھولوں سے شہد چوستی ہے اور پھر جس طرح چھتہ بنا کر اس میں شہد محفوظ کرتی ہے اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اسکی سمجھ شہد کی مکھی کو اللہ تعالیٰ نے دی ہے (وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ) بہرحال حواریوں کی طرف وحی کرنے کا اس آیت میں جو ذکر فرمایا گیا ہے اس کا مطلب اتنا ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی ایمانی دعوت کو قبول کریں اور اسی نے ان کو اس کی توفیق دی۔

اس کے بعد وہ آیت ہے جس میں ذکر ہے کہ ان حواریوں نے حضرت عیسیٰ سے درخواست کی کہ وہ اپنے رب سے "مائدہ" (یعنی عالم غیب کے کھانوں کا خوان) نازل کرنے کی استدعا کریں۔

اس آیت کے چند اہم نکات

اس میں چند باتیں خاص طور سے قابلِ لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ ان حواریوں نے یہ درخواست پیش کرتے ہوئے حضرت مسیحؑ کو "یَاعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ" ہی کے لفظوں سے مخاطب کیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ بزرگ حواری جو حضرت عیسیٰ کے براہ راست شاگرد اور خلفاء اور عیسائی امت کے سابقین اولین اور حضرت مسیحؑ کے بعد پہلے مرشد و معلم تھے۔ وہ ان کو ابن اللہ نہیں بلکہ ابن مریم ہی جانتے اور کہتے تھے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ان کا عقیدہ تھا کہ خود حضرت عیسیٰؑ میں یہ قدرت اور طاقت نہیں ہے کہ وہ آسمان سے "مائدہ" اتار سکیں۔ بلکہ ان کا مقام و منصب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو ان کا رب ہے اس کی دعا کریں۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں:

اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّکَ اَنْ یُّنَزِّلَ

عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ۔

(اور اس واقعہ کو بھی یاد کرو جب حواریوں نے کہا تھا کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا تمہارا رب یہ کر سکتا ہے کہ ہمارے واسطے آسمان سے کھانے کا خوان نازل کر دے)

یہاں ''یَسْتَطِیْعُ'' کا لفظ جس کا میں نے ترجمہ کیا کہ ''کر سکتا ہے'' قدرت کے لحاظ سے نہیں استعمال کیا گیا ہے کیونکہ کسی ادنیٰ درجہ کے مومن کو بھی اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ آسمان سے ''مائدہ'' نازل فرما دے، ہاں کوئی بندہ بطور خود یہ نہیں جان سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا فیصلہ اس کے بارے میں کیا ہوگا۔ بہر حال اس آیت میں ''یَسْتَطِیْعُ'' قدرت کے لحاظ سے نہیں، بلکہ حکمت اور مصلحت کے لحاظ سے استعمال فرمایا گیا ہے اور اس کو بالکل اس طرح سمجھنا چاہئے جس طرح میں آپ میں سے کسی سے کہوں کہ کیا آپ میرے فلاں کام کے لئے اس وقت بازار جا سکتے ہیں۔تو جس طرح اس کہنے سے میرا مطلب یہ ہوگا کہ کیا آپ اس وقت بازار جانا مناسب سمجھیں گے۔اسی طرح اس آیت میں ''هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ'' کا مطلب یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ ہمارے لئے مائدہ نازل کرنا بہتر سمجھے گا۔حواریوں کی اس گزارش کا مقصد یہی تھا کہ اگر یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی مقررہ سنت کے خلاف نہ ہو تو آپ اللہ تعالیٰ سے اس کی استدعا کیجئے۔

حضرت عیسیٰؑ نے حواریوں کی اس درخواست کو ناپسند کیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح کی خارق عادت چیزوں کے لئے استدعا کرنا اور وہ بھی کھانے پینے کی چیزوں کے لئے مومنین صادقین کے لئے زیبا نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا۔

''اِتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ'' (اگر تم ایمان لا چکے ہو تو خدا سے ڈرو اور ایسی بات نہ کرو جس سے یہ شبہ ہو کہ تم میری مقبولیت اور خدا کے فضل و کرم کا امتحان کرنا چاہتے ہو)

حواریوں نے عرض کیا۔

'' نُرِیْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَیْهَا مِنَ الشّٰهِدِیْنَ''۔

مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ آپ کی مقبولیت کا یا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا امتحان کریں۔ ہم تو ایمان لا چکے، اس استدعا سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ عالم غیب کا وہ مقدس نورانی کھانا کھائیں جو اس دنیا کی آلائشوں سے بالکل ہی پاک صاف ہو اور ہمیں اس

کے انوار و برکات نصیب ہوں اور اس معجزہ کے مشاہدہ سے ہمیں مزید اطمینان قلب نصیب ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور دعاؤں کی قبولیت کے بارے میں آپ جو کچھ فرمایا کرتے ہیں، ہم ایک دفعہ اپنی آنکھوں سے بھی اس کا ظہور دیکھ لیں اور جب دین کی دعوت و منادی کے لئے لوگوں کے پاس جائیں تو ذاتی مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر ہم لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے اس خارق عادت انعام اور معجزہ کی شہادت دے سکیں۔

اس آیت میں حواریوں نے جو یہ کہا کہ ہم نزول مائدہ کی استدعا اس واسطے کر رہے ہیں کہ ہمیں مزید اطمینان قلب حاصل ہو، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ مجھے میری آنکھوں سے دکھادے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرے گا۔ (رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ) اور پھر جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا "أَوَلَمْ تُؤْمِنْ" کیا اس پر ایمان و یقین نہیں ہے تو ابراہیمؑ نے عرض کیا تھا "بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي" (ایمان تو ہے لیکن اطمینان قلب کیلئے اسکا منظر آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں)۔ ایمان کے بعد اطمینان قلب کی حقیقت کو آپ اس مثال سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک صالح اور متقی باپ اپنے محبوب اور صالح اکلوتے بیٹے کو اپنے آخری وقت میں بتائے کہ دیکھو میں نے اور تمہاری ماں نے گھر میں فلاں جگہ تمہارے لئے ایک بڑی رقم دفن کردی ہے۔ جب ضرورت ہو اسے نکال کے لے آنا۔ پھر یہی بات بیٹے کو راز داری کے ساتھ ماں بھی بتائے تو ظاہر ہے کہ اسے ماں باپ کی اس اطلاع میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوگا اور وہ اس کو یقین کے ساتھ صحیح سمجھے گا، لیکن اس کے بعد اگر وہ جگہ کھود کر اس دفن شدہ رقم کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لے تو یقیناً اسے مزید اطمینان حاصل ہوگا۔ تو حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ سے جو یہ عرض کیا تھا کہ "وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا" تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کی دعا سے ہمارے لئے آسمان سے مائدہ نازل فرمادے تو ایمان کے بعد ہمیں مزید اطمینان قلبی حاصل ہو جائے گا۔

حواریوں کے یہ عرض کرنے پر حضرت عیسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ۔

یعنی اے میرے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے "مائدہ" یعنی کھانے کا خوان نازل فرما جو ہمارے اولین و آخرین کے لئے سامان جشن و مسرت اور تیرا ایک یادگار

انعام ہواور تیری طرف سے ایک نشانی ہواور تو ہم کو اپنے اس خاص رزق سے نواز۔ تو خیر الرازقین ہے۔ آگے قرآن مجید میں ہے۔

"قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْ أُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِيْنَ۔"

یعنی اللہ تعالیٰ نے عیسیٰؑ کی استدعا کے جواب میں فرمایا کہ تمہاری استدعا کے مطابق میں مائدہ نازل تو کر دوں گا لیکن اس کے بعد جو لوگ تم میں سے کفر کریں گے، تو میں ان کو وہ سخت ترین عذاب دوں گا جو دنیا میں کسی اور کو نہ دیا جائے گا۔

مائدہ نازل ہوا یا نہیں؟

اللہ تعالیٰ کے اس پُر جلال جواب سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ استدعا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں تھی۔ آگے قرآن پاک میں اس کا کوئی ذکر بلکہ اشارہ بھی نہیں ہے کہ وہ مائدہ نازل کیا گیا یا اللہ تعالیٰ کے اس جواب کے بعد حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں نے اپنی درخواست خود واپس لے لی۔ کسی صحیح حدیث سے بھی یہ بات معلوم نہیں ہوتی۔ اکثر مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ "مائدہ" نازل نہیں ہوا تھا۔ اور غیر مستند قسم کی روایتوں میں اس کی تفصیلات بھی ہیں۔ تابعین میں سے حضرت حسن بصری اور مجاہد سے سند کے ساتھ نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس جواب کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے اپنی استدعا واپس لے لی اس لئے مائدہ نازل ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مفسر ابن کثیرؒ نے بھی اسی کو راجح سمجھا ہے اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ انجیلوں میں اور مسیحی روایات میں اس مائدہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر آسمان سے یہ مائدہ نازل ہوا ہوتا تو انجیلوں میں اور مسیحی روایات میں اس کا ذکر ضرور ہوتا بلکہ مبالغوں کے ساتھ ہوتا۔ بہر حال مائدہ کے نزول یا عدم نزول کے بارے میں یقین اور وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

یہاں تک یہ بیان ہوا ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ عیسیٰؑ کو اپنے یہ انعامات واحسانات یاد دلائے گا۔ یہ سب دراصل اس پُر جلال سوال کی تمہید ہوگی جو اس دن برسرِ محشر حضرت عیسیٰؑ سے ان کے امتیوں کی گمراہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا اور اس کے جواب میں حضرت عیسیٰؑ اپنے امتیوں کے مشرکانہ عقائد واعمال سے اپنی بیزاری ظاہر فرمائیں گے اور کہیں گے کہ میں نے تو انھیں توحید ہی کی تعلیم دی تھی، یہ اپنی گمراہی کے خود ہی ذمہ دار ہیں، آگے کی آیتوں میں یہی بیان فرمایا گیا ہے اور اس کا انداز بڑا غیر معمولی ہے۔

(درس-۷)

عیسائی اُمت کی گمراہیوں کے بارے میں

سرِ محشر حضرت عیسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ کا پرجلال سوال اور اُن کا جواب

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم- بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ- قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُونُ لِيَ أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ- إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَآ أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ- إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَآ أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ، وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ، فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ۝ إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ، وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۝ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِينَ صِدْقُهُمْ- لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا- رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ- ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۝ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۝ (المائدہ- ع ۱۶- آیات ۱۱۶- ۱۲۰)

(ترجمہ) اور اس وقت کا تصور کرو جب اللہ (اپنے پیغمبر مسیحؑ سے) پوچھے گا کہ اے مریم کے فرزند عیسیٰ کیا تو نے (اپنی امت کے) ان لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی معبود بنالینا، تو وہ (جواب میں) عرض کریں گے تو پاک ہے، میرے لیے سزاوار نہ تھا کہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہ تھا، اگر میں نے کہا ہوتا تو تیرے علم میں ہوتا، تجھے میرے دل کی باتوں کا بھی علم ہے اور مجھے تیرے رازوں کی بالکل خبر نہیں، بے شک تو ہی علام الغیوب ہے۔ میں نے تو ان سے صرف وہی کہا تھا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ ہی کی عبادت اور پرستش کرو جو میرا تمہارا اور سب کا پروردگار ہے، اور میں ان کا نگراں تھا جب تک میں ان کے اندر رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھالیا تو تو ہی ان کو دیکھنے والا تھا اور تو ہر چیز پر گواہ اور پوری طرح واقف حال ہے، اگر تو ان کو عذاب دینے کا فیصلہ کرے تو یہ تیرے بندے ہیں (اور تیرا فیصلہ بر حق ہوگا) اور اگر تو ان کی معافی اور درگزر کا فیصلہ کرے تو سب کچھ تیرے اختیار میں ہے اور تو حکیم بھی ہے (اس لیے تیرا فیصلہ حکیمانہ ہی ہوگا اور کوئی اسے چیلنج نہ کر سکے گا) اللہ تعالیٰ فرمائے گا آج وہ دن ہے کہ راست باز بندوں کو ان کی راست بازی نفع پہنچائے گی (اور وہ اس کا پھل پائیں گے) ان کے لیے بہشتی باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔ یہ ہے عظیم کامیابی۔ آسمان وزمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کی بادشاہی اور فرماں روائی اللہ ہی کے لئے ہے۔ اور ہر چیز اس کی قدرت کے تحت ہے۔

تفسیر وتشریح

یہ سورہ مائدہ کی بالکل آخری آیتیں ہیں، انہی پر سورہ ختم ہے، اوپر کی آیتوں میں بتایا گیا تھا کہ قیامت کے دن سر محشر اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ کو پہلے اپنے انعامات یاد دلائے گا کہ میں نے تم کو روح القدس کی تائید سے نوازا اور تمہارے ہاتھ پر فلاں فلاں غیر معمولی قسم کے معجزے ظاہر کیے اور حواریوں کو تم پر ایمان لانے کی توفیق دی اور ان کو تمہارا پیروکار اور تمہاری دعوت کا علمبردار بنادیا، یہ سب میرے حکم اور میری قدرت سے ہوا، تمہارے کسی ذاتی کمال کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ پُر جلال سوال حضرت عیسیٰ سے کیا

جائے گا جس کی تمہید کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں یاد دلائی تھیں۔ ان آیتوں میں اسی سوال اور اس کے جواب کا ذکر فرمایا گیا ہے، ارشاد ہوا ہے۔

"وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَاُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ"۔

اس وقت کا تصور کرو جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے برسر محشر پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا تو نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی اور بتایا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو بھی اللہ کے سوا معبود بنا لینا اور ہماری بھی پرستش کرنا؟ حضرت عیسیٰ اپنے امتیوں کے مشرکانہ طرز عمل سے اپنی برأت اور بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے عرض کریں گے، اور خود خداوند علام الغیوب کو گواہ بنا کر عرض کریں گے۔

"سُبْحَانَكَ مَا يَكُوْنُ لِىْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِىْ بِحَقٍّ، اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ، تَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِىْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِكَ، اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ، مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِىْ بِهٖ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ، وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ"۔

یہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں حضرت عیسیٰؑ کا جواب ہے، وہ عرض کریں گے۔ خداوندا تیری عالی ذات ہر قسم کے شرک اور شریکوں سے پاک ہے۔ میرے لیے قطعاً سزاوار اور ممکن نہیں تھا کہ ایسی بات اپنے منہ سے نکالوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ خداوندا اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو ضرور تیرے علم میں ہوتی۔ تجھے تو میرے دل کی باتوں اور ارادوں کی بھی خبر ہے۔ تو علام الغیوب ہے۔ تو جانتا ہے کہ میرے دل میں کبھی اس کا وسوسہ بھی نہیں آیا۔ اس کے برعکس میں نے لوگوں سے وہی کہا اور ان کو وہی بتایا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا اور وہ یہ کہ صرف اس اللہ کی پرستش کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ اور خداوندا میں جب تک ان کے درمیان تھا ان کے حالات سے باخبر تھا اور ان کی نگرانی کرتا تھا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان کو دیکھنے والا اور ان کا نگراں تھا۔ مطلب یہ ہے کہ خداوندا تو جانتا ہے کہ ان لوگوں نے جو مشرکانہ عقیدے میرے اور میری ماں کے بارے میں اختیار کیے وہ

اس زمانے میں کیے جب میں ان کے درمیان نہیں تھا اور تو نے مجھے ان کے پاس سے اٹھالیا تھا، یہ سب کچھ تیری نگاہ کے سامنے ہے اور تجھ سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے۔

اس جوابی گزارش کے آخر میں حضرت عیسیٰؑ ان عیسائیوں کے بارے میں جنہوں نے ان کو اور ان کی والدہ حضرت مریم کو معبود بنایا تھا یہ بھی عرض کریں گے۔

''إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ''۔

خداوندا اگر تو ان کو عذاب دینے کا فیصلہ فرمائے اور جہنم میں ڈالے تو یہ تیرے بندے ہیں اور انہوں نے شرک کا جرم کیا ہے اس لیے ان کے حق میں عذاب کا تیرا فیصلہ بالکل برحق ہوگا۔ اور اگر تو ان کی معافی کا فیصلہ فرمائے تو چونکہ اقتدار اعلیٰ تیرا ہی ہے اور تو حکیم بھی ہے اس لیے تیرے اس فیصلہ کے سامنے بھی کوئی دم نہ مار سکے گا اور کوئی اس کو چیلنج نہ کر سکے گا۔

ایک باریک نکتہ

یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے۔ سرسری نظر میں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ ''إِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ'' کے بعد ''إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ'' کی جگہ ''إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ'' ہوتا۔ لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں ''إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ'' ہی ٹھیک ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ اگر اللہ کے حضور میں یہ عرض کرتے کہ ''إِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ'' تو اس میں سفارش کے معنی پیدا ہو جاتے اور مشرکین کے حق میں مغفرت کی سفارش کی گنجائش قطعاً نہیں ہے۔ اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سفارش کے شبہ سے بھی دامن بچاتے ہوئے عرض کریں گے ''وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔''

یہ آیت بڑی عظیم القدر ہے۔ حدیث کی کتابوں میں یہ واقعہ مروی ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ پوری رات کی نماز میں یہی ایک آیت پڑھتے رہے ''إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ'' اس وقت آپ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ یہاں تک کہ رکوع اور سجدے میں بھی اس رات آپ یہی آیت

پڑھتے رہے۔(۱) "إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ"۔

رُوح پرور ارشادات

یہاں تک حضرت عیسیٰؑ کا جواب ہوا۔آ گے ارشاد ہے:

"قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ"۔

اللہ تعالیٰ فرمائے گا آج وہ دن ہے کہ ہمارے سچے بندوں کو جنہوں نے سچائی اور راست بازی کے ساتھ زندگی گزاری، جو کہا وہ کر دکھایا، تو ان صادقین کو ان کی سچائی اور راست بازی آج پورا نفع پہنچائے گی۔ وہ اس کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ انھیں وہ بہشتی باغات عطا ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن کی وجہ سے وہ سدا شاداب اور پُر بہار رہیں گے۔ "خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا" وہ ہمیشہ ہمیشہ ان بہشتی باغوں میں رہیں گے۔ "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ" اور سب سے بڑی دولت ان کو یہ حاصل ہوگی کہ ان کا مالک و مولیٰ اور ان کا محبوب حقیقی ان سے راضی وخوش ہوگا کیونکہ انہوں نے بندگی کا حق ادا کر دیا اور وہ اس سے راضی وخوش ہوں گے کیونکہ وہ ان کو اس دن بھرپور نعمتوں سے نوازے گا اور ان کے دل کی ہر چاہت پوری کرے گا۔ آگے فرمایا گیا ہے۔ "ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ" بندوں کے لیے یہ عظیم ترین کامیابی ہے کہ ان کو جنت اور رضائے الٰہی نصیب ہو اور وہ اپنے مالک کی عنایات سے راضی اور خوش ہوں۔

اس آیت کا تعلق حضرت عیسیٰؑ ہی سے نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک عمومی اعلان اور منشور عام کی ہے، اس میں ان سب بندوں کے لیے بڑی روح پرور بشارت ہے جو اللہ کے ساتھ اپنے معاملہ میں سچے ہوں۔ ایسے ہی بندوں کے لیے دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ" (یعنی وہ لوگ جنھوں نے اس عہد کو

(۱) تفسیر ابن کثیر بحوالہ مسند احمد بروایت ابوذر غفاریؓ۔ اس حدیث سے مزید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کا مسئلہ یاد دلا دیا اور اس سے یہ کیفیت آپ پر طاری ہوئی۔ (مرتب)

پورا کیا اور سچ کر دکھایا جو انھوں نے اللہ سے کیا تھا) قرآن پاک میں جابجا ایسے صداقت شعار اور وفادار بندوں کے لیے جنت اور رضائے الٰہی کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ اور مائدہ کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حق میں یہ اعلان فرمائے گا، اس وقت ان بندوں کو جو خوشی حاصل ہوگی وہ بجائے خود بہت بڑی نعمت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے۔

اس کے بعد سورت کی بالکل آخری آیت ہے۔

"لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔"

یعنی زمین و آسمان اور جو کچھ زمین و آسمان میں ہے یعنی ساری کائنات اس سب پر اللہ کی اور صرف اللہ کی حکومت اور فرماں روائی ہے اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے اور جب اس کی یہ شان ہے تو بندوں کو اسی کی عبادت اور اسی کی فرماں برداری و اطاعت کرنی چاہیے اور اسی کی رضا جوئی کو اپنا نصب العین بنانا چاہیے۔

کیا اِن آیتوں میں وفاتِ مسیح کا ثبوت ہے؟

سورۂ مائدہ کی جو آخری آیتیں آج تلاوت کی گئی تھیں، ان کے ترجمہ اور مطلب کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کرنا تھا وہ عرض کیا جا چکا۔ ان ہی آیتوں سے متعلق ایک بات اور قابل ذکر ہے۔

سورۂ آلِ عمران میں اور پھر سورۂ نساء میں یہ واقعہ کسی قدر تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جو اسرائیلی سلسلہ کے آخری پیغمبر تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انھیں منصب نبوت سے سرفراز فرمایا اور ان کے ہاتھ پر بڑے بڑے معجزے ظاہر فرمائے تو ان کی قوم کے لوگوں نے یعنی یہودیوں نے پہلے تو ان کی تکذیب کی اور ان کو جھوٹا مدعی نبوت ٹھہرایا اور جادوگر بتایا اور طرح طرح سے ان کو ستایا اس کے بعد ان کے خلاف حکام کے کان بھرے۔ اور اس کی کوشش کی کہ حکومت ان کو گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دے۔ مروجہ انجیلوں میں بھی یہ واقعہ خاصی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کے آگے انجیل کا بیان اور قرآن کا بیان مختلف ہے۔ انجیل کا بیان ہے کہ یہودیوں کا یہ ناپاک منصوبہ کامیاب ہوگیا اور حضرت عیسیٰؑ پکڑ کے

سولی پر چڑھادیے گئے۔ خود یہودی بھی اسی کے مدعی ہیں۔ قرآن مجید میں یہودیوں ہی کی زبان سے نقل کیا گیا ہے۔ "إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ" (یعنی ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح کو قتل کروادیا اور اسے سولی دلوادی) لیکن قرآن پاک کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہودیوں کے اس ناپاک منصوبہ کو خاک میں ملا دیا اور عیسیٰ جس طرح عجیب وغریب معجزانہ طریقہ سے بن باپ کے نفخۂ ملکی سے پیدا کیے گئے تھے اور جس طرح انتہائی غیر معمولی قسم کے بہت سے معجزے اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں پہ ظاہر کیے تھے ایسے ہی معجزانہ طریقے سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ٹھیک اس وقت اٹھالیا جب یہودی اور حکومت کے سپاہی ان کو گرفتار کرنے کے لیے پہنچے، اُن سپاہیوں نے ان کی جگہ ایک دوسرے آدمی کو جوان کی شکل وصورت کا تھا، عیسیٰ مسیح سمجھ کر پکڑ لیا اور وہی سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اور یہ دراصل وہ جاسوس تھا جس نے عیسیٰ علیہ السلام سے غداری کی تھی اور رشوت لے کر ان کے دشمنوں سے سازش کر لی تھی۔ اسی کو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ۔"

بہر حال قرآن مجید کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بحفاظت اٹھالیا اور دشمنوں کے ناپاک ہاتھ ان کو چھو بھی نہ سکے۔

سورۂ نساء میں جہاں اس واقعہ کا ذکر آیا تھا، آپ حضرات کو یاد ہوگا وہاں میں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ اس بارہ میں عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری برناباس کی انجیل (۱) کا بیان بالکل قرآن مجید کے بیان اور امت محمدیہ کے عقیدہ کے مطابق ہے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے اور ایک پیشین گوئی کے طور پر احادیث میں اطلاع دی گئی ہے کہ عیسیٰؑ قیامت کے قریب پھر اس دنیا میں اتارے

---

(۱) انجیل دراصل ان چھوٹے چھوٹے رسالوں کا نام ہے جن میں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور کچھ حالاتِ زندگی اور کچھ ملفوظات ومواعظ جمع کیے گئے ہیں۔ ان کو مختلف حواریوں اور ان کے شاگردوں نے جمع کیا تھا۔ ان میں سے چار معروف اور عیسائیوں میں عام طور سے مقبول اور مروج ہیں۔ انجیل یوحنا، انجیل مرقس، انجیل متی، انجیل لوقا۔ لیکن اس کے علاوہ اور بھی اس طرح کے بہت سے مجموعے تھے، جن میں سے بعض بالکل ناپید ہیں، اور بعض کے نسخے موجود ہیں، اگرچہ وہ عیسائیوں میں مروج نہیں۔ انہیں میں انجیل برناباس بھی ہے۔ اس کے بیانات قرآن مجید کے بیانات سے کافی مطابقت رکھتے ہیں، غالباً اسی لئے تثلیث پرست عیسائیوں میں یہ مقبول نہیں ہے (نعمانی)

جائیں گے اور اس وقت آپ خاتم النبیین ﷺ کے ایک جلیل القدر نائب کے طور پر کام کریں گے......اس مضمون کی حدیثیں تواتر کی حد کو پہنچی ہوئی ہیں۔ ہمارے استاد حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ نے اس سلسلہ کی حدیثوں کو حدیث کے پورے ذخیرہ سے نکال کر ایک مستقل رسالہ میں جمع کرایا تھا جو عربی زبان میں "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" کے نام سے چھپ بھی چکا ہے۔ ان سب حدیثوں کے سامنے آجانے کے بعد قرب قیامت میں حضرت عیسیٰؑ کے نزول کا عقیدہ قریب قریب اتنا ہی یقینی اور ناقابل شک ہو جاتا ہے جس طرح خود قیامت کے آنے کا عقیدہ۔ اسی لئے امت میں ہمیشہ سے اس عقیدہ پر اجماع رہا ہے۔ لیکن ہمارے اس زمانہ میں جس طرح اور بہت سے مسلمہ اجماعی عقائد میں دشمنان اسلام مستشرقین کی دسیسہ کاریوں سے تشکیک پیدا کی گئی ہے اور آوارہ مزاج قسم کے لوگ بطور فیشن کے ایسی باتیں کرتے ہیں، اسی طرح نزولِ مسیح کے اس متواتر اجماعی عقیدہ کے بارے میں بھی وساوس پیدا کئے گئے ہیں۔ اور مرزا غلام احمد قادیانی نے چونکہ اپنے سارے دعووں کی بنیاد اسی پر رکھی ہے، کہ میں ہی وہ "مسیح" ہوں جس کے آخری زمانے میں آنے کی خبر دی گئی ہے اور اسرائیلی مسیح (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) تو قریباً دو ہزار برس پہلے انتقال فرما کر زمین میں دفن بھی ہو چکے ہیں۔ اس لئے خود انہوں نے اور ان کے پیروکاروں نے قرآنِ مجید سے بھی عیسیٰ علیہ السلام کے انتقال فرما جانے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لئے انھوں نے قرآن مجید کی جن آیتوں کو تختۂ مشق بنایا ہے ان میں سے ایک آیت یہ بھی ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کے ضمن میں سورۂ مائدہ کی ان آخری آیتوں میں ہے۔

"وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ۔"

(یعنی عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کریں گے کہ میں جب تک ان لوگوں میں رہا ان کے حالات سے باخبر اور ان پر گواہ تھا، پھر جب تو نے مجھے لے لیا تو تو ہی ان کا دیکھنے والا تھا)

قادیانی صاحبان کہتے ہیں کہ ہر معمولی پڑھا لکھا بھی جانتا ہے کہ وفات کے معنی موت آجانے اور مر جانے کے ہیں، اس لئے "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي" کا مطلب یہ ہوا کہ جب تو

نے مجھے وفات دے دی، یعنی جب تیرے حکم سے مجھے موت آ گئی۔ اس سے ثابت ہوا کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح عیسیٰ علیہ السلام بھی وفات پا چکے ہیں۔

پُر فریب قادیانی منطق

بظاہر قادیانیوں کی یہ بات ایسی سیدھی سی ہے کہ بہت سے سادہ دل اس سے دھوکا کھا سکتے ہیں، لیکن فی الحقیقت دھوکا اور فریب ہے، اسی لئے اس موقع پر میں نے ہی بحث چھیڑ کر اس بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری سمجھا۔

اس سلسلہ کی علمی اور تحقیقی بحثیں تو کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں، علماء نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے، ہمارے استاذ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف ہے "عقیدة الاسلام فی حیاة عیسیٰ علیه السلام" پھر اس کا گویا ایک تکملہ ہے اس کا نام ہے "تحیة الاسلام" یہ دونوں عربی زبان میں ہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ ان میں لکھا گیا ہے وہ تحقیق کے لحاظ سے حرف آخر ہے۔ میں تو اس وقت آپ حضرات کے سامنے بالکل عام فہم قسم کی ایک دو باتیں کہنا کافی سمجھتا ہوں۔

وفات کی کامل ترین صورت

پہلی بات یہ ہے کہ یہ کہنا کہ "تَوَفِّی" کے معنی موت ہی کے ہیں، سراسر دھوکا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تَوَفِّی کے معنٰی میں وسعت ہے اور وہ موت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ انتقال اور وصال کا لفظ موت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ انتقال اور وصال کے معنی موت ہی کے ہیں۔

تَوَفِّی کے اصل معنیٰ ہیں کسی چیز کو پوری طرح لے لینا (۱) چونکہ موت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح کو لے لیا جاتا ہے اس لئے اس پر بھی توفی کا لفظ بولا جاتا ہے، اور نیند میں بھی چونکہ شعور واحساس اور بیداری والی کیفیت انسان سے لے لی جاتی ہے اس لئے اس کو بھی توفی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک کی ایک آیت میں موت اور نیند دونوں کے لئے توفی

(۱) کلیات ابوالبقا میں "التوفی الاماتة وقبض الروح علیه استعمال العامة أو الاستیفاء وأخذ الحق وعلیه استعمال البلغاء" ۱۲ (نعمانی)

کا لفظ ایک ساتھ استعمال ہوا ہے، فرمایا گیا ہے۔

أَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (۱)

اللہ تعالیٰ لے لیتا ہے نفسوں کو ان کے مرنے کے وقت اور جو نہیں مرے ان کو لے لیتا ہے ان کی نیند کے اوقات میں۔

اور ایک دوسری آیت میں صرف نیند کے لئے بھی توفی کا لفظ استعمال ہوا ہے، ارشاد ہے:

هُوَالَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَاجَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ۔ (۲)

وہ اللہ ہی ہے جو تمہیں (یعنی تمہارے شعور کو قبضہ میں لے لیتا ہے رات میں نیند کی حالت میں) اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم عمل کرتے ہو دن میں۔

بہر حال یہ کہنا کہ توفی ہمیشہ موت ہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یا خود کہنے والے کی جہالت ہے یا وہ جان بوجھ کر دھوکا دیتا ہے۔ ورنہ توفی کے اصل معنی جیسا کہ میں نے بتایا کسی چیز کو پوری طرح لے لینے کے ہیں، اس لئے عام طور سے جس طرح روحیں قبض کی جاتی ہیں اس کے لئے بھی توفی کا لفظ بولنا صحیح ہے اور نیند میں جس طرح شعور اور احساس لے لیا جاتا ہے اس کے لئے بھی توفی کے لفظ کا استعمال صحیح ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو روح و جسم دونوں کے ساتھ اس دنیا سے اٹھالے (جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہوا) تو اس کے لئے بھی توفی کا استعمال بالکل صحیح ہوگا، بلکہ یہی توفی کی کامل ترین صورت ہوگی، اور مائدہ کی اس آیت میں "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ" کے لفظ سے یہی آخری صورت مراد ہے، خود اسی آیت میں اس کا کھلا قرینہ یہ ہے "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ" کا لفظ "مَادُمْتُ فِيْهِمْ" کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے "مَاكُنْتَ حَيًّا" کے مقابلہ میں استعمال نہیں ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے حضور میں عرض کریں گے کہ خداوندا جب تک میں ان لوگوں کے درمیان تھا اس وقت تک تو میں ان کی دیکھ بھال کرتا اور ان کے حالات سے باخبر تھا، پھر جب تو نے مجھے ان میں سے لے لیا یعنی ان کے درمیان سے اٹھالیا تو پھر تو ہی ان کا دیکھنے والا تھا۔ اگر بالفرض یہاں توفی سے موت مراد ہوتی تو اس کے مقابلہ میں وہ لفظ ہوتا جو حیات اور زندگی کے معنی میں ہوتا، لیکن آیت

---

(۱) سورہ ز[illegible]

میں اس کے مقابلہ میں "مَا دُمْتُ فِيهِمْ" فرمایا گیا ہے یہ اس بات کا کھلا قرینہ ہے کہ یہاں توفی سے موت مراد نہیں ہے بلکہ وہ صورت مراد ہے جو "مَادُمْتُ فِيهِمْ" کے مقابل کی چیز ہے۔اس لئے یہاں "فلما توفيتنى" کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ "پھر جب تو نے مجھے اٹھالیا"۔

ایک اور اہم بات

اس کے علاوہ ایک اور عام فہم بات بتاتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا موت کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور خود سید الانبیاء ﷺ کی موت کی خبر دیتے ہوئے فرمایا ہے "إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ" لیکن سارے قرآن میں کہیں ایک جگہ بھی عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کی اطلاع موت کے لفظ سے نہیں دی گئی۔ حالانکہ جب اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ امت محمدیہ بھی ان کی حیات اور رفع الی السماء کے عقیدہ کو اختیار کرلے گی تو کسی دوسرے کی موت کی بات قرآن میں کہی گئی ہوتی یا نہ کہی گئی ہوتی، لیکن عیسیٰ علیہ السلام کی موت کی خبر موت ہی کے لفظ کے ساتھ ضرور سنائی گئی ہوتی، لیکن سارے قرآن میں ایک جگہ بھی عیسیٰ علیہ السلام پر موت واقع ہونے کا ذکر نہیں کیا گیا اور اس طرح موت کا لفظ (بصیغۂ ماضی) ان کے لئے استعمال ہی نہیں ہوا۔ (ہاں ایک دن ضرور ایسا آئے گا کہ اُن پر بھی موت وارد ہوگی۔ (مرتب) اگر کسی کے دل میں انصاف ہو تو یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر ابھی موت وارد ہی نہیں ہوئی، اسی لئے قرآن پاک میں کہیں ان کی موت کی اطلاع نہیں دی گئی، بلکہ "تَوَفِّی" اور "رفع" کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی حقیقت وہی ہے جو جمہور امت کا عقیدہ ہے اور وہی ان لفظوں کا صحیح مفہوم ہے۔

یہ اصولی بات بھی میں آپ سے بار بار کہہ چکا ہوں کہ قرآن مجید کا مطلب وہی صحیح اور قابل قبول ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے برابر سمجھا جارہا ہو، اگر آج کوئی شخص قرآن مجید کی کسی آیت کا وہ مطلب بیان کرے جو اس کے بالکل خلاف ہو جو اب تک سمجھا جاتا رہا ہے اور جس پر گویا امت کا اجماع رہا ہے تو وہ قابلِ رد ہے اور اس کے غلط اور باطل ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اجماعِ امت کے خلاف ہے۔ اگر یہ اصول نہ مانا جائے تو قرآن اور دین بازیچۂ اطفال بن کے رہ جائے گا۔

"سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ، وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔"

(درس-۸)

گزشتہ درس پر ایک استدراک

"وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ"

گزشتہ درس جس کا تعلق مائدہ کے آخری رکوع سے تھا۔ اس میں لفظ "فَلَمَّاتَوَفَّيْتَنِيْ" کی تفسیر وتوضیح کے سلسلہ میں مسئلہ حیات ومماتِ مسیح کا بھی تذکرہ آ گیا تھا اوراس کی تمہید میں سرسری طور پر یہودیوں کی ان کوششوں کا بھی ذکر آ گیا تھا جو حضرت مسیحؑ کو سزائے موت دلوانے اور سولی پر چڑھوانے کے لیے انھوں نے کی تھیں، جن کا ذکر انجیلوں میں کیا گیا ہے اور جن کے بارہ میں قرآن پاک کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کوششوں کو ناکام کر دیا، اور مسیح نہ قتل ہوئے، نہ صلیب پہ چڑھائے گئے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اٹھالیے گئے۔ اس کو ملاحظہ فرما کے جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی (۱) (جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے اس دور میں قرآن مجید کی بڑی خدمت لی ہے) نے ایک کرم نامہ کے ذریعہ توجہ دلائی کہ حضرت مسیحؑ کا یہ واقعہ زمانۂ تاریخ کا ہے اور ان کے اس مقدمہ پر جس کا ذکر انجیلوں میں کیا گیا ہے، مستقل کتابیں لکھی جا چکی ہیں، ان سے بہت سی ایسی تفصیلات معلوم ہو جاتی ہیں جن سے واقعہ کی نوعیت سمجھنے اور متعلقہ قرآنی آیات پر غور کرنے میں مدد ملتی ہے اور نئی راہیں کھلتی ہیں۔ پھر مولانا نے میری گزارش پر کچھ تفصیلی اشارات بھی قلم بند فرما کر بھیج دئے۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنی تفسیر کی دوسری جلد میں (جو اس وقت لکھنؤ ہی میں چھپ رہی ہے) سورۂ نساء کی آیت "وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" کے ذیل میں اس موضوع پر مفصل کلام کیا ہے۔ مولانا کے برادر زادہ جناب حکیم عبد القوی صاحبؒ کی عنایت سے اس کے دیکھنے کا بھی موقع مل گیا۔ میں نے زیادہ مناسب اور مفید سمجھا کہ اسی کو بجنسہٖ ناظرین الفرقان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

---

(۱) وفات ۱۹۷۶ء (مرتب)

لیکن اس سے پہلے حضرت مسیح کے اس واقعہ سے متعلق کچھ تاریخی حقائق و واقعات کو مرتب طور پر پیش کر دینا مناسب ہوگا۔ یہ گویا بحث کے تمہیدی مقدمات ہیں جو مولانا ہی کے محولۂ بالا مکتوب سے ماخوذ ہیں بلکہ زیادہ تر مولانا ہی کے الفاظ میں ہیں۔

(۱) حضرت مسیح فلسطین میں بقوم بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے، یہ قوم محکوم اور رعایا تھی، حاکم اعلیٰ رومی شہنشاہ تھا، اسی کا گورنر صوبہ فلسطین کا حاکم تھا، جس طرح انگریزی دور حکومت میں خود اپنے ملک میں ہندوستانی محکوم اور رعایا تھے اور حاکم انگلستانی تھے۔

(۲) حاکم اور محکوم قوموں میں مغائرت ہر طرح کی تھی۔ دینی، نسلی، لسانی، ثقافتی، معاشرتی وغیرہ نہ یہ اُن کی بولی سمجھتے تھے نہ وہ اِن کی۔ وضع و لباس وغیرہ سب مختلف، وہی انگریزوں اور عام ہندوستانیوں کا سا حال تھا۔

(۳) رومیوں کو ہر اسرائیلی یکساں نظر آتا تھا اور اسی طرح اسرائیلیوں کو ہر رومی، جیسے گوروں کو ہر کالا اور کالوں کو ہر گورا، ایک ہی سا نظر آتا ہے۔

(۴) یہود کی اپنی مذہبی عدالتیں قائم تھیں، مجرم اُن کے سامنے پیش ہوتے تھے، لیکن فوجداری قانون تمام تر حکومت کے ہاتھ میں تھا۔ پولیس، جیل، سولی گھر وغیرہ سب حکومت کے تھے۔ یہودی مذہبی عدالت کسی مجرم کے لیے اگر سزا کا فیصلہ کرتی تو اس کی توثیق اور عملدرآمد کے لیے ملکی حکومت کی عدالت میں اس کو پیش کیا جاتا اور سزا کا نفاذ وہیں سے ہوتا۔

(۵) رومی حکومت میں، جس کے ماتحت شام و فلسطین تھے، سزائے موت سولی ہی کے ذریعہ دی جاتی تھی، جس طرح ہمارے ملک میں پھانسی کے ذریعہ دی جاتی ہے۔

(۶) عدالت سے سولی گھر کا فاصلہ ڈھائی تین میل کا تھا، سولی کی شکل ریل کے سگنل سے مشابہ انگریزی حرف (T) کی ہوتی تھی، سولی کا لمبا والا استون (I) سولی گھر ہی میں گڑا رہتا تھا، لیکن عرض والی لکڑی (-) عدالت ہی میں رکھی رہتی تھی، اور دستور یہ تھا کہ خونی مجرم (جس کے لیے سزائے موت کا حکم ہوتا) وہ سولی کی عرض والی لکڑی خود اپنے پر لاد کر عدالت سے سولی گھر تک لے جاتا تھا اور دیکھنے والوں کے لیے یہ اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ اس آدمی کے لیے سزائے موت کا حکم ہو چکا ہے اور یہ

سولی دیے جانے کی لیے سولی گھر لے جایا جارہا ہے۔

(۷) حضرت مسیحؑ جوان ہونے کے باوجود بلے پتلے اور کمزور تھے۔

(۸) انجیلی روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ کمال حاصل تھا کہ اپنی شکل وہیئت بدل لیتے تھے، اور آپ کا یہ کمال بار بار دیکھنے میں آیا تھا، خواہ اس کو معجزہ وکرامت کہا جائے یا کچھ اور۔

(۹) آپ کا مقدمہ ملکی عدالت میں جمعہ کے دن پیش ہوا (انگریزی میں گڈ فرائی ڈے اسی کو کہتے ہیں) یہودیوں کا یوم السبت اسی شام سے شروع ہو جاتا تھا، اور اسی وقت سے سارے یہودی کاروبار بند ہو جاتے تھے۔

(۱۰) قتل کے لغوی معنی ہلاک کر دینے کے ہیں، خواہ کسی طریقہ سے ہو، ائمہ لغت اور اکابر مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ اسی عام معنی میں استعمال ہوا ہے (قتل کو دھار دار آلہ کے استعمال سے مخصوص کرنا فقہی اصطلاح اور اردو کا محاورہ ہے۔)

اسی طرح صَلب کے معنی صرف سولی پر چڑھا دینے کے ہیں، سولی کے ذریعہ ہلاک کر دینا اس کے اصل مفہوم میں داخل نہیں، ائمہ لغت نے اس کی بھی تصریح کی ہے۔

ان تمہیدی مقدمات کو ذہن میں رکھ کر اب تفسیر ماجدی کی وہ بحث پڑھیے جو مولانا دریابادی نے سورۂ نساء کی آیت ۱۵۷ (وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۔الآیۃ) کے ذیل میں سپرد قلم فرمائی ہے۔

اقتباس از تفسیر ماجدی (جدید) جلد دوم

''تاریخ کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سزائے موت اگر چہ رومی عدالت سے ملی اور وہی ملکی عدالت نفاذِ سزا پر قادر تھی۔ لیکن آپ کو سزا دلوانے میں اور آپ کے لیے سزائے موت سنوانے میں ہاتھ تمام تر یہود ہی کا کام کر رہا تھا۔ اسی لیے قرآن مجید نے بھی جو تاریخ کی دقیق حقیقتوں کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا، بالکل صحیح طور پر آپ کے قتل یا اقدام قتل کی ذمہ داری

یہود ہی پر رکھی۔ انجیلیں اتنے جزو پر متفق المعنی (بلکہ ایک حد تک، متفق اللفظ بھی) ہیں کہ رومی عدالت کا حاکم پیلاطیس آپ کو سزا دینا ہرگز نہیں چاہتا تھا، بلکہ اس سے برابر بچ رہا تھا۔ یہ یہودی تھے، جنھوں نے استغاثہ جھوٹا گڑھا، اور گواہیاں جھوٹی گڑھیں، اور بلوہ و فساد کی دھمکی دے دے کر عدالت کو سزائے موت سنانے پر مجبور کر دیا، انجیل متی کا ایک مختصر سا بیان ملاحظہ ہو:

(جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا بلکہ الٹا بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا کہ میں راست باز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے کہا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا تاکہ صلیب دی جائے")۔ (۲۷:۲۴۔۲۶)

اسی کی تائید دوسری انجیلیں بھی کرتی ہیں، بلکہ لوقا میں تو اتنی تصریح اور زائد ہے کہ حاکم نے ملزم کو سزائے موت سے بچانے کی تین تین بار کوشش کی، لیکن یہود نے ہر دفعہ ان کی بات کو رد کر دیا (۲۳:۲۲)۔ یہ بیانات تو مسیحیوں کے تھے۔ خود یہود کی لکھی ہوئی جو قدیم ترین تاریخ عہد مسیح و ماقبل و مابعد کی دنیائے معلوم میں موجود ہے یعنی یوزیفس کی اور جس کا ترجمہ انگریزی میں Antiquities of the jews کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں اس واقعہ کو فخر کے ساتھ اپنی ہی جانب منسوب کیا ہے (اور اس سے قرآن مجید کے اس بیان کی پوری پوری توثیق ہوتی ہے "وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ۔ الآیۃ"۔ (نعمانی)

انجیلوں میں جو پیشین گوئیاں حضرت مسیحؑ کی زبان سے اپنے ہلاک ہونے کی بابت منقول ہیں، ان میں بھی ساری ذمہ داری سرداران یہود کے سر ملتی ہے اور رومیوں یا حاکموں کا ذکر نہیں آتا:۔ "اس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ یروشلم کو جاؤں اور بزرگوں، سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے بہت سے دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں۔" (متی ۱۶:۲۱) "پھر وہ انھیں تعلیم دینے لگا کہ ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے اور بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہ اسے رد کر دیں اور وہ قتل کیا جائے (۱)۔" (مرقس ۸:۳۱) ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے اور بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہ اسے رد کر دیں اور وہ قتل کر دیا جائے۔" (لوقا ۹:۲۲)

---

(۱) یاد رہے کہ حضرت والا کی طرف منسوب الفاظ کہ "قتل کیا جائے" انجیل کے ہیں۔ ہرگز ضروری نہیں کہ فی الواقع یہ آپ کے الفاظ ہوں۔ (مرتب)

''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ''

حالانکہ نہ وہ آپ کا کام تمام کر سکے اور نہ آپ کو سولی ہی پر چڑھا پائے۔ یعنی حضرت عیسیٰ کا کام تمام کر دینا تو الگ رہا یہود تو واقعۃً اتنا بھی نہ کر سکے کہ آپ کو سولی پر چڑھا ہی دیتے، رومی حکومت میں جس کے ماتحت شام و فلسطین تھے، سزائے موت کا طریقہ سولی ہی کے ذریعہ تھا۔

''وَمَا صَلَبُوْهُ'' صلبوا کے اصل معنی محض سولی پر لٹکانے یا چڑھانے کے ہیں۔ چڑھا کر جان لے لینے کے نہیں۔

''هو تعليق الا نسان للقتل'' (راغب)

اُردو میں یہ مفہوم (تعلیق) ''سولی دینے'' سے نہیں ''سولی چڑھانے'' ہی سے ادا ہوتا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہؒ نے اپنے فارسی ترجمہ اور شاہ عبدالقادرؒ اور علامہ تھانویؒ نے اپنے اپنے اُردو ترجمہ میں اسی مفہوم کو ادا کیا ہے۔

''وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ'' بلکہ ان پر شبہ ڈال دیا گیا۔

یا وہ دھوکہ میں ڈال دیے گئے یا ''حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی'' یہ شبہے میں کون پڑ گئے یا حقیقت کن پر مشتبہ و ملتبس ہو گئی؟ ظاہر ہے کہ مراد وہی یہود یا اعدائے مسیح ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔

كانه قيل وقع عليهم الشبه (مدارک) التبس عليهم الامر (بیضاوی) یا یوں کہا جائے کہ شبہ انھیں مقتول سے متعلق ہوا اور وہ دھوکے میں اس کی شخصیت کے بارہ میں پڑ گئے۔

''شُبِّهَ لهم المقتول والمصلوب'' (جلالین)

بہر حال اس پر ہمارے سارے مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہود کو دھوکا ہوا اور وہ حضرت مسیح کے دھوکہ میں کسی اور کو سولی پر چڑھا گئے لیکن یہ شخص کون تھا اور دھوکے کی صورت کیا ہوئی، اس کا تصریحی جواب نہ قرآن میں ہے نہ کسی حدیث میں۔ اب سوا اس کے چارہ نہیں رہتا کہ تاریخ کے روشنی میں واقعہ کے جزئیات کو ایک ایک کر کے لایا جائے۔ اس وقت کے پس منظر کو سامنے لے آیا جائے اور جو صورت واقعہ نسبتہً زیادہ قرین قیاس اور مطابق مقتضائے حال معلوم ہو اسی کو ترجیحی طور پر اختیار کیا جائے۔

پہلی بات اس سلسلہ میں یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ یروشلم کے لوگوں سے

ملتے جلتے کم تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام خواص بھی آپ کو پوری طرح پہچانتے نہ تھے، چنانچہ جب آپ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس کے لئے اکابر یہود اور متعدد سپاہیوں کا ایک پورا گروہ مل کر بھی اس ضرورت کے لیے کافی نہ ہوا بلکہ آپ کی شناخت کے لیے آپ ہی کی مختصر سی پارٹی کے ایک منافق وغدار کو ساتھ لینا پڑا۔ یہ ایک خالص تاریخی حقیقت ہے، لیکن امام رازیؒ اس راز سے بھی واقف ہیں فرماتے ہیں۔ والناس ما کانوا یعرفون المسیح الا بالاسم فانہ کان قلیل المخالطة للناس۔ (کبیر)

متیؔ اور مرقسؔ دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتاری کرنے والی پارٹی میں سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے ایک "بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لیے ہوئے سپاہیوں کی شامل تھی اس پر بھی گرفتاری اور شناخت کیلیے انھیں یہوداہ منافق کا سہارا ڈھونڈنا پڑا اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب یہ پلٹن اور پیادے وہاں پہنچے تو یسوع نے ان سے پھر پوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو؟ وہ بولے یسوع ناصری کو۔ یسوع نے جواب دیا میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں ہی ہوں۔" (۱۸: ۳۔۸)

حضرت مسیحؑ کا تعظیمی تخیل تو بہت بعد کی پیداوار ہے۔ معاصر مخالفین ومعاندین کی نظر میں تو آپ کی حیثیت صرف یسوع ناصری نامی ایک بدنام اور غیر معروف مجرم کی تھی۔ وہ سامنے موجود تھا اور پھر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ حالانکہ سب آئے تھے اسی کی تلاش میں۔

دوسری بات اس سلسلہ میں یہ خیال رکھنے کی ہے کہ حضرتؑ کو، بہ الفاظ یہود یسوع ناصری کو، تبدیل ہیئت پر خاص قدرت تھی۔ انجیلوں میں حضرتؑ کی اسی قدرت کو بطور معجزہ کے بیان کیا گیا ہے۔ "چھ دن کے بعد یسوع نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور انھیں ایک اونچے پہاڑ پر الگ لے گیا اور ان کے سامنے اس کی صورت بدل گئی۔ اور اس کا چہرہ سورج کی مانند چمکا۔" (متی ۱۷: ۲۱) "جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرہ کی صورت بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہوگئی۔" (لوقا ۹: ۲۹۔ نیز مرقس ۹: ۲۔۳) یہ معجزہ تھا یا نہ تھا، یہ ایک الگ بحث ہے۔ بہر حال تبدیل ہیئت پر آپ کو نفس قدرت حاصل تھی۔

تیسرے اس تاریخی حقیقت کا استحضار ذہن میں کرلیا جائے کہ ملک (شام وفلسطین) کی عام آبادی اس وقت اسرائیلیوں (یہود) ہی کی تھی۔ اور اسی برادری کے ایک فرد آپ بھی تھے لیکن ملک پر حکومت رومیوں کی تھی، اور اعلیٰ عہدہ دار اور پولیس اور فوج رومیوں پر مشتمل تھی۔ اور یہ رومی نہ صرف مشرک یعنی دین وعقیدہ میں اسرائیلیوں سے مختلف تھی، بلکہ صورت شکل، وضع

ولباس، نسل وزبان، معیشت ومعاشرت وغیرہ میں بھی ان سے ایسے ہی الگ تھے جیسے کل تک ہندوستان کے حاکم انگریز ہندوستانیوں سے نمایاں طور پر مختلف ومتمایز تھے۔ اور جس طرح ہندوستانیوں کو سب گورے یکساں اور گوروں کو سب کالے یکساں معلوم ہوتے تھے، اسی طرح بدیسی حکمراں رومیوں کی نظر میں سارے یہود یا اسرائیلی بھی ایک ہی تھے۔

چوتھی کڑی اس سلسلہ کی یہ ملایئے کہ جس مقام پر رومی عدالت تھی، وہاں سے سرکاری سولی گھر فاصلے پر تھا اور سولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی چھاپہ کے بڑے حرف ٹی (T) کے مشابہ یا سگنل سے ملتی جلتی ہوتی تھی، وہ سولی گھر میں پوری گڑی ہوئی نہیں ہوتی تھی، صرف اس کا سیدھا اور کھڑا استون زمین میں گڑا ہوا رہتا تھا۔ باقی جو لکڑی اس کے اوپر آڑی پڑتی تھی، اس کے لیے قاعدہ یہ تھا کہ وہ مجرم کو عدالت سے اپنے اوپر لاد کر سولی گھر تک لانی پڑتی تھی۔

یہاں تک جو کچھ عرض ہوا اس پر ایک نظر دوبارہ کر کے امورِ ذیل کو بھی نظر کے سامنے لے آیئے۔

(۱) جب حکم سنایا گیا ہے جمعہ کا دن تھا اور دن آخر ہو رہا تھا اور یہود کو جلدی تھی کہ ہر طرح فراغت پا کر شاموں شام گھر واپس آ جائیں۔ جمعہ کی شام ہی سے ان کا یوم السبت شروع ہو جاتا تھا، اور یوم السبت کے حدود کے اندر مجرم کی سزا دہی وغیرہ بھی ممنوع تھی۔ اور پھر یہود کا اہم تہوار یعنی عید فسح بھی شروع ہو رہی تھی۔ غرض یہود کو اس کی بہت عجلت تھی کہ کسی طرح ان کا یہ مجرم جلد سے جلد سولی پا کر شام سے قبل ہی دفن ہو جائے۔

(۲) لاغر و ناتواں مجرم (یعنی خود حضرت مسیحؑ) کے لیے ممکن نہ تھا کہ اتنی وزنی لکڑی لاد کر اتنا فاصلہ یہود کی خاطر خواہ تیزی سے طے کر سکیں، خصوصاً جب یہودی بچے اور شریر قسم کے لوگ خود ہی قدم قدم پر انھیں چھیڑتے جاتے اور ان کا راستہ کھوٹا کرتے جاتے۔

اب اس صورت حال کو اس تفصیل کے ساتھ پیش نظر رکھ کر غور فرمایئے کہ رومی سپاہی جو مجرم، بلکہ مجرموں کو (آپ کے ساتھ سولی پر لٹکانے کے لیے دو مجرم اور بھی تھے) حراست میں لیے ہوئے تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ رعایا میں سے نہیں، بلکہ حاکم قوم کے افراد تھے۔ ایسے موقع پر کیا کرتے؟ ...... خود تو اپنے اوپر سولی والی لکڑی کا بوجھ لادنے سے رہے۔ انھوں نے وہی کیا جو ان کی جگہ پر کوئی بھی ان حکمراں قوم کا فرد کرتا۔ انھوں نے مجمع ہی میں سے کسی بدتمیز یہودی کو پکڑ لیا اور صلیب کی لکڑی اس پر لاد دی...... انگریز گارڈ ایسے موقع پر یعنی کسی

ہندوستانی مجرم کو حراست میں لیے جاتا ہوتا تو کیا کرتا؟ خصوصاً جب ہندوستانی تماشائیوں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ بھی اس مجرم کے ساتھ جاری رہتی۔ یہی کرتا کہ بھیڑ میں سے کسی ہندوستانی ہی کو پکڑ لیتا اور چوب صلیب اس پر لاد دیتا۔ یہ محض قیاس وقرینہ نہیں، انجیلوں میں اتنے جز کی تصریح موجود ہے۔

''انھیں شمعون نامی ایک کرینی آدمی ملا۔ اسے بیگار پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے۔'' (متیٰ ۲۷:۳۲) ''شمعون نامی ایک کرینی آدمی اسکندر اور روفس کا باپ دیہات سے آتے ہوئے ادھر سے گزرا۔ انہوں نے اسے بیگار میں پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے۔'' (مرقس ۱۵:۲۱) ''اور جب اس کو لیے جاتے تھے تو انہوں نے شمعون نامی ایک کرینی کو جو دیہات سے آتا تھا پکڑ کے صلیب اسی پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے چلے۔'' (لوقا ۲۳:۲۶)

جب یہ مجمع (جو یقیناً کوئی باقاعدہ ومنظم مجمع نہیں تھا، بلکہ عوام کی ایک بھیڑ تھا) اس افرا تفری کے ساتھ ایک دوسرے کو ریلتا پیلتا، مجرم سے چھیڑ چھاڑ کرتا، اس سے تمسخر کرتا ہوا سولی گھر کے پھاٹک پر پہنچا تو رومی پولیس گارڈ جو ساتھ تھا اس کی ڈیوٹی ختم ہوگئی، اب یہاں سے جیل کے سنتریوں کا عمل دخل شروع ہوتا ہے۔ وہ کیا جانیں کہ یسوع ناصری کس شخصیت کا نام ہے، وہ اپنے حسب دستور مجرم اسی کو سمجھے جس کے اوپر صلیب لدی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو مستحضر کر لیجیے کہ جیل کے رومی سپاہیوں کی نظر میں سب یہودی ہی اجنبی تھے اور اس لیے باہم دگر ہم شکل اور یکساں۔ انھیں ایک اسرائیلی (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی (شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ نہایت آسان تھا۔ انھیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق ہی نہیں نظر آ سکتا تھا۔ شمعون نے یقیناً واویلا مچایا ہوگا لیکن ادھر مجمع کا شور وہنگامہ اُدھر جیل کے سپاہیوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت اور پھر سولی پر لٹکا دینے کی جلدی۔ اسی افرا تفری کے عالم میں اسی شمعون کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا گیا اور وہ چیختا چلاتا رہا۔ حضرت مسیحؑ قدرتاً اس ہڑبونگ میں دشمنوں کے ہاتھ سے رہا ہو گئے اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ٹامک ٹوئیے مارتے رہے۔

ہمارے اکابر نے اس شخص کا نام جس کو حضرت عیسیٰؑ کے دھوکے میں سولی پر چڑھا دیا گیا۔ حضرت ابن عباس کے حوالے سے یودس لکھا ہے۔ اور یہی عقیدہ بعض مسیحیوں کی جانب بھی منسوب کیا ہے۔ (البدایۃ والنہایۃ ۔ ۲/۹۳ ۔ مطبوعہ مصر)

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ یہ عقیدہ نو ایجاد نہیں، خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم ترین فرقہ باسلیدیہ کے نام سے گزرا ہے (بانی فرقہ کا سال وفات ۱۴۰ء) وہ اسی عقیدہ کا قائل تھا کھلم کھلا کہا کرتا تھا کہ مصلوب حضرت مسیحؑ نہیں ہوئے بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے۔ قرآن مجید نے اسی عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کر دیا ہے لیکن پولوس (متوفی ۶۵ء) کے اثر سے جو مسیحیت چلی اور پھیلی اس کی تو بنیاد ہی عقیدۂ کفارہ پر ہے یعنی اس عقیدہ پر کہ ابن اللہ نے یا خود خدا نے مجسم ہو کر اور صلیب پر جانکنی کی تکلیف اٹھا کر اور اپنی جان دے کر سب کی طرف سے مخلوق کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس لیے یہ رواجی مسیحیت تو بغیر مصلوبیت مسیح کو ماننے اور فرض کیے ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی۔ اس لیے لامحالہ اس پولوسی اور کلیسائی مسیحیت نے کُل قدیم صحیح العقیدہ مسیحی فرقوں کو "بدعتی" اور "مبتدع" قرار دے کر کلیسا سے خارج کر دیا اور خود وہی کہنے لگے جو دشمنان عیسیٰؑ یعنی یہود پہلے ہی سے کہہ رہے تھے۔ یعنی یہی کہ عیسیٰؑ صلیب پر وفات پا گئے! گو ظاہر ہے کہ اس اشتراکِ عقیدہ میں نیتیں دونوں کی بالکل الگ الگ ہیں۔ یہود وفات عیسیٰؑ کو موقعۂ تحقیر واہانت میں بیان کرتے ہیں اور مسیحی بعینہٖ اسی واقعہ سے آپ کی عظمت پر دلیل لاتے ہیں۔ لیکن نفس عقیدہ بہر حال دونوں میں مشترک ہے اور تاسف اور قلق کا مقام ہے کہ آج بیسویں صدی عیسوی میں بعض کلمہ گو فرقے بھی اسی گمراہی کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ اور طرفہ یہ کہ وفات مسیحؑ کے اس خلافِ تحقیق عقیدہ کو روشن خیالی کا تمغہ اور تحقیق کا پروانہ سمجھ رہے ہیں۔"

(نوٹ) تفسیر ماجدی کے منقولۂ بالا اقتباس کا تعلق صرف "وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" کی تفسیر وتشریح سے ہے۔ حضرت مسیحؑ کے "رَفَعَ إِلَى السَّمَاءِ" کے مسئلہ پر کلام مولانا نے اسی آیت کے آخری لفظ "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ" کے ذیل میں کیا ہے، اور مدلل طور سے "رفع إلى السماء" اور "رفع جسمانی" ہی کے نقطۂ نظر کو راجح اور ظاہر قرآن کا مقتضیٰ قرار دیا ہے جو جمہور امت کا نقطۂ نظر رہا ہے۔ (نعمانی)



سورۃ الأنعام

درس ۹ تا ۱۱

(درس-۹)

شرک کے خلاف حضرت ابراہیمؑ کا جہاد اور توحید خالص کا اعلان

ملکوت السمٰوٰت والارض کا مشاہدہ اور حکیمانہ حجت

سب پیغمبر ہدایت یافتہ، شرک سے پاک اور توحید کے داعی تھے

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً، اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۞ وَكَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۞ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا، قَالَ هٰذَا رَبِّيْ، فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۞ فَلَمَّا رَاَى الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ، فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۞ فَلَمَّا رَاَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ، فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۞ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۞

وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ۔ قَالَ اَتُحَاجُّوْنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنِ، وَلَآ اَخَافُ
مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّیْ شَيْئًا، وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ
عِلْمًا۔ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ہ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا
تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا۔
فَاَیُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَلَمْ يَلْبِسُوْآ اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُوْلٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ہ
وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنَاهَآ اِبْرَاهِيْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ
نَّشَآءُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ہ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ،
كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحاً هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ
وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰی وَهٰرُوْنَ۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ ہ
وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰی وَعِيْسٰی وَاِلْيَاسَ، كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ہ
وَاِسْمَاعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطاً، وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَی
الْعَالَمِيْنَ ہ وَمِنْ آبَائِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ
وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ ذٰلِكَ هُدَی اللّٰهِ يَهْدِیْ بِهٖ
مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ، وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ہ اُوْلٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ،
فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْماً لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ۔
اُوْلٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ، قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ
عَلَيْهِ اَجْرًا۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰی لِلْعٰلَمِيْنَ۔

(سورۃ الانعام۔ آیات ۷۵۔ ۹۱)

(ترجمہ) اور یاد کرو جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا کہ تم بتوں کو معبود مانتے ہو؟ (اور ان کی پرستش کرتے ہو؟) میں تو تمہیں اور تمہاری ساری قوم کو گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمانوں میں اور زمین میں خدا کی فرماں روائی اور (اس کے عجائبات کا مشاہدہ کراتے تھے تا کہ وہ کامل الیقین ہو جائے۔ پھر جب رات اپنی تاریکی کے ساتھ اس پر چھا گئی تو اس نے ایک درخشاں ستارہ دیکھا (اپنی قوم کے مشرکانہ عقیدہ کا بطلان ثابت کرنے کے لئے اس نے گویا ان ہی کی زبان میں کہا کہ) یہ ستارہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ ڈوب گیا تو اس نے کہا کہ میں ڈوب جانے والوں کو نہیں چاہتا (اور ان کو رب اور خدا نہیں مان سکتا،) پھر جب چاند کو چمکتا (اور چاندنی بکھیرتا) دیکھا تو (اسی طرح) کہا یہ ہے میرا رب، پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو اس نے کہا کہ اگر میرے رب نے رہنمائی نہ فرمائی ہوتی تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا، پھر جب سورج کو چمک دمک کے ساتھ نکلتا دیکھا تو کہا کہ یہ میرا رب ہے، یہ تو بہت ہی بڑا ہے، پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو (اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے) اس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! میں ان سب چیزوں سے بری اور بیزار ہوں جن کو تم (خدا کا) شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو اپنا رخ سب سے یکسو ہو کر اُس پاک ذات کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں ان میں سے نہیں ہوں جو کسی بھی چیز کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

اور اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے کہا کیا تم اللہ وحدہٗ لاشریک کے بارہ میں مجھ سے حجت اور بحث کرتے ہو، درانحالیکہ اسی نے مجھے ہدایت سے نوازا ہے، اور میں نہیں ڈرتا تمہارے ان (مصنوعی معبودوں) سے جن کو تم اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہو (وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے) مگر یہ کہ میرا رب ہی کوئی تکلیف پہنچانا چاہے (تو بے شک وہ پہنچ کے رہے گی) میرے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے، تو کیا تم دھیان نہیں کرتے! اور میں ان (وہمی اور فرضی معبودوں) سے کیسے ڈروں جن کو تم نے خدا کا شریک ٹھہرایا ہے حالانکہ تم اس سے نہیں ڈرتے کہ تم نے ایسی چیزوں کو اللہ کا شریک بنا دیا ہے جن کے بارہ میں اس نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری، تو (ذرا سوچو) ہم دونوں فریقوں میں سے کون مامون اور مطمئن رہنے کا زیادہ مستحق ہے، اگر تم کچھ جانتے ہو! (حقیقت یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا۔ ان ہی کے لئے امان اور

اطمینان ہے اور وہی راہ یاب ہیں۔

یہ ہماری وہ حجت ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر قائم کرنے کے لئے عطا کی تھی، ہم جس کے چاہتے ہیں مرتبے بلند کرتے ہیں، بے شک تمہارا رب بڑی حکمت والا، بڑے علم والا ہے۔

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب بخشے، ہر ایک کو ہم نے ہدایت سے نوازا، اور نوح کو بھی ہم نے ہدایت سے نوازا، اس سے پہلے، اور اس کی نسل میں داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف اور موسیٰ وہارون کو بھی۔ اور ہم اسی طرح نیک کرداروں کو صلہ دیتے ہیں۔ اور زکریا و یحییٰ اور عیسیٰ والیاس کو بھی (ہم نے ہدایت سے نوازا) یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے۔ اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی (ہم نے ہدایت بخشی) اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا جہاں والوں پر برتری عطا کی اور ان کے آباء واجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی ہم نے ہدایت یافتہ بنائے، ان کو برگزیدہ کیا، اور ان کو ہم نے صراط مستقیم کی ہدایت بخشی...... یہ اللہ کی ہدایت ہے۔ وہ اس سے سرفراز فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے۔ اور اگر یہ لوگ بھی (توحید کی راہ چھوڑ کے) شرک کرتے تو ان کے سارے اعمال اکارت ہو جاتے۔ یہ سب وہ بندے ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکمت (شریعت) اور پیغمبری عطا کی، پس اگر یہ (مشرکینِ مکہ) ان تعلیمات اور ہدایات کو نہ مانیں تو (کچھ پروا نہیں) ہم نے ان کے ماننے کے لئے کچھ دوسرے لوگ مقرر کر دئے ہیں جو انکار نہیں کریں گے (بلکہ قدر کے ساتھ قبول کریں گے اور سینہ سے لگائیں گے) یہ سب وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے اپنی ہدایت سے نوازا ہے، تو تم بھی ان ہی والی ہدایت کی پیروی کرو...... کہہ دو میں تم سے اس رہنمائی پر کوئی صلہ اور معاوضہ نہیں مانگتا، یہ تو تمام دنیا جہان والوں کے لئے بس نصیحت اور یاد دہانی ہے۔

تفسیر وتشریح

سورۃ الانعام کا مرکزی مضمون

یہ بات بار بار بیان کی جا چکی ہے کہ یہ سورہ ''الانعام'' مکی ہے، اور اس کے اولین

مخاطب مکہ کے مشرکین ہیں، اور ردّ شرک اور دعوتِ توحید اس کا خاص مرکزی مضمون ہے۔ شروع سورہ سے اب تک مختلف طور طریقوں سے توحید کی دعوت اور شرک کی تردید کی جاتی رہی ہے اور اس سلسلہ میں مختلف قسم کے دلائل و براہین پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ اس وقت جو آیتیں تلاوت کی گئی ہیں اور جو آج زیر درس ہیں، ان میں شرک سے حضرت ابراہیمؑ کے اعلان بیزاری اور اس دعوتِ توحید کا ذکر ہے جو انہوں نے بالکل شروع میں اپنے باپ اور اپنی قوم کو دی تھی، اور اس سلسلہ میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے جو ایک نہایت مؤثر طریقۂ استدلال اس دعوت و تلقین کے لئے اختیار کیا تھا وہ بھی ان آیتوں میں پوری تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا جہادِ توحید

ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا فرمائی ہے کہ بنی اسرائیل (یہود و نصاریٰ) بھی ان کو اپنا دینی مورث اور امام مانتے تھے اور بنی اسماعیل (مشرکین مکہ) بھی گویا ان ہی کا کلمہ پڑھتے تھے، اس لئے قرآن پاک میں جا بجا یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں بھی حضرت ابراہیمؑ کے حنفی مسلک کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ اس یہودیت یا نصرانیت کے داعی نہیں تھے جس کو یہود و نصاریٰ نے اپنا دین و مذہب بنا لیا ہے بلکہ وہ اسی خداوندی دین (اسلام) کے داعی اور علمبردار تھے جس کو ہمارے نبی محمد ﷺ پیش کر رہے ہیں اور سارے نبیوں کا وہی دین رہا ہے۔ اور بنی اسماعیل یعنی مشرکین عرب کے سامنے بھی قرآن پاک میں جا بجا حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ توحید اور اُن کے حنفی مسلک کا ذکر فرمایا گیا ہے اور ان پر حجت قائم کی گئی ہے، سورۂ انعام کی ان آیتوں میں مشرکین مکہ کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ توحید کو پیش کیا گیا ہے اور ایک واقعہ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی کواکب پرست قوم پر شرک کا بطلان واضح کرنے کے لئے کیسا عجیب و غریب اور کس قدر مؤثر طرز استدلال اختیار کیا تھا۔ ارشاد ہوا ہے۔

"وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً، إِنِّي أَرَاكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ"۔

اور یاد کرو اس واقعہ کو جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا کہ کیا تم پتھر کے بتوں کو معبود مانتے ہو اور اُن کی پرستش کرتے ہو؟ میری نگاہ میں تو یہ تمہاری اور پوری قوم کی صریح گمراہی ہے کہ اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے بتوں کو معبود بنا کر اُن کی پرستش کی جارہی ہے۔

اس آیت میں ابراہیمؑ کی یہ بات اختصار اور اجمال کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔ اسی کو سورۂ مریم میں اس طرح فرمایا گیا ہے۔

"إِذْقَالَ لِاَبِيْهِ يَآ اَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَالَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا، يَآ اَبَتِ إِنِّيْ قَدْجَاءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطاً سَوِيًّا"۔

اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا تھا اے میرے باپ آپ ایسی چیزوں کی کیوں عبادت اور پرستش کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔ اے میرے باپ مجھے خدا کی طرف سے وہ علم حاصل ہوا ہے جو آپ کو نہیں ملا ہے اس لئے آپ میری پیروی کریں، میں آپ کو سیدھے راستہ کی رہنمائی کروں گا۔

بعض مفسرین نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ آزر ابراہیمؑ کے باپ نہیں بلکہ چچا تھے اور حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات اپنے ان چچا سے ہی کہی تھی اور قرآن پاک میں اس سلسلہ کی آیتوں میں جہاں جہاں "اب" کا لفظ آیا ہے، ہر جگہ وہ چچا ہی کے لئے مجازاً استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید سے یا کسی صحیح حدیث سے اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا، اس کے برعکس قرآن پاک میں اور احادیثِ صحیحہ میں ہر جگہ اس سلسلہ میں "اب" کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے، جس کے اصلی اور حقیقی معنی والد ہی کے ہیں، اس لئے راجح یہی ہے کہ آزر ابراہیمؑ کے والد ہی کا نام ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات اپنے والد ہی سے کہی تھی۔ اور کسی نبی کے لئے ہرگز یہ عیب کی بات نہیں ہے کہ اس کے باپ کافر یا مشرک رہے ہوں، یہ تو اللہ کی شان ہے۔

سورۂ انعام کی اس آیت میں "اَتَتَّخِذُ اَصْنَاماً اٰلِهَةً" کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کے والد آزر بتوں کو معبود مان کر اُن کی پرستش کرتے تھے، اور اگلی آیتوں سے معلوم ہوگا کہ اُن کی قوم بتوں کے سوا چاند سورج اور بعض ستاروں کی پرستش بھی

کرتی تھی، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ ان میں دونوں طرح کے شرک مروج تھے۔

آگے ابراہیمؑ پر اللہ تعالیٰ کے ایک خاص الخاص انعام کا ذکر فرمایا گیا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو "مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "کا مشاہدہ کراتا تھا، یعنی ہماری اس دنیا میں اور عالمِ سماوات میں اللہ تعالیٰ کی فرماں روائی اور اس کی قدرت ومشیت کی کارفرمائی جس طرح ہو رہی ہے اور خالق کا حکم مخلوقات پر جس طرح چل رہا ہے، حضرت ابراہیمؑ پر اللہ تعالیٰ اس کو منکشف فرماتا تھا۔ یہ ان پر اللہ تعالے کا خاص الخاص انعام تھا اور اس کی وجہ سے اُن کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس طرح کے دوسرے حقائق کے بارے میں حق الیقین کا مقام حاصل تھا۔ اگلی آیت میں اسی کو ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

"وَكَذٰلِكَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ"۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے ابراہیم کو توحید کی نعمت عطا فرمائی اور اس کی دعوت وتبلیغ کی توفیق دی۔ اسی طرح ہم ان کو "مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"کا مشاہدہ کراتے تھے اور کائنات پر اللہ تعالیٰ کی فرماں روائی کے اسرار اور جلوے ان کو دکھاتے تھے۔

قوم کو دعوت حق کا ایک منظر

اس کے آگے کی آیتوں میں ابراہیم علیہ السلام ہی کا ایک عجیب وغریب واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔ اُن کی قوم چاند، سورج اور ستاروں کو اپنا رب مانتی اور اُن کی پرستش کرتی تھی۔ ایک دفعہ جب رات کا اندھیرا چھا گیا اور آسمان پر ایک چمک دار ستارہ ظاہر ہوا تو حضرت ابراہیمؑ نے بظاہر اپنے ہی کو مخاطب کر کے، لیکن فی الحقیقت اپنے گھر والوں اور قوم کے لوگوں کو سنانے کے لئے گویا اُن کا خاکہ اڑاتے ہوئے کہا "هٰذَا رَبِّیْ" "یہ چمکدار ستارہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ قانون قدرت کے مطابق اپنے وقت پر ڈوب گیا تو حضرت ابراہیمؑ نے پکار کر کہا "لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ" میں ڈوبنے والی کسی چیز کو محبوب ومعبود نہیں بنا سکتا، اس لئے ڈوب جانے والے اس ستارہ کو اپنا رب نہیں مان سکتا۔ اسی طرح جب ایک رات کو چاند اپنی پوری روشنی کے ساتھ نمودار ہوا تو حضرت ابراہیمؑ نے پھر ان لوگوں کو سنا کے اور گویا ان ہی کے خیالات کی ترجمانی کرتے

ہوئے کہا "ھٰذَا رَبِّیْ" اچھا تو یہ حسین اور روشن چاند میرا رب ہے، پھر جب وہ بھی اپنے وقت پر ڈوبا تو پکار کے کہا۔ "لَئِنْ لَّمْ یَھْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَکُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّیْنَ" نہیں، یہ ڈوب جانے والا چاند بھی رب اور معبود نہیں ہو سکتا۔ میرے اللہ نے مجھے یہ حقیقت سمجھا کے کہ ڈوبنے اور فنا ہو جانے والی کوئی چیز کبھی پروردگار اور معبود نہیں ہو سکتی! مجھے اِس گمراہی سے بچالیا، اگر میرا خدا رہنمائی نہ فرماتا تو میں بھی ایک گمراہ آدمی ہو کے رہ جاتا۔ پھر جب رات ختم ہو کر صبح ہوئی اور سورج اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ نکلا، جو ان کی قوم کا معبود اکبر تھا، تو ابراہیم علیہ السلام نے پھر لوگوں کو سنا کے کہا "ھٰذَا رَبِّیْ ھٰذَا اَکْبَرُ" اچھا تو یہ سورج میرا رب ہے، یہ تو سب سے بڑا ہے، اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا، پھر جب شام ہوئی اور وہ بھی ڈوب گیا اور ظاہر ہو گیا کہ بیچارے ستارے اور چاند کی طرح یہ بھی کسی کے حکم سے نکلتا اور ڈوبتا ہے تو حضرت ابراہیمؑ نے پکار کے اور قوم کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"یَا قَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ، اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفاً وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ"۔

اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے ان سب معبودوں سے براءت اور بیزاری کا اعلان کرتا ہوں، جن کو تم خدا کے ساتھ شریک کرتے ہو، میں نے ہر طرف سے یکسو ہو کر اپنا رُخ اس اللہ وحدہٗ لاشریک کی طرف موڑ لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، اور میں اہل شرک میں سے نہیں ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ کی قوم جس قسم کے شرک میں مبتلا تھی، اس کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرنے کے لئے یہ بہترین طریقہ تھا جو ابراہیمؑ نے استعمال کیا اور اگر قوم میں تفکر ہوتا اور صلاحیت ہوتی تو وہ سب شرک کا راستہ چھوڑ کے حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ توحید کو قبول کر لیتے لیکن ان کی ذہنیتیں مسخ ہو چکی تھیں، بجائے قبول کرنے کے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حجت بازی شروع کر دی اور اُن کو اپنے معبودوں سے ڈرانے لگے کہ تم نے ان کا انکار کیا ہے اور ان کی توہین کی ہے، اب تم پر یہ آفت آئے گی اور تمہیں یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"وَحَاجَّہٗ قَوْمُہٗ قَالَ اَتُحَاجُّوْنِّیْ فِی اللّٰہِ وَقَدْ ھَدٰانِ وَلَآ اَخَافُ مَا

نُشرِکُوْنَ بِهٖ إِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْئاً، وَسِعَ رَبِّیْ کُلَّ شَیْءٍ عِلْماً، اَفَلَا تَتَذَکَّرُوْنَ، وَکَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَکْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّکُمْ اَشْرَکْتُمْ بِاللّٰهِ مَالَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْکُمْ سُلْطَاناً، فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ"۔

مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے لوگ ان سے حجت بازی کرنے لگے اور جھگڑنے لگے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ تم مجھ سے اللہ کی توحید اور اس کی صفات وافعال کے بارہ میں جھگڑتے ہو، تو اسی نے مجھے یہ ہدایت بخشی ہے، اور گویا حقیقت مجھے آنکھوں سے دکھادی ہے، اور تم جو مجھے اپنے ان فرضی اور وہمی معبودوں اور دیوتاؤں سے ڈراتے ہو تو سن لو کہ میں ان سے بالکل نہیں ڈرتا، یہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، ہاں میرا پروردگار جس کی ساری کائنات پر حکومت اور فرماں روائی ہے، وہ جو چاہے گا وہ ہوگا اس کے علم میں سب کچھ ہے۔ وہ میرے حال سے بھی باخبر ہے اور تمہارے حال سے بھی۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ وہ مجھے اپنی حفاظت میں اور اپنی رحمت کے سایہ میں رکھے گا۔

آگے ہے "وَکَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَکْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّکُمْ اَشْرَکْتُمْ بِاللّٰهِ مَالَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْکُمْ سُلْطَاناً" یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے ان لوگوں سے جو اُن کو اپنے دیوتاؤں کی مخالفت اور انکار کی وجہ سے ڈراتے تھے، مزید فرمایا کہ میں تمہارے اِن دیوتاؤں سے جو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور جن کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے کیوں ڈروں، جبکہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم اس گناہ عظیم سے اور اُس کے برے انجام سے نہیں ڈرر ہے کہ اللہ پاک کے ساتھ تم ایسی چیزوں کو شریک کر رہے ہو، جن کی شرکت کی اللہ نے تم پر کوئی دلیل اور سند نہیں اتاری، مطلب یہ ہے کہ تم تو اتنا بڑا جرم کرنے کے باوجود خداوند قہار کے قہر وغضب سے نہیں ڈرتے، اور مجھے ان جھوٹے معبودوں اور بے حقیقت دیوتاؤں سے ڈراتے ہو، سوچو کہ ہم دونوں فریقوں میں سے کس کے لئے بے خوفی اور اطمینان کا رویّہ زیادہ سزاوار ہے، پھر خود ہی اس سوال کے جواب میں فرمایا۔ "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ" یعنی بے خوفی اور امان کے مستحق وہ ہیں جو خدا پر ایمان لائے اور اپنے ایمان کو انہوں نے شرک کی آلودگی سے بالکل

محفوظ رکھا۔ اُن کے لئے خدا کی امان ہے اور وہ ہی راہ یاب ہیں۔

آگے ارشاد ہے "وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ، نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّنْ نَّشَاءُ، إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ" یعنی ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے مقابلہ میں (جو چاند، سورج اور ستاروں کو معبود مانتی تھی اور ان کی پرستش کرتی تھی) جو حجت قائم کی اور جس طرح اُن پر ثابت کیا کہ یہ ستارے جو روز چمکتے چڑھتے اور ڈوبتے ہیں، خدا نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ برہان واستدلال جو اُن کی قوم کی ذہنیت اور مزاج کے لحاظ سے مؤثر ترین استدلال تھا۔ یہ ان کو ہم نے عطا فرمایا تھا اور ہم نے اس طرف ان کی رہنمائی کی تھی، اور یہ اپنے بندے ابراہیم پر ہمارا خاص انعام تھا، اس کے ذریعہ ہم نے ان کو رفعت بخشی اور اُن کا مرتبہ بلند کیا، ہم جس کے مرتبے بلند کرنا چاہتے ہیں، بلند کرتے ہیں، لیکن ہمارے تمام فیصلے علم اور حکمت کی بنا پر ہوتے ہیں۔ یوں ہی اندھا دھند کسی کو ہم بلند یا پست نہیں کر دیتے "اِنّ ربک حکیم علیم" تمہارا رب جو ساری کائنات کا رب ہے وہ بڑا حکیم بڑا دانا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر انعاماتِ الٰہی

آگے بیان فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم پر یہ نوازش بھی کی کہ اُن کو اسحاق جیسے بیٹے اور یعقوب جیسے پوتے بخشے اور اُن کو ہم نے ہدایت کی نعمت سے نوازا اور پھر ان کی نسل میں بھی مسلسل پیغمبر آتے رہے ہیں جن سے دنیا میں ہدایت کا سلسلہ جاری رہا۔ ارشاد ہے۔

"وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحاً هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ"

یہاں حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کے بعد حضرت نوحؑ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے بعد ان کی نسل میں ہدایت اور نبوت کا سلسلہ جاری رہا اسی طرح اُن سے اوپر اُن کے جدّ اعلیٰ نوح کو بھی ہم نے ہدایت سے نوازا تھا اور اُن کا دین اور مسلک بھی وہی تھا جو ابراہیم کا تھا اور وہ بھی توحید ہی کے داعی اور علمبردار تھے۔

اس کے بعد ابراہیمؑ کی نسل میں اسحاق و یعقوب علیہم السلام والی شاخ ہی میں بعد میں آنے والے مشہور پیغمبروں کا نام بنام ذکر فرمایا گیا ہے کہ ان سب کو ہدایت کی نعمت سے نوازا گیا تھا اور اُن سب کا دین و مسلک بھی وہی تھا جو ابراہیمؑ کا تھا اور یہ سب توحید ہی کے داعی

تھے جس کی دعوت قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔ارشاد ہے۔

"وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمَانَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهَارُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ، وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ، كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ، وَاِسْمَاعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ، وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ، ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ، وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ، فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ، قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا، اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ"۔

اوپر فرمایا گیا تھا کہ ہم نے ابراہیم کو "مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کا مشاہدہ کرایا جس کے بعد انھیں حق الیقین کی وہ دولت حاصل ہوگئی جو اصحاب مشاہدہ ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ پھر انہوں نے ہماری رہنمائی سے اپنی مشرک قوم پر وہ حجت قائم کی جس کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے اور یہ سب اپنے بندے ابراہیم پر ہمارے انعامات تھے اور ہم نے ان کو اسحاق ویعقوب عطا فرمائے اور ان کو بھی ہدایت کی نعمت سے نوازا، اور ان کے اوپر کے سلسلہ میں ان کے مورثِ اعلیٰ نوح کو بھی ہدایت اور نبوت کی نعمت سے نوازا تھا۔

آگے ان آیتوں میں بتلایا گیا ہے کہ ابراہیمؑ کی نسل میں اسحاق ویعقوب کے بعد بھی یہ تسلسل قائم رہا۔اُن کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف اور موسیٰ وہارون کو بھی ہدایت کی نعمت سے نوازا گیا۔ان کے علاوہ زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ والیاس کو بھی یہ نعمت عطا فرمائی گئی۔نیز اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط ان سب کو بھی ابراہیم کی اس وراثت سے حصہ ملا۔ اور صرف انھیں کو نہیں بلکہ ان کے آباء واجداد اور ان کی ذریت اور اُن کے بھائی بندوں میں سے بھی بہت سوں کو ہدایت کی نعمت اور برگزیدگی عطا فرمائی۔آگے فرمایا گیا: "ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ الخ"، یعنی یہ سب جس ہدایت کے حامل تھے اور جس کی دعوت دیتے تھے، جس کی اصل واساس توحید تھی، وہ خدا کی ہدایت تھی اور اگر بالفرض اللہ کے یہ مقبول بندے بھی (جن کی

زندگی اعمال صالحہ والی زندگی تھی) شرک کے مرتکب ہوجاتے تو ان کی سارے اعمال صالحہ اکارت ہوجاتے۔ کیونکہ شرک وہ آگ ہے جو سارے اعمال صالحہ کو جلا کر خاکستر کردیتی ہے۔

شرک کی سنگینی کی سخت ترین مثال

شرک کی سنگینی اور گندگی ظاہر کرنے کے لئے قرآن پاک میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس میں یہ بات سب سے زیادہ سخت ہے کہ اگر بالفرض اللہ کے کسی نبی سے بھی شرک سرزد ہوجائے تو اللہ اسکو بھی نظرانداز نہیں فرمائے گا۔ اور اس کے سارے پاکیزہ اعمال سوخت ہوکر رہ جائیں گے۔ العیاذ باللہ

یہ بات دراصل مشرکین کو اور خاص کر مکہ کے مشرکوں کو سنائی جارہی ہے جو شرک کی گندگی میں مُلوّث ہونے کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے اور ان کی نسبت پر فخر کرتے تھے اور خانہ کعبہ کی نسبت سے اپنے کو خدا کا برگزیدہ سمجھتے تھے۔ پہلے تو ان کو یہ بتایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کا مسلک اور طریقہ کیا تھا اور شرک کے خلاف انہوں نے کس طرح جنگ کی، پھر یہ بتایا گیا کہ اُن سے پہلے اُن کے مورثِ اعلیٰ نوح کا اور اُن کے بعد اُن کے اَخلاف اسحاق ویعقوب اور پھر اُن کی نسل میں تسلسل کے ساتھ آنے والے سب نبیوں کا مسلک اور طریقہ بھی وہی تھا، یہ سب توحید کے حامل اور داعی اور معلم تھے اور اللہ کے بندوں کو شرک کی گندگی سے نکالنا ان کا مشن تھا۔

دعوت توحید غالب ہوکر رہے گی

آگے اُن سب نبیوں کے بارہ میں جن کا اوپر ذکر ہوا، فرمایا گیا ہے: "أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَإِن يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ" یعنی ہم نے ان سب کو کتاب ہدایت دی اور حکمت وشریعت دی، اور منصب نبوت سے سرفراز فرمایا، اور یہی چیزیں اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہیں، پس اگر یہ مشرکین مکہ ان عظیم نعمتوں کی قدر نہ کریں اور کفر وانکار ہی کے رویہ پر جمے رہیں تو کوئی پرواہ کی بات نہیں ہم نے اور لوگ اس کے لئے مقرر کر رکھے ہیں وہ ان نعمتوں کو قبول

کریں گے اور سینے سے لگائیں گے۔

یہ اُس زمانے کی آیتیں ہیں جب مکہ میں گنتی کے چند ہی لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کیا تھا، جن میں زیادہ تر ضعفاء اور غرباء تھے، ان کے علاوہ مکہ کی عام فضا کفر و انکار اور شدید مخالفت کے شور و شغب سے گونج رہی تھی اور کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس دین کو کبھی استحکام اور قبول عام بھی حاصل ہو سکے گا، اسی حالت میں اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ بہت سے لوگوں کو اس کی توفیق ملے گی، اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس پیشین گوئی کا ظہور ہو گیا۔

آگے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

"اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰٮهُمُ اقْتَدِهْ، قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ" مطلب یہ ہے کہ جن انبیاء علیہم السلام کا اوپر ذکر کیا گیا یہ سب اللہ کی طرف سے ہدایت یاب تھے ان کی تعلیم اور ہدایت خدا ہی کی تعلیم اور ہدایت تھی، لہٰذا اے رسول تم اسی ہدایت کی پیروی کرو، جو ان انبیاء سابقین کو خدا کی طرف سے ملی تھی، اور جس طرح خدا کے یہ نبی توحید کی اور خدا کی فرماں برداری کی تبلیغ کرتے تھے تم بھی اسی طرح کرو اور اپنے مخاطبین سے کہہ دو کہ میں تم سے اس تعلیم و تبلیغ کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا یہ تو ساری دنیا کے لوگوں کے لئے نصیحت اور یاد دہانی ہے، میں تم سے کچھ لیتا نہیں بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ تم اللہ کی اس نعمت ہدایت کو مجھ سے لے لو اور نہ صرف تم مکہ والے اور میرے کنبے قبیلے والے بلکہ ساری دنیا والے اور ساری قوموں کے لوگ لے لیں۔

ہدایت سب سے بڑی نعمت

ان آیتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے، یہ وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اصلاً اور براہ راست انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوتی ہے، پھر جو بندے ان کی دعوت پر اس ہدایت کو قبول کریں وہ گویا اُن کے دستر خوان کے شریک ہو جاتے ہیں...... ہم آپ نے اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا مبارک دور نہیں پایا بلکہ قریباً ۱۴۰۰ سو سال بعد کا زمانہ پایا ہے لیکن اللہ کا کتنا عظیم انعام و احسان ہے کہ ایمان لا کر اور

آپ کا دین قبول کر کے آپ کے دستر خوان کے شریک بن گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ اس نعمت کی قدر و قیمت کو کچھ سمجھیں اور اُس کا شکر ادا کرنے کی کوشش اور فکر کریں۔ اس کا شکر یہی ہے کہ اپنی زندگی کو رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کا پورا پورا پابند بنائیں، جو جس درجہ میں آپ کا اور آپ کی ہدایات و تعلیمات کا اتباع کرے گا۔ وہ اسی درجہ میں آپ سے قریب اور آپ کی لائی ہوئی نعمت میں شریک ہوگا۔ بس اللہ تعالیٰ توفیق دے۔



(درس-۱۱)

تحریم و تحلیل صرف اللہ کا حق ہے

مشرکین کی بعض مشرکانہ بدعات و خرافات کا رد

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم- بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّماً عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُہٗٓ اِلَّآ
اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَۃً اَوْدَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْلَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّہٗ رِجْسٌ اَوْفِسْقًا
اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ، فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَاعَادٍ فَاِنَّ رَبَّکَ غَفُوْرٌ
رَّحِیْمٌ۝ وَعَلَی الَّذِیْنَ ھَادُوْا حَرَّمْنَا کُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ
وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَیْھِمْ شُحُوْمَھُمَآ اِلَّا مَاحَمَلَتْ ظُھُوْرُھُمَآ
اَوِالْحَوَایَا اَوْمَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ- ذٰلِکَ جَزَیْنَاھُمْ بِبَغْیِھِمْ وَاِنَّا
لَصٰدِقُوْنَ۝ فَاِنْ کَذَّبُوْکَ فَقُلْ رَّبُّکُمْ ذُوْ رَحْمَۃٍ وَّاسِعَۃٍ وَلَا یُرَدُّ
بَاْسُہٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ۝ سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْشَآءَ
اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا وَلَآ اٰبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ- کَذٰلِکَ
کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ حَتّٰی ذَاقُوْا بَاْسَنَا، قُلْ ھَلْ عِنْدَکُمْ
مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْہُ لَنَا- اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا
تَخْرُصُوْنَ۝ قُلْ فَلِلّٰہِ الْحُجَّۃُ الْبَالِغَۃُ فَلَوْشَآءَ لَھَدٰکُمْ اَجْمَعِیْنَ۝

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآئَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا، فَاِنْ
شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ، وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيَاتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ۔ قُلْ
تَعَالَوْا اَتْلُ مَاحَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا
وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا، وَلَا تَقْتُلُوْآ اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ۔ نَحْنُ
نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ۔ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنَ،
وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ ذَالِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ
حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ، وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ، لَانُكَلِّفُ
نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْكَانَ ذَا قُرْبٰى،
وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا۔ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ وَاَنَّ
هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْماً فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ
بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

(الانعام۔ آیات ۱۴۵۔ ۱۵۱)

(ترجمہ) اے پیغمبر ﷺ ان سے کہو کہ جو شریعت خدا کی طرف سے وحی کے ذریعہ میرے پاس آئی ہے میں اس میں کھائی جانے والی چیزوں میں سے کوئی چیز کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھانا چاہے حرام نہیں پاتا اِلّا یہ کہ وہ مُردار جانور ہو یا بہتا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت ہو کیونکہ وہ بالکل ہی ناپاک ہے یا وہ حرام اور سراپا فسق و فجور جانور ہو جو بطور نذر غیر اللہ کے لئے نام زد کر دیا گیا ہو۔ پھر جو شخص کسی وقت حلال غذا بالکل نہ مل سکنے کی وجہ سے ان محرمات میں سے کوئی چیز کھانے کے لئے مضطر ہو جائے (اور اس حالت میں بس جان بچانے کے لئے کچھ کھالے) بشرطیکہ (حکم خداوندی سے) قصد بغاوت اور نافرمانی کرنے والا نہ ہو اور حد ضرورت سے زیادہ نہ کھائے تو تمہارا رب غفور و رحیم ہے (وہ اس صورت میں

مواخذہ نہیں فرمائے گا۔)

اور یہودیوں پر ہم نے ناخن والے جانور حرام کر دئیے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کردی تھی بجز اس کے کہ جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں پر ہو یا ہڈی سے لگی ہو، یہ ہم نے انہیں ان کی شرارت اور سرکشی کی سزادی تھی اور ہم (اس بیان میں) سچے ہیں، پھر اگر وہ تمہیں جھٹلائیں تو ان سے کہہ دو کہ تمہارا پروردگار بڑی وسیع رحمت والا ہے (اس لئے تمہیں یہ مہلت ملی ہوئی ہے) تاہم اُس کا عذاب مجرموں سے ٹلنے والا نہیں ہے۔

یہ مشرکین ضرور یہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کر سکتے اور نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ (ان چیزوں میں سے جن کے بارہ میں بحث ہے) کسی چیز کو ہم حرام قرار دے سکتے اسی طرح (ایسی ہی باتیں کر کے) ان سے پہلے مکذبین نے بھی حق کو جھٹلایا تھا یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا، اے پیغمبر ان سے کہہ دو کیا تمہارے پاس (اس بارہ میں) کوئی علمی بُرہان ہے جس کو ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض خیالی باتوں پر چل رہے ہو اور بالکل بے بنیاد قیاس آرائیاں کر رہے ہو۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ (تمہارے دعوے کا بے دلیل ہونا تو ظاہر ہو چکا) پس حجۃ بالغہ (کامل و روشن دلیل) اللہ ہی کی ہے (جو اس کے پیغمبر کے ذریعہ آئی اور تم اس کی رو سے یقیناً مجرم ہو) بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا (یقیناً اس کو اس کی قدرت تھی، لیکن ایسا کرنا حکمت کے مطابق نہ تھا)۔

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم اپنے ان رہنماؤں اور نمائندوں کو لاؤ جو اس کی شہادت دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے، پھر اگر وہ یہ گواہی دیں تو تم ان کی ہمنوائی نہ کرنا اور ان لوگوں کی بدعات، و مزخرفات، (باطل خیالات) پر نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور (دوسری ہستیوں کو) اپنے پروردگار کے برابر ٹھہراتے ہیں۔

اے پیغمبر ان سے کہو آؤ میں تمہیں سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے (اور جو پابندیاں تمہارے اوپر عائد کی ہیں، اُس کی سب سے پہلی اور اہم ہدایت یہ ہے) کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرو اور مفلسی تنگ دستی کے خیال سے اپنی اولاد کو مار نہ ڈالو، ہم تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور اُن کو بھی، اور بے حیائی

و بے شرمی کی گندی باتوں کے پاس نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چُھپی، اور جس کا خون بہانا اللہ نے حرام کیا ہو اس کو قتل نہ کرو، اِلّا یہ کہ کسی حق کی بنیاد پر اُس کی جان لی جائے۔ اللہ نے ان باتوں کی تم کو سخت تاکید کی ہے، امید کی جانی چاہیئے کہ تم (ان ہدایتوں کو اور اُن کی اہمیت اور روح کو) سمجھو (اور عمل کرو) اور یہ (بھی اس کی ہدایت ہے) کہ یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جو بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے پورے سن بلوغ کو پہونچ جائے اور ناپ تول پوری کرو انصاف اور دیانت داری کے ساتھ، ہم مکلّف نہیں کرتے کسی کو مگر اتنے ہی کا جتنا اس کے امکان میں ہو، اور جب بات کہو تو حق و انصاف کی کہو اگرچہ وہ (جس کا معاملہ سے تعلق ہو) تمہارا عزیز قریب ہی ہو، اور اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرو۔ اللہ نے تم کو اس سب کی تاکیدی ہدایت کی ہے، اُمید کی جانی چاہیئے کہ تم نصیحت پکڑو گے (اور عمل کرو گے) اور (اسی اللہ کا ارشاد ہے کہ) یہ (جس کی تمہیں دعوت دی جارہی ہے) میرا مقرر کیا ہوا راستہ ہے پس اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں خدائی راہ سے ہٹا کر اِدھر اُدھر کردیں۔

تمہیں تمہارے رب نے یہ سب وصیت کی ہے، امید کی جانی چاہیئے کہ تم (اس کی پیروی اور پابندی کرتے ہوئے نافرمانی اور اس کے بُرے انجام سے) بچو گے۔

تفسیر و تشریح

یہ آیتیں سورۃ الانعام کے سترہویں اور اٹھارویں رکوع کی ہیں پچھلے ہفتہ ان سے پہلی جو آیتیں زیر درس تھیں "وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ۔ سے لے کر اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ تک" ان میں مشرکین عرب کی اُس گمراہی کا ذکر کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کی غذا کے لئے جو حلال چوپائے گائے بھینس بکری وغیرہ پیدا کئے ہیں اور اسی طرح زمین سے جو غذائی پیداوار ہوتی ہے، ان مشرکین نے ان کے بارہ میں اپنی ایک شریعت گڑھ رکھی تھی اور اپنی مشرکانہ اور توہم پرستانہ ذہنیت کے مطابق بہت سی حلال طیب چیزوں کو کسی خاص طبقہ کے لئے یا سب کے لئے حرام قرار دے رکھا تھا اور اسی طرح بعض حرام اور گندی چیزوں کو حلال بنالیا تھا اور اس تحریم

تحلیل کو بالکل بے سند خدا کی طرف منسوب کرتے تھے اور اپنی اس خود ساختہ شریعت کو خدا کی شریعت بتاتے تھے حالانکہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل اور سند نہیں تھی۔ بلکہ یہ اُن کا خالص افتراء تھا۔ آخر میں فرمایا گیا تھا ''فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ'' (ان سے بڑا مجرم کون ہوگا جو لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے اللہ پر بالکل جھوٹ بہتان باندھیں جس کی کوئی دلیل اور سند نہ ہو۔ اللہ ایسے مجرموں کو راہ یاب نہیں کرتا)

اس کے بعد متصلاً یہ آیتیں ہیں جو میں نے اس وقت تلاوت کی ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو حکم دیا ہے کہ اِن نا آشنایانِ حقیقت کو بتایئے اور اعلان کر دیجئے کہ خدا نے جو شریعت میری طرف وحی کی ہے اُس میں ان چیزوں میں سے جو کھائی جاتی ہیں اور جن کے کھانے کا تم لوگوں میں دستور اور چلن ہے صرف یہ چار چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں۔ ایک ''مَیْتَة'' (مرا ہوا جانور) یعنی جو مر گیا ہو اور شرعی طریقہ پر حلال نہ کیا گیا ہو۔ دوسرے بہا ہوا خون (جو ذبح کے وقت یا زخمی ہو جانے کی صورت میں جانور کے جسم سے بہتا ہے) تیسرے خنزیر کا گوشت جو سراسر ناپاک ہے، چوتھے وہ جانور جو بطور نذر اللہ کے سوا کسی ہستی کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو اور بول دیا گیا ہو۔ ارشاد ہے:

''قُلْ لَّا اَجِدُ فِيْمَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ''۔

یہ مضمون الفاظ کے بہت تھوڑے فرق کے ساتھ سورہ بقرہ میں بھی گذر چکا ہے، وہاں بھی فرمایا گیا تھا کہ بس یہی چار چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حرام قرار دی ہیں۔ ''اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ''۔ پھر سورۂ مائدہ کے پہلے رکوع میں بھی ان چار چیزوں کی حرمت کا ذکر کیا گیا ہے، بلکہ اس میں ان چار کے علاوہ کچھ اور محرمات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

"مَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" کا مطلب

ان چار چیزوں میں سے "مَیْتَة" مرا ہوا جانور اور "دَمٌ مَّسْفُوْحٌ" (بہا ہوا خون) اور "لَحْمَ خِنْزِیْر" (سور کا گوشت) یہ تینوں بالکل واضح ہیں، ان کے بارہ میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں، البتہ چوتھی چیز "مَا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ" کی کچھ وضاحت کی ضرورت ہے۔ اگرچہ پہلے جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں وضاحت کی جا چکی ہے، لیکن آپ حضرات میں بعض وہ بھی ہوں گے جو اس موقع پر شریک درس نہیں رہے ہوں گے اس لئے میں آج پھر ضروری وضاحت کرتا ہوں۔

پہلے یہ بات سمجھ لیجئے کہ خدا کے پرستار بندے خدا کو راضی کرنے اور اس کی رحمت وعنایت حاصل کرنے کے لئے جو کچھ کرتے ہیں مشرکین بھی اپنے دیوتاؤں اور فرضی اور وہمی خداؤں کی رضامندی اور نظر عنایت حاصل کرنے کے لئے وہ سب ہی کرتے ہیں، مثلاً خدا کے پرستار اس کی عبادت اور پرستش کرتے ہیں تو مشرکین بھی اپنی معبودوں کی عبادت اور پرستش کرتے ہیں، خدا پرست اپنے پروردگار کے لئے نذر مانتے ہیں اور قربانیاں کرتے ہیں تو مشرکین بھی اپنے مانے ہوئے دیوتاؤں اور شریکوں کے لئے نذریں مانتے اور قربانیاں کرتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جو ہر اُس شخص کو معلوم ہے جو مشرکین کے حالات اور اُن کے مشرکانہ طور طریقوں سے واقف اور باخبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح غیر اللہ کی عبادت اور پرستش کو شرک قرار دیا ہے۔ اسی طرح اللہ کے سوا کسی کے لئے نذر ماننے، نذر چڑھانے اور اُس کے واسطے قربانی کرنے کو بھی شرک بتایا ہے مشرکین عرب میں شرک کی یہ سب صورتیں رائج تھیں، وہ غیرُ اللہ کی عبادت اور پرستش بھی کرتے تھے، اُن کے لئے جانوروں کی نذر بھی مانتے تھے، قربانیاں بھی کرتے تھے۔ قرآن پاک نے غیر اللہ کے لئے اس نذر اور قربانی کو ایسا خبیث مشرکانہ عمل قرار دیا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جانور بھی حرام اور مردار ہو جاتا ہے جس کو اللہ کے سوا کسی کی نذر کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو یا غیر اللہ کے لئے اس کی قربانی کی گئی ہو "مَا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ" سے یہی دونوں صورتیں مراد ہیں۔ جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں اس کا

مصداق وہ جانور تھے جن کو مشرکین اپنے بتوں کے لئے نذر کے طور پر نامزد کر دیا کرتے تھے یا اپنے بتوں کو راضی کرنے کے لئے جن کی قربانی کرتے تھے۔ قرآن مجید کی اس آیت میں اُن کا گوشت حرام اور مردار قرار دیا گیا ہے اگر چہ وہ مرغے اور بکرے جیسے حلال جانور ہوں۔

بعض لوگوں کا شبہ

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ "مَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ" سے مراد صرف وہ جانور ہے جس پر ذبح کے وقت اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام لیا گیا ہو۔ لیکن لغت کے لحاظ سے بھی یہ بات صحیح نہیں ہے، عربی لغت اور محاورہ کی رو سے اس سے وہ جانور مراد ہے جس کو غیر اللہ کے لئے بول دیا گیا، ہاں وہ جانور بھی اس میں داخل ہوگا اور بدرجۂ اولیٰ داخل ہوگا جس پر ذبح کے وقت خدا کے سوا کسی کا نام لیا گیا ہو۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس پر بڑی تفصیل سے نہایت فاضلانہ اور محققانہ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہیں جن کو بطور نذر غیر اللہ کے لئے نامزد کیا گیا ہو، وہ اس مشرکانہ نذر سے حرام ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ اگر بالفرض اُس غیر اللہ کے لئے ان کی قربانی کرتے وقت اُن پر اللہ کا نام لیا جائے اور بسم اللہ پڑھ کر ہی ذبح کیا جائے جب بھی وہ جانور حلال نہ ہوگا جس طرح سور یا کتا اگر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے تو حلال نہ ہو پائے گا۔

رسول اللہ ﷺ کی مشہور حدیث ہے آپ نے بطور پیشین گوئی فرمایا تھا "لَتَرْكَبُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ"، جس کا مطلب یہ ہے کہ میری اُمت میں بھی وہ گمراہیاں آئیں گی جو اگلوں میں آئی تھیں۔ حضور کی اس پیشین گوئی کے مطابق بہت سے جاہل مسلمان بھی اس طرح کے مشرکانہ اعمال کرتے ہیں، وہ اللہ کے سوا جن ہستیوں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہیں، اُن کے لئے نذریں مانتے ہیں، اُن کے نام کے مرغے اور بکرے ان کے مزاروں پہ چڑھاتے ہیں اور انہیں راضی کرنے کے لئے ان کی قربانیاں کرتے ہیں۔ یہ قطعاً مشرکانہ اعمال ہیں اور ان کے وہ مرغے اور بکرے بلاشبہ "مَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ" میں داخل ہیں۔ جس طرح عبادت صرف اللہ کا حق ہے اور غیر اللہ کی عبادت

شرک ہے۔ اسی طرح نذر اور قربانی بھی صرف اللہ کا حق ہے اور غیر اللہ کے لئے قطعاً شرک ہے، (۱) یہ سب وہی شرک ہیں جن کو مٹانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے تھے۔

الغرض اس آیت میں اس جانور کو جس کی غیر اللہ کے لئے نذر بول دی گئی ہو، حرام قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ حرمت چونکہ مشرکانہ نذر کی وجہ سے آتی ہے اس لئے اگر وہ آدمی جس نے اس جانور کی نذر بولی ہو، اس جانور کے ذبح ہونے سے پہلے ہی اپنے اس مشرکانہ عمل سے توبہ کرے تو جانور کی حرمت ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ جس مشرکانہ عمل کی وجہ سے حرمت پیدا ہوئی تھی جب اس شخص نے اللہ کی توفیق سے اس سے توبہ کر لی تو حرمت کا وہ سبب ہی ختم ہو گیا۔

تاویل یا دھوکہ؟

بعض لوگ ان جاہل عوام کی طرف سے جو اپنی حاجتیں اور مرادیں پوری کرانے کے لئے بزرگوں کے لئے نذریں مانتے اور اُن کے مزارات پر مرغے اور بکرے چڑھاتے ہیں یہ تاویل کرتے ہیں کہ ان کا مقصد دراصل ان بزرگوں کی روحوں کے لئے ایصال ثواب کرنا ہوتا ہے، حالانکہ جو لوگ عوام کے اس طبقہ کے حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ تو ایصال ثواب کے تصور سے بھی ناآشنا ہوتے ہیں، وہ تو انہیں حاجت روا اور کارساز سمجھ کر انہیں راضی کرنے کے لئے نذر مانتے ہیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں، ان کا مقصد بس یہی ہوتا ہے کہ یہ بزرگ ہم سے راضی ہو جائیں اور ہمارا فلاں کام بنا دیں اور فلاں بلا کو ٹال دیں، یہ بالکل وہی ذہن ہے جو عرب کے مشرکوں کا تھا اور ہمارے ملک کے بُت پرست اور توہم پرست مشرکوں کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے دل کا حال جانتا ہے، اس طرح کی تاویلوں سے اُس کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔

حرام چیزیں صرف یہی چار نہیں ہیں

یہاں ایک بات اور وضاحت طلب ہے، سورۂ انعام کی آیت "قُلْ لَّا أَجِدُ فِيمَا أُوْحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّماً عَلىٰ طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗ" الآیۃ میں اور اسی طرح سورۂ بقرہ کی آیت

(۱) نذر دراصل ایک طرح کی عبادت ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے "وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ" ـ الحج ۲۲:۲۹ [illegible]

"إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ" میں حصر کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ بس یہی چار چیزیں حرام ہیں، اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ شریعتِ اسلام میں اِن چار کے علاوہ کوئی پانچویں چیز یں حرام نہیں، ان کے سوا سب حلال ہی حلال ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث سے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی گندی اور خراب چیزیں حرام ہیں۔ مثلاً کتا، بھیڑیا، چیتا وغیرہ سارے درندے حرام ہیں۔ اسی طرح چیل اور شکرہ جیسے شکاری پرندے حرام ہیں۔ زمین کے کیڑے مکوڑے سانپ بچھو وغیرہ حرام ہیں، خود قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ "يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ" (یعنی وہ پاکیزہ اچھی چیزوں کی حلت کا حکم دیتے ہیں اور گندی خبیث چیزوں کی حرمت کا حکم دیتے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اسلام میں ہر خبیث اور گندی چیز حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے جن حدیثوں میں درندوں اور شکاری پرندوں کی حرمت کا اعلان کیا ہے وہ گویا اسی "يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ" کی تشریح اور تفصیل ہے۔

اِن چار چیزوں کی خصوصیت

بہر حال اس میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اسلامی شریعت میں ان چار چیزوں (مردار، خون، خنزیز اور ما أهل لغير الله به) کے علاوہ بھی بہت سی چیزوں کا کھانا حرام قرار دیا گیا ہے اس لئے اس کی وضاحت ضروری ہے کہ ان دو آیتوں میں جو حصر کے ساتھ کہا گیا ہے کہ بس یہی چار چیزیں حرام ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ اصطلاحی لفظوں میں تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ حصر منطقیوں کا حصرِ حقیقی نہیں ہے بلکہ یہ حصرِ اضافی ہے یعنی ان آیتوں کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سارے محرمات کی تفصیل بتا دی جائے اور ان کی مکمل فہرست پیش کر دی جائے، بلکہ سورۂ انعام اور سورۂ بقرہ کی ان دونوں آیتوں کے سیاق وسباق سے صاف ظاہر ہے کہ مشرکینِ مکہ نے کھانے پینے کی جن حلال چیزوں کو بغیر کسی دلیل اور علم کے حرام قرار دے رکھا تھا اور اس تحریم کو بغیر کسی سند کے خدا کی طرف منسوب کرتے تھے، ان آیتوں کا اصل مقصد بس اس کی نفی اور تردید ہے، اور مطلب ان دونوں آیتوں کا بس یہ ہے کہ تم نے اور تمہارے باپ دادا نے کھانے پینے کی

چیزوں میں سے جو بہت سے چیزوں کو سب کے لئے یا کسی خاص طبقہ کے لئے حرام قرار دے رکھا ہے اور اس سلسلہ میں ایک شریعت گڑھ لی ہے اور اس کو خدا کی طرف نسبت کرتے ہو۔ یہ سب غلط اور خدا پر تمہارا افتراء ہے، کھانے پینے کی جن چیزوں کا تم لوگوں میں چلن ہے، دستور ہے اُن میں خدا نے بس یہ چار چیزیں حرام کی ہیں، اِن کے سوا جن چیزوں کو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے حرام قرار دے رکھا ہے وہ حرام نہیں کی گئی ہیں۔

حاصل یہ ہوا کہ یہ حصر دُنیا بھر کی تمام چیزوں کے لحاظ سے نہیں ہے، بلکہ صرف اُن چیزوں کے لحاظ سے ہے جن کو مشرکینِ عرب نے بلا کسی دلیل اور سند کے حرام قرار دے لیا تھا اسی کو حصر اضافی کہتے ہیں۔

مجبوری کا مسئلہ

آگے فرمایا گیا ہے کہ اگر بالفرض کسی وقت کسی آدمی کے لئے ایسی صورت پیش آجائے کہ وہ جان بچانے کے لئے ان چار حرام چیزوں میں سے کچھ کھانے کے لئے مضطر اور مجبور ہو جائے تو دو شرطوں کے ساتھ اس کی اجازت دے دی گئی ہے۔ ایک یہ کہ صرف جان بچانے کے لئے کھائے، لذت حاصل کرنے کے لئے نافرمانی کرنے والا نہ ہو اور دوسری شرط یہ ہے کہ بس بقدرِ ضرورت کھائے حدِ ضرورت سے تجاوز نہ کرے۔ "غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ" کا یہی مطلب ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے "فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت اور صفتِ مغفرت کا کرشمہ ہے کہ مضطر کے لئے یہ گنجائش دے دی گئی اور آخرت میں اُس سے اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔

کچھ حلال چیزیں جو تورات میں حرام کی گئیں

آگے " وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا" سے جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس کی حیثیت اسی تحلیل و تحریم کے سلسلہ میں مزید وضاحت کی ہے۔ اوپر والی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حرام صرف یہ چار چیزیں ہیں، اس پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تورات کے ذریعہ جو شریعت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کو ملی تھی اس

میں توان چار کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں حرام کی گئی تھیں چنانچہ ناخن اور سُم والے سارے جانور حرام کیے گئے تھے اور گائے بکری وغیرہ کی چربی (بعض خاص اعضاء کی چربی کو مستثنیٰ کرکے) حرام کی گئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بھی خبیث اور گندی ہیں، پھر ان کو قرآن میں کیوں حرام نہیں قرار دیا گیا؟ گویا اسی کے جواب میں فرمایا گیا ہے۔

"وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ، وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَا اَوِالْحَوَايَآ اَوْمَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ، ذٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصٰدِقُوْنَ"۔

مطلب یہ کہ یہودیوں پر جو یہ چیزیں حرام کی گئی تھیں، یعنی ناخن اور سُم والے جانور، جیسے اونٹ، شتر مرغ، بط، قاز وغیرہ۔ اور گائے بھینس اور بھیڑ بکری کی چربی (سوائے اُس چربی کے جو اِن جانوروں کی پشت پر ہو یا انتڑیوں پر ہو یا ہڈی سے لگی ہو) تو یہ چیزیں اس وجہ سے حرام نہیں کی گئی تھیں کہ ان مین کوئی خباثت اور گندگی ہے، بلکہ یہودیوں کے لئے ان چیزوں کی تحریم اُن کی سرکشی اور بغاوت کی سزا کے طور پر تھی، گویا اس تحریم کے ذریعہ ان کو بطور سزا کے ان نعمتوں سے محروم کر دیا گیا تھا، اس لئے یہ تحریم وقتی اور عارضی تھی، جو اَب منسوخ کر دی گئی۔ آخر میں فرمایا گیا ہے کہ یہ ایک سچی تاریخی حقیقت ہے اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے (وَإِنَّا لَصٰدِقُوْنَ)۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "فَإِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ وَّلَايُرَدُّ بَأْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ" مطلب یہ ہے کہ اگر اس وضاحت کے بعد بھی یہ آپ کی تکذیب کریں اور کٹ حجتی سے باز نہ آئیں تو آپ ان سے کہہ دیں اور اُن کو سُنا دیں کہ یہ مت سمجھو کہ خدا تمہارے جرم اور تمہاری ہٹ دھرمی کو دیکھ نہیں رہا یا وہ تمہاری ان حرکتوں سے راضی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کی رحمت کا دامن بڑا وسیع ہے وہ مجرموں کو فوراً ہی عذاب کی گرفت میں نہیں لے لیتا بلکہ ان کو پوری مہلت دیتا ہے تاکہ اگر وہ رجوع اور تلافی کرنا چاہیں تو کرسکیں، اس نے تم کو بھی اپنے اسی دستور کے مطابق مہلت دے رکھی ہے۔ لیکن جب اس کی طرف سے عذاب اور سزا کا فیصلہ ہو جائے گا تو پھر کسی طاقت اور کسی تدبیر سے اس عذاب کو مجرموں سے روکا نہ جاسکے گا۔ (وَلَايُرَدُّ بَأْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ)۔

ایک جاہلانہ منطق کا جواب

آگے "سَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا" سے مشرکین کی ایک جاہلانہ منطق کا ذکر کر کے اس کی تردید کی گئی ہی وہ اپنے کافرانہ اور مشرکانہ طور طریقوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ایک بات یہ بھی کہتے تھے کہ ہم جس راستے پر چل رہے ہیں اگر یہ خدا کی مرضی کے خلاف ہوتا تو وہ ہمیں اس پر چلنے ہی نہ دیتا حالانکہ ایسا نہیں ہو رہا ہے ہم برابر اس راستے پر چل رہے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادے بھی چلتے رہے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ راستہ اللہ کی مرضی کے خلاف نہیں ہے۔ حالانکہ یہ دلیل نہیں محض جاہلانہ ڈھکوسلہ ہے، یہ بات تو چور اور ڈاکو اور بُرے سے برا پیشہ کرنے والے بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس دُنیا میں سب کچھ کرنے کی جو آزادی ملی ہوئی ہے یہ ہرگز اس کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ ہر کوئی جو کچھ کر رہا ہے وہ اللہ کی مرضی کے مطابق ہے۔ ارشاد ہے:

"سَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشۡرَکۡنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ شَیۡءٍ، کَذٰلِكَ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ حَتّٰی ذَاقُوۡا بَاۡسَنَا، قُلۡ هَلۡ عِنۡدَکُمۡ مِّنۡ عِلۡمٍ فَتُخۡرِجُوۡهُ لَنَا، اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا تَخۡرُصُوۡنَ۔ قُلۡ فَلِلّٰهِ الۡحُجَّةُ الۡبَالِغَةُ فَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ"۔

مطلب یہ ہے کہ یہ مشرکین یہ بھی کہیں گے کہ اگر اللہ یہ چاہتا کہ ہم شرک نہ کریں اور جن چیزوں کو ہم نے حرام قرار دیا ہے اُن کو حرام قرار نہ دیں، تو پھر ہم اور ہمارے باپ دادے اللہ کی قدرت اور اس کے ارادہ کے سامنے مجبور ہو جاتے اور ان میں سے کوئی بات بھی نہ کر سکتے، نہ ہم شرک کرتے نہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کو حرام کر سکتے۔ اور جب ہم یہ سب کر رہے ہیں اور اس کے باوجود اس دُنیا میں ٹھاٹھ سے جی رہے ہیں، تو ثابت ہوا کہ یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں سب ٹھیک ہے اور اللہ یہی چاہتا ہے۔ اس کے جواب میں پہلے تو اُن کے انجام سے خبردار کرنے کے لئے یہ فرمایا گیا کہ ان سے پہلے منکرین حق نے بھی اسی طرح کی کٹ حجتی کر کے اور منطق بگھار کے داعیانِ حق کو جھٹلایا تھا جس کے نتیجہ میں اُن پر ہمارا عذاب آ گیا تھا۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ تو تمہارے خیالی تیر تکّے اور بے اصل اوہام ہیں۔ اگر کوئی علم

یقین والی بات ہو تو پیش کرو۔ اس کے بعد فرمایا گیا "قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَة" مطلب یہ ہے کہ جب ان کی بات کا غلط اور بے بنیاد اور بے سند ہونا ظاہر ہو گیا تو اے رسول ان سے کہئے کہ پھر اللہ کی قطعی حجت جو اُس کے پیغمبروں کے ذریعہ آئی ہے۔ جس میں تمہارے شرک اور اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کی تحریم کو بدترین جرم قرار دیا گیا ہے وہ قائم اور ثابت ہو چکی۔ اب تم اس کے بارہ میں کوئی معذرت بھی نہیں کر سکتے۔ اور یہ بے شک صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا قادرِ مطلق ہے کہ اگر وہ تم سب کو ہدایت سے نوازنا چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا (فَلَوْشَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْن) لیکن اس کی حکمت کا تقاضا اور فیصلہ یہی ہے کہ وہ بندوں کو راہِ حق پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کرے گا، اس نے بندوں کو پیدا فرما کر ایک درجہ کی فکر و عمل کی آزادی دے دی ہے، اور جو جس راستے پر چلنا چاہتا ہے اللہ اس کو اس کا موقع دے دیتا ہے، یہی اس کی مشیت ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ ان کو حق کی دعوت اور تعلیم دلوائی ہے اور بتلا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے کیا چاہتا ہے اور اس کی رضا اور غضب کا قانون کیا ہے۔ اور چونکہ تم خدا کی دی ہوئی آزادی اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں کو اس کی ہدایت کے مخالفت میں استعمال کر رہے ہو، اور تمہاری شرارت حد سے بڑھ گئی ہے، اس لئے خدا نے تمہیں ہدایت سے نوازنا نہیں چاہا اگر وہ چاہتا تو تم کو بھی ہدایت کی نعمت دے سکتا تھا۔ (فَلَوْشَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْن)۔

تحلیل اور تحریم صرف اللہ کا حق

مشرکین جن خرافات میں مبتلا تھے جیسا کہ اوپر کی آیات میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اُن میں سے ایک یہ گمراہی بھی تھی کہ بہت سی حلال طیب غذاؤں کو انہوں نے حرام کر رکھا تھا اس کے لئے اُن کی سب سے بڑی سند یہ تھی کہ ہمارے بڑوں نے اور قومی رہنماؤں نے جن کی ہم پیروی کرتے ہیں، ہم کو یہی بتایا ہے کہ خدا نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔ اگلی آیت میں اس کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ اپنے ان رہنماؤں کو لاؤ وہ اس کی شہادت دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی میں ذرّہ برابر بھی احساسِ ذمہ داری ہو گا تو وہ ایسی غلط بات خدا کے بارہ میں نہ کہے گا اگر کوئی شخص [illegible] کے ایسی بات کہے گا تو کوئی

دلیل اور سند نہ پیش کر سکے گا۔رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَ كُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ"۔

مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ تم اپنے ان رہنماؤں کو لاؤ جو اس کی شہادت دیں کہ ان چیزوں کو خدا تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، امید یہی ہے کہ خدا پر ایسے صریح افتراء کی جرأت کوئی نہ کرے گا۔لیکن اگر بالفرض وہ اس کی شہادت دیں تو اے پیغمبر تم اس میں ان کی ہمنوائی نہ کرنا۔ بلکہ پوری قوت سے اس کی تردید کرنا اور ایسے لوگوں کی بدعات پر مت چلنا جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں اور آخرت کو نہیں مانتے ہیں۔اور دوسری ہستیوں کو خدا کے برابر کرتے ہیں۔

یہاں تک مشرکین کی تحریم طیبات والی مشرکانہ بدعت پر کلام کیا گیا اور مختلف پہلوؤں سے اس کی تردید کی گئی جس سے یہ بات پور طرح ظاہر ہوگئی کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا صرف اللہ کا حق ہے اور کسی اور کے لئے بھی یہ حق تسلیم کرنا ایک طرح کا شرک ہے اور اسی طرح بغیر معتبر سند اور دلیل کے یہ کہنا کہ فلاں چیز کو خدا نے حرام یا حلال کیا ہے اُس پر افتراء اور سنگین جرم ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ ان مشرکوں سے کہئے کہ تم نے جن چیزوں کو خواہ مخواہ اور بغیر کسی سند کے حرام قرار دے رکھا ہے، اس کی حقیقت تو تم کو بتادی گئی کہ خدا نے ہرگز ان کی حرمت کا حکم نہیں دیا ہے۔اب آؤ میں تم کو بتاؤں کہ فی الحقیقت کن کن چیزوں اور کن کن باتوں کو خدا نے حرام کیا ہے اور اُس کے بنیادی احکام کیا ہیں! قل تعالو اتل الخ

(اس کے بعد کا حصہ درس آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایئے)۔(مرتب)



(درس-۱۱)

دِین حق کی بنیادی اور اَبدی ہدایات

انسانوں کیلئے ان کے رب کی مقرر کی ہوئی صراطِ مستقیم

بندوں کو اُن کے پروردگار کی وصیّت

(گذشتہ سے پیوستہ)

{گذشتہ درس والے صفحات میں پڑھی گئی کچھ آیتوں کا تفسیری حصہ جو وہاں درج نہیں ہوا ہے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے جو حسب ذیل نوٹ کے ساتھ الفرقان محرم ۱۳۹۰ھ میں شائع ہوا تھا۔ مرتب}

۸/فروری کو سورۂ الانعام کے ۱۷ہویں اور اٹھارویں رکوع کا درس ہوا تھا یہ دونوں رکوع اوران کا ترجمہ گذشتہ اشاعت میں قارئین پڑھ چکے ہیں۔ لیکن صفحات میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے تشریح اور تفسیر صرف ۱۷ہویں رکوع کی شائع ہو سکی تھی، اٹھارویں رکوع کی تشریح وتفسیر ناظرین آج کی صحبت میں ملاحظہ فرمائیں۔

سلسلۂ کلام کے استحضار کے لئے یہ یاد کرلیا جائے کہ ۱۷ویں رکوع سے پہلے قریباً دس آیتوں میں مشرکین عرب کی اس گمراہی کا ذکر کیا گیا تھا کہ انہوں نے بہت سی اُن حلال طیب چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے، خواہ مخواہ حرام ٹھہرالیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں ایک پوری شریعت گڑھ لی ہے اوراس کو بالکل بے دلیل اور بے سند اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں جو جرم عظیم ہے۔ اس کے بعد ۱۷ویں رکوع میں ان کی اسی گمراہی اوراس مجرمانہ حرکت پر زیادہ تفصیل کے ساتھ تبصرہ فرمایا گیا اوراس بارے میں جو کچھ وہ کہتے تھے اُس کی بھرپور مدلل تردید فرمائی گئی۔ اس سب کے بعد اٹھارویں رکوع میں جوان الفاظ سے شروع ہوتا ہے "قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ رَبُّكُمْ۔ الخ "رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرمایا

گیا ہے کہ آپ ان مشرکوں سے کہئے کہ تم نے جن چیزوں کو خواہ مخواہ اور بغیر کسی سند کے حرام قرار دے رکھا ہے، اس کی حقیقت تو تم کو بتا دی گئی اور تمہیں معلوم ہو گیا کہ یہ سب بے اصل جاہلانہ خیالات وخرافات اور شیطانی تسویلات ہیں۔ اب آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارے پروردگار نے واقعۃً کن کن باتوں کو حرام قرار دیا ہے اور اپنے بندوں کے لئے اس کی بنیادی وصیتیں اور ہدایتیں کیا ہیں جو پیغمبروں کے ذریعہ ہمیشہ دی جاتی رہی ہیں۔

الغرض اس اٹھارویں رکوع میں اللہ تعالیٰ کی ان بنیادی اور دائمی ہدایات کو بیان فرمایا گیا ہے جو پیغمبروں کے ذریعہ ہر دور میں انسانوں کو دی جاتی رہی ہیں اور آخر میں فرمایا گیا ہے کہ یہی بندوں کے لئے ان کے رب کی خاص وصیتیں اور اس کی مقرر کی ہوئی صراطِ مستقیم ہے جس کی پیروی کرنی چاہئے۔

اس تمہیدی نوٹ کے بعد درس کا وہ حصہ ملاحظہ فرمایا جائے جو گذشتہ شمارہ میں شائع ہونے سے رہ گیا تھا۔

ارشاد ہے:

"قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا، وَلَا تَقْتُلُوْآ اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ، نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ، وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ، ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ"۔

مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر اپنی قوم کے اُن لوگوں سے کہئے جنہوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی بہت سی حلال اور طیب چیزوں کو حرام بنالیا ہے اور ایک پوری شریعت گڑھ لی ہے اور بغیر دلیل اور سند کے اس کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان سے کہئے کہ آؤ مجھ سے سنو، میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارے پروردگار نے فی الواقع کن کن باتوں کو حرام قرار دیا ہے، اور تمہارے لئے اور سب بندوں کے لئے اس کی بنیادی ہدایتیں کیا ہیں؟ ۔ سنو سب سے اہم اور مقدم ہدایت اس کی یہ ہے کہ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا یعنی اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ نہ اس کی ذات میں نہ اس کی صفات میں، نہ اُس کے حقوق میں۔ یہ اللہ کی وہ ہدایت اور حکم وہ ہے جو ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو سب سے پہلے پہنچایا ہے

اس کے بعد دوسرے نمبر کی اس کی ہدایت یہ ہے کہ ''وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَاناً''۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرو، ان کی فرماں برداری اور خدمت کرتے رہو۔ قرآن پاک میں اور تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں خالق کے بعد مخلوق پر سب سے بڑا حق ماں باپ ہی کا بتایا گیا ہے، ان کو اللہ تعالیٰ نے پیدائش کا اور پھر پرورش کا وسیلہ بنایا ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا اسی طرح اللہ کی عبادت اور توحید کی ہدایت کے ساتھ ماں باپ کے ساتھ حُسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر اس سے بھی زیادہ وضاحت فرمائی گئی ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

''وَقَضیٰ رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْآ اِلَّا اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَاناً، اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلَاھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلاً کَرِیْماً، وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیَانِیْ صَغِیْراً''۔

مطلب یہ ہے کہ تمہارے رب کا قطعی حکم ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ صرف اسی کی عبادت اور پرستش کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک ہی تمہارے سامنے بوڑھے ہو جائیں (اور بظاہر تمہارے لئے بوجھ بن جائیں) تب بھی اس کی پوری احتیاط کرو کہ ان کے لئے کوئی نازیبا اور ناگوار بات زبان سے نہ نکالو، اور ان کے سامنے اپنے کو ادب سے جھکائے رکھو اور اس عملی برتاؤ کے علاوہ ان کے حق میں خدا سے دعا بھی کرو کہ اے اللہ ان پر اپنی رحمت فرما جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں پالا اور پرورش کیا تھا۔

توشرک سے پرہیز اور توحید پر قائم رہنے کی پہلی ہدایت کے بعد دوسری ہدایت یہ دی گئی کہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور اُن کے خدمت گزار اور فرماں بردار بن کے رہو (وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَاناً) اس کے بعد تیسری ہدایت یہ فرمائی گئی ''وَلَاتَقْتُلُوْآ اَوْلَادَکُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ'' یعنی مفلسی کی وجہ سے اپنے بچوں بچیوں کو ہلاک نہ کر ڈالو۔

عربوں میں انتہائی درجہ کی جو گمراہیاں رائج تھیں اُن میں سے ایک یہ شقاوت بھی تھی کہ بعض غریب اور نادار لوگ بچہ پیدا ہونے کے بعد اس کو اس خیال سے کہ خود ہمارے کھانے

کو تو ہے نہیں انہیں کہاں سے کھلائیں گے، خود اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیتے تھے۔ اللہ کی پناہ! یہ وہ شقاوت ہے جو بھیڑیوں، چیتوں، اور سانپوں، بچھوؤں میں بھی نہیں تھی۔

قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ بعض دوسرے اسباب اور خیالات کی بنا پر بھی بے چارے معصوم بچوں کو ختم کیا جاتا تھا، مثلاً خاص خاص بتوں اور دیوتاؤں کے بھینٹ اور چڑھاوے کے طور پر ان کو قربان کر دیا جاتا تھا۔ اسی سورۂ انعام میں کچھ ہی پہلے یہ آیت گزر چکی ہے "وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ" اس آیت میں بچوں کے اسی قتل کا ذکر ہے جو یہ مشرکانہ خیالات و توہمات کی بنا پر بتوں کے بھینٹ اور چڑھاوے کے لئے بچوں کو قربان کر دیتے تھے اور اپنی جہالت و بدبختی سے اس کو نیکی سمجھتے تھے اور اس سے بڑی برکتوں کی اُمید رکھتے تھے۔ ایک تیسری شکل قتل اولاد کی بعض خاص قبیلوں اور طبقوں میں یہ بھی رائج تھی کہ صرف بے چاری لڑکیوں کو ان کے جاہل و ظالم باپ اس خیال سے ختم کر دیتے تھے کہ اگر یہ زندہ رہیں گی تو کسی کے ساتھ شادی ہوگی، پھر وہ ہمارا داماد بنے گا۔ اس کو وہ جاہل اپنے لئے باعثِ عار سمجھتے تھے۔ اور اس سے بچنے کے لئے بے چاری لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ سورۂ تکویر میں غالباً اسی کے بارے میں فرمایا گیا ہے "وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ، بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ" مطلب یہ ہے کہ اُس دن کو یاد کرو اور اس منظر کا ذرا خیال کرو جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت برپا ہوگی اور جس معصوم بچی کو زندہ زمین میں گاڑ دیا گیا تھا اُس سے پوچھا جائے گا کہ اے معصوم بچی! بتا کہ تجھے کس جرم میں زندہ زمین میں گاڑا گیا تھا۔ جن لوگوں کو عربی زبان کا ذوق ہو وہ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس سوال میں کتنا جلال و غضب بھرا ہوا ہے۔ اور اس ظلم کے کرنے والوں کے لئے کتنے شدید عذاب کی اس میں آگاہی ہے۔

تو قرآن مجید سے بھی اور عربوں کی تاریخ سے بھی قتل اولاد کی ان تین شکلوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے پہلی صورت یعنی بچے کے کھانے پینے اور پرورش کے اقتصادی اور معاشی بوجھ سے بچنے کے لئے اس کو ختم کر دینے کا رواج نسبتاً زیادہ تھا اور یہ غالباً دنیا کی اور قوموں میں بھی رہا ہے اور آج کل بھی اخبارات میں کبھی کبھی اس طرح کے واقعات کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ غالباً اسی لئے اس

کی ممانعت کو بنیادی ہدایات میں شامل کیا گیا ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس ظلم و شقاوت کی جڑ بنیاد دراصل یہ جاہلانہ اور گمراہانہ نظریہ ہے کہ اپنے بچوں کے رازق اور روزی رساں ہم ہیں۔ اور جب ہمارے پاس روزی کا سامان نہیں تو پھر ان بچوں کو کہاں سے کھلائیں گے؟ اس لئے وہ ان کو پیدا ہوتے ہی ختم کر دینا آسان سمجھتے تھے۔ اسی لئے قرآن پاک میں اس کی ممانعت کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا کہ نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَاِیَّاھُمۡ کہ رزق اور روزی دینے والے تو ہم ہیں۔ تمہاری پرورش بھی ہمارے ہی رزق سے ہوئی ہے اور ہو رہی ہے۔ اسی طرح ان بچوں کی پرورش بھی ہمارے ہی رزق سے ہوگی۔

عرب کے ان اَن پڑھ مشرکوں نے اقتصادی و معاشی مسئلہ کا حل یہ سمجھا تھا کہ پیدا ہونے والے بچوں کو جینے نہ دو، پیدا ہونے کے ساتھ ہی ان کو ختم کر دو، ہمارے زمانہ کے پڑھے لکھے خداناشناسوں نے یہ ترقی یافتہ حل نکالا ہے کہ بچوں کو پیدا ہی نہ ہونے دو۔ اس کے لئے حکومتیں منصوبے بناتی ہیں اور ان پر کروڑوں بلکہ اربوں روپیہ خرچ کرتی ہیں لیکن اس کی بھی جڑ بنیاد یہی گمراہی ہے کہ رزق اور روزی کا مسئلہ اللہ کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ اپنے ہاتھوں میں سمجھا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید کی یہ آیت ان حکومتوں کو بھی یہ پکار کر کہہ رہی ہے۔ "نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَاِیَّاھُمۡ" اگر آدمی سمجھنا چاہے تو کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے، برابر اس کا تجربہ ہو رہا ہے کہ اللہ نے انسان کو وہ عقل و فکر دی ہے جس سے وہ ان تدبیروں کو سوچ سکتا ہے اور وہ آلات ایجاد کر سکتا ہے جن کے ذریعے ضروریات بڑھنے کے ساتھ زمین سے پیداوار بڑھاتے چلے جائیں۔ اور زمین میں وہ صلاحیت رکھی ہے کہ جو پیداوار اس سے ہوتی ہے اس پر دسوں بیسوں گنا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا اور زمین میں اتنی ہی پیداوار ہوا کرتی جتنی اب سے دو چار سو برس پہلے ہوتی تھی تو ہمیں اور آپ کو کھانے کے لئے ایک دانہ بھی نہ ملتا۔

یہاں تک تین بنیادی ہدایتیں ہوئیں۔ چوتھی ہدایت یہ فرمائی گئی کہ "وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنۡھَا وَمَا بَطَنَ" فواحش فاحشہ کی جمع ہے، فاحشہ اس فعل کو کہتے ہیں جو انسانی شرم و حیا کے بالکل خلاف ہو، جیسے زناکاری اور اس کے قبیل کی چیزیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ زنا اور اُس جیسی دوسری گندی اور شرمناک باتوں کے پاس نہ جاؤ۔ کسی چیز

سے الگ اور دور رہنے کی تاکید کرنی ہو تو یہی کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ اس سے دور ہی دور رہو۔ حقیقتاً وہ خبیث افعال جنھیں فواحش کہا گیا ہے ایسے ہی گندے اور ناپاک ہیں کہ اللہ کے بندہ کو ان سے دور ہی رہنا چاہئے۔ ماظھر منھا ومابطن کا مطلب یہ ہے کہ ان بدفعلیوں سے بھی بچو اور دور رہو جن کا فاحشہ اور بے حیائی والا عمل ہونا بالکل علانیہ اور کھلا ہوا ہو، اور اُن بدفعلیوں سے بھی دور رہو جن کی یہ حیثیت کچھ ڈھکی چھپی ہو۔ جیسے آنکھ کی بدفعلی، ہاتھ کی بدفعلی، زبان کی بدفعلی، ان سب کو رسول اللہ ﷺ نے حدیث پاک میں ان اعضاء کا زنا بتلایا ہے۔ یہ چوتھی ہدایت ہوئی۔

پانچویں ہدایت یہ فرمائی گئی ہے کہ "وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ" مطلب یہ ہے کہ اللہ نے آدمی کو پیدا کیا اور اس کی جان کو قابلِ احترام قرار دیا ہے۔ لہٰذا جب تک وہ کوئی ایسا جرم نہ کرے جس کی وجہ سے اس کا خون بہانا اور ہلاک کیا جانا خدا کے قانون کی رُو سے درست ہو جائے، اس کو قتل نہ کیا جائے۔ حاصل یہ کہ اللہ کے حکم کے بغیر کسی بھی آدمی کا قتل کرنا قطعاً حرام ہے۔

اللہ کے قانون میں تین جرم ایسے ہیں جن کی سزا قتل ہے۔ ایک تو ناحق قتل کی سزا قتل ہے، یعنی اگر کوئی آدمی کسی دوسرے کو قصداً ناحق قتل کر دے تو قصاص میں اس کو قتل کیا جائے گا۔ دوسرے کسی شادی شدہ کا زنا کرنا ایسا جرم ہے کہ شریعتِ اسلام میں اس کی سزا سنگ ساری ہے۔ جو قتل کی بھی انتہائی اذیت ناک شکل ہے۔ تیسرے ارتداد یعنی اللہ کا دین اسلام قبول کر کے پھر اُس سے غداری کرنا اور کفر اختیار کر لینا، ایسا شخص بھی خدا کے قانون کی رُو سے واجب القتل ہو جاتا ہے۔ لیکن ان سزاؤں کا اختیار بھی صرف حاکم اسلام کو ہے۔ عوام میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان مجرموں کو بھی قتل کر سکیں اگر وہ ایسا کریں گے تو خود مجرم ہوں گے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اس آیت "لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ" میں جو قتل ناحق کو حرام قرار دیا گیا ہے تو یہ صرف مسلمانوں ہی کے حق میں نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح کسی مسلمان کا ناحق قتل حرام اور سنگین گناہ ہے اُسی طرح غیر مسلم کا قتل بھی حرام اور ایسا ہی سنگین گناہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی مشہور حدیث ہے "من قتل معاهداً لم

برح رائحۃ الجنۃ'' یعنی جو کوئی کسی غیر مسلم معاہد کو ناحق قتل کرے گا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا(۱)، معاہد ہر وہ غیر مسلم ہے جو مسلمانوں کے ساتھ کسی معاہدہ کی بنیاد پر رہتا ہو، خواہ وہ معاہدہ انفرادی ہو یا اجتماعی اور خواہ حکومت اسلامی ہو یا غیر اسلامی، مثلاً ہم اپنے ملک میں غیر مسلموں کے ساتھ رہتے ہیں تو ہم سب کا ایک اجتماعی غیر رسمی معاہدہ ہے اور ہم سب ایک دوسرے کے لئے معاہد ہیں، اور اس لئے ناحق کسی غیر مسلم کا خون بہانا بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح مسلمان کو قتل کرنا۔

یہاں تک پانچ ہدایتیں فرمائی گئیں۔ (۱) شرک نہ کرو۔ (۲) ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو، انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ پہونچاؤ اور دل نہ دکھاؤ۔ (۳) غریبی اور افلاس کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ (۴) زنا جیسی بدفعلیوں سے دور رہو۔ (۵) کسی آدمی کا خون نہ بہاؤ جب تک وہ کسی ایسے جرم کا ارتکاب نہ کرلے جس کی وجہ سے اس کا قتل کیا جانا ضروری ہو جائے۔

یہ پانچوں ہدایتیں ایسی ہیں کہ انسانی عقل بدیہی اور فطری طور پر خود بھی ان کو ضروری سمجھتی ہے۔ اسی لئے ان ہدایتوں کے بعد متصلاً فرمایا گیا ہے ''ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ'' کہ تمہیں یہ ہدایتیں دی گئی ہیں، تمہیں چاہئے کہ اپنی عقلوں سے کام لو اور سوچو سمجھو کہ یہ باتیں کس قدر معقول ہیں اور ان میں تمہارے لئے کتنی خیر اور بھلائی ہے۔

ان پانچ کے بعد چار ہدایتیں اس کے بعد والی آیت میں دی گئی ہیں۔ ارشاد ہے۔

''وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہٗ، وَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ، لَا نُکَلِّفُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَھَا، وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی، وَبِعَھْدِ اللّٰہِ اَوْفُوْا، ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ''۔

ان میں پہلی آیت کا تعلق خاص طور سے ان لوگوں سے ہے جو کسی کے انتقال کے بعد اس کے یتیم بچوں کے مال و جائداد کی دیکھ بھال کے ذمہ دار ہوتے ہیں، انہیں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، یعنی اس میں کوئی تصرف نہ کرو، ہاں نیک نیتی

(۱) صحیح بخاری، کتاب [illegible] باب ۵

سے اور یتیموں کی خیر خواہی پیش نظر رکھتے ہوئے ایسا تصرف کر سکتے ہو جس میں بھلائی ہو۔ آگے فرمایا "حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہ" یعنی یہ ہدایت اور تاکید اُس وقت تک کے لئے ہے جب تک کہ وہ یتیم اُس عمر تک نہ پہونچ جائے جب کہ وہ اپنے مالی معاملات خود دیکھ بھال سکے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی آدمی کا انتقال ہو گیا اُس نے چھوٹے بچے چھوڑے اور اُن کے لئے مال و جائداد بھی چھوڑی ایسی صورت میں قریبی اعزہ ہی جائداد اور مال و کاروبار کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اب اگر ان کی نیت خراب ہو یا یتیموں کی جائداد اور مال و کاروبار کے سلسلہ میں وہ غفلت برتیں اور ذمہ داری کا جو حق ہے وہ ادا نہ کریں تو اس کا انجام یہی ہوگا کہ بے چارے یتیم بچوں کا اثاثہ برباد ہو جائے گا۔ اسی لئے اس آیت میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جو شخص یتیموں کے مال و جائداد کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہو اس کو بہت احتیاط، کامل دیانتداری اور ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ اپنا فرض اس وقت تک ادا کرنا چاہئے جبکہ وہ بچے اپنا کام خود سنبھالنے کے قابل ہو جائیں، وہ یتیموں کے مال و جائداد میں کوئی ایسا تصرف نہ کریں جو بہتر نہ ہو اور جس میں یتیموں کی بھلائی نہ ہو۔ سورۂ نساء کے شروع میں وہ آیت گزر چکی ہے جس میں ایسے لوگوں کو جو بدنیتی اور بد دیانتی سے یتیموں کے مال میں تصرف کریں جہنم کے سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتَامٰی ظُلْماً اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ نَاراً وَّسَیَصْلَوْنَ سَعِیْراً"۔ (جو لوگ ظالمانہ طور پر اور ناجائز طریقوں سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں جہنم کے انگارے بھرتے ہیں اور وہ دوزخ کی آگ میں جلیں گے)۔

دوسری ہدایت یہ فرمائی گئی ہے۔ "وَاَوْفُوْا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ" مطلب یہ ہے کہ خرید و فروخت کے وقت اور کسی کو اس کا حق ادا کرنے کے وقت پوری دیانتداری سے کام لو، بے ایمانی اور دھوکہ بازی بالکل نہ ہو۔ اسی کے ساتھ فرمایا گیا ہے "لَا نُکَلِّفُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَھَا" اسکا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا حکم اور اس کا مطالبہ بس یہ ہے کہ تم اپنی طرف سے اس کی پوری کوشش کرو کہ کسی کی حق تلفی تم سے نہ ہو، اگر بالفرض بھول چوک ہو جائے تو تم سے مواخذہ نہ ہوگا۔

ناپ تول میں بددیانتی بھی اُن سنگین گناہوں میں ... جن پر قرآن مجید میں

سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ ارشاد ہے "وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ، وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ، أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ، يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ" مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے بڑی ہی خرابی اور بڑا خوفناک عذاب ہے جو ناپ تول میں کمی بیشی کرتے ہیں، جب دوسروں سے ناپ کر لیتے ہیں تو بھرپور لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو بے ایمانی سے کم دیتے ہیں۔ کیا انہیں اس کا خیال نہیں ہے کہ وہ قیامت کے اُس عظیم دن میں جب سب لوگ خدا کے حضور میں پیش ہوں گے وہ بھی زندہ کئے جائیں گے اور خدا کی عدالت میں ان کی بھی پیشی ہوگی۔

اس کے بعد تیسری ہدایت یہ فرمائی گئی ہے "وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ" مطلب یہ ہے کہ جب کسی معاملہ میں تمہیں فیصلہ دینا ہو یا گواہی دینی ہو تو حق وانصاف کی بات کہو، اگرچہ معاملہ کا کوئی فریق تمہارا عزیز قریب ہی کیوں نہ ہو۔ تم اس کے نفع نقصان اور رضامندی اور ناراضی کی بالکل پروا نہ کرو۔ اسی طرح رشوت وغیرہ مالی منفعت کی وجہ سے بے انصافی نہ کرو، بلکہ وہی کہو جو دیانت داری سے حق وانصاف کا تقاضا ہو۔

چوتھی اور آخری ہدایت جو سب سے زیادہ جامع ہے یہ فرمائی گئی ہے "وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا" یعنی اللہ کا عہد پورا کرو۔ اس سے مراد بظاہر وہ عہد و میثاق ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیوں کے ذریعہ بندوں سے لیا جاتا رہا ہے، مثلاً یہ کہ اُس کی عبادت وفرماں برداری کریں، اُس کی مقرر کی ہوئی شریعت اور صراط مستقیم پر چلیں، اُس کے نبیوں کی پیروی کریں۔ انبیاء علیہم السلام جو ایمان کی دعوت دیتے ہیں وہ دراصل اسی عہد و میثاق کی دعوت دیتے ہیں، اور جو شخص ان کی دعوت پر ایمان لاتا ہے وہ دراصل اللہ تعالیٰ سے یہ عہد و میثاق کرتا ہے۔ "بِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا" میں اسی عہد و میثاق کے پورا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے، اسی لئے میں نے عرض کیا کہ یہ جامع ترین ہدایت ہے، اور اس کی وسعت میں وہ سب جائز عہد و معاہدے بھی آ گئے جو بندے آپس میں کرتے ہیں اور جن کے پورا کرنے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے۔ یہی ہدایت سورۂ بنی اسرائیل میں ان الفاظ میں دی گئی ہے۔

"وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا"

اپنے عہد معاہدوں کو پورا کرو، ان کے بارے میں آخرت میں تم سے باز پرس ہوگی۔

پہلی پانچ ہدایتوں کے بعد یہ چار ہدایتیں اور ہوئیں۔ (۱) یتیموں کے مال کے بارے میں بہت محتاط رہو۔ (۲) ناپ تول میں پوری دیانت داری سے کام لو۔ (۳) گواہی میں اور اسی طرح فیصلہ میں کسی کی طرفداری نہ کرو بلکہ خدالگتی کہو۔ (۴) اللہ کے عہد و میثاق کو پورا کرو۔

ان چاروں ہدایتوں کا تعلق زیادہ تر اُن دنیوی معاملات سے ہے جن میں اکثر لوگوں سے لغزش ہوتی ہے۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی اُن احکام اور ہدایات کو اور آخرت میں اللہ کے سامنے حاضری اور حساب اور وہاں کی جزا سزا کو یاد کرے اور یاد رکھے۔ اسی لئے ان چار ہدایتوں کے بعد فرمایا گیا ہے "ذَالِكُمْ وَصَّاكُم بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ" مطلب یہ ہے کہ تمہیں یہ ہدایتیں دی گئی ہیں۔ چاہئے کہ ان کو یاد رکھو، نصیحت حاصل کرو اور عمل کرو۔

اس کے بعد آخر میں فرمایا گیا ہے

"وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيماً فَاتَّبِعُوْهُ، وَلَاتَتَّبِعُو السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ، ذٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ"۔

اس کا تعلق اوپر کے پورے مضمون سے ہے، مطلب یہ کہ جو نو بنیادی ہدایتیں یہاں ایک خاص ترتیب کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں، یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی صراط مستقیم ہے، یہی اللہ تعالیٰ کی رضا اور نجات و فلاح کا راستہ ہے، اللہ کے سب پیغمبروں نے اپنی قوموں اور اُمتوں کو اس کی دعوت اور تعلیم دی تھی، تم بھی اس کی پیروی کرو۔ اس کے علاوہ جو دوسرے راستے اور طریقے نکال لئے گئے ہیں وہ خدا کے مقرر کئے ہوئے راستے نہیں ہیں، ان پر چلو گے تو اللہ کی صراطِ مستقیم سے ہٹ جاؤ گے اور جو منزل مقصود ہے یعنی اللہ کی رضا اور نجات و فلاح اُس سے محروم ہو جاؤ گے۔ آخر میں فرمایا گیا ہے "ذَالِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس صراطِ مستقیم کی وصیت اور نصیحت تم کو اس لئے کی ہے کہ اس پر چل کر تمہاری زندگی تقوے والی ہو جائے اور پھر تم اس کے غضب اور عذاب سے بچ جاؤ اور اس کی رضا اور جنت پالو جو اس کے متقی بندوں کا حصہ اور نصیب ہے۔

ان آیتوں کے سلسلہ میں ایک وضاحت اور ضروری ہے۔ سلسلۂ کلام ان الفاظ سے شروع ہوا تھا، "قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ" (اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو آؤ میں تمہیں سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے) ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے کہ آگے وہ چیزیں ذکر کی جائیں گی جنھیں اللہ نے بندوں کے لئے حرام قرار دیا ہے لیکن جو نو ہدایتیں اس کے بعد ذکر فرمائی گئی ہیں اُن میں سے کچھ منفی ہیں اور کچھ مثبت ہیں، مثلاً فرمایا گیا شرک نہ کرو، اولاد کو قتل نہ کرو، فواحش کے پاس نہ جاؤ، کسی کو ناحق قتل نہ کرو، یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، یہ پانچ ہدایتیں منفی ہیں اور ممانعت کی صورت میں لکھی گئی ہیں جن سے معلوم ہو گیا کہ یہ پانچ باتیں حرام ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ باقی چار ہدایتیں ایجابی شکل میں دی گئی ہیں، یعنی چار کاموں کے کرنے کا حکم تاکید کے ساتھ دیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، ناپ تول پوری کرو، عدل وانصاف کی بات کرو، خدا کا عہد پورا کرو۔ طرز بیان کے اس فرق میں خاص حکمت یہ ہے کہ جن پانچ چیزوں کی ممانعت فرمائی گئی ہے اُن میں شریعت کا اصل مقصد اور مطالبہ یہی ہے کہ یہ کام نہ کئے جائیں، اس لئے ان کے لئے ممانعت کا عنوان اختیار فرمایا گیا اور اس طرح ان کا حرام ہونا معلوم ہو گیا، اور جن چار باتوں کا مثبت انداز میں حکم دیا گیا ہے وہاں اصل مطلوب ان کاموں کا کرانا ہے۔ اگر چہ اسی مثبت حکم سے ان اعمال کی جانب مخالف کی حُرمت بھی معلوم ہو گئی، کیونکہ جس چیز کے بارے میں شریعت کا حکم ہو گا کہ یہ واجب وفرض ہے تو اس کی ضد اور جانبِ مخالف کا حرام ہونا خود بخود معلوم ہو جائے گا، مثلاً والدین کیساتھ حسنِ سلوک فرض ہے تو اس کا لازمی اور بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ بدسلوکی اور ایذارسانی حرام ہے، اسی طرح ناپ تول صحیح اور پوری کرنا فرض قرار دیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس میں بددیانتی اور کمی بیشی حرام ہو گئی، علیٰ ہذا عدل وانصاف کی بات کہنا اور عہد کا پورا کرنا جب فرض وواجب کر دیا گیا تو اس کی ضد اور جانبِ مخالف یعنی بے انصافی اور بددیانتی اور عہد شکنی کی حرمت معلوم ہو گئی۔

یہ نو ہدایتیں جو سورۂ انعام کی ان آیتوں میں دی گئی ہیں ان کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی وصیت فرمایا گیا ہے اور مکرر سہ کرر فرمایا گیا ہے "ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ" یہ تمہارے رب کی وصیت ہے، یہ تمہارے پروردگار کی وصیت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جن کو قرآن مجید کے علم میں خاص امتیاز حاصل تھا اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ان کے اس امتیاز کی توثیق فرمائی تھی تفسیر ابن کثیر میں اُن کے بارہ میں روایت ذکر کی گئی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔

من أراد ان ينظر إلىٰ وصية رسول الله ﷺ التي عليها خاتمه فليقرء هؤلاء الأيات "قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ رَبُّكُمْ ......إلىٰ قوله لعلّكم تتّقون" (جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر بند وصیت دیکھنا چاہے اسے ان آیتوں کو پڑھنا چاہئے۔)

یوں تو قرآن مجید کا ہر حکم واجب العمل ہے لیکن ان آیتوں میں جو ہدایتیں اللہ تعالیٰ کی وصیت کے عنوان سے دی گئیں ہیں اُن کی یقیناً خاص اہمیت ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق دے کہ ان کی پابندی اور پیروی کا خصوصیت سے اہتمام کریں۔

و آخر دعوانا أن الحمد لِلّٰه ربّ العٰلمين.



سورۃ الاعراف

درس — ۱۲

(درس-۱۲)

"نبی اُمّی" کے
مبعوث ہو جانے کے بعد
اُن پر ایمان اور اُن کی شریعت کی پیروی نجات و فلاح کی شرط ہے

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَهٗ مَکۡتُوۡبًا
عِنۡدَهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ یَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡهٰهُمۡ
عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ
وَیَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ، فَالَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا بِهٖ وَعَزَّرُوۡهُ وَنَصَرُوۡهُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ
اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ۔ (الاعراف۔ ۱۵۶)

(ترجمہ) جو لوگ پیروی کرتے ہیں (خدا کے) اُس پیغمبر کی جو نبی اُمّی ہے، جس کو وہ لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں، جو اچھی پسندیدہ باتوں اور نیک کاموں کی ان کو ہدایت کرتا ہے اور بری باتوں اور ناپسندیدہ کاموں سے ان کو منع کرتا ہے اور نفیس پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتاتا ہے اور خراب گندی چیزوں کو ان کے لئے حرام ٹھہراتا ہے اور اُن کے بوجھ (جن کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے) اور وہ بندشیں جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے ان سے دور کرتا ہے۔

پس جولوگ اس نبی اُمّی پیغمبر پر ایمان لائے اور اس کی تائید اور حمایت کی اور (اس کے پیغمبرانہ مشن میں) اس کے مددگار ہوئے اور اُس نور ہدایت کی انہوں نے پیروی اختیار کی جو (خدا کی طرف سے) اس پیغمبر پر اتارا گیا ہے تو یہی لوگ فلاح یاب اور بامراد ہیں۔

تفسیر وتشریح

یہ سورۂ اعراف کے ۱۹ ویں رکوع کی آخری آیت ہے۔ اس سے اوپر کی آیتوں میں جو پچھلے ہفتہ زیر درس تھیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک واقعہ کا اور ان کی ایک اہم دعا کا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے جواب کا ذکر کیا گیا تھا۔ واقعہ یہ ذکر کیا گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل میں ستر نمائندے منتخب کر کے اپنے ساتھ مقررہ وقت پر اُس مقام پر لے گئے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا۔ ان نمائندوں کو ساتھ لے جانے کا مقصد یہ تھا کہ وہاں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ ہو اور اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت دی جائے اس کو یہ لوگ بھی ممکن حد تک دیکھ اور سُن سکیں۔ پھر خود ان کے دلوں میں اطمینان ویقین پیدا ہو اور اُن کے شہادت دینے اور بتانے سے قوم کے عوام میں بھی اطمینان ویقین پیدا ہو۔ لیکن ہوا یہ کہ بنی اسرائیل کے اِن نمائندوں نے خدا کی قدرت کی کھلی نشانیاں بھی دیکھیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو جو ہدایات دی گئیں اُس کو بھی سُنا لیکن مزاج کے فساد اور شرارت وسرکشی کی وجہ سے یہ سب کچھ دیکھنے، سننے کے بعد بھی کہا کہ ہم اُس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک کہ خدا کو کھلم کھلا ہم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، (لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً)۔

ان کی اس گستاخی پر خدا کا جلال ظاہر ہوا نیچے سے ''رجفہ''، یعنی سخت ہولناک بھونچال آیا اور اوپر سے ''صاعقہ''، یعنی بجلی کا ایسا کڑکا ہوا جس سے دل پھٹ جائیں۔ اُس سے یہ سب لوگ مردوں کی طرح گر پڑے۔ موسیٰ علیہ السلام نے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا کہ خداوندا تو مالک ومختار ہے۔ تجھے ہم سب کو ہلاک کر ڈالنے کا بھی پورا حق ہے۔ اور تو چاہتا تو میری قوم کے ان گستاخوں کی گستاخی سے پہلے اور اس جرم کے بغیر ہی انہیں اور اُن کے ساتھ مجھے بھی ختم کر سکتا تھا۔ کوئی تیرے فیصلہ کو روک نہیں سکتا تھا (رَبِّ لَوْ شِئْتَ

أَهْلَكْتَهُمْ مِنْ قَبْلُ وَإِيَّايَ) لیکن تو نے ہمارے بہت سے قصوروں اور کوتاہیوں کے باوجود ہمیں ہلاک نہیں کیا بلکہ ہمیں برابر انعامات سے نوازتا رہا۔ تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میری قوم کے ان جاہلوں بے وقوفوں کی ایک جاہلانہ اور احمقانہ حرکت کی وجہ سے آج تو ہم سب کو ہلاک کردے۔ یعنی یہ بات تیری شان کریمی سے بعید ہے۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ یہ جو تیری طرف سے جلال کا ظہور ہوا ہے یہ ہمارے لئے بس ایک آزمائش اور تنبیہ ہے (أَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ) اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے قصورواروں کے لئے بلکہ ان کے ساتھ پوری قوم کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ التجا کی۔

"أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ، وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ"۔

یعنی خداوندا! تو ہمارا والی اور کارساز ہے پس ہم کو بخش دے اور رحم فرما۔ تو سب سے اچھا بخشنے والا ہے۔ اور لکھ دے ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھی، ہم تیری طرف رجوع ہوگئے ہیں۔ یعنی ہم نے سب طرف سے یکسو ہو کر تیری طرف رُخ کرلیا ہے اور تیری بندگی اور فرماں برداری کا ارادہ کرلیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے جواب میں فرمایا گیا۔

"عَذَابِيْ أُصِيْبُ بِهٖ مَنْ أَشَآءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ، فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيَاتِنَا يُؤْمِنُوْنَ"۔

مطلب یہ ہے کہ میرے ہاں عذاب بھی ہے اور رحمت بھی لیکن عذاب سب کے لئے نہیں ہے۔ یہاں تک کہ سارے مجرموں اور گنہگاروں کے لئے بھی نہیں ہے۔ بلکہ صرف ان مجرموں کے لئے ہے جن کو میں عذاب دینے ہی کا فیصلہ کروں۔ یعنی جو اپنے سنگین جرموں کی وجہ سے معافی کے قابل ہی نہ ہوں۔ مگر میری رحمت ہر چیز کو محیط ہے کوئی شئے نہیں ہے جسے میری رحمت سے کچھ نہ کچھ حصّہ نہ مل رہا ہو، لیکن اے موسیٰ! جس رحمت خاصہ کی تم نے استدعا کی ہے کہ دنیا میں بھی حسنہ یعنی میرا فضلِ خاص ہو اور اسی طرح آخرت میں بھی خصوصی رحمت

وکرم ہو تو یہ چیز کسی خاص نسل یا کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہے اور نہ مخصوص کی جاسکتی ہے بلکہ یہ اُن بندوں کا حصہ ہے جن میں بنیادی طور پر یہ تین صفات ہوں۔

ایک یہ کہ ان میں تقویٰ اور پرہیز گاری ہو یعنی وہ سب بری باتوں اور برے کاموں سے بچنے اور پرہیز کرنے کا اہتمام کرتے ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ زکوٰۃ دیتے ہوں۔ جو اکثر دنیا والوں کے لئے سب سے مشکل کام ہوتا ہے اور تیسرے یہ کہ ہماری ساری آیتوں پر ایمان لائے ہوں۔ یعنی ہمارے سارے فرمانوں اور حکموں کو دل و جان سے مانتے ہوں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کی درخواست کا جواب ہوا۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ ہماری رحمت کا یہ خاص درجہ کہ دنیا اور آخرت دونوں میں ہمارا خصوصی فضل و انعام ہو۔ یہ اُن وفادار اور اطاعت شعار بندوں کے لئے طے شدہ ہے جو زندگی میں تقویٰ کا طریقہ اختیار کریں اور اپنی دولت اور کمائی اللہ کی رضا کے واسطے قربان کریں اور اللہ کے تمام فرامین اور احکام کو مانیں، تو قوم بنی اسرائیل میں سے جو لوگ رحمت الٰہی کا یہ خاص درجہ حاصل کرنا چاہیں وہ اپنے اندر یہ تین باتیں پیدا کریں، ان کو یہ درجہ مل جائے گا۔

اس کے بعد رکوع کی یہ آخری آیت ہے جو میں نے اس وقت آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ۔ الآیۃ

بہت سے مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی استدعا کا جو جواب دیا ہے، یہ آیت بھی اُسی کا جز ہے اور اس میں رحمت الٰہی کا خاص درجہ پانے والوں کی چوتھی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ نبی امی (یعنی آخری نبی حضرت محمد ﷺ) پر ایمان لائیں اور ان کی پیروی کریں لیکن میرے نزدیک دوسرے مفسرین کی یہ رائے قابل ترجیح ہے کہ اس آیت میں ایک دوسرا مستقل اہم اعلان کیا گیا ہے۔ اور اس کے مخاطب موسیٰ علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ حضرت محمد ﷺ کے دور کے بنی اسرائیل یعنی وہ یہود و نصاریٰ اس کے خصوصی مخاطب ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا پیغمبر مانتے تھے اور اپنے کو خدا کی خاص رحمت اور اُس کے خصوصی فضل و انعام کا مستحق سمجھتے تھے، تو اس آیت میں دراصل انہیں کو بتایا گیا ہے کہ اب جو کہ خدا کی طرف سے وہ "الرسول" اور "النبی الامی" (یعنی حضرت

محمد ﷺ) مبعوث ہو گئے جن کا ذکر تمہاری مقدس الہامی کتابوں تورات وانجیل میں موجود ہے اور ایسا تفصیلی ذکر موجود ہے کہ گویا وہ خود ہو بہو اس میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور تمہاری آنکھیں ان مقدس کتابوں کے صفحات میں ان کو دیکھ رہی ہیں اور پا رہی ہیں۔ (یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْباً عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِیْلِ) تو اب ان کے مبعوث ہو جانے کے بعد دُنیا اور آخرت میں فلاح وکامیابی کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل وانعام کے لئے یہ بھی لازمی شرط ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے اور جو نورِ ہدایت اور شریعت وہ لے کر آئے ہیں اس کا اتباع کیا جائے اور راہِ خدا کی ہدایت کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیا جائے۔ کیونکہ اس دور میں وہی خدا کے رسول اور خدا کی مرضی کے نمائندے ہیں اور اب خدا کی رحمت اور رضامندی ان کی پیروی سے وابستہ ہے، پس اس دور میں جو ان پر ایمان نہیں لائے گا اور ان کی لائی ہوئی ہدایت کی پیروی نہیں کرے گا وہ فلاح ونجات سے محروم رہے گا- میرے نزدیک اس آیت کا یہی پیغام ہے اور اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے ایک اہم منشور اور اعلان کی ہے۔

اب ذرا اس آیت کے الفاظ پر کسی قدر تفصیل سے غور کیا جائے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی نو صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ سب سے پہلے کہا گیا ہے "الرَّسُوْلَ، النَّبِیَّ"۔

پیغمبروں کو دو حیثیتیں حاصل ہوتی ہیں، یا یوں کہا جائے کہ ان کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی ہدایت اور اُس کے احکام بندوں کو پہونچاتے ہیں، اس لحاظ سے ان کو رسول کہا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات اور عالمِ آخرت اور عالمِ غیب کی بہت سی باتوں کا اور ہدایت واحکام کا علم وحی والہام کے ذریعہ ان کو عطا فرماتا ہے، اس لحاظ سے ان کو نبی کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی ان دونوں حیثیتوں کو ظاہر کرنے کے لئے "الرَّسُوْل" بھی کہا گیا ہے اور "النَّبِیّ" بھی، تیسری صفت "الاُمّی" بیان کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نوشت وخواند یعنی لکھنے پڑھنے کے لحاظ سے آپ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے، اس لئے آپ کے علوم کسی اُستاد اور کسی کتاب سے حاصل کئے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کے عطا فرمائے ہوئے ہیں...... چوتھی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "اَلَّذِیْنَ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْباً عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِیْلِ" جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ اُن کو اپنی الہامی کتابوں تورات

وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ لحاظ ہے کہ یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ اُن کا نام لکھا ہوا پاتے ہیں یا اُن کا حلیہ اور سراپا یا اُن کے اخلاق وعادات یا اُن کی کوئی اور خاص بات لکھی ہوئی پاتے ہیں بلکہ فرمایا گیا ہے "یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ" یعنی خود آپ کو لکھا ہوا پاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کتابوں میں آپ کا ایسا مکمل تذکرہ ہے کہ گویا اُن کے صفحات میں خود ہو بہو آپ لکھے ہوئے ہیں، اور ان کے پڑھنے والے یہودی ونصرانی اپنی کھلی آنکھوں اِن کتابوں میں آپ کو دیکھتے ہیں۔ اس سے ایک یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر چہ تورات وانجیل میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہی تحریف ہو چکی تھی جس کا ذکر خود قرآن مجید میں جا بجا کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود جو تورات اور انجیل حضور کے زمانہ میں یہود ونصاریٰ پڑھتے تھے اُن میں بھی رسول اللہ ﷺ کا ایسا صاف اور مکمل تذکرہ موجود تھا کہ اس آیت میں فرمایا گیا "یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ" لیکن ہمارے اس زمانہ میں تورات وانجیل کے نام کی جو دو کتابیں پائی جاتی ہیں اُن میں اگر چہ ایسی عبارتیں موجود ہیں جن کے مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں لیکن وہ ایسی روشن اور کھلی ہوئی نہیں ہیں جن کی بنا پر کہا جا سکے کہ آپ خود تورات وانجیل میں لکھے ہوئے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ گذشتہ ۱۳، ۱۴ صدیوں میں بھی تورات وانجیل میں بہت کچھ تحریف اور تبدیلی ہوئی ہے۔(۱)

یہاں ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے، اس آیت میں بالاعلان یہ دعویٰ کیا گیا ہے اور خاص طور سے یہود ونصاریٰ کو سنایا گیا ہے اور گویا اُن کو چیلنج کیا گیا ہے کہ تمہاری مقدس کتابوں تورات وانجیل میں یہ "الرسول النبی الامی" (یعنی حضرت محمد ﷺ) لکھے ہوئے ہیں اور تم ان کتابوں میں ان کو لکھا ہوا پاتے ہو۔ اگر بالفرض قرآن کا یہ دعویٰ واقعہ کے مطابق نہ ہوتا یا اس میں کچھ بھی کچا پن ہوتا تو اس زمانہ کے یہود ونصاریٰ یقیناً اس کی تردید اور تکذیب کرتے اور رسول اللہ ﷺ کے دعوائے نبوت اور قرآن مجید کے خلاف یہ ان کی خاص دلیل ہوتی اور اس میں بڑا وزن ہوتا لیکن تاریخ میں کہیں اس کا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ اس دور کے یہود ونصاریٰ نے اس قسم کی کوئی بات کہی ہو اور قرآن پاک کے اس دعوے کی تردید وتکذیب میں آواز

(۱) تحقیقی تفصیلات کیلئے دیکھئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی "اظہار الحق" نیز سرسید خاں کی "خطبات احمدیہ" (مرتب)

اٹھائی ہو۔ اگر انصاف کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ بڑی فیصلہ کن بات ہے۔

یہاں ایک بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہماری حدیث کی کتابوں میں متعدد ایسی روایتیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ کتاب کے یہاں رسول اللہ ﷺ کی تصویریں تک موجود تھیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے جو محدث بھی ہیں اپنی تفسیر میں کئی روایتیں حدیث کی مختلف کتابوں سے سند کے ساتھ نقل کی ہیں۔ اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو یہی کہا جائے گا کہ قدیم آسمانی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ اتنی تفصیل کے ساتھ کیا گیا تھا اور اتنی وضاحت کے ساتھ آپ کا سراپا بیان کیا گیا تھا کہ اس کی روشنی میں آپ کی تصویریں تک بنا لی گئی تھیں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا قرآنِ پاک کی اس آیت کے الفاظ "يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ" سے اس کی پوری تائید ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس سورۂ اعراف سے پہلی سورۃ "الانعام" میں یہ آیت گذر چکی ہے "اَلَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ" یعنی اہل کتاب رسول اللہ ﷺ کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں۔ یہ آیت بھی یہی بتاتی ہے کہ اگلی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ ایسی تفصیل سے کیا گیا تھا کہ اس کی روشنی میں ان کتابوں کے پڑھنے والے اور خاص کر بنی اسرائیل کے احبار اور علماء رسول اللہ ﷺ کو ایسے پہچانتے تھے جیسے دیکھے بھالے آدمی کو پہچانا جاتا ہے بلکہ جس طرح ایک باپ اپنے بیٹے کو پہچان لیتا ہے۔ یہود و نصاریٰ کی موجودگی میں اور ان کی کتابوں اور ان کے علماء کی موجودگی میں قرآن مجید کا یہ دعویٰ خود اس کی دلیل ہے کہ حقیقت یہی تھی۔

میں آیت کے الفاظ "يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ" کی وضاحت کر رہا تھا۔ بات بہت طویل ہو گئی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی نو صفات بیان کی گئی ہیں۔ ایک "الرَّسُول" دوسری "النَّبِيّ" تیسری "الأُمِّي" چوتھی یہ کہ "اہل کتاب ان کو توراۃ میں لکھا ہوا پاتے ہیں" ان چاروں کی تشریح ہو چکی ہے۔ ان کے بعد پانچویں اور چھٹی صفت یہ بیان کی گئی ہے "يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ" یعنی وہ رسول ان لوگوں کو معروف کی ہدایت کرتا ہے اور منکر سے منع کرتا ہے، معروف اُن سب اعمال و اخلاق کو کہا جاتا ہے جن کو انسان کی سلیم فطرت پسند کرے۔ اور جن

کی وجہ سے آدمی کو تعریف اور تحسین کے لائق سمجھا جائے اور منکر اس کے برعکس اُن رذیل اور قبیح اعمال واخلاق کو کہا جاتا ہے جن سے فطرتِ سلیم انکار اور نفرت کرے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور ہدایات کو تفصیل سے دیکھا جائے تو یہی معلوم ہوگا کہ جن اعمال واخلاق کی آپ نے ہدایت فرمائی ہے وہ شریف انسانوں کے نزدیک معروف اور پسندیدہ ہیں اور اُن کو نیکی سمجھا جاتا ہے اور جن کاموں سے آپ نے منع فرمایا ہے وہ منکر اور ناپسندیدہ ہیں اور اُن کو گراوٹ کی بات سمجھا جاتا ہے۔ پھر ساتویں اور آٹھویں صفت یہ بیان کی گئی ہے "يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ" یعنی وہ رسول نبی اُمّی دُنیا کی تمام نفیس اور پاکیزہ چیزوں کو انسان کے لئے حلال ٹھہراتا ہے اور گندی خراب چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور سب سے آخر میں نویں صفت یہ بیان کی گئی ہے "يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ" مطلب یہ ہے کہ لوگوں پر خاص کر بنی اسرائیل پر ان کی شرارت وسرکشی کی وجہ سے اگلی شریعتوں میں جو بعض سخت احکام عائد کئے گئے تھے جو بہت ہی مشکل اور بھاری تھے، یہ رسول نبی اُمّی ان کی منسوخی کا اعلان کر کے ان سے نجات دیتا ہے اور وہ بوجھ اُتارتا ہے جس کے تلے وہ دبے ہوئے تھے۔ سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے کہ بعض چیزیں جو فی نفسہٖ حلال طیب تھیں، بنی اسرائیل پر ان کی شرارت وسرکشی کی وجہ سے حرام کر دی گئی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس حکم کی منسوخی کا اعلان کیا اور ساری دُنیا کے لئے ان چیزوں کو حلال کر دیا۔ اسی طرح بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ اگر کپڑے میں کہیں ناپاکی لگ جائے تو وہ حصہ کاٹ کر پھینک دیا جائے، رسول اللہ ﷺ نے اس سخت حکم کی منسوخی کا اعلان فرمایا اور بتایا کہ صرف دھو دینے سے کپڑا پاک ہو جائے گا۔ میں نے صرف دو مثالیں دی ہیں، بنی اسرائیل کی شریعت اور رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے احکام کا مقابلہ کر کے ایسی بہت سی مثالیں معلوم کی جا سکتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی یہ نو صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

"فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِيَ أُنزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ"۔

مطلب یہ ہے کہ اب جو لوگ اس نبی اُمّی رسول پر ایمان لائیں، یعنی جو ان کو خدا کا

رسول اور نبی مانیں اور منکرین ومخالفین کے مقابلہ میں اُن کی تائید وحمایت کریں اور اُن کی پیغمبرانہ مہم میں ان کا ساتھ دیں اور مدد کریں اور جو نور ہدایت ان کے ساتھ اتارا گیا ہے یعنی قرآن مجید اور وہ دستور شریعت جو قرآن ہی میں ہے اُس کی پیروی کریں اور اُس کو اپنا دستور زندگی بنالیں وہی فلاح یاب اور کامیاب ہوں گے اور دُنیا وآخرت میں وہی خدا کی رضا ورحمت کے مستحق ہوں گے۔

آیت کا اصل مقصد اور پیغام دراصل یہی ہے جو اس کے اس آخری حصہ میں ہے، اس سے پہلے جو کچھ فرمایا گیا تھا وہ دراصل اسی کی تمہید تھی اور اُس میں صرف رسول اللہ ﷺ کا تعارف کرایا گیا تھا۔ اور اتنا تفصیلی تعارف اسی لئے کرایا گیا تھا کہ آپ کے بارہ میں اتنا اہم اور غیر معمولی اعلان کیا جانا تھا یعنی یہ کہ آپ کے مبعوث ہوجانے کے بعد نجات وفلاح کے مستحق وہی ہوں گے جو آپ پر ایمان لائیں اور آپ پر نازل کی ہوئی مقدس کتاب قرآن مجید اور اُس کی شریعت کی پیروی کریں۔

ہمارا ایمان ہے اور قرآن مجید نے ہمیں بتایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام خدا کے پیغمبر تھے جنہیں خدا کی ہم کلامی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر تورات نازل فرمائی تھی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے پیغمبر اور کلمۃ اللہ تھے اور اُن کو اللہ تعالیٰ نے بڑے غیر معمولی قسم کے معجزات عطا فرمائے تھے اور انجیل ان پر نازل کی گئی تھی اور اپنے اپنے دور میں ان پر ایمان لانا اور ان کی لائی ہوئی ہدایت وتعلیم کی پیروی کرنا نجات وفلاح کے لئے بلکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے بھی کافی تھا۔

لیکن قرآن مجید کی اس آیت میں (اور بہت سی دوسری آیتوں میں بھی) اعلان فرمایا گیا ہے کہ خدا کے آخری نبی ورسول حضرت محمد ﷺ کے مبعوث ہوجانے کے بعد ان پر ایمان لائے بغیر اور ان کی شریعت کو اختیار کئے بغیر کوئی شخص فلاح ونجات حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ خداوندی فیصلہ اور منشور ہے اور اسی کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث پاک میں یہاں تک ارشاد فرمایا "لو کان موسیٰ حیاً لما وسعہ إلا إتباعی" (۱) یعنی اگر آج اللہ کے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو اُن کے لئے بھی میری شریعت کی پیروی لازم ہوتی۔

(۱) رواہ البیہقی

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَایَسْمَعُ بِیْ مِنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ یَھُوْدِیٌّ وَلَانَصْرَانِیٌّ ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِہٖ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ"۔(۱)

اس پاک ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی (یعنی میری) جان ہے اس دور کا جو یہودی یا نصرانی میری اطلاع پالے، پھر اس حال میں مر جائے کہ جو دین اور شریعت اللہ کی طرف سے میں لایا ہوں اس پر وہ ایمان نہ لائے اور اس کو قبول نہ کرے تو وہ اہلِ نار میں سے ہوگا۔اور نجات وفلاح سے محروم رہے گا۔

بہر حال یہ مسئلہ کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد، آپ پر ایمان لانا اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کو قبول کرنا نجات وفلاح کی شرط ہے، اسلام کے اُن بنیادی مسائل میں سے ہے جن کو قرآن مجید میں اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اس میں کسی دوسری رائے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ، وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔



(۱) مشکوٰۃ المصابیح۔کتاب الایمان بحوالہ صحیح مسلم (مرتب)

سورۃ التوبہ

درس — ۱۳

(درس-۱۳۳)

سورۂ توبہ کی اہمیت
اُس کے ناقابل فراموش اسباق
اور اس کا خاص پیغام

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

لَقَدْ جَاءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ
عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ
لَآاِلٰهَ اِلَّاهُوَ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔

(خاتمة سورة البراءة)

یہ سورۂ ''البراءۃ'' کی آخری دو آیتیں ہیں جو آج میں نے پھر تلاوت کی ہیں، پچھلے ہفتہ اس سورت کے آخری دو رکوع کا درس ہوا تھا اور ان دونوں آخری آیتوں کا بھی ترجمہ کر دیا گیا تھا اور مختصر تشریح بھی کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد آج سورۂ یونس کا درس شروع ہونا چاہئے تھا، لیکن سورۂ توبہ کی غیر معمولی اہمیت اور اسکے مضامین کی خاص نوعیت کی وجہ سے میں نے ارادہ کیا کہ آج بھی اسی سورت کے اہم مضمون کا اعادہ کیا جائے اور اس میں اُمت کو جو خاص سبق دئے گئے ہیں اُن کو دُہرایا جائے اور سمجھنے اور یاد کرنے کی کوشش کی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ وہ سورۂ توبہ کا علم حاصل کرنے کی خاص طور سے تاکید فرماتے تھے، دراصل اس سورت کے ذریعہ اُس ہدایت کی تکمیل ہوئی ہے جو آغاز نبوت سے نازل ہونا شروع ہوئی تھی اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کیسا ایمان اللہ کے ہاں قابلِ قبول ہے اور اللہ و رسول کے ساتھ اور دین کے ساتھ مومن کا تعلق کیسا ہونا چاہیے۔

سورہ کا پس منظر

یہ سورۃ حضورؐ کے آخری دورِ حیات میں نازل ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ نبوت کو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تین دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ایک :- آغاز نبوت سے مدینۂ طیبہ ہجرت فرمانے تک کے قریباً ۱۳ سال، یہ پورا مکی دور ہے۔

دوسرا:- ہجرت سے فتح مکہ تک کے قریباً ۸ سال، یہ گویا درمیانی دور ہے۔

تیسرا:- فتح مکہ سے وفات تک کے قریباً ڈھائی سال، یہی آپ کا آخری دورِ حیات ہے، اسی میں ہر حیثیت سے دین کی تکمیل ہوئی ہے۔

یہ سورۂ براءۃ جیسا کہ آپ حضرات کو بھی اُس کے مضامین سے اندازہ ہو چکا ہوگا اسی آخری دور میں نازل ہوئی ہے ۹ھ کے وسط میں، مشہور روایت کے مطابق رجب کے مہینہ میں رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک والا سفر فرمایا، یہ آپ کا اور آپ کے اصحابِ کرام کا سب سے طویل اور نہایت پُر مشقت جہادی سفر تھا اور اس لحاظ سے بھی نہایت پُر خطر تھا کہ اس وقت کی دُنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور سلطنت یعنی رومی حکومت کی باقاعدہ اور نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ فوج سے جنگ کا امکان تھا جو لاکھوں کی تعداد میں تھی اور اُس دور کے لحاظ سے بہترین اسلحہ اور ہر قسم کے سامانِ جنگ سے لیس تھی، اور آپ کے ساتھ صرف تیس ہزار کی جمعیت تھی جو رومی فوج کے مقابلہ میں بالکل ہی بے سروسامان تھی، حد یہ ہے کہ ان مجاہدین کے لئے غذا کی اتنی کمی تھی کہ بعض دنوں میں اللہ کے بندوں نے ایک ایک کھجور کھا کر گزارا کیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ موسم سخت گرم تھا اور بعض منزلوں پر پینے کے لئے پانی بھی

نصیب نہیں ہوتا تھا، اسی لئے اس غزوہ کا ایک نام ''غزوۃ العسرہ'' بھی ہے۔ یعنی تنگی اور فقر وفاقہ والا غزوہ۔

سورۂ توبہ کا کچھ حصہ غزوۂ تبوک سے کچھ پہلے اسی کے سلسلہ میں نازل ہوا تھا، اور کچھ حصہ تبوک کے سفر کے دوران میں نازل ہوا، اور زیادہ تر اس سفر سے واپسی کے بعد نازل ہوا ہے۔

بہر حال اس کے مضامین کا بہت کچھ تعلق غزوۂ تبوک اور اُس کی سلسلہ کے واقعات سے ہے۔ میں اس غزوہ کے واقعات پوری تفصیل سے پچھلے ہفتوں درس میں موقع بہ موقع بیان کرتا رہا ہوں۔ مختصر طور سے اس وقت پھر ذکر کرتا ہوں۔

غزوۂ تبوک میں مسلمانوں کا امتحان

واقعات کا سلسلہ یوں ہے کہ عرب کی مغربی سرحد پر جو شام کے علاقہ سے ملتی ہے عرب عیسائیوں کی کئی ریاستیں تھیں جو رومی شہنشاہی کی باج گزار تھیں اور گویا اُس کی سرپرستی میں تھیں۔ جب ۸ھ میں مکہ معظمہ اور طائف کے فتح ہو جانے کے بعد قریباً پورے عرب پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو گیا تو سرحد کی ان عیسائی ریاستوں نے محسوس کیا کہ یہ اُبھرتی ہوئی اور تیزی سے بڑھتی ہوئی نئی طاقت کسی وقت ہمارے لئے بھی خطرہ کا باعث بن سکتی ہے، وہ ایک ہی سال پہلے غزوۂ موتہ میں (۱) مسلمانوں کی حوصلہ مندی اور جرأت و جانبازی کا تجربہ کر چکے تھے۔ انہوں نے اس بات کو رومی حکومت تک بھی پہنچایا جس کا اس وقت شام پر اقتدار تھا اور پھر رومی حکومت کی پوری امداد اور پشت پناہی کا اطمینان حاصل کر کے یہ منصوبہ بنایا کہ پوری طاقت سے مدینہ پر ایک بھرپور حملہ کر کے اس نئی اُبھرتی طاقت کو اسی مرحلہ میں کچل دیا جائے، اور پوری تیز رفتاری کے ساتھ اس کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں۔

رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے وحی الٰہی کی رہنمائی میں جنگی حکمتِ عملی کی طور پر یہ طے کیا کہ اُن کو حملہ کرنے کا موقع دینے کے بجائے خود پیش قدمی کر کے اُن پر ضرب لگائیں اور مسلمانوں کی ایمانی طاقت اور اُن کی مجاہدانہ اسپرٹ کا ان کو اندازہ

---

(۱) یعنی غزوۂ تبوک سے ایک سال پہلے، اس لئے کہ غزوۂ موتہ بھی ۸ھ میں ہی پیش آیا تھا اور ایک لاکھ شامیوں اور رومیوں کے مقابلہ میں مسلمان صرف تین ہزار تھے۔ (مرتب)

کرادیں تا کہ ان کے حوصلے پست ہو جائیں۔ اس کے لئے عالم اسباب میں یہ ضروری تھا کہ مجاہدین کی زیادہ سے زیادہ تعداد آپ کے ساتھ ہو اس لئے آپ نے مدینہ طیبہ اور قرب و جوار کے تمام مسلمانوں کو اس جہادی مہم کے لئے تیاری کا اور اس میں حصہ لینے کا اعلانِ عام جاری فرمادیا، اس سے پہلے کسی مہم اور جنگ کے لئے کبھی بھی اس طرح کی نفیرِ عام نہیں دی گئی تھی۔ غزوۂ تبوک ہی میں آپ نے یہ حکم جاری کیا کہ ہر مسلمان جو معذور و مجبور نہیں ہے اس میں شرکت کرے۔ اور اتفاق کی بات کہ موسم انتہائی گرم تھا، اور مدینہ کے باغوں میں کھجوروں کے تیار ہونے اور پکنے کا زمانہ تھا اور اسی پر اہلِ مدینہ کی معیشت کا دارومدار تھا، اس حالت میں اپنے باغوں کو چھوڑ کر جانا بڑا سخت امتحان تھا، اس کے علاوہ سفر دور دراز کا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسی فوج کے مقابلہ کے لئے جانا تھا جو اس وقت کی دُنیا کی سب سے زیادہ طاقتور فوج تھی اور جس نے چند ہی برس پہلے دُنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت فارس کی فوجوں کو شکست دے کر دُنیا بھر پر اپنی برتری کا سکہ جما دیا تھا اور اپنی دھاک بٹھادی تھی۔ (۱) اسی بنا پر منافقین یہ سمجھتے تھے کہ اس سفر میں جانا موت کے منہ میں جانا ہے اور جو جائے گا وہ واپس نہیں آئے گا، وہیں کے چیل کوے اور جانوران کی لاشوں کو کھائیں گے۔ اس لئے ان منافقین نے طرح طرح کے حیلے بہانے کئے اور نہیں گئے۔ ان منافقین کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے ایمانوں میں کچھ ضعف تھا اور اس لئے کم ہمتی تھی وہ بھی چاہتے تھے کہ کسی طرح بچ جائیں تو اچھا ہے۔

انہی حالات میں یہ پر جلال آیتیں نازل ہوئیں۔

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ، اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ، فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ، اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْکُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا وَّیَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَیْـًٔا"۔

(ترجمہ) یعنی اے مسلمانو تمہارا یہ کیا حال ہے کہ جب تم کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کے راستے میں قربانی اور جانبازی کے لئے قدم اٹھاؤ اور چلو تو تم بجائے اُٹھ کھڑے ہونے

---

(۱) یہ روم اور فارس کی وہ طویل جنگ ہے جس کی طرف سورۂ روم (۳۰) کی ابتدائی آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لئے ان آیتوں کی تفسیر یا سیرت کی کوئی کتاب دیکھنی چاہیے۔ (مرتب)

کے زمین پر پڑ جاتے ہو، کیا تم نے آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیوی زندگی کی خوش عیشی کو اپنے لئے پسند کرلیا ہے، حالانکہ دنیا کا ساز وسامان آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں بالکل ہی ہیچ ہے۔ اگر تم نے اس دعوت پر لبیک نہیں کہا اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نہیں چلے تو اللہ کی طرف سے تم پر بڑی سخت مار پڑے گی اور پھر وہ اپنے دین کی خدمت کے لئے تمہاری جگہ کسی اور قوم کو کھڑا کردے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے خود ہی محروم ہو جاؤ گے۔

ان پُرجلال آیتوں کا روئے سخن دراصل اُن مسلمانوں کی طرف تھا جن میں کچھ ضعف اور تذبذب تھا۔ ان آیتوں نے اس تذبذب کو ختم کر دیا اور ہر مخلص مسلمان نے ساتھ چلنے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن اللہ کی شان کعب بن مالک جیسے کئی ایسے مخلص مسلمانوں سے جو صفِ اوّل کے مخلصوں میں تھے لغزش ہوگئی اور وہ صرف سستی اور لیت ولعل کی وجہ سے پیچھے رہ گئے، ان کے واقعات تفصیل سے پہلے بیان کئے جاچکے ہیں اور یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ ان واقعات میں اُمت کے لئے کتنے اہم سبق ہیں۔

الغرض ان کے علاوہ مدینہ طیبہ اور قرب وجوار کے قریباً سب ہی مسلمان حضورؐ کی نفیرِ عام پر لبیک کہہ کر آپ کے ساتھ تبوک کے لئے روانہ ہوگئے، ان کی تعداد تیس ہزار کے قریب تھی۔ مدینہ طیبہ سے تبوک تک کا ۱۴۔۱۵ دن کا راستہ تھا اور جیسا کہ میں نے بتایا بڑا ہی پُر مشقت اور بڑے سخت مجاہدہ کا یہ سفر تھا۔ لیکن مسلمانوں کی اس پیش قدمی نے اُن عرب ریاستوں کے حوصلے پست کر دئے جو مدینہ طیبہ پر حملہ کا منصوبہ بنا رہے تھے اس لئے انہوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ مدینہ کی اسلامی حکومت سے مصالحت کرلی جائے۔ (۱) یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مسلمانوں کی بڑی کامیابی تھی، چنانچہ قریباً بیس دن تبوک میں قیام کر کے اور اس سرزمین پر اللہ کا نام بلند کر کے، اذانیں دے کے اور نمازیں پڑھ کے آپ واپس تشریف لے آئے۔ اور آپ کے اس سفر نے اس علاقہ میں اسلام کے نفوذ کی اور آگے کی بڑی کامیابیوں کی راہ ہموار کردی، اور دور دور تک مسلمانوں کی دھاک بٹھادی، اس کے علاوہ بہت سے داخلی فائدے ہوئے۔ وہ مارِ آستین منافقین جن کا نفاق اب تک دبا اور چھپا ہوا تھا، اس غزوۂ تبوک نے ان کا پردہ فاش کردیا۔ اور سورۂ توبہ کی آیات نے ان کو بالکل عریاں کر دیا۔ پھر ان میں

(۱) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرحد کی ان متعدد عیسائی ریاستوں سے صلح ناموں کے بعد سالماً وغانماً واپس تشریف لائے۔ (مرتب)

سے بہت سوں کا نفاق ختم ہو کر اُن کے اندر ایمان آ گیا۔ اور اس غزوہ کے سخت مجاہدہ نے مومنین صادقین کو اور نکھار دیا اور اُن کے ایمانوں میں بڑی ترقی ہوئی۔ اور کعب بن مالک وغیرہ چند مخلصین، جو محض سستی اور لیت و لعل کی وجہ سے اس غزوہ میں جانے سے رہ گئے تھے ان پر سخت عتاب ہوا اور اُن کو مقاطعہ کی ایسی سخت سزا دی گئی کہ قرآن پاک میں اُس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے "ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ" (یعنی ان کے لئے دُنیا تنگ و تاریک ہوگئی اور وہ اپنی زندگی سے تنگ آ گئے) مگر انہوں نے اللہ ورسول اور دین کے ساتھ اپنی وفاداری اور اپنے اخلاص کا پورا پورا ثبوت دے دیا تو ان کی سچی توبہ کی بنا پر ان کی معافی اور توبہ کی قبولیت کا اعلان فرما کر اُمت کو قیامت تک کے لئے ایک بڑا سبق دے دیا گیا۔

مشرک قبائل کی بدعہدی پر اعلان جنگ

اسی سفر تبوک کے زمانہ میں یہ بھی ہوا کہ جس طرح منافقین یہ سمجھتے تھے کہ یہ تبوک جانے والے مسلمان اب واپس نہ آ سکیں گے اور رومی فوج ان سب کا وہیں خاتمہ کر دے گی اسی طرح عرب کے مختلف علاقوں کے وہ مشرکین جن سے رسول اللہ ﷺ نے معاہدے کر لئے تھے، انہوں نے بھی یہی سمجھا اور ایسی شرارتیں شروع کر دیں جو معاہدوں کے بالکل خلاف تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک سے واپس آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان معاہدوں کو فسخ کئے جانے کا اعلان فرما دیا اور ان سب کیلئے چار مہینے کی مہلت کا بھی اعلان فرما دیا گیا۔ اور جن قبیلوں اور علاقوں کے مشرکوں نے عہد شکنی نہیں کی تھی اُنکے متعلق اعلان فرمایا گیا کہ اُن سے معاہدہ مقررہ میعاد تک قائم رہیگا لیکن آئندہ اس میں توسیع نہ ہوگی۔ اس سورۂ توبہ کے ۳۔۴ رکوع قریباً ۳۰ آیتوں میں تمام مشرکین عرب کے سلسلہ میں اسی نئے فیصلے اور نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس حکم اور فیصلہ کا مقصد یہ تھا کہ عرب کا وہ خاص علاقہ جس کو دعوتِ توحید اور دین حق اسلام کا مرکز بننا تھا وہ شرک سے بالکل پاک صاف ہو جائے، بتوں سے اور بُت پرستی سے کعبۃ اللہ کی تطہیر کی طرح یہ چیز رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خاص مقاصد میں تھی، اور اب اسکی تکمیل کا وقت آ گیا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بھی حکم آیا کہ آئندہ مشرکوں کو اپنے مشرکانہ عقائد

اور رسوم کیساتھ حج میں شریک ہونے کی اور کعبہ کے طواف وغیرہ کی بلکہ مسجد حرام میں داخلہ کی بھی اجازت نہ ہوگی۔ یہ سب نہایت اہم احکام اور فیصلے تھے۔ غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ھ کے حج سے کچھ ہی پہلے سورۂ توبہ کا یہ ابتدائی حصہ نازل ہوا تھا، رسول اللہ ﷺ نے طے فرمایا کہ ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) آپ کے خاص نمائندہ اور امیرِ حج کی حیثیت سے اس سال حج کریں اور آپ کی طرف سے اللہ ورسول کے ان اہم فیصلوں کا حج میں شریک ہونے والے تمام عربوں کے سامنے اعلان کریں۔ صدیق اکبرؓ کے روانہ ہو جانے کے بعد بعض تجربہ کار لوگوں نے حضور ﷺ کو توجہ دلائی کہ عربوں کا پرانا دستور یہ ہے کہ کسی معاہدہ کے فسخ کرنے کا اعلان یا تو صاحب معاہدہ خود کرے یا پھر اس کا کوئی قریبی عزیز اور رشتہ دار کرے۔ اس بات کے سامنے آنے کے بعد آپ نے حضرت علی مرتضیٰؓ کو روانہ کیا جو آپ کے حقیقی چچا زاد بھائی اور داماد تھے، چنانچہ صدیق اکبرؓ نے یہ اعلان انہیں سے کرایا۔ تو جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ سورۂ براءۃ کی شروع کی قریباً تیس آیتوں کا تعلق انہی اہم فیصلوں سے ہے۔

ایک نیا امتحان

سورۂ براءۃ کی ان آیتوں میں ایک طرح سے گویا تمام مشرکین عرب کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا تھا، قدرتی طور پر اس کے اثرات بہت سے مسلمانوں پر بھی پڑ سکتے تھے۔ کسی کے باپ یا بھائی ابھی شرک ہی کی حالت میں تھے، کسی کے دوسرے قریبی عزیز مشرک تھے، اب ان سب ہی کے خلاف اعلانِ جنگ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی امکان تھا کہ اس نئی پالیسی کے اعلان کے بعد جنگوں کا ایسا سلسلہ چھڑ جائے جن سے کبھی فرصت نہ ملے اور سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے۔ غالباً ان خیالات نے کچھ کچے مسلمانوں کے دلوں میں کچھ وسوسے پیدا کئے ہوں گے۔ اور اگر اس وقت ایسے وسوسے پیدا نہ بھی ہوئے ہوں تو اس میں تو شبہ ہی نہیں کہ ایسے سخت حالات میں ایسے وسوسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور قرآن مجید کو قیامت تک کے حالات اور امکانات کے بارہ میں رہنمائی دینی تھی۔ اس لئے اس سلسلہ کی آیتوں کے آخر میں مسلمانوں کو مخاطب فرما کر یہ سخت آگاہی بھی دے دی گئی۔

"قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ

وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُكُمْ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔"

اس آیت کا پیغام یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے دل کو ٹٹول لے اور جانچ لے، اگر اس کا حال یہ ہے کہ اپنے ماں باپ، اپنی اولاد، اپنی چہیتی بیویوں اور دوسرے قریبی عزیزوں رشتہ داروں سے یا اپنی کمائی ہوئی دولت اور اپنے چلتے ہوئے کاروبار سے یا اپنے مکانات اور جائداد سے اس کو ایسا تعلق ہے جو اللہ و رسول کے حکم کی تعمیل میں اور دین کے راستے میں قربانی دینے سے رکاوٹ بن سکتا ہے تو وہ اللہ کے اُن بندوں میں سے نہیں ہے جو اس کی رحمت اور عنایت کے مستحق ہوں بلکہ وہ ''فاسقین'' میں سے ہے، جس کو خدا کے عذاب کا انتظار کرنا چاہئے۔ اور ایسے لوگ ہدایت کی نعمت سے محروم رہیں گے۔ اور پھر خداوندی رحمت اور جنت سے بھی محروم رہیں گے۔

میرے محترم بھائیو! اگر ہمارے دلوں میں کچھ بھی ایمانی رمق ہو تو یہ بڑی لرزا دینے والی آیت ہے، آج جہاد اور جاں فروشی کا وہ میدان تو ہمارے سامنے نہیں ہے جو اس آیت کے نازل ہونے کے وقت صحابۂ کرام کے سامنے تھا، لیکن امتحان کے دوسرے میدان ہمارے سامنے ہیں۔ روزمرہ ایسے حالات اور معاملات سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے کہ اگر خدا رسول کے اور شریعت کے حکم پر چلیں اور دین کے مطالبہ اور تقاضے کو پورا کرنے کا فیصلہ کریں تو ہمیں کچھ مالی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے یا ہماری بیویوں اور دوسرے گھر والوں کی ناراضی کا خطرہ ہوتا ہے۔ تو ذرا سوچیں کہ ایسے موقعوں پر ہمارا طرز عمل کیا ہوتا ہے؟ ہم چھوٹے چھوٹے مقدموں میں جیت حاصل کرنے کے لئے اور بس اپنی ناک اونچی رکھنے کے لئے بے تکلف جھوٹی گواہیاں دے دیتے ہیں جو اشد حرام ہے۔ دین کے تقاضے ہمارے سامنے ہیں اور ہم سے اس کے لئے اپنا آرام بھی قربان نہیں کیا جاتا۔ اس آیت کا کھلا فیصلہ یہ ہے کہ جن کا یہ حال ہو وہ اللہ کی نگاہوں میں سخت مجرم ہیں اور اس کے مستحق ہیں کہ ان پر خداوندی عذاب کے کوڑے برسیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام کو جو آگاہی دی تھی وہ ہم آپ کو سب کو اور قیامت تک کے مسلمانوں کو دی گئی ہے۔ سورۂ توبہ کی یہ آیت ایک کسوٹی ہے جس سے ہر ایک اپنا ایمان جانچ سکتا ہے، ور ایک آئینہ ہے جس میں ہم میں سے ہر ایک اپنی صورت دیکھ سکتا ہے۔

اہلِ کتاب کے خلاف اعلانِ جنگ

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ سورۂ براءۃ کی ابتدائی تقریباً ۳۰ آیتوں کا تعلق مشرکین عرب سے اور اُن کے بارے میں نئے فیصلے اور نئی پالیسی سے ہے۔

اس کے بعد ان اہلِ کتاب کے خلاف بھی جنگ کا اعلان کیا گیا ہے اور اُن سے جہاد کی دعوت دی گئی ہے جو اس وقت اسلام کو مٹا دینے اور نورِ حق کو گل کر دینے کے منصوبے بنا رہے تھے اور اُنہوں نے اپنے پیغمبروں کا لایا ہوا دین اور ان کی شریعت کو چھوڑ کے اپنے نفس کی اور شیطان کی پیروی اختیار کر لی تھی۔ اس موقع پر قرآن پاک نے اُن کے ٹھیٹ مشرکانہ عقائد کا بھی ذکر کیا ہے، فرمایا گیا ہے۔

"اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ بْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ اِلٰهًا وَّاحِداً لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ"۔

یعنی انہوں نے اپنے اَحْبَارْ وَرُهْبَان کو یعنی عالموں اور درویشوں کو خدا کے علاوہ اپنا رب بنا لیا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی خدا بنا لیا ہے حالانکہ توریت و انجیل کے ذریعہ ان کو توحید کی تعلیم دی گئی تھی، لیکن انہوں نے اس خداوندی تعلیم کو پس پشت ڈال کر یہ مشرکانہ طریقہ اختیار کر لیا ہے۔

پھر اس کے آگے کی آیتوں میں خصوصیت کے ساتھ اُن کے مذہبی پیشواؤں، پیروں اور پادریوں کی سیاہ باطنی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِنَّ كَثِيْراً مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"۔

یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کے یہ پیر پادری جو بظاہر بڑے مقدس اور مہاتما بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کا حال یہ ہے کہ وہ ریاکار اور مکار ہیں اور حرام و ناجائز طریقوں سے بس دُنیا بٹورتے ہیں اور اپنے ماننے والے سیدھے سادے عوام کو لوٹتے ہیں اور اپنی جیبیں اور اپنے خزانے بھرتے ہیں۔ یہ بالکل دولت کے پجاری ہو گئے ہیں، اور انہوں

نے خدا کے بجائے مال و دولت کو اپنا مقصود و معبود بنالیا ہے۔

اہلِ کتاب کے حال میں ہم مسلمانوں کی تصویر

ان آیتوں کا اگرچہ براہ راست تعلق بگڑے ہوئے یہود و نصاریٰ اور اُن کے حرام خور اور ریاکار پیروں، پادریوں سے ہے، لیکن ہم مسلمانوں کے لئے اور خاص کر ہم جیسوں کے لئے جن کو لوگ مذہبی عالم اور دینی پیشوا سمجھتے ہیں، ان آیتوں میں بڑا سبق اور بڑی آگاہی ہے۔ حضور ﷺ کی مشہور حدیث ہے "لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْراً بِشِبْرٍ وَذِرَاعاً بِذِرَاعٍ" جس کا مطلب یہ ہے کہ میری اُمت کے لوگ وہ سب کچھ کریں گے جو پہلی امتوں، یہودیوں اور نصرانیوں نے کیا اور ان کے بالکل قدم بقدم چلیں گے۔ یہاں تک کہ پہلی اُمتوں کے کسی بدبخت نے اپنی ماں کے ساتھ حرام کیا تھا تو میری امت میں بھی یہ ہو کر رہے گا۔(۱)

حضور ﷺ کے اس ارشاد کا مقصد دراصل اُمت کو خبردار کرنا تھا کہ وہ اس خطرے سے اپنی حفاظت کرے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ حضور ﷺ نے فرمایا تھا وہ سب سامنے آرہا ہے۔ اُمت میں اعمال و اخلاق کی وہ ساری خرابیاں اور وہ سب اعتقادی گمراہیاں پیدا ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں جو یہود و نصاریٰ میں تھیں۔ وہ کون سا جرم اور گناہ ہے جو مسلمانوں میں نہیں ہے۔ اور وہ کون سا فسق و فجور ہے جو دین و مذہب ہی کے نام پر بزرگانِ دین کے عرسوں میں نہیں ہو رہا ہے اور وہ کون سا شرک ہے جو ان کے مزاروں پر نہیں ہو رہا ہے، قبروں کو سجدے ہو رہے ہیں، مرادیں مانگی جا رہی ہیں، نذریں چڑھائی جا رہی ہیں، الغرض وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو یہود و نصاریٰ کرتے تھے۔

اور جس طرح اُن کے پیر پادری دین کے نام پر دُنیا کماتے اور بچارے عوام کو لوٹتے تھے اُن کے نمونے بھی اس اُمت کے مولویوں اور پیروں میں موجود ہیں۔ لیکن اللہ کا قانون بے لاگ ہے، اس کی کسی سے رشتہ داری نہیں، یہ نہیں ہے کہ بے چارہ یہودی یا نصرانی کہلانے والا شرک یا کوئی جرم کرلے تو جہنم میں جائے اور مسلمان کہلانے والا کرے تو اس کو چھوڑ دیا جائے۔ وہاں کا قانون تو یہ ہے۔ "فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ، وَمَنْ يَعْمَلْ

(۱) بخاری کتاب الاعتصام بالسنۃ۔ نیز صحیح مسلم (مرتب)

مِّثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔"

میں یہ کہہ رہا تھا کہ سورۂ توبہ کی ان آیات "اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" سے لے کر "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ۔ الآیۃ" تک کا تعلق اگرچہ براہ راست یہود نصاریٰ سے ہے، لیکن ان میں ہم مسلمانوں کے لئے بھی بڑا سبق ہے۔

غزوۂ تبوک کی تمہید

یہ آیتیں جن میں اہلِ کتاب کی گمراہیوں اور اُن کے صریح مشرکانہ عقائد اور اُن کی اسلام دشمنی اور نورِ اسلام کو مٹا دینے کے منصوبوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اُن کے خلاف جہاد و قتال کی تیاری کی مسلمانوں کو دعوت دی گئی ہے، یہ دراصل غزوۂ تبوک کی تمہید ہے۔ جس کا میں ابھی تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ مختلف پہلوؤں سے اس غزوہ میں بڑے خطرات تھے اور بڑی سخت آزمائش تھی اس لئے منافقوں کے علاوہ بعض کچے دل کے اور کم ہمت مسلمان بھی اس سے کترانا چاہتے تھے تو آگے کی آیتیں نازل ہوئیں۔

"يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ...... الآیۃ"

میں ابھی آپ کے سامنے ان آیتوں کا ترجمہ کر چکا ہوں، اور بتا چکا ہوں کہ ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد ہر مخلص مسلمان تیار ہو گیا۔ ہاں جن کے دلوں میں کسی درجہ کا نفاق تھا انہوں نے حیلے بہانے کئے اور طرح طرح کے عذر پیش کئے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ان سب کے عذر قبول کر لئے، ان کی تعداد روایات میں اسّی کے قریب بتائی گئی ہے۔ بعض منافق ساتھ بھی گئے لیکن اپنے منافقانہ ذہن اور منافقانہ کردار کو ساتھ لے کر گئے اور وہاں بھی شرارتیں اور ناپاک سازشیں کرتے رہے۔ اور اُن کے جو ساتھی مدینہ میں رہ گئے تھے ان کا چونکہ یہ خیال اور گمان تھا کہ رومی فوج اس پورے اسلامی لشکر کو موت کے گھاٹ اتار دے گی اور اب یہ زندہ واپس نہ آئیں گے اس لئے اس زمانہ میں ان کی زبانوں پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایسی باتیں بھی آئیں جو ان کے ناپاک دلوں میں چھپی ہوئی تھیں لیکن کبھی زبان پر

نہیں آتی تھیں، اوران میں سے بہت سوں کا نفاق بالکل عریاں ہو گیا۔

منافقین کے بارے میں سخت پالیسی کا اعلان

سورۂ توبہ کی شروع کی قریباً چالیس آیتوں کے بعد مسلسل قریباً ۵۰۔۶۰ آیتیں (۵۔۶ رکوع کے قریب) ایسی ہیں جن میں ان منافقین کے نفاق ہی کا بیان ہے۔اور جس طرح اس سورت کی شروع کی آیتوں میں مشرکینِ عرب کے بارہ میں ایک نئے فیصلے اور نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے اسی طرح بعد کی ان آیتوں میں منافقین کے متعلق وہ سخت رویہ اختیار کیا گیا ہے جو اس سے پہلے کبھی اختیار نہیں کیا گیا تھا۔اور اُن پر اوران کے نفاق پر وہ ضربیں لگائیں اور ایسے کوڑے برسائے جنہوں نے نفاق کا گویا خاتمہ کر دیا، اور اسلامی معاشرہ میں منافقین کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

منافقین کے بارہ میں رسول اللہ ﷺ سے یہاں تک فرمادیا گیا۔"اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْلَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْلَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ"یعنی یہ منافقین ایسے مردود ہیں کہ اے نبی اگر تم بھی ان کی بخشش کے لئے ہم سے دعا کرو اور ایک دو دفعہ نہیں ستر دفعہ دعا کرو تو ہم تمہاری دعا بھی ان کے بارہ میں نہیں سنیں گے اوران کو نہیں بخشیں گے۔اس کے بعد آپ کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ "وَلَاتُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَاتَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ"یعنی ان میں سے جب کوئی مرجائے تو اے نبی تم اس کی نماز جنازہ بھی نہ پڑھو اور اس کی قبر کے پاس بھی نہ کھڑے ہو۔جیسا کہ میں نے عرض کیا منافقین کے بارہ میں یہ نیا حکم تھا اور نئی پالیسی کا اعلان تھا۔اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بہت سے منافقین کے دل بدل گئے اور ان کو حقیقی ایمان نصیب ہو گیا۔قریباً ۵۰۔۶۰ آیتیں ساتویں رکوع سے بارہویں تک منافقین ہی سے متعلق ہیں، درمیان میں کہیں کہیں بطور مقابلہ مومنین صالحین کے کردار کا بھی ذکر آ گیا ہے۔

مخلصین کی کوتاہی پر عتاب

اس کے بعد اُن چند مخلص مسلمانوں کا ذکر کیا گیا ہے جو صرف سستی اور لیت ولعل کی وجہ سے غزوہ تبوک میں جانے سے رہ گئے تھے اور خود ان کو اس کا بے انتہا رنج وغم تھا اور انہوں

نے پوری سچائی کے ساتھ حضور علیہ السلام کے سامنے اپنے قصور کا اقرار کر لیا تھا اور بعضوں نے تو مسجد نبویؐ کے ستون سے اپنے کو باندھ دیا تھا اور طے کر لیا تھا کہ حضور علیہ السلام ہی معافی دے کر اپنے ہاتھ سے کھولیں گے تو کھلیں گے ورنہ اسی طرح بندھے بندھے مرجائیں گے، ان حضرات کے واقعات متعلقہ آیتوں کے درس میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ سورہ کے تیرہویں رکوع میں ان کے بارہ میں فرمایا گیا ہے۔

"وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا، عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔"

یعنی کچھ بندے وہ ہیں جنہوں نے دلی ندامت کے ساتھ اپنے جرم وقصور کا اقرار کر کے خود اپنے کو پیش کر دیا ہے، ان کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اچھے اعمال بھی کئے ہیں اور بُرے عمل بھی ان سے سرزد ہوئے ہیں، وہ امید کر سکتے ہیں کہ اللہ مہربانی فرما کر ان کو معاف کر دے اور ان کی توبہ قبول کر لے، اللہ غفور رّحیم ہے۔

پھر دو تین آیتوں کے بعد فرمایا گیا ہے "وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ" یعنی غزوۂ تبوک میں نہ جانے والے اہلِ ایمان میں سے کچھ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا معاملہ خدا کے حکم کے انتظار میں ملتوی ہے، وہ انہیں عذاب دے یا ان کی توبہ قبول فرما کر معاف فرما دے۔

اللہ اکبر! اللہ اکبر! قرآن مجید کا یہ انداز بیان کعب بن مالک اور ابولبابہ انصاری جیسے صفِ اوّل کے مخلصین کے حق میں ہے جو ہمیشہ اللہ ورسول کے احکام کی اطاعت اور دین کی خدمت اور اس کی راہ میں ہر قربانی کرتے رہے، ان میں سے کئی ایک بدری بھی تھے۔ اُن سے بس یہ غلطی ہوئی تھی کہ سُستی کی وجہ سے غزوۂ تبوک سے بچھڑ گئے تھے، اسی پر اتنا سخت عتاب ہوا کہ کعب بن مالک اور اُن کے دو اور ساتھیوں کا پچاس دن تک مکمل مقاطعہ رہا، کوئی مسلمان ان سے بات نہیں کرتا تھا، اُن کے سلام کا جواب تک نہیں دیتا تھا۔ اس آیت میں اُن کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ ان کا معاملہ خدا کے حکم پر موقوف ہے، وہ احکم الحاکمین چاہے عذاب دے چاہے معاف فرما دے۔

ذرا غور کیجئے ان آیات میں کعب بن مالک اور اُن کے ساتھیوں کا ایسے انداز میں

ذکر کیا گیا ہے جیسے کہ وہ بڑے ہی مجرم تھے۔ ذرا ہم اپنے بارہ میں سوچیں کہ اللہ ورسول کے احکام کی فرماں برداری اور دین کے لئے جان و مال کی قربانی کے معاملہ میں ہمارا حال کیا ہے اور ہمارا انجام کیا ہونے والا ہے۔

پھر اس سے اگلے رکوع میں بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ سچے مسلمان کا اللہ کے ساتھ کیا معاملہ اور دین کی راہ میں قربانی کے بارہ میں کیا رویہ ہونا چاہئے اور اُس کی زندگی کا کیا رنگ ہونا چاہئے۔ سنئے فرمایا گیا ہے۔

"إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ، يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْداً عَلَيْهِ حَقّاً فِي التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْآنِ، وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔"

اہلِ ایمان اپنی جان و مال بیچ چکے ہیں

مطلب یہ ہے کہ جو سچے ایمان والے ہیں اُن کی جانیں اور اُن کے مال اللہ نے جنت کے عوض خرید لئے ہیں، اب کسی سچے مسلمان کی جان و مال اس کی اپنی مِلک نہیں ہے، بلکہ وہ اللہ کے ہاتھ بیچ چکا ہے، اب اُن کا کام یہ ہے کہ جب ان کو راہ خدا میں جہاد اور جانبازی کے لئے پکارا جائے وہ لبیک کہہ کے میدان میں آجائیں، خدا کے اور اُس کے دینِ حق کے دشمنوں کے مقابلہ میں جنگ کریں، ماریں اور مریں۔ اور اس طرح خدا کے ہاتھ بیچی ہوئی جان و مال اس کی راہ میں قربان کردیں اور اس کے عوض جنت اور اس کی لازوال نعمتیں اور ابدی عیش و آرام حاصل کرلیں۔ آگے فرمایا گیا ہے "وَعْداً عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْآنِ" یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ معاملہ بالکل پکا ہے، کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، پہلے مقدس صحیفوں تورات وانجیل میں بھی اس کا اعلان ہوچکا ہے اور اب قرآن میں بھی اس کی ضمانت دی جارہی ہے۔ اور خدا سے زیادہ وعدہ کا سچا کون ہوسکتا ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ مومنین کا اپنے اللہ کے ساتھ یہ ایسا نفع بخش سودا ہوا ہے جس پر انہیں جتنی بھی خوشی اور مسرت ہو برحق ہے، یہ ان کی بہت ہی بڑی فیروزمندی ہے۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔

ذرا غور کیجئے اللہ ہی کی دی ہوئی ایک فانی جان جو دیر سویر ختم ہونے ہی والی ہے اور مال و دولت جس کو یا خرچ ہونا ہے یا مر کر ترکہ میں چھوڑ دینا ہے، اس کو اللہ کے حکم پر اس کی راہ میں قربان کر کے آخرت کی حیاتِ ابدی اور جنت حاصل کر لینا کتنا نفع بخش سودا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قدر دانی دیکھئے کہ وہ خود ہمارا خریدار اور طالب بنا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ مومنین نے اپنی جان و مال کے عوض ہم سے جنت خرید لی ہے، بلکہ یوں فرمایا کہ ہم نے جنت اُن کے لئے لکھ دی ہے اور اس کے بدلے اُن کی جانیں اور اُن کے مال ہم نے خرید لئے ہیں، ہم اُن کے خریدار بنے ہیں۔ خرید و فروخت کے معاملہ میں ہمیشہ خریدنے والا طالب ہوتا ہے جو قیمت ادا کر کے مطلوب چیز کو خرید لیتا ہے۔ قیمت کی حیثیت تو خرید و فروخت کے ایک وسیلہ کی ہوتی ہے۔

اہلِ ایمان کی زندگی کا نقشہ

اس کے بعد والی آیت میں بتایا گیا ہے کہ ان مومنین کی زندگی کا کیا ڈھنگ ہوتا ہے اور کیا ان کے اوصاف و احوال ہوتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے۔

"اَلتَّآئِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ، وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔"

یعنی یہ اپنی خطاؤں قصوروں سے توبہ کرنے والے اور اللہ کے عبادت گزار بندے ہوتے ہیں۔ ان کی زبانوں پر خدا کی حمد و تسبیح رہتی ہے، یہ خدا کی راہ میں حسب ضرورت و موقع دور یا قریب کے علاقوں میں پھرتے ہیں۔ (جس دن ان آیتوں کا درس تھا میں نے بتایا تھا کہ "اَلسَّائِحُوْنَ" کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، میرے نزدیک اس کو ترجیح ہے کہ اس سے دین کی راہ میں پھرنا مراد ہے۔ عبادت اور ذکر و تسبیح کی طرح خدا کی راہ میں پھرنا بھی صحابہ کرام کی زندگی کا خاص جز تھا، ہمارے اس دور میں تبلیغی جماعت کے مخلصوں کا پھرنا دیکھ کر یہ بات خوب سمجھ میں آتی ہے)۔ آگے فرمایا گیا ہے "اَلرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ" یعنی یہ لوگ ذوق و شوق سے نمازیں پڑھتے ہیں اور اس سے روحانی غذا حاصل کرتے ہیں، "اَلْاٰمِرُوْنَ

بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" یعنی ان ذاتی اعمال واشغال کے علاوہ اللہ ورسول کے حکم کے مطابق یہ دوسرے بندگانِ خدا کی فکر کرتے ہیں۔ اچھے کام کرنے اور نیکی کے راستے پر چلنے کے لئے کہتے ہیں اور بُرے کاموں سے ان کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر میں فرمایا گیا ہے "وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ" یعنی اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کی محافظت اور پابندی کرتے ہیں، یعنی جن کاموں اور جن باتوں سے منع فرما دیا گیا اُن کی طرف قدم نہیں اٹھاتے۔ یہ ہے سچے ایمان والوں کی پوری تصویر!۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ" یعنی اے پیغمبر ہمارے ان صاحبِ ایمان بندوں کو جو اپنا جان و مال اور سب کچھ ہمارے ہاتھ بیچ چکے اور جن کے یہ اوصاف واحوال ہیں، ان کو ہماری رضا اور جنت کی خوشخبری دے دیجئے، ہماری طرف سے وہ ان کے لئے لکھی جا چکی ہے۔

ان دو آیتوں نے ہمارے سامنے سچے مسلمانوں کی ایسی مکمل تصویر رکھ دی ہے کہ اس کو سامنے رکھ کے ہم میں سے ہر ایک اپنی ایمانی حالت اور اسلامیت کو جانچ پرکھ سکتا ہے۔ اس میں جتنی کمی ہو سمجھنا چاہئے کہ اتنی ہی ایمان میں اور اسلامیت میں کمی ہے۔

چو میگویم مسلمانم بلرزم

کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را (۱)

پھر چند آیتوں کے بعد اسی سچی اسلامیت اور ایمانِ صادق کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۔"

یعنی اے مسلمانو جنہوں نے اسلام کو بطور دین کے قبول کر لیا ہے اللہ سے ڈرو، اپنے اندر تقوی اللہ کی کیفیت پیدا کرو اور مومنین صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔

سورۂ توبہ کے ان تمام مضامین کے بعد جن میں ہر قسم کے اور ہر درجہ کے نفاق اور دین کی راہ میں قربانی سے گریز، بلکہ معمولی کوتاہی اور سُستی پر بھی سخت عتاب کیا گیا ہے اور انتہائی جلال کے کوڑے برسائے گئے ہیں تو ان مضامین کے بعد یہ آیت "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

(۱) ترجمہ: جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو کانپ جاتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے معلوم ہے مسلمان ہونے کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ (مرتب)

اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ" بڑی معنویت رکھتی ہے۔ اس آیت کی جو دعوت و پکار صحابہ کرام کے لئے تھی وہ میرے اور آپ کے لئے بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی مخاطب کر کے فرما رہا ہے۔ "يٰاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ"۔ مجھے اور آپ کو دل سے اور عمل سے جواب دینا چاہئے کہ اے ہمارے اللہ ہم نے فیصلہ کرلیا، تو توفیق دے کہ تیرا تقویٰ اور صادقین کی معیت نصیب ہو جائے۔

خاتمہ سورۃ

اس کے بعد اب اس سورۃ کی اُن آخری دو آیتوں پر آ جایئے جو میں نے شروع میں تلاوت کی تھیں اور جن پر یہ سورۃ ختم ہوئی ہے۔

آپ حضرات نے اس پوری سورت کے درس سے خود بھی محسوس کیا ہوگا اور میں بھی برابر عرض کرتا رہا ہوں کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے جلال کا بڑا ظہور ہوا ہے۔ مشرکین، یہود و نصاریٰ، منافقین اور وہ مسلمان جن کے ایمانوں میں کچھ ضعف تھا اور وہ صحابہ کرام جن سے دین کے بارہ میں کچھ بھی سُستی اور کمزوری ظاہر ہوئی تھی اُن سب کے خلاف اس سورۃ میں بڑا سخت رویہ اختیاری کیا گیا ہے اور سب ہی کو جھنجھوڑا گیا ہے، اسی لئے حضرت حذیفہؓ اس سورۃ کو "سورۃ العذاب" کہا کرتے تھے۔ لیکن اس کا خاتمہ ایسی آیت پر کیا گیا ہے جو رحمت سے بھرپور ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔

"لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ"۔

مطلب یہ ہے کہ خدا نے تم سب طبقوں پر یہ رحمت فرمائی ہے کہ ایسا رسول تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا ہے جو خود تمہیں میں سے ہے، تم اس کو جانچ پرکھ سکتے ہو اور وہ تمہارا ایسا غمخوار و غمگسار ہے کہ تمہاری تکلیف و مشقت اس پر بھاری اور شاق ہے، اس کو تمہاری فوز و فلاح کی بڑی حرص اور فکر و لگن ہے اور خاص کر ایمان والوں کے لئے وہ بڑا ہی شفیق و ہمدرد ہے اور اس کا قلب رأفت و رحمت سے معمور ہے۔ تو اے سب لوگو تمہیں اللہ کی اس نعمت اور رحمت کی قدر کرنی چاہئے اور آگے بڑھ کر استقبال کرنا چاہئے۔ اور اس کے رؤف و رحیم پیغمبر

کی رأفت ورحمت سے فائدہ اٹھانا چاہئے! خاص کر ایمان والوں کو چاہئے کہ اس کی ہدایات پر چل کر اور اس کا اتباع کر کے اللہ کی رضا اور رحمت اور جنت حاصل کریں۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے:

"فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔"

یعنی اگر یہ لوگ رحمت کی اس پکار کو بھی نہ سنیں اور اے پیغمبر تمہاری طرف نہ آئیں تو پھر تم ان سے کہہ دو کہ مجھے تم سے کچھ لینا نہیں، میرا اللہ مجھے کافی ہے، وہی اور صرف وہی معبود ومقصود ہے، میرا اسی پر اعتماد و بھروسہ ہے، اور وہ "رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْم" ہے۔ اس آیت پر یہ سورت ختم ہے۔

یہ سورۂ توبہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں رسول اللہ ﷺ کے آخری دور حیات میں نازل ہوئی ہے اور اس کے مضامین کی نوعیت ایسی ہے کہ گویا یہ الوداعی پیغام اور وصیت نامہ ہے، غالباً اسی لئے حضرت عمرؓ اس کی تاکید فرماتے تھے کہ ہر مسلمان اس کا علم حاصل کرے تاکہ اس سے اس کو برابر ہدایت اور روشنی ملتی رہے۔ میں نے بھی آج اسی لئے اس کے اہم مضامین کو دہرا دینا مناسب سمجھا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب حضرات کو اس سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آخر میں اس کی بالکل آخری آیت کے متعلق ایک حدیث اور سن لیجئے۔ رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت سے سنن ابی داؤد میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص صبح وشام سات سات دفعہ یہ کلمہ پڑھ لیا کرے "حَسْبِيَ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔" تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مشکلات ومہمات حل ہوتی رہیں گی اور اللہ اس کے لئے کافی ہوگا۔

"سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ نَشْهَدُ أَنْ لَآ إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ نَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوْبُ إِلَيْكَ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ۔"

سورۃ ابراہیم

درس ۔ ۱۴

(درس-۱۴)

آخرت میں مجرموں کا حال اور خداوندِ قہار کا قہر وجلال

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم- بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ- اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ
لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُo مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ
اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌo وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ
الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ،
نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَo اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ
قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍo وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَo
وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ- وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ
لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُo فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ- اِنَّ
اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍo يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ
وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِo وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ
فِي الْاَصْفَادِo سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُo

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (سورہ ابراھیم۔ آیت ۴۲-۵۲)

(ترجمہ) اور تم ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ اللہ ظالموں مجرموں کے اعمال (اور کرتوتوں) سے غافل اور بے خبر ہے، درحقیقت اس نے اُن کو (یعنی اُن کی سزا کے معاملے کو) بس اُس دن (یوم الحساب) تک کے لئے مؤخر کر رکھا ہے، جس دن (حال یہ ہوگا کہ) آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، یہ لوگ (حواس باختہ اور مبہوت) سر اوپر اٹھائے (میدانِ حساب کی طرف) دوڑ رہے ہوں گے، ان کی نگاہ بھی اپنی طرف نہ لوٹے گی، (سراسیمگی اور دہشت سے) ان کے دل (فہم وشعور سے) خالی ہوں گے۔

اور اے پیغمبر لوگوں کو اُس دن کی آمد سے خبردار کرو جب اُن پر اللہ کا عذاب نمودار ہو جائے گا، تو اُس وقت یہ ظالمین کہیں گے کہ پروردگار ہمیں تھوڑی سی مدت کے لئے اور مہلت دے دے ہم (کفر وشرک اور عصیان وبغاوت سے تائب ہوکر) تیری دعوتِ حق کو قبول کریں گے اور تیرے رسولوں کی پیروی کریں گے (تو ان کو اس وقت جواب دیا جائے گا) کیا تم نے قسمیں کھا کے نہیں کہا تھا کہ ہمیں کبھی زوال نہ ہوگا۔ حالانکہ تم ان لوگوں کی بستیوں میں رہ رہے تھے جنہوں نے (تم سے پہلے دور میں کفر وانکار کرکے) اپنے نفسوں پر ظلم کیا تھا، اور تم پر یہ بھی واضح ہو چکا تھا کہ ہم نے اُن ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا تھا (اور ان کا انجام کیا ہوا تھا) اور ہم نے (تمہاری نصیحت کے لئے) طرح طرح کی مثالیں بھی بیان کی تھیں۔ اور ان ظالموں نے (حق اور اس کے داعیوں کے خلاف) بڑی بڑی چالیں چلی تھیں، اور ان کی ان ساری چالوں کا ریکارڈ (اور اُن کا بدلہ اور توڑ) اللہ کے پاس ہے اور بلاشبہ اُن کی یہ چالیں ایسی تھیں کہ ان کے اثر سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں۔ تو ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ نے جو وعدہ اپنے رسولوں سے کیا ہے (کہ ظالمین و مجرمین ضرور اپنے کیفر کردار تک پہونچیں گے) وہ اُس کے خلاف کرنے والا ہے (ایسا ہرگز نہ ہوگا) حق ہے کہ اللہ تعالیٰ غالب وزبردست ہے اور مجرموں کو سزا دینا اس کی صفت ہے۔

وہ دن جبکہ یہ زمین ایک اور زمین سے بدل دی جائے گی، اور آسمان بھی بدل جائیں

گے، اور سب لوگ نکل کے اللہ واحدِ قہار کے حضور میں حاضر ہوں گے اور تم اُس دن مجرموں کو دیکھو گے کہ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، اُن کے کُرتے قطران کے ہوں گے (جو ایک نہایت بدبودار اور بدرنگ آتش گیر غلیظ تیل سا ہوتا ہے، وہ گویا اُن کے پورے جسموں پر لگا ہوا ہوگا اور وہی گویا اُن کا لباس ہوگا) اور آگ کے شعلوں نے اُن کے چہروں کو ڈھانک رکھا ہوگا، یہ سب اس لئے ہوگا کہ اللہ ہر شخص کو اُس کے کیئے کا بدلہ دے دے۔ یقین کرو اللہ جلدی حساب لینے والا ہے۔ یہ لوگوں کو پہنچائے جانے کے لئے (خداوندی) پیغام ہے اور مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو (آنے والے انجام سے) خبردار کیا جائے، اور لوگ یقین سے جان لیں کہ وہی اللہ ایک معبود برحق ہے، اور ارباب فہم و دانش نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر و تشریح

سورہ کی گزشتہ آیتوں کا خلاصہ

یہ سورۂ ابراہیم کا آخری رکوع ہے، آپ حضرات کو یاد ہوگا میں نے عرض کیا تھا کہ یہ سورت مکّی ہے اور اکثر مکّی سورتوں کی طرح اس کا روئے سخن بھی مکہ کے کفار و مشرکین کی طرف اور خاص طور سے اُن کے لیڈروں اور سرداروں کی طرف ہے جو رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے سب سے پہلے مخاطب تھے اور انتہائی مخالف تھے۔ دوسروں کو بھی حق کے راستہ سے روکتے تھے۔ اس آخری رکوع سے ایک ہی رکوع پہلے ان ہی کے بارہ میں فرمایا گیا تھا۔ "بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْراً وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَار، جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَار"، یعنی اللہ نے ان پر طرح طرح کے احسانات کیئے، نعمتوں سے نوازا، لیکن انہوں نے اس کا بدلہ یہ دیا کہ کفر کی راہ اختیار کی اور اپنی قوم کو بھی کفر و شرک کے راستہ پر ڈال کے جہنم میں جھونک دیا۔ آگے فرمایا گیا تھا۔ "وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَاداً لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ" یعنی انہوں نے اپنے باطل معبودوں، بتوں کو اللہ کا شریک بنایا اور لوگوں کو خدا کے راستے سے ہٹا کر شرک کے راستے پر ڈالا۔ ان کا یہ جرم بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا گیا تھا۔ "قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّار"، یعنی انہیں بتا دیا جائے اور جتا دیا جائے کہ دنیا کی اس چند روزہ

زندگی میں خوب مزے اڑالو، آخر میں تمہیں جہنم کا ایندھن بننا ہے۔ یہ بات بالکل اس طرح فرمائی گئی جس طرح طبیب کسی سخت بد پرہیز مریض سے کہتا ہے کہ اچھا تم خوب بد پرہیزی کرلو تم اس کا نتیجہ دیکھ لوگے، تمہارا وقت قریب ہی آ گیا ہے۔

اس کے بعد درمیان میں اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے ہدایت فرمائی گئی تھی کہ تم استقامت کے ساتھ بندگی کے راستے پر چلتے رہو اور خصوصیت کے ساتھ یہ دو عمل کرتے رہو۔ ایک نماز قائم کرتے رہو جو روح کے لئے قربِ الٰہی حاصل ہونے کا خاص ذریعہ ہے، اور دوسرے اللہ کی دی ہوئی روزی میں سے اس کی رضا کی راہوں میں خرچ کرتے رہو جو تزکیۂ نفس کا خاص وسیلہ ہے (یُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ وَیُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً)۔

میں نے آپ سے اس درس کے سلسلہ میں بار بار عرض کیا ہے کہ یہ دو عمل (نماز اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) سعادت کی بنیاد ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر شریعت میں اور ہر پیغمبر کی ہدایت و تعلیم میں ان کا حکم رہا ہے، اور ان دو حکموں پر عمل کرنے سے پورے دین پر چلنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے چند ایسے عظیم احسانات کا ذکر فرمانے کے بعد جن کا تعلق سب انسانوں بلکہ اکثر مخلوقات سے ہے آخر میں ارشاد فرمایا گیا تھا "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّار" (آدمی بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے) یعنی بہت سے آدمیوں کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کی ان نعمتوں سے برابر فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اُس کی عبادت اور فرماں برداری کا حق ادا نہیں کرتے بلکہ بہت سے تو ایسے ناشکرے ہیں کہ اُس کو بھولے سے بھی یاد نہیں کرتے۔ "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّار"۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چند دعاؤں کا ذکر فرمایا گیا تھا، پہلی دُعا یہ تھی، "رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَام" (اے پروردگار اس شہر مکہ کو امن کا شہر بنادے اور مجھے اور میری اولاد کو بُت پرستی کی گندگی سے محفوظ رکھ) اس کے بعد دوسری دُعا یہ تھی "رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ...... الآیۃ" (خداوندا میں نے تیرے مقدس اور باعظمت گھر (خانۂ کعبہ) کے پاس ایسی وادی میں جہاں کوئی کھیتی اور پیداوار نہیں ہوتی اپنی کچھ نسل کو بسا دیا ہے تاکہ وہ نماز قائم کریں اور تیرا گھر تیری

عبادت اور تیرے ذکر سے آباد رہے، خداوندا تو اپنے کچھ بندوں کے دل اُن کی طرف مائل کردے، وہ ان سے محبت کریں اور اُن کی روزی کے لئے زمین کی پیداوار، پھل وغیرہ، اپنی قدرت اور رحمت سے ان کو پہنچا، تا کہ وہ تیرا شکر کریں۔)

ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعائیں خاص طور سے مکہ کے اُن مشرکوں اور کافروں کو سنائی گئی ہیں جو ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مورثِ اعلیٰ کہتے تھے اور اُن کی نسبت پر فخر کرتے تھے۔ اِن آیتوں میں اُن کو بتایا جا رہا ہے کہ ابراہیم تو شرک سے بے زار تھے، انہوں نے تو اپنی نسل کو ملک شام کے سرسبز علاقہ سے لاکر اس وادیٔ غیر ذی زرع میں صرف اس لئے آباد کیا تھا کہ ان کے ذریعہ خانۂ کعبہ نماز اور عبادت سے آباد رہے۔ سوچو غور کرو تمہارا کیا حال ہے، تم نے اللہ کی عبادت اور نماز کے بجائے بتوں کی پوجا کا طریقہ اپنالیا ہے اور تم اللہ کے اُس پیغمبر کی مخالفت اور دشمنی پر کمر بستہ ہو گئے ہو جو ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر ایک اللہ کی عبادت اور نماز کی طرف بلاتا ہے اور کعبۃ اللہ کو اللہ کی عبادت اور نماز سے آباد کرنا چاہتا ہے جو تم سب کے مورثِ اعلیٰ ابراہیم علیہ السلام کی تمنا اور آرزو تھی۔

آخری دُعا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ نقل کی گئی ہے "رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ، رَبَّنَا اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ" (اے پروردگار مجھے نماز کا قائم کرنے والا بنادے اور میری نسل کو بھی اس کی توفیق دے۔ خداوندا میری دُعا قبول فرمالے، خداوندا میری بخشش فرمادے اور میرے ماں باپ اور سب ہی ایمان والوں کو بخش دے اُس دن جبکہ اعمال کا محاسبہ ہو)۔

ابراہیم علیہ السلام کی یہ آخری دُعا نقل کر کے مکہ کے کفار و مشرکین کو بتایا گیا ہے کہ تمہارے جداعلیٰ جن کے نام اور نسبت پر تم فخر کرتے ہو اُنہوں نے تو اللہ سے یہ دُعا کی تھی کہ اُن کو اور ان کی نسل کو نماز قائم کرنے کی خاص توفیق ملے، اور تمہارا حال یہ ہے کہ اللہ کے جو بندے نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کے گھر کو اس کے ذریعہ آباد کرنا چاہتے ہیں تم اُن کی مخالفت کر رہے ہو۔ اور ابراہیم علیہ السلام کا حال یہ تھا کہ وہ آخرت میں مغفرت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے تھے، اور تمہارا حال یہ ہے کہ آخرت کے محاسبہ سے بالکل بے فکر بلکہ اس کے منکر ہو۔

بلاشبہ مکہ والوں کے لئے دعوت اور نصیحت کا یہ بہترین اور نہایت حکیمانہ طریقہ تھا۔

ان کے علاوہ اہلِ ایمان کے لئے بھی اس میں سبق تھا اور ہے کہ اقامت صلوٰۃ اور آخرت میں مغفرت اس درجہ اہم چیزیں ہیں کہ اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ السلام بھی اُن کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کرتے تھے، اس لئے ہمیں اس دُعا کو اپنا خاص وظیفہ بنا لینا چاہئے۔ ''رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ رَبَّنَا وَتَقَبَّلۡ دُعَآءِ، رَبَّنَا اغۡفِرۡلِیۡ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ''۔

زیرِ تلاوت آیات کا پس منظر

یہاں تک میں نے سلسلۂ کلام کے لئے اوپر کی آیتوں کا خلاصہ دُہرا دیا۔ اس کے بعد آخری رکوع کی وہ آیتیں ہیں جن کی میں نے اس وقت تلاوت کی ہے، ان کا رخ بھی مکہ کے ان کفار و مشرکین ہی کی طرف ہے۔ ان کا مفہوم اور مطلب سمجھنے کے لئے اس صورت حال کا تصور کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ مکہ کے سامنے توحید اور خدا پرستی اور آخرت کی فکر اور تیاری کی دعوت پیش کر رہے ہیں، مختلف طریقوں اور اسلوبوں سے انتہائی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ ان کو خدا کا پیغام پہونچاتے ہیں، کبھی خدا کے انعامات و احسانات یاد دلاتے ہیں، کبھی ابراہیمؑ کی تعلیمات اور ان کی دُعاؤں کا ذکر فرماتے ہیں، کبھی خدا کے قہر و عذاب سے ڈراتے ہیں، لیکن وہ لوگ جن کے دلوں پر کفر و شرک کی سیاہی چھا گئی ہے کوئی اثر نہیں لیتے بلکہ اور زیادہ بدتمیزیاں اور گستاخیاں کرتے ہیں اور اُن پر آسمان سے کوئی عذاب بھی نہیں آتا۔ تو ایسی حالت میں وہ خود یا دوسرے خدا ناشناس جاہل لوگ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ان کو خدا کے قہر و عذاب کی جو وعیدیں اور خبریں سنائی جا رہی ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یا معاذ اللہ خدا اس صورتِ حال سے غافل اور بے خبر ہے۔ تو سورۂ ابراہیم کی ان آخری آیتوں کا تعلق اس صورتِ حال سے ہے۔

اللہ سب دیکھ رہا ہے لیکن......

حاصل یہ ہے کہ کسی کو یہ خیال یا وسوسہ نہ ہو کہ یہ جفا کار مجرمین جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے بے خبر ہے، وہ سب کچھ دیکھ رہا سن رہا ہے، لیکن اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ ان

ظالموں پر دنیا میں عذاب نہ بھیجے، ان کو پوری مہلت دے کہ اگر اپنی اصلاح کرنا چاہیں تو کرلیں، اور اگر اسی کفر و شرک اور ظلم پر قائم رہیں تو آخرت میں ان کا پورا حساب ہو جائے، وہاں ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے گا جس کے یہ مستحق ہوں گے، اور جو اللہ "عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍ" کی شانِ قہر و جلال کے مطابق ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا!

ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "وَلَاتَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا یُؤَخِّرُھُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ، مُھْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُؤُسِھِمْ لَایَرْتَدُّ اِلَیْھِمْ طَرْفُھُمْ وَاَفْئِدَتُھُمْ ھَوَاءٌ" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہرگز یہ گمان نہ کرو، اور ہرگز کسی کو یہ وسوسہ نہ ہو کہ خدا فراموش اور جفا کار لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے غافل ہے، وہ سب دیکھ رہا ہے سن رہا ہے، لیکن ان کے محاسبہ اور سزا کے معاملے کو اس نے قیامت کے اس دن تک کے لئے مؤخر کر دیا ہے جو ایسا ہیبت ناک ہوگا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، اس دن ان اشرار مجرمین کی یہ حالت ہوگی کہ انتہائی گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں جانوروں کی طرح سر اوپر اٹھائے، آنکھیں پھاڑے میدانِ حساب کی طرف دوڑ رہے ہوں گے، ہوش و حواس بجا نہ ہوں گے۔

آگے ارشاد ہے "وَاَنْذِرِ النَّاسَ یَوْمَ یَاْتِیْھِمُ الْعَذَابُ فَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ" اے پیغمبر لوگوں کو اس روزِ قیامت کی آمد سے خبردار کرو جب ان کے سامنے عذابِ الٰہی نمودار ہوگا، تو جنھوں نے دنیا میں ظالمانہ اور مجرمانہ زندگی گزاری تھی اور اللہ کے پیغمبروں کی بات نہیں مانی تھی وہ اس وقت کہیں گے پروردگار! ہمیں تھوڑی سی مدت کے لئے مہلت دے دے یعنی تھوڑے سے وقت کے لئے عمل والی دنیا میں پھر بھیج دے، ہم تیری دعوتِ حق کو جو پیغمبروں کے ذریعہ آئی تھی اور ہم نے اس کو قبول نہیں کیا تھا اب قبول کرلیں گے اور تیرے رسولوں کی پیروی کریں گے)"۔

قرآن پاک میں دوسری جگہ سورۂ سجدہ میں بھی فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن مجرمین اللہ کے حضور میں عرض کریں گے "رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا" (خداوندا ہم نے (جن حقیقتوں کا انکار کیا تھا) یہاں ہم نے ان کو خود دیکھ لیا اور سن لیا، اب ہمیں دنیا میں واپس بھیج دے اب ہم تیرے اور تیرے رسولوں کے حکموں کے مطابق نیک اعمال کریں گے)۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان مجرمین کو یہ پر جلال جواب دیا جائے گا "أَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِنْ قَبْلُ مَالَكُمْ مِنْ زَوَالٍ۔ وَسَكَنْتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْأَمْثَالَ، وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَاللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ...... فرمایا جائے گا کیا تم وہی نہیں ہو جنھوں نے بڑے گھمنڈ کے ساتھ قسمیں کھا کھا کے کہا تھا کہ ہم کو کبھی زوال نہ ہوگا، حالانکہ تم ان لوگوں کے علاقوں اور بستیوں میں رہے تھے جنھوں نے اپنے زمانوں میں نافرمانی کی مجرمانہ زندگی گزاری تھی اور تمہارے سامنے یہ آچکا تھا کہ ہم نے ان مجرمین کے ساتھ کیا معاملہ کیا اور تمہارے سامنے ایسی قوموں اور ایسے گروہوں کی بہت سی مثالیں بھی بیان کردی گئی تھیں۔ لیکن تم نے کوئی سبق نہیں لیا، اور قسمیں کھا کھا کے یہی کہا کہ ہم پر کبھی بُرا وقت نہیں آئے گا۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کہ انھوں نے اپنی شرارتوں اور مکّارانہ تدبیروں میں کوئی کسر اُٹھا کے نہیں رکھی تھی، حق کی مخالفت میں جو شیطانی تدبیریں وہ کرسکتے تھے وہ سب انھوں نے کیں، اور یہ تدبیریں اور شرارتیں ایسی خطرناک تھیں کہ ان کے ذریعہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹا دیے جائیں (وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ) اور یہ سب تدبیریں اور شرارتیں اللہ کے سامنے اور اس کے علم میں تھیں۔ اس لئے وہ ان کی ان مکارانہ تدبیروں اور شرارتوں کی ان کو بھرپور سزا دے گا۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ ذُوانْتِقَامٍ" مطلب یہ ہے کہ ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ اللہ نے مجرموں کو سزا دینے اور کیفرکردار کو پہونچانے کے جو وعدے اپنے رسولوں سے کئے ہیں وہ ان کے خلاف کرے گا، ایسا ہرگز نہ ہوگا، "إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ ذُوانْتِقَامٍ" اللہ غالب اور زبردست ہے اور مجرموں کو سزا دینا اس کی شان اور صفت ہے۔ اس لئے مجرموں کو سزا دینے کے وعدے اپنے وقت پر ضرور پورے ہوں گے۔

قیامت اور مجرموں کی پکڑ

آگے جو آیتیں ہیں جن پر یہ سورت ختم ہوتی ہے، ان میں [illegible] بتایا گیا ہے کہ اللہ

تعالیٰ کی صفت انتقام اور شانِ قہر و جلال کا جب قیامت میں ظہور ہوگا تو کس قدر ہیبت ناک اور دہشت ناک منظر ہوگا، اور جن بد بخت مجرموں پر ظہور ہوگا ان کا کیا حال ہوگا۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَالْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّار" مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن زمین و آسمان بدل جائیں گے، اور اللہ واحد قہار کے حضور میں پیشی ہوگی۔ اسی پیشی کا ذکر یہاں جن الفاظ میں کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پیشی کے وقت اللہ تعالیٰ کی شان قہر و جلال کا ظہور ہوگا۔ آگے بتایا گیا ہے کہ مجرمین جن کے جرائم ناقابلِ معافی ہوں گے ان کا کیا حال ہوگا۔ "وَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ سَرَابِیْلُھُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰی وُجُوْھَھُمُ النَّارُ، لِیَجْزِیَ اللّٰہُ کُلَّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ"۔

اور قیامت کے اُس دن تم مجرمین کو اس حالت میں دیکھو گے کہ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، اور ان کے جسموں پر قطران اس طرح لگا ہوا ہے کہ گویا وہی ان کا کرتا اور لباس ہے۔ قطران ایک طرح کا بدبودار و بدرنگ تیل ہوتا ہے جس میں کچھ اور تیز قسم کی چیزیں ملا کر اس اونٹ پر ملا جاتا ہے جس کو خارش ہو جاتی ہے، اس سے خارش کا مادہ جل جاتا ہے، اس میں آگ پکڑنے کی بھی خاص صلاحیت ہوتی ہے، آپ مثال کے طور پر تارکول بلکہ اس سے بھی زیادہ بدبودار اور بدرنگ غلیظ قسم کا تیل تصور کرلیں۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ آخرت میں ان مجرموں کے جسموں پر اوپر سے نیچے تک جسم کے جتنے حصہ پر کرتا پہنا جاتا ہے قطران اور وہ بھی آخرت اور دوزخ والا قطران لیپ دیا جائے گا گویا وہی ان کا کرتا ہوگا۔ جس طرح کسی آدمی کو برہنہ کرکے اس کے جسم پر تارکول پھیر دیا جائے تو یہ تارکول ہی اس کا لباس ہو جائے گا، اس سے آپ کچھ تصور کرسکتے ہیں کہ اُس وقت اُن بد بخت مجرموں کا کیا حال ہوگا اور کیا منظر ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا!

پھر یہ بھی تصور کیجئے کہ ہر طرف آگ کے شعلے ہیں اور یہ قطران خود آتش گیر ہوتا ہے، اسپرٹ کی طرح جلتا ہے۔ تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُس وقت اُن بدنصیبوں کو کیسا عذاب ہوگا۔ اللہ کی پناہ!

آگے فرمایا گیا ہے "وَتَغْشیٰ وُجُوْھَھُمُ النَّار" مطلب یہ ہے کہ آگ کے شعلے ان کے چہروں تک پہونچ رہے ہوں گے۔ اس سے یہ اشارہ مفہوم ہوتا ہے کہ ان کے چہروں پر قطران نہیں لیپا جائے گا، بلکہ چہروں تک صرف شعلے پہونچیں گے، یہ غالباً اس لئے ہوگا کہ وہاں بھی پہچانے جاسکیں کہ یہ فلاں لیڈر صاحب ہیں اور یہ قوم کے فلاں سردار ہیں، اگر سب کے چہروں پر بھی قطران مل دیا جاتا تو کوئی نہ پہچانا جاتا۔ اس طرح چہروں پر قطران نہ ملا جانا بھی ایک عذاب ہوگا۔ بس اللہ اپنی پناہ میں رکھے۔

آگے فرمایا گیا ہے۔ "لِیَجْزِیَ اللّٰہُ کُلَّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَاب" مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں یہ کوئی ظلم نہ ہوگا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا تقاضا ہوگا، عدل و انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ نیکوکاروں کو ان کی نیکی کا اچھا صلہ اور ثواب دیا جائے، ان پر عنایتیں ہوں، اور ظالموں مجرموں کو ان کے مظالم اور جرائم کی سزائیں دی جائیں، اگر کوئی حاکم ظالموں اور مجرموں کو سزا نہیں دیتا تو وہ حکومت کا اہل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات تمام صفات کمال کی جامع ہے، اس میں رحم بھی ہے اور عدل بھی ہے، وہ اچھے اعمال و اخلاق کا اپنی شانِ عالی کے مطابق صلہ عطا فرمائے گا اور ایسے گنہگار جو توبہ کر چکے ہوں گے، اور اسی طرح ایسے قصوروار جن کے قصور لائق معافی اور درگزر ہوں گے ان کو اپنے کرم سے معافی دے گا اور رحم فرمائے گا، لیکن جن کے جرائم اور مظالم قطعاً ناقابلِ معافی ہوں گے اُن کو اپنے قانونِ عدل کے مطابق سزائیں دے گا، اور یہ سزائیں بھی اس کی شانِ قہر و جلال کے مطابق ہوں گی۔

"اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَاب" سے یہ آگاہی دی گئی ہے کہ کوئی یہ سمجھ کر گناہوں پر جرأت نہ کرے اور آخرت کے محاسبہ سے غافل نہ ہو کہ قیامت اور آخرت کا معاملہ تو بہت دور ہے۔

یقین کرنا چاہئے کہ حساب کی گھڑی جلدی ہی آجانے والی ہے۔ سورۂ انبیاء کے شروع میں بھی فرمایا گیا ہے "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُھُمْ وَھُمْ فِیْ غَفْلَۃٍ مُّعْرِضُوْنَ" یعنی حساب کی گھڑی قریب ہی ہے اور لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کل کا دن جو، گزر چکا وہ بہت دور ہوگیا کیونکہ وہ اب کبھی پلٹ کر نہیں آئے گا اور قیامت اور آخرت کا

حساب کتاب چونکہ یقینی ہے، کوئی شک وشبہ نہیں ہے، اس لئے سمجھنا چاہیئے کہ وہ قریب ہی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَاب'' اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے اور بیان بھی کیا گیا ہے کہ جب وقت آئے گا تو سب کا حساب کتاب بہت جلد بس چند لمحے میں ہو جائے گا دنیا کی عدالتوں کی طرح ایک ایک معاملہ میں مہینے اور برس نہیں لگیں گے۔ ''اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابُ ''

بالکل آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے ''ھٰذَا بَلٰغٌ لِلنَّاسِ وَلِیُنْذَرُوْا بِہٖ وَلِیَعْلَمُوْا أَنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَّلِیَذَّکَّرَ أُوْلُوا الْاَلْبَاب''۔

مطلب یہ ہے کہ اس سورۃ میں جو کچھ فرمایا گیا ہے یہ لوگوں تک پہونچانے کے لئے ایک اہم پیغام ہے اور اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ اللہ کے بندے اس کے ذریعہ خبردار اور خوابِ غفلت سے بیدار کئے جائیں، اور اس کی آیات اور مضامین میں غور وفکر کر کے اس یقین تک پہونچ جائیں کہ بندگی اور عبادت کا مستحق وہی ایک معبود برحق ہے اور عقل ودانش والے اس سے نصیحت وہدایت حاصل کریں۔

ہمارے لئے اِن آیتوں کا سبق

آج کے درس پر سورۂ ابراہیم ختم ہوگئی، میں نے پہلے بھی آپ حضرات سے بار بار عرض کیا ہے کہ قرآنِ مجید کا اصل موضوع ہدایت اور نصیحت ہے، ہمیں ہر سورت بلکہ ہر رکوع اور ہر آیت سے گزرتے ہوئے یہ سوچنا چاہیئے کہ اس میں ہمارے لئے کیا ہدایت اور کیا سبق ہے۔ آج جو آیتیں درس میں تھیں اُن کا خاص سبق ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم آخرت کے حساب اور اپنے اعمال کے نتائج سے غافل نہ ہوں، ہمیشہ یہ بات سامنے رہے کہ خدا دیکھ رہا ہے اور وہ مجرموں کو بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔ ہمیشہ گناہوں اور نافرمانیوں سے بچتے رہیں، استغفار کرتے رہیں اور اُس کے عذاب اور قہر وجلال سے پناہ مانگتے رہیں۔ توحید پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں اور اعمال میں دو چیزوں کا بہت ہی اہتمام رکھیں۔ ایک اقامتِ صلوٰۃ کا، یعنی اپنے امکان بھر اچھے طریقہ سے نماز پڑھنے کا، اور دوسرے اللہ جو کچھ نصیب فرمائے اُس میں سے اُس کی راہ میں دوسرے ضرورت مند لوگوں پر خرچ کرنے کا، اور اپنے لئے اور اپنے والدین

اور سب اہلِ ایمان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دُعا کرتے رہیں۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَاب۔

اگر ان چند باتوں کا اہتمام نصیب ہو جائے تو انشاء اللہ بیڑا پار ہے اور اللہ کی رحمت میں ہمارا بڑا حصہ ہے۔ اللہ نصیب فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ۔



سورۃ النحل

درس ۱۵–۱۶

(درس - ۱۵)

قیامت کے دن اپنی اُمتوں کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کی شہادت

قرآن پاک میں انسانوں کی ہدایت اور صلاح وفلاح کی سب باتیں بیان کردی گئی ہیں

خیر وشر کے بارے میں قرآن پاک کی جامع ترین آیت

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

وَيَــوْمَ نَبْعَثُ فِــىْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ
وَجِئْنَابِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا
لِّكُلِّ شَىْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ہ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ
بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ
وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ، يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ہ
(سورة النحل۔ آیات ۸۹۔ ۹۰)

(ترجمہ) اور (قیامت کا) وہ دن (یاد رکھنے کے لائق ہے) جب ہر اُمت پر شہادت دینے والا اور اُنکے معمول بتانے والا ہم انھیں میں سے کھڑا کریں گے اور (اے پیغمبر) تم کو ہم ان لوگوں پر شہادت دینے کے لئے لائیں گے، اور ہم نے تم پر نازل کی ''الکتاب'' پوری طرح بیان کرنے کے لئے (ہدایت اور سعادت سے متعلق) سب باتیں، اور تاکہ ہدایت اور رحمت کا ذریعہ ہو اور بشارت ہو قبول کرنے والوں اور فرمانبرداری کرنے والوں کے لئے۔

اللہ حکم فرماتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت والوں کے ساتھ دادودہش کا اور منع فرماتا ہے گندی بے حیائی کی باتوں سے اور ہر طرح کی نامعقول بری باتوں سے اور ظلم وزیادتی سے، وہ تم کو نصیحت فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو اور نصیحت پکڑو۔

تفسیر وتشریح

یہ سورۂ النحل کا سلسلہ چل رہا ہے، میں بتا چکا ہوں کہ یہ سورۃ بھی مکی ہے۔ اور اکثر مکی سورتوں کی طرح اس کا خاص روئے سخن بھی مکہ کے کفار و مشرکین کی طرف ہے، اور شرک کا رد اور توحید و خدا پرستی کی دعوت اس کا بنیادی مضمون اور پیغام ہے۔ سورۃ کی سب سے پہلی آیت میں ہر طرح کے شرک اور شریکوں سے اللہ تعالیٰ کی پاکی اور برتری بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا تھا۔ أَتىٰ أَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالىٰ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ" اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا گیا تھا کہ سارے پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آتا رہا ہے کہ لوگوں کو خالص توحید کی اور صرف اللہ کی عبادت و بندگی اور صرف اسی سے ڈرنے اور اس کے حکموں پر چلنے کی دعوت دو۔ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ أَمْرِهٖ عَلىٰ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ أَنْ أَنْذِرُوْٓا أَنَّهٗ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاتَّقُوْنِ۔

سورۂ نحل کی ایک خصوصیت

اس سورت میں توحید و خدا پرستی کی دعوت کا خاص انداز یہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس زندگی اور اس دنیا میں بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بے شمار نعمتیں مل رہی ہیں ان کی طرف توجہ دلا کر فرمایا گیا ہے کہ جو خالق و پروردگار ان نعمتوں سے تم کو نواز رہا ہے اسی کا حق ہے کہ اس کو اپنا معبود سمجھو، اور صرف اسی کی عبادت و بندگی کرو اور بس اُسی کے ہو جاؤ، اُسی کے حکموں پر چلو۔

میرا خیال ہے کہ خدا کی نعمتوں کا جیسا بھرپور اور مؤثر بیان اس سورت میں کیا گیا ہے غالباً قرآن مجید کی کسی دوسری سورت میں نہیں کیا گیا۔ اس مضمون اور اس سلسلہ کی آیتوں کی طرف میں اس وقت کچھ اشارات کرتا ہوں۔ شروع کی جو دو آیتیں میں نے ابھی پڑھیں

اُن کے بعد تیسری ہی آیت سے ان نعمتوں کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ فرمایا گیا ہے "خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ تَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ" بلاشبہ زمین و آسمان کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، ہم کو جو کچھ مل رہا ہے زمین یا آسمان ہی سے مل رہا ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ انسان خود اپنے بارے میں غور کرے اُس کو اللہ تعالیٰ نے ایک گندے بے جان قطرہ سے بنایا اور پھر اسے زبان و بیان کی عظیم نعمت دی جو اس دنیا میں اس کے سوا کسی کو نہیں ملی، وہ تقریریں اور بحثیں کرتا ہے، اپنی بات کو دلائل سے ثابت کرنے کی خاص صلاحیت رکھتا ہے۔ (خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ) آگے ارشاد فرمایا کہ اس نے تمہارے لئے طرح طرح کے چوپائے پیدا کئے جن سے کہ سواری اور بار برداری کا کام بھی لیتے ہو اور اُن کا گوشت تمہارے لئے بہترین غذا ہے، اور ان کی کھالوں اور اُن کے اُون سے تمہاری بہت سی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ (وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ) پھر بارش کے نظام کا اور اس کے نتیجہ میں زمین سے پیدا ہونے والی غذائی اجناس اور پھلوں میووں وغیرہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ پھر دن رات کے نظام اور چاند سورج کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ پھر زمین پر اللہ تعالیٰ نے انواع واقسام کی اور رنگ برنگ کی جو لاتعداد نعمتیں بکھار رکھی ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ (وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ)۔ پھر سمندری نعمتوں اور وہاں کی غذائی اور غیر غذائی پیداوار کا ذکر فرمایا گیا ہے اور سمندروں دریاؤں میں چلنے والی کشتیوں اور جہازوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن کے ذریعہ ایک علاقہ کے آدمی اور وہاں کی خاص نعمتیں دوسرے علاقوں تک پہونچتی ہیں۔ اس کے بعد اسی طرح کی کچھ اور نعمتوں کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو سب کو شمار نہیں کر سکتے، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا اور بہت مہربان ہے۔

یہ میں نے صرف اُن نعمتوں کی طرف اشارات کیے ہیں جن کا ذکر اس سورۃ النحل کی ابتدائی آیتوں میں کیا گیا ہے۔ اس کے آگے بھی اس سورت میں جا بجا اسی طرح ان نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن سے انسان عام طور سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ کچھ ہی پہلے وہ آیات گزر

چکی ہیں جن میں انسانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ سوچیں اور غور کریں کہ گائے، بکری، بھینس وغیرہ جانوروں کے پیٹ میں جہاں غلاظت کے ڈھیر ہیں اور سرخ ناپاک خون کی نالیوں کا جال پھیلا ہوا ہے اسی کے درمیان سے اللہ تعالیٰ کیسا صاف شفاف لذیذ اور صحت بخش دودھ انسانوں کے لئے نکالتا ہے، اسی طرح وہ خاص قسم کی مکھیوں کے ذریعہ شہد کی رنگ برنگ کی قسمیں انسانوں کے لئے تیار کراتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کیسی نعمتیں اور اس میں اس کی قدرت کی کیسی نشانیاں ہیں۔

پھر جو آیتیں آج زیر درس ہیں جن کی میں نے ابھی شروع میں تلاوت کی تھی اُن سے ایک ہی رکوع پہلے پچھلے ہفتہ کے درس میں وہ آیتیں گزر چکی ہیں جن میں انسانوں کو یاد دلایا گیا ہے کہ جس وقت تم ماں کے پیٹ سے اس دنیا میں آئے تھے تو تمہیں کسی بات کا علم و شعور نہیں تھا، نہ وہ معلومات تھے جو آنکھ یا کان کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں اور نہ وہ جو غور و فکر اور سمجھ بوجھ سے حاصل ہوتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تم کو علم و شعور کے یہ سارے ذریعے عطا فرمائے۔ ”وَاللّٰهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُوْنِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ“۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مستقل سکونت والے گھروں، اور سفری خیموں اور پہاڑی پناہ گاہوں کے سایوں اور گرمی سردی کی تکلیف سے بچانے والے کپڑوں اور جنگ میں کام آنیوالے حفاظتی لباسوں کا ذکر کر کے آخر میں فرمایا گیا تھا۔ ”كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ“ یعنی اللہ تعالیٰ اسی طرح تم کو اپنی نعمتیں بھرپور عطا فرما رہا ہے تا کہ تم ان انعامات و احسانات کو محسوس کر کے اُس کی بندگی اور فرمانبرداری کا راستہ اختیار کرو۔

نعمتوں کی یاددہانی کے بعد

یہاں تک اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات تفصیل سے بیان فرما کر گویا حجت تمام کر دی گئی اور اس کے بعد خطاب کا انداز بدل گیا اور اس میں جلال کا رنگ آ گیا۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ”فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ“ (یعنی اگر یہ منکرین ان نعمتوں کی یاددہانی کے بعد بھی نہ مانیں اور اُلٹے ہی چلیں تو اے پیغمبر تم پر کوئی ذمہ داری نہیں، تمہارے ذمہ

تو بس صاف صاف بتلا دینا اور پہنچا دینا ہے)۔اس کے بعد فرمایا گیا ہے۔"یَعْرِفُوْنَ نِعْمَةَ اللّٰهِ ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا وَأَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ"یعنی یہ ظالم اللہ کی نعمتوں سے ناواقف نہیں ہیں،خوب جانتے ہیں،لیکن اس کے باوجود منکر ہیں اور ان میں سے اکثر کفر ہی پر قائم رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور کافر ہی رہیں گے۔

اس کے بعد ان منکرین کے کافرانہ رویہ کا جو انجام آخرت میں ان کے سامنے آنے والا ہے وہ بیان فرمایا گیا ہے۔ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"وَیَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِیْدًا ثُمَّ لَایُؤْذَنُ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَلَاهُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ" (اس کا مطلب یہ ہے کہ جس امت میں جو نبی اور ہادی بھیجے گئے تھے قیامت کے دن اُن سے اُس اُمت کے بارے میں گواہی لی جائے گی اور وہ خدا کے سامنے گواہی دیں گے اور بتائیں گے کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ اور میری دعوت وہدایت کے ساتھ یہ معاملہ کیا تھا،پھر وہ لوگ جنھوں نے پیغمبر کی مخالفت اور کفر کی راہ اختیار کی ہوگی چاہیں گے کہ اب اُن کو توبہ کرنے کا موقع دے دیا جائے اور معاف فرمادیا جائے۔لیکن وہاں ان کے لئے توبہ اور معافی کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

ذرا اس وقت کا تصور کیجئے کہ میدانِ حشر ہے،اللہ تعالیٰ کے جلال وغضب کا پورا پورا ظہور ہے،ہر نبی اور ہر قوم کے ہادی اور داعیٔ حق کی اللہ کے حضور میں پیشی ہورہی ہے اور وہ سرکاری گواہ کی حیثیت سے اپنی اپنی اُمتوں اور قوموں کے بارے میں بیان دے رہے ہیں، جنھوں نے مخالفت اور کفر کا راستہ اختیار کیا تھا وہ بھی موجود ہیں اور اُن کے بارے میں اللہ کے پیغمبروں اور حق کے داعیوں کی شہادت گزر رہی ہے،جہنم کا عذاب سامنے ہے،اس وقت اُن مجرموں کی جو حالت ہوگی اُس کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے؟؟؟ وہ درخواست کریں گے کہ اب ان کو توبہ کی اجازت دے دی جائے اور معاف فرمادیا جائے۔لیکن زندگی بھر کفر وانکار پر قائم رہ کر وہ اس کا استحقاق بالکل کھو چکے ہوں گے،پھر اُن کی خواہش اور استدعا ہوگی کہ سزا میں کچھ تخفیف ہی ہوجائے،یا معاملہ کچھ مؤخر کردیا جائے،لیکن کفر کے سنگین جرم کے بعد کوئی رعایت بھی ان کو نہ دی جاسکے گی۔اسی کو فرمایا گیا ہے۔"وَإِذَا رَأَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا الْعَذَابَ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَاهُمْ یُنْظَرُوْنَ" یہ آیتیں مکہ معظمہ میں نازل ہورہی ہیں اور اہل مکہ

کو سنائی جا رہی ہیں تا کہ وہ اپنے انجام کو سوچیں اور اپنے رویہ پر نظر ثانی کریں۔ پھر ان اہلِ مکہ میں وہ اشرار بھی تھے جو خود کفر اور مخالفت کا رویہ اختیار کرنے کے علاوہ دوسروں کو بھی دینِ حق قبول کرنے سے روکتے تھے اور اس کے لئے طرح طرح کی شیطانی تدبیریں اختیار کرتے تھے، ضعیفوں کمزوروں کو ستاتے بھی تھے، اور ہر زمانہ میں ایسے اشرار ہو سکتے ہیں۔ آگے خاص طور سے ایسوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

"اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ زِدْنٰھُمْ عَذَاباً فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا کَانُوْا یُفْسِدُوْنَ" یعنی جن لوگوں کا کردار یہ ہے کہ انھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا اور دوسروں کو بھی اللہ کے راستے پر اور اللہ کے دین کی طرف آنے سے روکا، اُن کو اُن کے اس مفسدانہ جرم کی پاداش میں اور زیادہ عذاب بالائے عذاب دیا جائے گا۔

اس کے آگے وہ آیتیں ہیں جو میں نے آج تلاوت کی ہیں۔ پہلی آیت میں تو قیامت میں نبیوں، رسولوں اور حق کے داعیوں کی شہادت کے اس مضمون کو کچھ اضافہ کے ساتھ دوہرایا گیا ہے جو ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

حشر میں انبیاءؑ کی گواہی

"وَیَوْمَ نَبْعَثُ فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ شَھِیْداً عَلَیْھِمْ مِنْ اَنْفُسِھِمْ وَجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰؤُلَآءِ شَھِیْدًا" یعنی اُس دن کو یاد کرو اور اس کا دھیان کرو جب ہم ہر اُمت میں سے اُن پر شہادت دینے والا اُنہی میں سے کھڑا کریں گے اور اے پیغمبر تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کے لائیں گے، یعنی قیامت کے دن کے اس منظر کا دھیان کرو جب اللہ کے حکم سے ہر اُمت کے پیغمبر اور ہر قوم میں آنے والے داعیانِ حق کو سرکاری گواہ کی حیثیت سے کھڑا کیا جائے گا اور وہ اس اُمت اور قوم کے رویہ کے بارے میں بیان دیں گے کہ انھوں نے حق کی دعوت کو قبول کیا تھا یا انکار واستکبار کیا تھا۔ اور اللہ کے آخری نبی سیدنا حضرت محمد ﷺ سے اُن کی اُمت اور خاص طور سے اُن کے پہلے مخاطبین اہلِ مکہ کے بارے میں بیان دینے کو کہا جائے گا اور آپ آخری سرکاری گواہ کی حیثیت سے بیان دیں گے اور بتلائیں گے کہ ان لوگوں نے آپ کے اور آپ کی دعوت کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا تھا... لئے سوچنے کی بات

ہے کہ اُس دن ان کا کیا حشر اور کیا انجام ہوگا۔

یہ مضمون سورۂ نساء میں بھی گزر چکا ہے وہاں ارشاد فرمایا گیا ہے "فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَآءِ شَهِيْدًا" صرف الفاظ کا کچھ فرق ہے مضمون بالکل وہی ہے۔

انبیاءؑ کی گواہی پر ایک سوال

ان آیتوں میں قیامت کے دن اپنی اپنی امتوں کے بارے میں انبیاءؑ کی اور رسول اللہ ﷺ کی اُمت کے بارہ میں آپ کی جس شہادت اور گواہی کا ذکر فرمایا گیا ہے اُس کے بارے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُمتوں کے جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں تھے اور جن سے ان کو واسطہ پڑا تھا اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے جو اُمتی آپ کے زمانہ میں تھے اُن کے بارہ میں شہادت دینا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن جو لوگ بعد کے زمانوں میں پیدا ہوئے اور اگلے انبیاء علیہم السلام نے اور رسول پاک ﷺ نے جن کو دیکھا بھی نہیں اُن کے بارے میں شہادت کیسے دے سکیں گے؟ اس سوال کے دو جواب دیئے گئے ہیں، ایک یہ کہ شہادت اُمتوں کے صرف انہی لوگوں کے بارے میں ہوگی جو اُن کے زمانہ میں تھے اور جن سے ان کو واسطہ پڑا تھا۔ اس کا اشارہ ایک حدیث سے بھی ملتا ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ حضورؐ کے مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضورؐ کے حکم سے قرآن پاک کی کچھ آیات آپ کو سنائیں، ان میں سورۂ نساء کی یہ آیت بھی سنائی جس میں قیامت کی اس شہادت کا ذکر ہے "فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَآءِ شَهِيْدًا" تو حضور ﷺ کے آنسو جاری ہوگئے اور آپ نے فرمایا "شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ" یعنی اے اللہ میں اُسی وقت تک کا حال بتا سکوں گا جب تک میں ان میں رہا تھا، پھر اے اللہ جب تو نے مجھے اٹھالیا تو تو ہی ان کا نگراں اور دیکھنے والا تھا (۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہادت انہی امتیوں کے بارے میں ہوگی جن سے اس دنیا میں واسطہ پڑا تھا۔ اور دوسرا جواب اس سوال کا یہ بھی دیا

(۱) تفسیر ابن کثیر بحوالہ تفسیر ابن جریر طبری اصل روایت بخاری اور مسلم میں بھی ہے، آخری جملہ اس روایت میں نہیں ہے۔مرتب)

گیا ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو آپ کی اُمت کے اعمال واحوال کی اور اسی طرح سب نبیوں کو اُن کی اُمتوں کے اعمال واحوال کی برابر اطلاع دی جاتی ہے۔ اسی اطلاع کی بنیاد پر وہ سب اُمتیوں کے بارے میں شہادت دیں گے، اور اُن کی یہ شہادت گویا سرکاری گواہ کی شہادت ہوگی۔ بعض مفسرین نے ان آیات کی تفسیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ قیامت میں یہ شہادت انبیاء علیہم السلام بھی دیں گے اور ان کے علاوہ اُن کے سچے نائبوں اور اُن کی دینی دعوت کے داعیوں نے جن لوگوں اور جن طبقوں کو دعوت دی ہوگی اُن کے بارے میں وہی شہادت دیں گے اور ان کی حیثیت بھی قیامت کے دن سرکاری گواہ کی ہوگی۔

بہرحال ان آیتوں کا اصل مقصد اور مدعا تو قیامت کے اُس منظر کی طرف توجہ دلانا ہے جب اللہ تعالیٰ کے جلال کا پورا ظہور ہوگا اور انبیاء علیہم السلام اور امتوں کے ہادیوں اور حق کے داعیوں کی گواہیاں گزریں گی اور وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بیان دیں گے کہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ اور خدا کے دین کی دعوت کے ساتھ یہ معاملہ کیا، تو آج کے منکروں اور کافروں کو یہ سوچنا چاہئے کہ اس دن اُن کا کیا حال ہوگا۔

نزولِ قرآن کا احسان

اس کے بعد فرمایا گیا ہے ''وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ'' مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر ہم نے تم پر ''الکتاب'' (یعنی اپنا مقدس فرمان قرآن مجید) نازل فرمایا ہے جس میں سب ضروری باتوں کا واضح بیان ہے، اور وہ ہدایت اور رحمت ہے اور قبول کرنے والوں اور ماننے والوں کے لئے اچھے اور مبارک انجام کی بشارت ہے۔

اس سے پہلی والی آیت تک روئے سخن منکروں اور کافروں کی طرف تھا، انواع واقسام کی نعمتیں یاد دلا کر ان لوگوں کو شکر گزاری، خدا پرستی اور توحید اور ایمان کی دعوت دی جارہی تھی، اور کفر و انکار کے بُرے انجام سے ڈرایا جارہا تھا۔ اب اس آیت ''وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ'' سے روئے سخن رسول اللہ ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والوں کی طرف ہوگیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے فرمایا جارہا ہے کہ ہم نے آپ پر ''الکتاب'' نازل فرمائی ہے؟

یعنی جس جامع اور مکمل آخری آسمانی کتاب کا اگلی آسمانی کتابوں میں بھی ذکر کیا گیا تھا، وہ ہم نے آپ پر نازل فرمائی ہے، یہ قرآن مجید آپ پر ہماری طرف سے نازل ہو رہا ہے، جس میں سب ضروری چیزوں کا کھلا اور واضح بیان ہے، یہ آپ پر ہمارا بہت ہی بڑا انعام ہے، آپ اس نعمت کا شکر ادا کریں اور آپ پر اس کا جو حق ہے وہ ادا کریں۔ اور یہ قرآن ایمان لانے والوں او رماننے والوں کے لئے ہدایت کا نور اور خدا کی رحمت ہے، وہ اس کی روشنی میں خدا کا راستہ پالیں گے اور اس پر چل کر اس کی خاص رحمت کے مستحق ہو جائیں گے، اور یہ قرآن ان کو دُنیا اور آخرت کے اچھے انجام کی بشارت بھی سناتا ہے۔ ''هُدیً وَّرَحْمَةً وَّبُشْریٰ لِلْمُسْلِمِیْنَ'' تو انھیں چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم احسان کی عظمت کو سمجھیں اور اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں۔

قرآن میں ہر شئے کے بیان کا مطلب

اس آیت سے متعلق ایک بات اور بھی ذکر کر دینا انشاء اللہ آپ حضرات کے لئے مفید ہوگا۔ اس آیت میں اور اس کے علاوہ بھی کئی مقامات پر قرآن مجید کو ''تِبْیَانًا لِکُلِّ شَیْءٍ'' فرمایا گیا ہے اور کہیں ''تَفْصِیْلًا لِکُلِّ شَیْءٍ'' بھی فرمایا گیا ہے۔ ان آیتوں کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت وسعادت اور صلاح وفلاح کے لئے جن چیزوں کا بیان کر دینا ضروری تھا وہ سب چیزیں قرآن پاک میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں، عام مفسرین نے یہی مطلب سمجھا اور یہی لکھا ہے، اور یہی عقل کی بات ہے، اگر طب اور حکمت کی کسی کتاب کے بارے میں یہ کہا جائے کہ ''اس میں سب کچھ بیان کر دیا گیا اور لکھ دیا گیا ہے'' تو اس کا مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ فنِ طب اور علاج معالجہ سے متعلق تمام ضروری باتیں جن کے جاننے کی کسی طبیب اور معالج کو ضرورت ہو سکتی ہے وہ اس میں بیان کر دی گئی ہیں۔ اس کا یہ مطلب کوئی بھی نہیں سمجھے گا کہ کھیتی باڑی اور باغبانی سے متعلق یا لوہار اور سنار یا درزی اور بڑھئی کے کاموں سے متعلق بھی ساری باتیں طب کی اس کتاب میں لکھی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی دعویٰ کرے کہ اس کا مطلب یہی ہے کہ طب کی اس کتاب میں یہ سب چیزیں بھی بیان کی گئی ہیں اور اس میں سارے فقہی مسائل بھی اور فنِ حدیث وتفسیر سے متعلق ساری باتیں بھی لکھی ہوئی ہیں تو لوگ ایسا دعویٰ کرنے والے کو خبطی سمجھیں گے۔ بہر حال یہ بالکل سیدھی اور بدیہی سی

بات ہے کہ قرآن پاک کے "تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ" اور "تَفْصِيْلًا لِكُلِّ شَيْءٍ" ہونے کا مطلب یہی ہے کہ انسانوں کی ہدایت اور سعادت سے متعلق تمام ضروری باتیں اس میں بیان فرمادی گئی ہیں، اور جو جزئی اور فروعی مسائل اس میں بیان نہیں فرمائے گئے ہیں اُن کے بارہ میں واضح اصولی رہنمائی دے دی گئی ہے۔ اس طرح ان کا بھی بیان ہو گیا ہے۔ مفسرین نے "تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ" اور "تَفْصِيْلًا لِكُلِّ شَيْءٍ" کا عام طور سے یہی مطلب بیان فرمایا ہے۔ لیکن ہمارے زمانے کے بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب اور جَمِیْعِ مَا کَانَ وَمَا یَکُوْن کا عالم ثابت کرنے کے لئے یہ عجیب بات کہنی شروع کی ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے جو ہو چکا اور جو قیامت تک ہوگا خواہ اس کا تعلق کسی لائن سے ہو، قرآن مجید میں اس سب کا تفصیلی بیان ہے اور "تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ" اور "تَفْصِيْلًا لِكُلِّ شَيْءٍ" کا یہی مطلب ہے۔ یعنی قرآن حکیم میں دنیا بھر کی مکھیوں اور مچھروں کا بھی بیان ہے، سمندر کی لاتعداد مچھلیوں اور اُن کے انڈوں تک کا بیان ہے: ہمارے گھروں میں چوہے اور چارپائیوں میں جو کھٹمل ہیں اُن کا بھی بیان ہے، زمین کے سارے کیڑے مکوڑوں کا بھی بیان ہے، دُنیا بھر کے ہزاروں مختلف زبانوں کے اخباروں رسالوں میں جو کچھ روز چھپتا رہتا ہے، جو خرافاتی تصویریں اور کارٹون چھپتے رہتے ہیں اور دنیا بھر کے بازاروں، تماشوں اور تفریح گاہوں میں جو کچھ ہوتا ہے، قرآنِ پاک میں معاذ اللہ اُس سب کا بھی کھلا بیان ہے (لاحول ولاقوة الا باللہ) حیرت ہے کہ یہ لوگ ایسی بات کس طرح منہ سے نکالتے ہیں، ظاہر ہے کہ کوئی عقل سلیم رکھنے والا اس کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ قرآن میں اس ساری خرافات کا بھی بیان ہے، قرآن پاک کے "تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ" اور "تَفْصِيْلًا لِكُلِّ شَيْءٍ" ہونے کا مطلب یہی ہے۔ کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے اور دنیا و آخرت میں ان کی صلاح و فلاح کے لئے جن باتوں کا بیان ضروری تھا وہ سب قرآنِ مجید میں واضح طور پر بیان کر دی گئی ہیں، اب قیامت تک انسانوں کو کسی نئے ہدایت نامہ کی ضرورت نہ ہوگی، بس یہی قرآن اُن کے لئے کافی ہے۔

سورہ کی نہایت اہم آیت

اس کے آگے متصلاً یہ آیت ہے "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ، يَعِظُكُمْ

لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ — یہ آیت قرآن پاک کے "تِبْیَانًا لِکُلِّ شَیْءٍ" ہونے کی حقیقت اور نوعیت کو پوری طرح واضح کردیتی ہے، اور اُس کی ہدایت کی جامعیت کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں تین باتوں کا حکم فرمایا گیا ہے عدل، احسان، ایتاء ذی القربیٰ۔

عدلؔ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی عقائد وخیالات، اعمال اور اخلاق، جذبات اور معاملات میں اعتدال اور توازن کو اپنائے، افراط اور تفریط اور ہر قسم کی بے اعتدالی سے بچتا رہے، دشمنوں کے ساتھ بھی بے انصافی نہ کرے۔

اور احسانؔ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پر نگاہ رکھتے ہوئے نیک کرداری اور بھلائی کو اختیار کرے اور عدلؔ وانصاف کے مقام سے بھی بلند ہوکر دوسروں کے ساتھ تبرع اور ترحم اور حُسنِ سلوک کا معاملہ کرے، برائی کا بدلہ بھی بھلائی سے دے۔ عدلؔ اور احسان ان دو باتوں کا حکم تو اپنوں پرایوں سب کے لئے دیا گیا ہے، تیسرا حکم "اِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبیٰ" کا خاص اہلِ قرابت اور رشتہ داروں سے متعلق ہے کہ اُن کے ساتھ عدل واحسان کے مقام سے بھی آگے بڑھ کر داد ودہش کا معاملہ کیا جائے، یعنی اللہ نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں سے اپنے عزیزوں قریبوں کو ضرور دو اور اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں میں ان کا بھی حصہ لگاؤ اور اُن کو شریک کرو۔

واقعہ یہ ہے کہ آدمی کا ہر وقت کا معاملہ عزیزوں قریبوں ہی سے رہتا ہے انہی سے معاملات زیادہ پڑتے ہیں اور انہی کے ساتھ نزاعات اور اختلافات ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے زندگی کبھی کبھی جہنم بن جاتی ہے، اس لئے قرآن پاک کی اس آیت میں اور اس کے علاوہ بھی بیسیوں آیتوں میں ذوی القربیٰ یعنی قریبی عزیزوں رشتہ داروں کو اپنی محنت کی کمائی میں سے تحفے تحائف دینے اور حُسنِ سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

غور فرمائیے اگر قرآن پاک کی ان تین ہدایتوں پر عمل نصیب ہوجائے، عدلؔ، احسانؔ، ایتاء ذی القربیٰؔ، تو ہماری زندگی کیسی چین سکون کی زندگی ہو اور دُنیا ہمیں کس نگاہ سے دیکھے، اور دشمن بھی ہمارے کیسے گرویدہ ہوجائیں، اور یہ دُنیا ہمارے لئے کیسی جنت بن جائے۔

اس آیت میں ان تین باتوں کا حکم دینے کے بعد تین ہی باتوں سے منع فرمایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے "وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ"، یعنی اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتا ہے ان تین چیزوں کے پاس جانے سے،

فحشاء سے منکر سے اور بغی سے۔

فحشاء سے وہ گناہ مراد ہیں جو شہوت نفس کے تقاضہ سے ہوں جیسے زنا وغیرہ، اور منکر سے مراد وہ گناہ ہیں جن کو عقلِ سلیم اور شریف طبیعتیں بُرا سمجھتی ہیں، ان کی مثال جھوٹ، خیانت اور بدعہدی اور شراب وغیرہ سے دی جاسکتی ہے۔ اور بغی سے ہر قسم کی ظلم وزیادتی مراد ہے خواہ کسی شکل میں ہو، غور کیا جائے تو آسانی سے سمجھ میں آجائے گا کہ ساری بُرائیاں اور ساری شرارتیں اور سارے گناہ ان تین عنوانوں کے تحت آجاتے ہیں۔ اس طرح قرآن کریم کی یہ آیت اوامر ونواہی کے سلسلہ کی جامع ترین آیت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے مشہور جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے کہ اس آیت میں ہر قسم کے خیر وشر کے بارے میں جامع ہدایت فرمادی گئی ہے (۱) اس آیت کی اسی خصوصیت کی وجہ سے خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو خطبۂ جمعہ کا مستقل جزو بنادیا تھا اور اُس وقت سے برابر یہی دستور ہوگیا ہے کہ جمعہ کا خطبہ اسی آیت پر ختم کیا جاتا ہے۔ اور ہر جمعہ کو یہ خداوندی پیغام مسلمانوں کو سنایا جاتا ہے۔ کاش ہم اس سے نصیحت حاصل کریں۔

الغرض یہ آیت قرآن مجید کے "تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ" ہونے کا بہترین نمونہ ہے اور اس سے صاف اشارہ ملتا ہے کہ قرآن پاک کے "تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ" ہونے کا مطلب یہی ہے کہ انسانوں کی ہدایت وسعادت اور صلاح وفلاح سے متعلق تمام ضروری باتیں اس میں بیان فرمادی گئی ہیں۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ ایسا ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کو توفیق دے کہ اللہ تعالیٰ کی اس مقدس کتاب کی قدر کریں، اس کی عظمت کو سمجھیں اور اس کو اپنی زندگی کا راہنما بنائیں، اس کے احکام، اوامر ونواہی کی تابعداری کریں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَآلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِیْنَ۔

---

(۱) تفسیر ابن کثیر بحوالہ ابن جریر۔ (مرتب)

(درس-۱۶)

ابراہیمؑ جو سب اہلِ اَدیان کے مسلّم مقتدا ہیں توحیدِ خالص کے علمبردار تھے

ہمارے اِن پیغمبر (محمد صلعم) کا طریقہ بعینہٖ ابراہیمی طریقہ ہے

راہِ حق کی طرف دعوت کے بارے میں اہم ہدایات

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم- بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيْفًا- وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ٥
شَاكِرًا لِاَنْعُمِهٖ اِجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ٥ وَاٰتَيْنٰهُ فِى
الدُّنْيَا حَسَنَةً- وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ٥ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ
اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا- وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ٥
اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ- وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ٥ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ
بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ- اِنَّ
رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ٥
وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ- وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ

خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ۝ وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ
وَلَا تَكُ فِىۡ ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ۝ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوْا
وَّالَّذِيۡنَ هُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ۝ (سورۃ النحل۔ آیت ۱۱۹ تا ۱۲۸)

(ترجمہ) بیشک ابراہیمؑ بڑے مقتدااور عظیم پیشوا تھے، اللہ کے پورے فرمانبردار بندے تھے، ہر طرف سے رُخ موڑ کے پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ ہی کے ہو گئے تھے اور وہ ہرگز اہلِ شرک میں سے نہ تھے، اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، اللہ نے ان کو (اپنے خاص انعام اور منصبِ نبوت کے لئے) منتخب کرلیا تھا، اور صراطِ مستقیم کی ہدایت سے نوازا تھا اور ہم نے ان کو دُنیا میں بھی بھلائی اور بہتری دی، اور وہ آخرت میں بھی (ہمارے خاص) عبادِ صالحین میں سے ہوں گے، پھر اے پیغمبر! ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ تم ابراہیم والے طریقہ ہی پر چلو، جنھوں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر خدا ہی کی طرف رُخ کرلیا تھا، اور وہ مشرکوں سے بالکل الگ تھے۔

یوم السبت (ہفتہ کے دن) کے خاص احکام تو صرف ان لوگوں پر عائد کئے گئے تھے، جنھوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا تھا، اور یقیناً تمہارا پروردگار قیامت کے دن ان امور کا (خاص طور سے) فیصلہ فرمادے گا جن کے بارے میں وہ باہم اختلاف رکھتے تھے۔

اے پیغمبر! آپ لوگوں کو اپنے پروردگار کی راہ کی طرف حکمت سے اور موعظۂ حسنہ سے بلایئے، (یعنی دینِ حق کی دعوت کے لئے حکمت و دانش اور موعظۂ حسنہ کا طریقہ اختیار کیجئے) اور اس طریقہ سے بحث کیجئے جو مستحسن ہو، تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے ان کو جو اس راہ سے بھٹک گئے ہیں اور ان کا بھی اس کو پورا علم ہے جو ہدایت یاب ہیں۔

وراہل ایمان اگر تم مخالفین سے زیادتی کا بدلہ لینے لگو تو جوابی کاروائی میں بھی بس اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اُن کی طرف سے تم پر زیادتی کی گئی تھی، اور اگر صبر کرو (اور قدرت حاصل ہو جانے پر مخالفین کے ظلم و جفا کا بدلہ نہ لو) تو صبر کا یہ رویہ صابرین کے حق میں بہت اچھا ہے۔ اور اے پیغمبر تم تو صبر ہی کو اختیار کرو اور تمہارا یہ صبر کرنا اللہ ہی کی توفیق سے ہوگا اور ان منکرین کے حال پر تم غم نہ کھاؤ اور نہ ان کی مخالفانہ چالوں سے دل تنگ ہو، یہ یقینی ہے

کہ اللہ تعالیٰ (اور اُس کی پوری مدد ونصرت) ان بندوں کے ساتھ ہے جو پرہیز گاری اور نیک کرداری کے ساتھ زندگی گزارنے والے ہیں۔

تفسیر وتشریح

یہ سورۂ نحل کا سولہواں اور آخری رکوع ہے اور اسی پر چودھواں پارہ بھی ختم ہوتا ہے، اسی درس کے سلسلے میں میں نے کئی دفعہ یہ ذکر کیا ہے کہ قرآن مجید کی اکثر بڑی سورتوں میں ایسا ہے کہ اس کا آخری حصہ گویا مقطع کا بند ہوتا ہے اور اس میں اس کے خاص پیغام کا خلاصہ آجاتا ہے۔ اس آخری رکوع کی بھی یہی نوعیت ہے۔

یہ صورت جیسا کہ میں بتلا چکا ہوں مکی ہے اور اس کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی ہے جب مکہ میں آپ کی دعوت پر کافی عرصہ گزر چکا ہے، اس سورت کا خاص موضوع توحید کی دعوت اور شرک کا رد ہے۔ اگرچہ ضمنی طور پر وحی ورسالت اور قیامت وآخرت اور وہاں کی جزا سزا کا ذکر بھی فرمادیا گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید کا طریقہ ہے۔ اور توحید کی دعوت کے سلسلے میں بھی اس سورت میں یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں بندوں کو اس زندگی میں مل رہی ہیں اُن کا بڑی تفصیل سے ذکر کر کے فرمایا گیا ہے کہ تمہارا جو رب تم کو ان نعمتوں سے نواز رہا ہے اُس کا حق ہے کہ بس اسی کی عبادت کرو، اُس کے شکر گزار بندے بنو، اسی سے اپنی حاجتیں مانگو اور کسی دوسری ہستی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور اُس کے قہر اور عذاب سے ڈرو۔

مذکورہ آیات کا پہلا مضمون

مکہ کے مشرکین اپنے کو ابراہیم علیہ السلام کا وارث اور ملّتِ ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے، اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ بھی اپنی نسبت ابراہیم علیہ السلام ہی سے جوڑتے تھے اور کہتے تھے کہ اُن کا طریقہ وہی تھا جو ہمارا طریقہ ہے۔ گویا ان سب ہی کو مخاطب کر کے سورۂ نحل کے اس آخری رکوع میں پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے "اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا

وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" اُمت کے معروف و مشہور معنی تو وہی ہیں جس میں ہم اور آپ اس لفظ کو بولتے ہیں، یعنی گروہ اور جماعت، اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کو اُمت کہا گیا ہے (اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ کَانَ اُمَّۃً) تو اس معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابراہیم علیہ السلام اگرچہ بظاہر ایک فرد تھے لیکن اپنی صفات اور غیر معمولی شخصیت کے لحاظ سے گویا ایک پوری اُمت اور قوم تھے جیسے کہ ہمارے محاورہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ "فلاں آدمی اپنی ذات سے ایک انجمن ہے"۔ "امۃ" کے دوسرے معنی امام اور مقتدا کے بھی ہیں، یعنی وہ ہستی جس کی اقتدا اور پیروی کی جائے، اگر یہ معنی لئے جائیں تو پھر سیدھا مطلب یہ ہوگا کہ بلاشبہ ہمارے بندے ابراہیم انسانی دنیا کے لئے امام اور مقتدا تھے۔ آگے فرمایا گیا ہے "قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیْفًا وَّلَمْ یَکُ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ" یعنی وہ ہمہ تن اللہ کے فرمانبردار تھے اور انھوں نے ہر طرف سے اپنا رُخ موڑ کے پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ کی طرف رُخ کر لیا تھا اور وہ اہل شرک میں سے نہیں تھے یعنی وہ شرک اور اہلِ شرک سے بیزار اور خاص توحید کے علمبردار تھے۔ پس جو لوگ کسی بھی قسم کے شرک میں مبتلا ہیں خواہ وہ مشرکین عرب ہوں یا یہود و نصاریٰ، وہ ہرگز ہمارے بندے ابراہیم کے راستہ پر نہیں ہیں، اور اُن کا ملت ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے "شَاکِرًا لِّاَنْعُمِہٖ" یعنی وہ اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے "اِجْتَبَاہُ وَھَدَاہُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" یعنی اللہ نے ان کو نبوت و امامت کے منصبِ عظیم کے لئے منتخب اور نامزد کیا تھا اور صراطِ مستقیم کی ہدایت سے نوازا تھا۔

"وَاٰتَیْنَاہُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ" یعنی ہم نے اس دنیاوی زندگی میں بھی ان کو خوبی اور بھلائی عطا کی تھی اور آخرت میں وہ ہمارے خاص صالح بندوں میں ہوں گے۔ اس دنیا میں ابراہیم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی جو خاص عنایت ہے (جس کو فرمایا گیا ہے وَاٰتَیْنَاہُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً) اسی کا یہ ظہور ہے کہ تمام اہلِ ادیان ان کا احترام کرتے ہیں، ان کو اپنا مقتدا مانتے ہیں، اور ان کے بعد ان ہی کی نسل میں نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری رہا اور خانۂ کعبہ جس کو انھوں نے اللہ کے حکم سے مرکز عبادت بنایا تھا اس کی وجہ سے بھی ان کا ذکر خیر جاری ہے، اور حج اور قربانی وغیرہ اعمال اُن کی خاص عملی یادگاریں ہیں جن کو قیامت تک کے لئے اسلام کا رکن اور شعار بنا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جو درود

شریف ہم لوگ ہر نماز میں پڑھتے ہیں اُس میں ان پر بھی خدا کے درود کا ذکر ہے اور اس کے ذریعہ ہر نماز میں اُن کی عظمت اور محبوبیت کے عقیدہ کو تازہ کیا جاتا ہے۔ یہ سب "آتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً" کا ظہور ہے۔ اس کے بعد آخرت کے بارے میں جو فرمایا گیا ہے "وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ" اس کا ظہور انشاء اللہ آخرت میں ہوگا وہاں سب دیکھ لیں گے کہ اللہ کے خاص بندے اور خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام کتنا بلند اور ممتاز ہے اور ان کے رب کی ان پر کیسی عنایتیں ہیں اور انبیاء علیہم السلام بھی ان کا کیسا ادب کرتے ہیں۔

محمدؐ وارثِ ملت ابراہیمی ہیں

اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے "ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ" مطلب یہ ہے کہ اے محمدؐ! اب قرنہا قرن کے بعد جب ہم نے تم کو نبوت کے سلسلہ کا خاتم اور آخری نبی بنا کر بھیجا ہے تو وحی کے ذریعہ ہم نے تم کو یہ حکم دیا ہے کہ تم ہمارے خلیل ابراہیم ہی کی ملت یعنی ان کے طریقہ اور اصول کی پیروی کرو جن کا حال یہ تھا کہ وہ ہر طرف سے کٹ کے بس اللہ ہی کے ہو گئے تھے اور یکسوئی کے ساتھ اسی کی طرف اپنا رخ کر لیا تھا اور وہ قطعاً اہل شرک کے گروہ میں سے نہیں تھے بس تمہارا بھی حال اور طریقہ یہی ہونا چاہئے۔ اس آیت کا مطلب اور مدعا یہ ہے کہ محمد ﷺ جو خاتم النّبیین اور سید المرسلین ہیں ان کو بھی اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ خدا پرستی اور خلق اللہ کے ساتھ برتاؤ میں ان ہی اصولوں کی پیروی کریں اور اپنی تعلیم اور عمل سے اسی کو زندہ کریں اور رواج دیں جو ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے، جو توحید خالص کے داعی اور علمبردار تھے، جو شرک اور مشرکین سے الگ اور بیزار تھے۔

اس آیت میں اگرچہ براہ راست خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے لیکن اس کے ذریعہ ساری دنیا کو اور خصوصیت کے ساتھ مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ کو بتلایا گیا ہے کہ ہمارے یہ آخری رسول (محمد ﷺ) جس راہ کی دعوت دیتے ہیں وہ وہی راہ ہے جسکی دعوت ابراہیم علیہ السلام دیتے تھے، ان کا طریقہ عین ابراہیمی طریقہ اور ان کی ملت ابراہیمی ملت ہے، تو جن کو فی الحقیقت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر چلنا ہے، وہ محمد ﷺ کی پیروی کریں، اُن کا راستہ بعینہ ابراہیمی راستہ ہے۔

ایک سوال کا جواب

آگے فرمایا گیا ہے "اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ" یہ آیت دراصل ایک سوال کا جواب ہے، یہود کہتے تھے کہ ہم لوگ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور ہماری شریعت کے خاص احکام وہی ہیں جو ان کی شریعت میں تھے اور ان میں سے ایک "سبت" کا حکم بھی تھا یعنی یہ کہ ہفتہ کے دن کا خاص احترام کیا جائے اور اس دن شکار بھی نہ کیا جائے تو یہود کا دعویٰ تھا کہ یہ حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کا بھی خاص شعار تھا (جس طرح جمعہ کی نماز اور خطبہ اور جمعہ کے خاص احکام اور اُس دن کا خاص احترام شریعت اسلامی کا شعار ہے)

پس یہود یہ کہتے تھے کہ اگر یہ نبی (محمد ﷺ) ابراہیمی طریقے پر ہوتے تو ان کی شریعت میں بھی یوم السبت کے بارے میں یہی حکم ہوتا اور یہی پابندیاں ہوتیں اور اُس دن کا شکار حلال نہ ہوتا۔

اس آیت میں گویا اس سوال یا اعتراض کا جواب دیا گیا ہے، حاصل یہ ہے کہ ابراہیمی شریعت میں سبت کا یہ حکم ہرگز نہیں دیا گیا تھا، یہ حکم تو عہد ابراہیمی کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال بعد موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان یہودیوں پر عائد کیا گیا تھا جنھوں نے سبت کے بارے میں اختلاف کی روش اختیار کی تھی، گویا یہ حکم، ایک طرح سے، ان کے اختلاف اور عدم اطاعت کی سزا تھی۔ اس کی تفصیل سورۂ اعراف میں گزر چکی ہے، جہاں یہ آیت ہے "وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ"۔

وہاں میں نے شریعت یہود کے اس حکم کی پوری تفصیل بیان کی تھی اور یہ بھی بتلایا تھا کہ جب انھوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی تو ان پر خدا کا سخت قہر وعذاب نازل ہوا اور قرآن مجید میں صراحتاً بیان فرمادیا گیا ہے کہ وہ بندروں اور سوروں کی شکل میں مسخ کردیے گئے۔

الغرض اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ سبت کا حکم تو (موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں) سزا کے طور پر صرف ان لوگوں پر عائد کیا گیا تھا جنھوں نے اس کے بارے میں اختلاف کی روش اختیار کی تھی اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے درمیان ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ فرمادے گا جن میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے اور اُس وقت سب کو معلوم ہو جائے گا کہ اصل حقیقت کیا تھی۔

اسی طرح کی ایک بات سورۂ انعام میں بھی بیان فرمائی گئی ہے جہاں ذکر کیا گیا ہے کہ یہود کے لئے بعض فلاں فلاں چیزوں کا کھانا بھی حرام کیا گیا تھا جو شریعت محمدی میں حلال ہیں، تو وہ چیزیں یہود پر اس لئے حرام نہیں کی گئی تھیں کہ اُس میں کوئی خباثت اور نجاست ہے بلکہ اُن کی باغیانہ روش اور سرکشی کی سزا کے طور پر یہ حلال طیّب چیزیں اُن پر حرام کردی گئی تھیں، وہاں فرمایا گیا ہے "ذٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ"۔

یہاں تک تو عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب پر حجت قائم کردی گئی اور ان کو سنایا گیا کہ ہمارے برگزیدہ بندے ابراہیم شرک اور اہل شرک سے بیزار اور توحید کے علمبردار تھے اور ہمارے یہ نبی (محمد ﷺ) ان ہی کے طریقہ پر ہیں، اس لئے جن کو ابراہیم علیہ السلام کی راہ پر چلنا ہو وہ اُس راہ پر چلیں جس پر محمد ﷺ خود چل رہے ہیں اور جس کی طرف وہ اللہ کے بندوں کو دعوت دے رہے ہیں، کیونکہ وہی ابراہیمی راستہ ہے۔ پھر "يَوْمُ السَّبْتِ" کے خاص احکام کے حوالہ سے جو اعتراض یا سوال یہود کی طرف سے اٹھایا جاتا تھا اُس کا جواب دیا گیا کہ ابراہیمی شریعت میں "یوم السبت" کے یہ احکام قطعاً نہیں تھے، یہ احکام تو دراصل موسوی دور میں بنی اسرائیل کی عدم اطاعت اور بے راہ روی کی سزا کے طور پر اُن پر عائد کئے گئے تھے۔

دعوت کا حکیمانہ طریق

اس کے بعد سورت کی جو آخری ۲۔۳ آیتیں ہیں ان کا روئے سخن رسول اللہ ﷺ اور آپ کی اُمت کی طرف ہے اور ان میں دین کی دعوت کے بارے میں خود آپ کو اور امت کو نہایت اہم ہدایت فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہے۔ "اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ

وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ، إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص وحی کے ذریعہ جس ابراہیمی اور حنیفی ملت کی طرف آپ کو رہنمائی کی ہے جو دراصل خدا کا مقرر کیا ہوا اور خدا تک پہونچانے والا زندگی کا طریقہ اور راستہ ہے، اُس کی طرف لوگوں کو بلانے اور دعوت دینے میں آپ حسب موقع تین طریقے استعمال کریں۔

اول یہ کہ حکمت اور دانائی کے انداز میں ان کو سمجھانے اور حکیمانہ دلائل و براہین سے ان کی عقل وفہم کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔ اس کا بہترین نمونہ خود قرآن مجید کے دلائل و براہین ہیں "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ" کا یہی مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو عقل و دانائی کا وافر حصہ دیا ہوتا ہے جن کو عقلاء اور حکماء کہا جاتا ہے ان کو یہی طریقہ مطمئن کرسکتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دل کو متاثر کرنے والی موعظت ونصیحت اور ترغیب وترہیب کا خطیبانہ اور واعظانہ انداز اختیار کریں۔ عام نیک دل اور نیک فطرت لوگوں کے لئے یہی طریقہ زیادہ مؤثر ہوتا ہے "وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ" کا یہی مطلب ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا یہ طریقہ بھی استعمال کیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خطبات ومواعظ میں اس کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اگر مخاطب بحث ومباحثہ اور حجت بازی کرے، جیسا کہ بہت سے لوگوں کا مزاج ہوتا ہے، تو ان سے بحث ایسے طریقہ سے کی جائے اور ان کے اعتراضات اور سوالات کا جواب ایسے انداز میں دیا جائے جو خوشگوار اور حسین وجمیل ہو، کلام میں تلخی اور دل آزاری کا عنصر بالکل نہ آئے، مخالف کے پتھروں کا جواب پھولوں سے دیا جائے اور گالیوں کے جواب میں دعائیں دیجائیں۔ بحث مباحثہ اور مناظرہ کرنے والوں کے دل اسی طریقہ سے فتح کئے جاسکتے ہیں "جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ" میں بھی یہی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

اگر مخاطب کے دل میں کچھ بھی صلاحیت اور سلامتی ہوگی تو وہ ان طریقوں سے ضرور متاثر ہوگا، اور جو آدمی نہ حکیمانہ دلائل و براہین سے متاثر ہو نہ موعظۂ حسنہ کا اس پر کوئی اثر ہو اور حسین وجمیل بحث ومباحثہ کے بعد بھی اس کی کٹ حجتی ختم نہ ہو اور اس سب کے بعد بھی انکار ہی پر جما رہے جیسا کہ قرآن مجید کے اوّل مخاطبین میں ابوجہل اور ابولہب وغیرہ کا حال تھا، تو سمجھنا چاہئے کہ اس کی

فطرت مسخ ہو چکی ہے اُس کے دل میں حق قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے "اِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ" اس کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر! تمہارا کام اور وظیفہ مذکورۂ بالا تین طریقوں سے لوگوں کو راہ حق کی طرف دعوت دینا ہے اور اپنے امکان کی حد تک اس کی کوشش کرنا ہے کہ وہ حق کو قبول کر لیں اور راہ حق پر آجائیں، تمہاری، اور حق کے کسی بھی داعی کی، یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے حق کو منوالے۔ بہت سے لوگ آپ کی مخلصانہ دعوت اور دلسوزی کے ساتھ محنت کے باوجود نہیں مانیں گے، اس کی وجہ سے آپ مایوس اور آزردہ خاطر نہ ہوں، آپ نے دعوت کا فرض ادا کر دیا، جو بدبخت اس کے بعد بھی گمراہی پر جمے رہنے والے ہیں اور جو خوش نصیب ہدایت قبول کرنے والے ہیں اُن سب کا یہ حال تمہارے پروردگار کو خوب معلوم ہے، اور یہ سب کچھ اس کے علم میں ہے "اِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ"۔

برائی کا بدلہ

آگے فرمایا گیا ہے "وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَاعُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِيْنَ" راہ حق کی تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں یہ بھی پیش آتا ہے کہ باطل پرست حق کے داعیوں کو ایذائیں پہونچاتے ہیں، طرح طرح سے ستاتے ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے صحابہ خصوصاً سابقین اولین کو جو ایذائیں پہونچائی گئیں، اور جس طرح وطن تک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا وہ ہم نے اور آپ نے حدیث اور سیرت کی کتابوں میں پڑھا ہے یا آپ میں سے بعض بھائیوں نے سنا ہے، خود رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "مَاأُوْذِيَ فِي اللّٰهِ أَحَدٌ مِثْلَ مَاأُوْذِيْتُ" یعنی اللہ کے راستہ میں کسی کو اتنا نہیں ستایا گیا جتنا مجھے ستایا گیا، تو اس آیت (وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْابِمِثْلِ مَاعُوْقِبْتُمْ بِهٖ) میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جب تمہارے ہاتھ میں طاقت آئے اور تم اس پوزیشن میں ہو کہ ان ظالموں مجرموں کو ان کی شرارتوں اور ایذا رسانیوں کی سزا دے سکو، تو اُس وقت کے لئے تمہارے خدا کا تم کو یہ حکم ہے کہ اس سزا میں بھی اور اس جوابی کاروائی میں بھی عدل وانصاف

کے قانون کی پابندی کرو، یعنی ان کو سزا ان کی شرارت اور ایذاء رسانی کے حساب ہی سے دو! آگے فرمایا اور یہ بھی تم کو صرف اجازت ہے، لیکن اگر تم صبر کرو اور طاقت حاصل ہونے پر بھی اپنے پر ظلم کرنے والوں کو سزا نہ دو اور معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اور اس سے تمہارا خدا زیادہ راضی ہوگا اور اس کے نتائج بہتر نکلیں گے اور تمہارے ان دشمنوں پر بھی اس کا اثر اچھا پڑے گا، اور وہ ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر مجبور ہوں گے اور پھر تمہارا یہ صبر ہی اُن کی ہدایت کا باعث ہو جائے گا "وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِيْنَ" میں اس سب کی طرف اشارہ ہے۔

آگے خصوصیت سے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے "وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ" یعنی اے ہمارے پیغمبر! خود آپ کا ذاتی رویہ تو صبر و برداشت اور معافی ہی کا ہونا چاہئے۔ یعنی اگر خود آپ کی ذات پر کسی نے زیادتی کی ہو، آپ کو کسی نے ایذا پہنچائی ہو تو آپ اس کا جائز اور منصفانہ بدلہ بھی نہ لیں اور عفو ہی سے کام لیں آپ کے مقام عالی کے لئے یہی بہتر ہے۔ اور چونکہ انسانی ذات کے لئے یہ بہت مشکل بات ہے، اس لئے فرمایا کہ آپ کو اس کی توفیق اللہ ہی کی طرف سے ملے گی "واصبر وماصبرک الا باللہ"

حدیث شریف میں غالباً حضرت عائشہ صدیقہؓ کا یہ بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے پر کیے جانے والے کسی ظلم و زیادتی کا کبھی بدلہ نہیں لیا، ذاتی مجرموں کو ہمیشہ معاف فرما دیا، ہاں! جب کسی نے خدا کا جرم کیا، جس پر سزا دینے اور حد جاری کرنے کا خدا ہی کی طرف سے آپ کو حکم تھا، تو آپ نے اُس خداوندی حد اور سزا کو نافذ کیا۔ اس میں آپ کو کسی رعایت کی بھی اجازت نہیں تھی۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ" اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مخلصانہ دعوت و نصیحت، اور دلسوزی کے ساتھ اُن کی ہدایت کے لئے محنت کے بعد بھی جب وہ ایمان نہ لائیں تو آپ اس کا غم نہ کھائیں، آپ نے اپنا فرض اور دعوت کا حق ادا کر دیا، اور اپنے خدا کو راضی کر لیا، ان بدبختوں نے آپ کی بات نہ مان کر خود اپنے کو ہلاک و برباد کیا ہے اور اپنے لئے خدا کی رضا اور جنت سے محروم رہنا اور دوزخی بننا پسند کیا ہے اس لئے آپ ان کا غم نہ کھائیں "وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ"

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ" مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو سازشیں اور فتنہ انگیزیاں آپ کے خلاف اور آپ کی دعوتِ حق کے خلاف کرتے ہیں اُن کی وجہ سے آپ تنگ دل اور فکرمند نہ ہوں، یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے "وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ" (یہاں ایک طالبعلمانہ بات بھی عرض کردوں، اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ "ضَیق" ضؔ کے فتحہ کے ساتھ دل کی تنگی اور اندرونی پریشانی کو کہتے ہیں اور "ضِیق" ضؔ کے کسرہ کے ساتھ معاشی تنگی یا گھر یا راستہ وغیرہ کی تنگی کو کہتے ہیں) بہرحال اس جملہ میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ ان اشرار کی شرارتیں اور سازشیں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔

ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ہے "يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ" اور ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا "وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا أَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ" یعنی یہ حق کے دشمن منکرین اللہ کے نازل کئے ہوئے نورِ ہدایت کو بجھا دینا چاہتے ہیں اور اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ ہدایت کا یہ نور باقی رہے گا اور چمکے گا اور مشرق و مغرب کو روشن کرے گا۔

ایک ابدی منشور خداوندی

سورت کی بالکل آخری آیت ہے "إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ" یہ گویا سورہ کا آخری مقطع اور نہایت اہم خداوندی منشور ہے۔ اس میں بہت بڑی بشارت اور بڑا اطمینان بخش وعدہ ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور قیامت تک پیدا ہونے والے حق پرستوں کو خوش خبری سنائی گئی ہے اور گویا ضمانت دی گئی ہے کہ جس جماعت اور گروہ کی زندگی تقویٰ پرہیزگاری اور نیکوکاری کی ہوگی، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ اور اپنے غیبی لشکروں کے ساتھ ان کا رفیق اور مددگار ہوگا۔ "إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ"۔

آج مسلمان عرب و عجم میں مشرق و مغرب میں ہر جگہ ذلیل و خوار ہیں، اگرچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت دنیا کے مختلف براعظموں میں ان کی ۳۰۔۳۵ خودمختار حکومتیں ہیں (۱) لیکن جن

(۱) (یہ تعداد ۱۹۷۳ء کی ہے ... اب تعداد ۵۵ ہو چکی ہے۔ (مرتب)

لوگوں کو دنیا کے حالات کی کچھ خبر ہے وہ سب جانتے ہیں کہ آج کی دنیا میں ان مسلمان حکومتوں کا کچھ وزن نہیں ہے۔ اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ ان میں سے ایک ایک کے حالات تفصیل سے مطالعہ کر لے! اور ہم ہندوستانی مسلمان اپنی تاریخ اور اپنے حالات پر نظر ڈال لیں۔ ملک کی آزادی سے پہلے یہاں مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کو دیکھنے والے خود ہم لوگ موجود ہیں اور آزادی کے بعد جن حالات سے گزر رہے ہیں وہ آپ سب ہی دیکھ رہے ہیں، ہم نے بہت آسان نسخہ یہ سیکھ رکھا ہے کہ پہلے انگریزوں کے دور میں اپنی ساری مصیبتوں اور بربادیوں کی ذمہ داری ہم انگریزوں پر ڈال دیتے تھے اور آزادی کے بعد سے جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری ہندوؤں پر یا کانگرسی حکومت پر ڈال دیتے ہیں، گویا خود ہم بالکل بے قصور ہیں اور ہمارے ان حالات میں ہماری بدعملیوں اور غفلتوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ہم نے اس کا حل اور علاج بس یہ سمجھا ہے کہ سیاسی پلیٹ فارموں سے اپنی مظلومیت کا بس شور مچائے جاؤ، حکومت کے خلاف احتجاج کرتے رہو، چیلنج دیتے رہو اور اخبارات و رسائل میں مضامین پر مضامین لکھے جاؤ! واقعہ یہ ہے یہ طریقہ بس اپنے کو اور بیچارے اپنے عوام کو فریب دینے کا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری ذلت و خواری اور تباہی و بربادی کی جڑ بنیاد خود ہمارے اندر ہے۔ قرآن مجید میں قوموں اور خاص کر پیغمبروں کی اُمتوں کی عزت و ذلت اور خوش حالی کا جو قانون جا بجا بیان فرمایا گیا ہے وہ صرف اگلے پیغمبروں اور حضور کے زمانہ ہی کے لئے نہیں تھا، وہ ازلی ابدی قانون ہے، قرآن پاک میں جا بجا یہ حقیقت بیان فرمائی گئی ہے کہ قوموں اور اُمتوں پر بُرے حالات اُن کے اندر کے بگاڑ کی وجہ سے آتے ہیں۔ ارشاد فرمایا گیا ہے "ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَابِاَنْفُسِهِمْ" دوسری جگہ فرمایا گیا ہے "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَابِاَنْفُسِهِمْ۔ بنی اسرائیل اور دوسری قوموں کے بارے میں جن کے حالات خراب ہوئے اور جن پر تباہیاں آئیں، جا بجا فرمایا گیا ہے۔ "وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ"۔

اگر قرآن پاک کی یہ بات صحیح ہے تو ہمیں یقین کر لینا چاہئے کہ ہمارے یہ حالات

(بنیادی طور پر) خود ہمارے ایمانی نقص اور اعمال واخلاق کی خرابی کا نتیجہ ہیں اور ہمیں ان حالات سے اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی جب تک کہ ہم اپنے اندر حقیقی ایمان ویقین پیدا کرنے اور اعمال واخلاق کی اصلاح کی فکر نہ کریں۔

میں کوئی صاحبِ کشف وکرامت بزرگ نہیں ہوں، ایک گنہگار آدمی ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن پر ایمان اور اس کا کچھ سمجھنا نصیب فرمایا ہے، اس کی بنیاد پر قسم کھا کے پیشین گوئی کرسکتا ہوں کہ اس دور کے مسلمانوں کی اور خاصکر ہم ہندوستانی مسلمانوں کی یہ پریشانیاں اور رسوائیاں ہرگز ختم نہیں ہوں گی اور ہمارے مسائل ہرگز حل نہیں ہوں گے، جب تک کہ ہم خود اپنی ایمانی، عملی اور اخلاقی حالت کو بدلنے کی فکر نہ کریں۔ یہ حالات خود بخود پیدا نہیں ہوگئے ہیں نہ کسی دوسری قوم، یا پارٹی یا حکومت نے ان کو پیدا کیا ہے، یہ خدا کا عذاب ہے (از ماست کہ بر ماست) حدیث قدسی ہے "أَعْمَالُكُمْ أُحْصِيهَا لَكُمْ" اس کے علاج کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ پہلے اپنے حال اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرنے کی کوشش کی جائے، ایمان وتقویٰ پرہیزگاری اور نیکوکاری اُمت میں عام کرنے کی امکانی حد تک جدوجہد کی جائے۔ اس کے بغیر ہماری تدبیریں اور کوششیں اور ہمارے پلیٹ فارموں کے شور وہنگامے اسی طرح بالکل بے نتیجہ رہیں گے جس طرح اب تک بے نتیجہ رہے ہیں، اس کا بنیادی سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم خدا کی مدد اور نصرت کا استحقاق کھو چکے ہیں، خدا کی نصرت اور رفاقت کی شرط اس آخری آیت میں تقویٰ، پرہیزگاری اور نیکوکاری والی زندگی بتلائی گئی ہے۔ "إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِيْنَ هُمْ مُحْسِنُوْنَ"۔

میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری والی زندگی کے بعد آپ سے آپ بلا کچھ کئے حالات خود بخود بدل جائیں گے اور ہمارے مسائل حل آپ سے آپ ہوجائیں گے بلکہ اس تبدیلی کے بعد ہم خدا کی امداد ونصرت کے مستحق ہوجائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے مسائل حل کرنے کے لئے صحیح تدبیریں اختیار کرنے کی اور صحیح طریقہ پر جدوجہد کی ہمیں توفیق ملے گی، اور پھر ہماری اس جدوجہد کے صحیح اور خاطر خواہ نتائج وثمرات پیدا ہوں گے، یہی سنت اللہ ہے اور یہ انبیاء اللہ کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا طریقہ ہے، بلکہ میں تو قرآن ہی کی روشنی میں اور اپنی تاریخ کی روشنی میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اگر

ہم مسلمانوں میں تقویٰ اور نیکوکاری کی زندگی وسیع پیمانے پر پیدا ہو جائے تو دنیا بھر کے ملکوں میں اور خاص کر ہمارے اس ملک ہندوستان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی ایسی ہوائیں چلیں گی کہ قومیں کی قومیں اور علاقے کے علاقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا طریقۂ زندگی قبول کرنے لگیں گے، لیکن کیسی بدقسمتی کی بات ہے! کہ ہم سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہیں مگر اپنی اصلاح کی کوشش کرنے کے لئے تیار نہیں، حالانکہ ہمارے لئے راستہ صرف یہی ہے: اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّالَّذِیۡنَ ہُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ۔



سورۃ بنی اسرائیل

درس ـــ ۱۷

اِسرا اور معراج خواب تھا یا عالمِ بیداری کا واقعہ؟

عقلی اشکالات اور اُن کا حل

بنی اسرائیل پر

اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات اور پیشگی آ گاہی

پھر نافرمانی اور سرکشی پر خداوندی عذاب کا تازیانہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی
الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَآ اِنَّہٗ ھُوَ
السَّمِیْعُ الْبَصِیْرہ وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتَابَ وَجَعَلْنٰہُ ھُدًی لِّبَنِیْ
اِسْرَآئِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلاہ ذُرِّیَّۃَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ
نُوْحٍ اِنَّہٗ کَانَ عَبْداً شَکُوْرًاہ وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَائِیْلَ فِی
الْکِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًاہ
فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰھُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُوْلِیْ بَاسٍ
شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلَالَ الدِّیَارِ۔ وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًاہ ثُمَّ
رَدَدْنَالَکُمُ الْکَرَّۃَ عَلَیْھِمْ وَأَمْدَدْنٰکُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَجَعَلْنٰکُمْ
أَکْثَرَ نَفِیْرًاہ إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِکُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ
فَلَھَا۔ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَۃِ لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْھَکُمْ وَلِیَدْخُلُوا
الْمَسْجِدَ کَمَا دَخَلُوْہُ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّلِیُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْ تَتْبِیْرًاہ
عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَھَنَّمَ
لِلْکٰفِرِیْنَ حَصِیْرًاہ (سورہ بنی اسرائیل۔ ۱۔۸)

(ترجمہ) پاک اور مقدس ہے وہ ذات جو اپنے بندے (محمد ﷺ) کو راتوں رات مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک لے گئی جس کے ماحول اور اطراف کو ہم نے بابرکت بنادیا ہے، تاکہ اس بندے کو ہم اپنے کچھ عجائباتِ قدرت دکھائیں، بلاشبہ وہ خداوند قدوس سمیع وبصیر ہے۔

اور ہم نے (اپنے پیغمبر) موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور اس کو بنی اسرائیل کے لئے نسخۂ ہدایت بنایا اور اس میں حکم دیا کہ میرے سوا اور کسی کو کارساز نہ ٹھہراؤ، اے اُن لوگوں کی نسل کے لوگو جن کو ہم نے اپنے پیغمبر نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کرایا تھا، (اور طوفان کی ہلاکت سے بچالیا تھا) بلاشبہ وہ (نوح) شکرگزار بندہ تھا۔

اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ کی آگاہی دے دی تھی کہ تم ملک میں دومرتبہ خرابی پھیلاؤ گے اور بڑی سرکشی کی حرکتیں کرو گے، پھر جب اُن میں سے پہلے کا موعود وقت آ گیا (اور تم نے ملک میں پہلی دفعہ خرابیاں پھیلائیں اور سرکشی کا مجرمانہ رویہ اختیار کیا) تو اے بنی اسرائیل (ہم نے تمہاری سزا اور سرکوبی کے لئے) اپنے ایسے بندے تم پر بھیج دیئے جو بڑے خوفناک اور جنگ آزما تھے، پس وہ گھس پل گئے تمہاری آبادیوں کے اندر، اور یہ اللہ کا وعدہ تھا جس کو پورا ہونا تھا۔ پھر ہم نے دوبارہ تم کو ان پر غلبہ دے دیا اور تمہارے مال واولاد میں خوب بڑھوتری کی، اور تم کو بہت بڑے جتھے والا بنادیا (اور تم کو یہ انتباہ بھی دے دیا گیا تھا کہ) اگر تم بھلائی کے کام کرو گے تو اپنے ہی نفع کے لئے بھلائی کرو گے، اور اگر برائیاں کرو گے تو وہ بھی اپنے ہی لئے کرو گے (یعنی تمہارے اچھے اور برے اعمال کے نتائج ہی تمہارے سامنے آئیں گے) پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آ گیا (اور تم نے دوبارہ شرارت اور سرکشی کی تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کردیا) تاکہ وہ تمہارے چہروں کو بگاڑ دیں اور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) میں اس طرح حملہ آورانہ گھس جائیں جس طرح پہلے گھسے تھے اور تمہاری جن چیزوں پر اور جہاں تک غلبہ پائیں سب تباہ وبرباد کرڈالیں (اور اس کتاب میں یہ بھی بتادیا گیا تھا کہ اسکے بعد بھی تم شرارت اور نافرمانی سے باز آگئے اور اپنی اصلاح تم نے کرلی تو) امید رکھ سکتے ہو کہ تمہارے مالک وپروردگار کی تم پر پھر رحمت ہو، اور اگر تم نے پھر وہی کیا جو پہلے کیا تھا (یعنی شرارت اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا) تو ہم بھی وہی کریں گے جو ہم نے پہلے کیا تھا (یعنی تمہارے بدترین

دشمنوں کو تم پر پھر مسلط کر دیں گے) اور (یہ تو اس دُنیا میں ہوگا اور آخرت کے لئے) ہم نے دوزخ کو نہ ماننے والوں کا قید خانہ قرار دے دیا ہے۔

تفسیر وتشریح

واقعۂ معراج

یہ سورۂ بنی اسرائیل شروع ہوئی اور یہیں سے پندرھواں پارہ شروع ہوتا ہے اس کی پہلی آیت میں واقعہ اسرا کا غیر معمولی انداز میں ذکر فرمایا گیا ہے، عرف عام میں اسی واقعہ کو معراج کہا جاتا ہے، معراج کا واقعہ آپ حضرات نے کتابوں میں پڑھا ہوگا اور سنا ہوگا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر بہت اجمال کے ساتھ آیا ہے، ہاں حدیثوں میں واقعہ کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اکثر روایات کے مطابق یہ واقعہ ہجرت سے قریباً ایک سال پہلے مکہ معظمہ میں پیش آیا تھا۔ معراج کی حقیقت اور نوعیت کو یوں سمجھنا آپ حضرات کے لئے کچھ آسان ہوگا کہ جس طرح اللہ کے حکم سے فرشتے آسمان سے زمین پر آتے ہیں اور یہاں سے آسمانوں پر چلے جاتے ہیں اور ایک لمحہ میں مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق پہونچ سکتے ہیں، اسی طرح ایک رات میں بلکہ رات کے بھی بہت تھوڑے سے حصے میں بس چند لمحات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص قدرت سے رسول اللہ ﷺ کو پہلے مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے آسمانوں سے بھی اوپر سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچایا اور اپنی قدرت کی خاص نشانیوں اور بہت سی غیبی حقیقتوں کا مشاہدہ کرایا اور یہ مشاہدہ کرانا ہی اس سفرِ معراج کا خاص مقصد تھا، اسی آیت میں فرمایا گیا ہے "لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا" یعنی ہم نے یہ سفر اسی لئے کرایا کہ اپنے بندے محمد ﷺ کو اپنے عجائباتِ قدرت کا مشاہدہ اور نظارہ کرائیں۔

اس سفر کے دو حصے ہیں ایک مکہ مکرمہ کی مسجد حرام سے فلسطین کی مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس تک، اور دوسرا حصہ سفر کا ہے وہاں سے آسمانوں اور اُن کے بھی اوپر سدرۃ المنتہیٰ تک۔ عرف عام میں اس پورے سفر کو معراج کہا جاتا ہے، اور اہل علم کی خاص اصطلاح میں پہلے حصہ کو

'اِسرا' اور دوسرے کو 'معراج' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں سورۂ بنی اسرائیل کی اس پہلی آیت میں صرف پہلے حصہ کا ذکر ہے، یعنی مسجد حرام سے بیت المقدس تک کے آپ کے سفر کا ذکر ہے۔ اور چونکہ یہ سفر ایسا تھا کہ عام عقلیں اس کو سمجھ نہیں سکتیں اور باور نہیں کرسکتیں کہ رات کے ذرا سے حصہ میں مکہ سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر ہوگیا۔ اس لئے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کی بے انتہا قدرت کی طرف اشارہ کر کے یہ صراحت کردی گئی کہ یہ محیر العقول سفر خود محمد ﷺ کا فعل نہیں تھا بلکہ اُس خداوند قدوس کا فعل تھا جس کی قدرت کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے اور جو "فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْد" ہے۔ آیت کے سب سے پہلے لفظ "سُبْحَانَ الَّذِیْ" سے اسی طرف اشارہ کیا گیا۔

اگر یہ کہا جاتا کہ یہ سفر خود رسول اللہ ﷺ نے کیا جو اپنی ذات سے ایک بشر اور پیغمبر تھے تو شک شبہ کی گنجائش تھی کہ ایک انسان اور آدم زاد کے لئے بظاہر یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ چند لمحوں میں حرمِ مکہ سے بیت المقدس تک اور وہاں سے آسمانوں کے بھی اوپر سدرۃ المنتہیٰ تک جائے اور واپس آجائے۔ لیکن اس آیت میں اس سفر معراج کو رسول اللہ ﷺ کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فعل بتلایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے "سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَهٗ" (یعنی وہ خداوند قدوس ہر نقص اور کمزوری سے پاک ہے جو اپنے خاص بندے (محمد ﷺ) کو رات کے ایک حصہ میں مکہ کی مسجد حرام سے اس مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک لے گیا جس کے آس پاس اور ماحول کو ہم نے اپنی خاص برکتوں سے مالا مال کیا ہے) قرآن مجید نے اس آیت میں اِسرا اور معراج کو اللہ تعالیٰ کا فعل بتلا کر منکرین اور مخالفین کے تمام اعتراضات اور شکوک و شبہات کا جواب دے دیا اور ہم مسلمانوں کو بھی اس مشرکانہ گمراہی سے بچا دیا جس میں عیسائی مبتلا ہوئے، انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو اُن کا ذاتی فعل اور اُن کا تصرف سمجھا اور اُن کو خدائی میں اور خداوندی صفات میں شریک مان لیا، اگر وہ حضرت مسیح کے ان معجزات کو خدا کا فعل اور خداوندی تصرف سمجھتے تو اس شرک میں مبتلا نہ ہوتے۔

ظاہری اور باطنی برکتوں کی سرزمین

اس آیت میں مسجد اقصیٰ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اس کے ماحول اور

اطراف کو برکتوں سے نوازا ہے۔ مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس جس سرزمین اور جس علاقہ میں واقع ہے اُس کی سب سے بڑی برکت اور عظمت تو یہ ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل کے قریباً پورے سلسلہ کا مرکزِ دعوت وہدایت اور اُن کا قبلہ رہا ہے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے جلیل القدر انبیاء ورسل اس میں مدفون ہیں۔ اس کے علاوہ یہ علاقہ دنیوی اور مادّی برکتوں اور نعمتوں سے مالا مال ہے۔ بہترین آب وہوا ہے، پھلوں کی پیداوار کے لحاظ سے تو گویا جنت کا ایک خطہ ہے، الغرض بیت المقدس کا یہ علاقہ دینی اور دنیوی، روحانی اور مادّی ہر قسم کی برکتوں سے مالا مال ہے۔ "بَارَکْنَا حَوْلَهٗ" میں غالباً ان ہی سب برکتوں کی طرف اشارہ ہے، واللہ اعلم۔

مقصدِ سفر

آگے اس سفرِ معراج کا مقصد اور اس کی غرض وغایت بیان فرمائی گئی ہے، ارشاد ہے "لِنُرِيَهٗ مِنْ آيٰتِنَا" یعنی ہم نے اپنے اس بندے محمد (ﷺ) کو یہ سفر اس لئے کرایا کہ اپنی قدرت کی کچھ خاص نشانیاں اس کو دکھلا دیں اور بعض اُن حقائق کا مشاہدہ کرا دیں جو اس دُنیا کے دائرہ سے باہر پردۂ غیب میں ہیں۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" یعنی وہ اللہ اپنی ذات سے سمیع وبصیر ہے سارا عالمِ غیب وشہادت ہر وقت اس کی نگاہ میں ہے، کائنات کا کوئی ذرہ اس سے مخفی نہیں ہے، اور وہ عالم غیب وشہادت کی ہر آواز سنتا ہے اور یہ سننا اور دیکھنا اُس کی ذاتی صفت ہے (اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ) پھر یہ بھی اُس کے اختیار میں ہے کہ اپنے جس بندہ کو اور جس مخلوق کو جو چاہے دکھلا دے اور جو آواز چاہے سنوا دے، اور جس بندے اور مخلوق کو وہ اپنی قدرت سے عالمِ غیب وشہادت کی کچھ چیزیں دکھلا دے یا سنوا دے تو وہ ہرگز اُس کے برابر اور اُس صفت میں اس کا شریک نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ تو اپنی ذات سے سمیع وبصیر ہے اور یہ اس کی ذاتی اور قدیم ازلی صفت ہے "اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ"۔

یہاں تک سورت کی پہلی آیت کی تشریح ہوئی اور اِسرا کا بیان اسی پر ختم ہوگیا، آگے دوسرا مضمون شروع ہے جس کا خاص تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔

کچھ سوالات کچھ بحثیں

اِسرا اور معراج سے متعلق کچھ مشہور سوالات اور اشکالات ہیں اور کچھ بحثیں ہیں جن کے بارہ میں کتابوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ایک اہم سوال اور بحث تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کا اِسرا اور معراج کا یہ سفر خواب تھا یا عالمِ بیداری کا واقعہ؟۔

اسی طرح کا دوسرا سوال اور دوسری بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سفر صرف آپ کی روح کو کرایا تھا اور یہ صرف ایک روحانی سیر تھی یا آپ کا یہ سفر جسم عنصری کے ساتھ ہوا تھا، مختصر لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ معراج روحانی تھی یا جسمانی؟۔

صحابۂ کرام اور تابعین سے لے کر اس وقت تک اُمّت کی غالب اکثریت بلکہ کہنا چاہئے کہ جمہور امّت اس کے قائل ہیں کہ معراج خواب کی بات نہیں بلکہ عالمِ بیداری کا واقعہ ہے اور وہ صرف روحانی نہیں بلکہ جسم عنصری کے ساتھ ہوئی تھی۔ حدیث کی عام روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور قرآن مجید کے الفاظ اور خاص اندازِ بیان سے بھی یہی سمجھا جاتا ہے۔

اس آیت میں اِسرا اور معراج کے اس واقعہ کو "أَسْرىٰ بِعَبْدِهٖ" کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے خواب یا صرف روحانی سیر کی تعبیر ان الفاظ سے کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ مضمون کو "سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرَیٰ" کے الفاظ سے شروع کیا گیا ہے جس سے صاف معلوم ہوا کہ کسی بہت ہی غیر معمولی قسم کے اور محیر العقول واقعہ کا ذکر کیا جارہا ہے، حالانکہ ایسے خواب تو ہم آپ بھی دیکھ سکتے ہیں اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں، اور جس کو روحانی سیر کہا جاتا ہے وہ بھی خواب سے ملتی جلتی ایک کیفیت ہوتی ہے، الغرض ان دونوں میں سے کوئی بھی ایسی اہم اور غیر معمولی بات نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب پاک میں غیر معمولی انداز میں اور "سُبْحَانَ الَّذِیْ" کے شاندار عنوان سے بیان فرمائیں، جس شخص کو عربی زبان اور محاورات سے ذرا سی بھی واقفیت ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس انداز اور اس اہتمام سے ایسے ہی واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے جو بہت غیر معمولی ہو اور لوگوں کی عقل میں آنا مشکل ہو۔ الغرض قرانِ مجید کے خاص اندازِ بیان اور الفاظ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اِسرا اور معراج حضور کا خواب

نہیں تھا، بلکہ عالمِ بیداری کا واقعہ تھا، اور یہ صرف روحانی سیر اور روحانی مشاہدہ نہیں تھا۔ ہاں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ اس طرح کا سفر بھی نہیں تھا جس طرح کے سفر ہم اس دُنیا میں کرتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اِسرا اور معراج کا معاملہ ایک بالکل نرالا معاملہ تھا، اس عالم اور ہماری اس دُنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے، اس لئے اس کی حقیقت اور نوعیت کو ہم پوری طرح سمجھ نہیں سکتے، جس طرح خود نبوت اور وحی کا معاملہ ہے کہ ہمارا اس پر ایمان تو ہے لیکن ہم اس کی نوعیت اور حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ میرا خیال ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت معاویہؓ وغیرہ بعض صحابہ کے متعلق روایات میں جو یہ مذکور ہے کہ وہ حضرات اِسرا اور معراج کو ''خواب'' کا واقعہ کہتے تھے تو میرے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کو ہماری اس دُنیا کے سفروں جیسا سفر نہیں مانتے تھے بلکہ اس کو دوسرے عالم کا ایک معاملہ سمجھتے تھے اور اس کو ''رؤیا'' سے تعبیر کرتے تھے، یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اس کو حضور کا صرف ایک خواب سمجھتے ہوں، قرآن پاک نے اِس کو جس غیر معمولی انداز میں بیان کیا ہے اُس کو پیش نظر رکھتے ہوئے عربی زبان و محاورات سے واقفیت رکھنے والا کوئی آدمی بھی اس کو ''خواب کی بات'' نہیں کہہ سکتا۔ پھر صحیح روایات میں یہ بھی ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے معراج کا واقعہ لوگوں کے سامنے بیان کیا تو ابوجہل، کفار وغیرہ نے اُس پر خوب مذاق اڑایا اور اس واقعہ کو معاذ اللہ حضور کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور پروپیگنڈہ کیا کہ یہ ایسی بات کا دعویٰ کر رہے ہیں جو بالکل ناممکن ہے، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی آدمی ایک رات میں اتنا طویل سفر کر کے واپس آجائے۔ تو اگر صرف خواب کی بات ہوتی تو اس میں کسی کے لئے بھی تعجب اور اعتراض کا موقع نہ ہوتا، الغرض ابوجہل وغیرہ نے معراج کے بارہ میں جو شور و غوغا مچایا اور اس سلسلہ میں حضور کے خلاف جس طرح کا پروپیگنڈہ کیا وہ بھی اس کی واضح دلیل ہے کہ حضور نے معراج کے واقعہ کو خواب کے طور پر یا صرف روحانی سیر کے طور پر بیان نہیں فرمایا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے ایک غیر معمولی انعام اور معجزہ کے طور پر بیان فرمایا تھا جو اُن کے نزدیک ناممکن اور خلاف عقل تھا اور معجزہ کی شان یہی ہوتی ہے۔ اِن سب باتوں کو سامنے رکھ کر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کسی صحابی یا تابعی نے اسراء اور معراج کو حضور کے دوسرے خوابوں کی طرح صرف ایک خواب قرار دیا ہو، اس لئے قریب قریب یقین کے ساتھ میرا یہ خیال ہے کہ جن

بعض صحابہ یا تابعین سے یہ مروی ہے کہ انہوں نے اسرا اور معراج کو ''رؤیا'' کہا اُس سے اُن کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس طرح کا سفر نہیں تھا جس طرح کے سفر ہم اپنی اس دنیا میں مختلف قسم کی سواریوں پر کرتے ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے عالم کا معاملہ تھا جس کی کوئی مثال اس دنیا کے ہمارے حالات اور واردات میں نہیں مل سکتی، اسی کو اُن بزرگوں نے ''رؤیا'' کے لفظ سے تعبیر کر دیا ہے۔

حضرت علّامہ انور شاہ صاحب کا ارشاد

ہمارے استاذ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ جنہوں نے قدیم آسمانی کتابوں کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس مقصد کے لئے عبرانی اور سریانی زبانوں سے بھی واقفیت حاصل کی تھی، فرماتے تھے کہ انبیاء سابقین کے صحیفوں میں انبیاء علیہم السلام کے خاص واردات و معاملات کو بکثرت ''رؤیا'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس سے مراد وہ نہیں ہوتا جس کو ہم لوگ ''خواب'' کہتے ہیں۔ اور اسی سورۂ بنی اسرائیل میں چند رکوع کے بعد ''رؤیا'' کا جو لفظ آیا ہے ''وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِیْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ...... الخ'' تو بظاہر اس واقعۂ اسراء اور معراج ہی کو اس آیت میں ''رؤیا'' کہا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے ''رؤیا عینٍ أُریها رسول الله ﷺ (۱)'' میرے نزدیک یہ بالکل وہی بات ہے جو ہمارے استاذ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے، پس جن صحابہ یا تابعین نے معراج کو ''رؤیا'' کہا ہے اُس کا مطلب یہی سمجھنا چاہئے!۔

اسراء اور معراج کے بارے میں ایک سوال یہ بھی اٹھایا جاتا ہے کہ اب سے قریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے جبکہ ہوائی جہاز اور راکٹ جیسی تیز رفتار کوئی چیز ایجاد نہیں ہوئی تھی ایک رات بلکہ اس کے بھی تھوڑے سے حصہ میں اتنا طویل سفر کیسے ہو گیا؟۔ لیکن یہ اور اس طرح کے سارے اشکالات کا یہ جواب کافی ہے کہ قرآن پاک نے رسول اللہ ﷺ کا فعل نہیں بلکہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ کا فعل بتایا ہے اور اُس کیلئے کچھ بھی مشکل نہیں، اُس کے حکم اور اس کی قدرت سے فرشتے ایک آن میں آسمان سے زمین پر اور زمین سے آسمان پر آتے اور جاتے ہیں، بس اسی

(۱) ترجمہ۔ ایک مشاہدہ جو حضور کو کھلی آنکھوں کرایا گیا۔ (مرتب)

قادر مطلق نے اپنی قدرت کاملہ سے اپنے بندہ اور رسول حضرت محمد ﷺ کو یہ سفر اس طرح کرایا، دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیجئے کہ یہ سفر ایک خاص معجزہ تھا اور معجزہ تو وہی ہوتا ہے جو اس عالم اسباب کے لحاظ سے عام عقلوں کے کے لئے ناقابل فہم ہو۔ اور ہر معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، اگرچہ اس کے نبی ورسول کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، اسی لئے اِس آیت میں اسراء کو اللہ تعالیٰ کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ (اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ)۔

معجزہ کے بارہ میں ہمارے عقائد کی کتابوں میں بھی بنیادی عقیدہ کے طور پر یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو پیغمبر کی تصدیق کے لئے اس کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح کرامت کے بارے میں عقائد کی کتابوں میں صاف صاف لکھا ہے کہ وہ ولی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو کسی متقی اور صالح بندہ کی عنداللہ مقبولیت ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اُس کے ہاتھ پر ظاہر کرتا ہے، اسی لئے معجزہ اور کرامت نبی یا ولی کے اختیار میں نہیں ہوتی کہ جب چاہیں ظاہر کریں اور دکھائیں بلکہ اللہ ہی کے اختیار میں ہوتی ہے، قرآن پاک میں جابجا بیان فرمایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے منکرین نے اُن سے جب معجزہ دکھانے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ معجزات ہمارے اختیار کی چیز نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے "اِنَّمَا الْاٰیَاتُ عِنْدَ اللّٰہِ" بہرحال معراج کا واقعہ بھی ایک عظیم معجزہ ہی تھا اور جو کچھ ہوا براہ راست اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوا، اس لئے اس طرح کے سوال اور اشکال کی گنجائش ہی نہیں۔

جن امتوں اور گروہوں نے اس بات کو ذہن میں نہیں رکھا اور معجزوں اور کرامتوں کو خود نبیوں اور ولیوں کا فعل اور تصرف سمجھا وہ شرک میں مبتلا ہو گئیں، عیسائیوں میں بھی شرک یہیں سے آیا۔ افسوس ہے کہ بہت سے مسلمان کہلانے والے بھی اس معاملہ میں گمراہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے ہم کو اور آپ کو اس سے محفوظ رکھا ہے۔ "اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ"۔

بنی اسرائیل کی ایک سرگزشت

میں نے عرض کیا تھا کہ اسرا اور معراج کے معجزانہ سفر کا ذکر اس سورت کی صرف پہلی

ایک آیت میں کیا گیا ہے، آگے دوسری آیت سے دوسرا مضمون شروع ہے جس کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔ اس مضمون کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کے لئے کتاب ہدایت (یعنی تورات) نازل کی تھی تو جب تک انہوں نے ہماری اس ہدایت کی پیروی کی اور نیکی اور فرمانبرداری کے راستے پر چلتے رہے وہ دُنیا میں بھی عزت اور اقبال کے ساتھ رہے، اور جب انہوں نے اطاعت کے بجائے نافرمانی اور بندگی وسرافگندگی کے بجائے سرکشی کا راستہ اختیار کیا تو ان پر اُن کے بدترین دشمنوں کو مسلط کر دیا گیا جنہوں نے ان کو بہت ذلیل وخوار کیا اور بالکل تباہ و برباد کر ڈالا۔ اور یہ ایک دفعہ نہیں بلکہ بار بار ہوا اور اس کے باوجود ہوا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اس کے بارہ میں اسی کتابِ ہدایت میں کھلی آگاہی دی تھی، آخر میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ نافرمانی اور سرکشی کی یہ سزا تو اُن کو دُنیا میں دی گئی، اور آخرت میں نہ ماننے والوں کے لئے جہنم کا عذاب ہے۔ اللہ کی پناہ،

ارشاد فرمایا گیا ہے "وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا۔" یعنی ہم نے اپنے بندے اور پیغمبر موسیٰ کو کتاب یعنی تورات دی تھی اور اس کو ہم نے بنی اسرائیل کے لئے اپنا ہدایت نامہ قرار دیا تھا اور اس میں خاص ہدایت یہ دی گئی تھی کہ میرے سوا کسی کو کارساز نہ ٹھہراؤ، صرف مجھ کو ہی کارساز اور مختارِ کل مانو اور میرے ہی ساتھ عبادت و بندگی کا وہ معاملہ کرو جو کسی کارساز ہستی کے ساتھ ہونا چاہئے۔ "اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا" کا یہی مطلب ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے "ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا" حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کی قوم کا واقعہ سورۂ ہود میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے، نوح علیہ السلام نے سیکڑوں سال تبلیغ کی اور اس کی کوشش کی کہ ان کی قوم کفر و شرک کا راستہ چھوڑ کے ایمان اور عمل صالح والی زندگی اختیار کرلے، لیکن قوم کے بہت بڑے حصہ نے آپ کی بات نہیں مانی، بہت تھوڑے لوگوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا اور ایمان اور عمل صالح کا راستہ اختیار کرلیا، آخری نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہلاکت خیز طوفان کی شکل میں خدا کا عذاب آیا اور وہ سب لوگ ہلاک و برباد کر دئے گئے جنہوں نے نوح علیہ السلام کی ہدایت کے مقابلہ میں انکار اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا تھا، اور جن تھوڑے [illegible] آپ کی ہدایت کو قبول کیا تھا [illegible] کے حکم سے نوح علیہ السلام

کے ساتھ اُن کی کشتی پر سوار ہو کر اس عذاب سے بچ گئے، انہی میں سے کچھ لوگوں کی نسل سے ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے اور اُن کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام سے بنی اسرائیل کا سلسلہ چلا۔ تو اس آیت (ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ) میں اس قدیم تاریخی واقعہ کو یاد دلا کر بنی اسرائیل سے فرمایا گیا ہے کہ تم ہمارے اُن بندوں کی نسل ہو جن کو ہم نے اُن کے ایمان اور اعمال صالحہ کی وجہ سے اپنے پیغمبر نوح کے ساتھ جو ہمارے بڑے شکر گزار بندے تھے، اُن کی کشتی پر اپنے حکم سے سوار کرا کے طوفان کے عذاب سے بچالیا تھا، تو اگر اپنے ان آباء واجداد کی طرح تم نے بھی ہماری نازل کی ہوئی ہدایت کی پیروی کی اور ایمان اور اعمال صالحہ والی زندگی اپنائی تو تم پر بھی ہمارا ایسا ہی فضل وکرم ہوگا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ اگر تم نے نہ ماننے کا اور سرکشی کا وہ رویہ اختیار کیا جو قومِ نوح کی اکثریت نے اختیار کیا تھا تو تم بھی خدا کے عذاب اور اُس کی مار سے نہ بچ سکو گے، خدا کا قانون بے لاگ ہے، کسی سے اس کی رشتہ داری نہیں ہے۔

آگے کی آیتوں میں انہی بنی اسرائیل کے بارہ میں جو بیان فرمایا گیا ہے وہ بڑا ہی سبق آموز بلکہ لرزہ خیز ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے سبق لینے کی توفیق دے، جو کچھ بیان کیا جارہا ہے دراصل ہماری یعنی اُمت محمدیہ کی تنبیہ اور سبق آموزی کے لئے بیان کیا جارہا ہے۔

ارشاد ہے۔ "وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا...... اِلٰى قَوْلِهٖ...... وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِينَ حَصِيرًا"، یعنی ہم نے اُس کتاب میں یعنی تورات میں بنی اسرائیل کو آگاہی دے دی تھی کہ یہ ہونے والا ہے کہ تم اپنی بداعمالیوں اور شیطانی حرکتوں سے علاقہ میں دو دفعہ فساد اور خباثت پھیلاؤ گے اور خدا کی بندگی اور فرمانبرداری کا راستہ چھوڑ کے سرکشی کا یہ راستہ اختیار کرو گے۔

قرآن پاک میں یہاں صراحت کے ساتھ صرف اتنی ہی آگاہی کا ذکر فرمایا گیا ہے، لیکن جو لوگ قرآن مجید کے طرزِ بیان سے کچھ آشنا ہیں وہ سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اسی میں یہ آگاہی بھی مضمر ہے کہ جب تم فساد و بدعملی اور سرکشی کا راستہ اختیار کرو گے تو ہماری طرف سے تم پر عذاب کا تازیانہ پڑے گا۔ آگے کی آیتوں میں بنی اسرائیل کے فساد کے ساتھ ان پر خداوندی عذاب کے تازیانوں کے پڑنے کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے اس سے بھی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ فساد اور سرکشی کی آگاہی کے ساتھ خداوندی سزا اور عذاب کی آگاہی بھی دی گئی تھی۔ اور

"کان وعداً مفعولاً" (اور یہ پورا ہوکر رہنے والا وعدہ تھا) کے الفاظ سے تو یہ بات گویا صراحت ہی کے ساتھ معلوم ہو جاتی ہے کہ عذاب کی آ گاہی بھی ساتھ ہی ساتھ دے دی گئی تھی۔

پیشین گوئی نہیں آ گاہی

یہاں ایک بات یہ بھی قابلِ ذکر اور قابلِ لحاظ ہے کہ بنی اسرائیل کو دی جانے والی جس آ گاہی کا یہاں قرآن پاک میں ذکر کیا گیا ہے وہ صرف ایک "پیشین گوئی" نہیں تھی، بلکہ بنی اسرائیل کے لئے ایک اہم تنبیہ اور آ گاہی تھی، اس کو بالکل اُسی طرح کی آ گاہی سمجھنا چاہئے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام اور اُمت کو بہت سے فتنوں کے بارے میں حدیثوں میں آ گاہی دی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں ایسی پچاسوں حدیثیں ہیں جن کو محدثین نے اپنی مرتب کی ہوئی کتابوں میں "کتاب الفتن" میں درج کیا ہے، تو حضور ﷺ کے ان ارشادات کا مقصد نجومیوں اور کاہنوں کی طرح صرف پیشنگوئی سنانا ہرگز نہیں تھا، بلکہ امت کو باخبر کرنا تھا، تاکہ ان فتنوں کے ظہور کے وقت یہ حدیثیں اُمت کی رہنمائی کریں اور اللہ کے باتوفیق بندے ان حدیثوں کی روشنی میں اپنے کو اِن فتنوں میں ملوث ہونے سے بچائیں۔ الغرض تورات میں بنی اسرائیل کو جو آ گاہی دی گئی تھی اور جس کا ذکر اس آیت میں بھی کیا گیا ہے وہ اسی طرح کی تھی۔

پہلی آ گاہی کا ظہور

آگے کی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ جب بنی اسرائیل میں پہلی دفعہ وہ فساد آیا جس کے بارے میں اُن کو آ گاہی دی جا چکی تھی اور انہوں نے ہماری ہدایت اور آ گاہی کو پسِ پشت ڈال کر شیطنت اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا تو ہم نے ایسے دشمنوں کو اُن پر مسلط کر دیا جو "اُولِی بَأْسٍ شَدِيْدٍ" یعنی نہایت خوفناک اور بڑے جلاّد تھے، وہ ان بنی اسرائیل کی بستیوں میں اور اُن کے گھروں میں گھس گئے اور بالکل تباہ و برباد کر ڈالا۔ فرمایا گیا ہے "فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُوْلٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَاداً لَّنَآ أُوْلِي بَأْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلَالَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْداً مَّفْعُوْلاً"۔

بہت سے مفسرین نے جن کی بنی اسرائیل کی تاریخ پر اچھی نظر ہے، یہ رائے ظاہر کی

ہے کہ اس سے بابل کے بادشاہ بُخت نصر کا حملہ مراد ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام سے قریباً ۶ سو سال پہلے بنی اسرائیل کی بستیوں پر ہوا تھا، اس نے بنی اسرائیل کو بری طرح تباہ و برباد کیا تھا، ان کی بہت بڑی تعداد قتل ہوئی اور بہت بڑی تعداد میں قیدی بنا کر بابل لے جایا گیا اور ان کی بستیاں بالکل اُجاڑ دی گئیں۔

آگے بیان فرمایا گیا ہے کہ پھر ایک مدت کے بعد اللہ نے ان پر رحم فرمایا ان کی مدد فرمائی اور خدا کی اس مدد نے پانسہ پلٹ دیا، بنی اسرائیل کو غلبہ نصیب ہوا، پھر ان کے مال واولاد میں بھی برکت ہوئی اور ان کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ارشاد ہے۔ ''ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيْرًا''۔

یہاں قرآن مجید میں بنی اسرائیل کی توبہ انابت اور رجوع الی اللہ کا بظاہر کوئی ذکر نہیں فرمایا گیا، لیکن تورات میں اور بنی اسرائیل کی تاریخ میں اس کا ذکر ہے اور قرآن مجید کے خاص طرز بیان کے مطابق یہاں اس کو مضمر سمجھنا چاہئے۔ آیت کا مطلب یہی ہے کہ ''بُخت نصر'' کے لشکر کے ہاتھوں پامال اور تباہ و برباد ہونے کے بعد ان میں انابت پیدا ہوئی، جیسا کہ عام طور سے ہوا کرتا ہے۔ ''جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا''۔

بابل میں جب وہ قیدیوں والی ذلت وخواری کی زندگی گزار رہے تھے، ان میں انابت پیدا ہوئی، انہوں نے نافرمانی کی زندگی سے توبہ کی اور فرمانبرداری والی زندگی کا خدا سے عہد کیا تو اللہ تعالیٰ کا ان پر فضل ہوا اور اس کی خاص مدد سے ان کو دشمنوں پر غلبہ بھی نصیب ہوگیا اور ان کی نسل اور دولت میں بھی خدا تعالیٰ نے خوب اضافہ کیا، اور بنی اسرائیل پھر سے ایک خوش حال اور طاقتور قوم بن گئے۔

آگے فرمایا گیا ہے ''إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا''، یعنی ہم نے ان بنی اسرائیل کے اس دوسرے دور میں پھر ان کو جتا دیا تھا اور آگاہ کر دیا تھا کہ دیکھو آئندہ بھی یہی ہوگا کہ اگر تمہارا رویہ اچھا رہا جیسا کتاب و پیغمبر والی اُمّت کا ہونا چاہئے تو تم کو ہماری طرف سے اس کا بہترین صلہ ملتا رہے گا، لیکن اگر تم نے بدعملی اور شرارت کی راہ اختیار کی تو سابق کی طرح اس کا بُرا نتیجہ بھی تمہیں بھگتنا ہوگا، جزا سزا کا ہمارا یہ قانون اٹل ہے۔ ''إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا''

دوسری بار کی تباہی

آگے فرمایا گیا ہے "فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ" الخ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل وکرم کے بعد جس کا ذکر اوپر کی آیت میں کیا گیا ہے، بنی اسرائیل نے پھر خدا کو اور اس کی ہدایت کو بھلا دیا اور نفس پرستی اور سرکشی کا وہ راستہ پھر اختیار کر لیا جس کے بارے میں ان کو آگاہی دی جا چکی تھی (لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا) تو خدا کی طرف سے ان پر پھر ان کے دوسرے نہایت خراب اور خونخوار دشمن مسلط کر دئے گئے، وہ خدا کا عذاب بن کر ان پر نازل ہوئے، انہوں نے اِن کو ایسی مار دی کہ صورتیں تک بگاڑ دیں اور جس طرح بخت نصر کے لشکر نے ان کے دینی اور قومی مرکز اور ان کی عزت اور عظمت کے نشان بیت المقدس کو تباہ و برباد کیا تھا ان کے نئے حملہ آور دشمنوں نے بھی ایسا ہی کیا اور اس کے علاوہ بھی جہاں تک قابو پایا سب برباد کر دیا، اور یہ خدائے ذوالجلال کے عذاب کے طور پر ہوا۔ خدا نے بنی اسرائیل کی شرارت اور سرکشی کی سزا دینے ہی کے لئے ان دشمنوں کو ان پر اس طرح مسلط کیا، اس کی طرف سے پہلے ہی جتا دیا گیا تھا "وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا" (کہ اگر تم نے بدکرداری اختیار کی تو تم کو اس کی سزا ضرور بھگتنی ہوگی) اکثر واقف مفسرین نے طیطوس رومی کے حملہ (۷۰ء) کو اس کا مصداق قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

آگے فرمایا گیا ہے۔ "عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا" یعنی بنی اسرائیل کی اس دوسری دفعہ کی بربادی کے بعد بھی ان کو اس کی امید دلائی گئی تھی کہ اگر اب بھی معصیت کوشی اور سرکشی کا راستہ چھوڑ کے نیکی اور فرمانبرداری کا راستہ اختیار کر لو گے تو تمہارا پروردگار پھر تم کو اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے گا اور تم کو پھر ایک نئی زندگی عطا کر دی جائے گی۔ اور اگر اس کے برخلاف تم نے پھر شرارت اور شیطنت کا راستہ اختیار کیا تو ہم پھر وہی کریں گے جو پہلے ہم نے کیا تھا۔ یعنی جس طرح پہلے تم پر ہمارے عذاب کے کوڑے برسے تھے اسی طرح ...

اور پھر آخرت کی سزا

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ''وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْراً''. بنی اسرائیل سے متعلق جو سلسلۂ کلام سورت کی دوسری آیت سے شروع ہوا تھا وہ یہاں ختم ہو گیا۔ یہ اس سلسلہ کی آخری آیت ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر اس بار بار کی تنبیہ اور ہمارے قہر و عذاب کے بار بار کے تجربے کے بعد بھی تم نے ہدایت کی پیروی اور فرمانبرداری کا راستہ اختیار نہیں کیا اور کفر و طغیان ہی کی راہ پر چلتے رہے تو ایسے مجرموں کے لئے دنیوی عذاب کے ان تازیانوں کے علاوہ آخرت کی کبھی ختم نہ ہونے والی زندگی میں جہنم کا شدید عذاب ہے اور پھر جہنم کا جیل خانہ ہی اُن کا دائمی ٹھکانا ہے۔ ''وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْراً''۔

ان آیتوں کا سبق

یہاں ہمارے آپ کے لئے سوچنے سمجھنے کی خاص بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی یہ سرگزشت ہم کو یعنی اُمت محمدیہ ﷺ کو کیوں سنائی گئی اور اس کو قرآن مجید میں کیوں شامل کیا گیا؟۔ قرآن پاک نہ تو تاریخ کی کتاب ہے اور نہ قصہ کہانیوں کی، وہ تو کتابِ ہدایت ہے، اس میں بنی اسرائیل کے اور دوسری قوموں اور ان کی نبیوں رسولوں کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، سب ہماری ہدایت اور سبق آموزی کے لئے بیان کئے گئے ہیں۔ ان آیتوں کا کھلا سبق ہمیں اور آپ کو اور حضور ﷺ کی ساری اُمت کو یہ ہے کہ کسی قوم، کسی نسل اور کسی اُمت سے اللہ تعالیٰ کی رشتہ داری نہیں ہے، اس کا قانون بے لاگ ہے، بنی اسرائیل حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، اور حضرت یعقوب علیہم السلام جیسے جلیل القدر پیغمبروں کی اولاد تھے، اور یہ ایسی نسل تھی جس میں اللہ کے ہزاروں پیغمبر آئے، لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ بندوں کے ساتھ ایسا بے لاگ ہے کہ جب تک یہ سیدھے چلے اور ان کی زندگی ایمان اور عمل صالح والی زندگی رہی ان پر نعمتوں کی بارشیں ہوتی رہیں اور ان کو عزت اور سربلندی نصیب رہی، لیکن جب انہوں نے خدا اور اس کے پیغمبروں کا بتایا ہوا راستہ چھوڑ کر نفس پرستی اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا تو اللہ کی رحمت سے محروم ہو گئے، اور پھر نہایت خوفناک قسم کے کفار ان پر مسلط کر دیئے گئے جنہوں نے ان کو

بری طرح تہس نہس کیا اور ان کے قبلے بیت المقدس تک کو برباد کر ڈالا۔ اور یہ سب اللہ کے حکم سے اور اس کی طرف سے ہوا۔

امتِ محمدیؐ کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہوا ہے، جب تک اس کی عام زندگی ایمان و عمل صالح اور تقوے والی رہی روم و فارس جیسی عظیم الشان اور نہایت طاقتور حکومتوں کے مقابلہ میں ان کو غلبہ حاصل رہا اور ''اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ'' کا ظہور ہوتا رہا۔ لیکن جب ایمان اور تقویٰ کے بجائے اُمت میں نفاق اور فسق و فجور کا غلبہ ہو گیا تو اُن پر تاتاری جیسی وحشی اور خونخوار قوم مسلّط کر دی گئی اور پھر وہی ہوا جو بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا تھا۔ ''فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ وَ کَانَ وَعْداً مَّفْعُوْلاً'' اس کے بعد بھی دُنیا کے مختلف حصوں میں اللہ تعالیٰ کے اس بے لاگ قانون کا ظہور ہوتا رہا ہے، اور ہم آپ خود بھی کسی رنگ میں اس کا تجربہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم کو سبق لینے کی توفیق دے اور ہم پر رحم فرمائے۔ ہمارے لئے بھی اللہ تعالیٰ کا اور قرآن مجید کا پیغام یہی ہے۔ ''عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا''

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔



سورۃ الکہف

درس ۱۸—۱۹

(درس-۱۸)

سورۂ کہف کی خاص اہمیت وفضیلت

قرآن پاک کی تنزیل اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت

نزولِ قرآن کا خاص مقصد مجرمین کو آگاہی اور مومنین صالحین کو بشارت

یہ دُنیا دارالابتلا ہے اور یہاں جو کچھ ہے فانی ہے

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم- بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِهِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡهُ وَیُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۝ مَّاکِثِیۡنَ فِیۡهِ اَبَدًا ۝ وَّیُنۡذِرَ الَّذِیۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمۡ ؕ کَبُرَتۡ کَلِمَةً تَخۡرُجُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ ؕ اِنۡ یَّقُوۡلُوۡنَ اِلَّا کَذِبًا ۝ فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ عَلٰۤی اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا ۝ اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَی الۡاَرۡضِ زِیۡنَةً لَّهَا لِنَبۡلُوَهُمۡ

أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝ وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ۝
(سورۃ الکھف۔ آیت ۱ تا ۸)

(ترجمہ) ساری حمد وستائش اُس اللہ کے لئے جس نے اپنے خاص بندے (محمد ﷺ) پر الکتاب نازل فرمائی (یعنی قرآن) اور اس میں کسی قسم کی ذرا بھی کجی نہیں رکھی، بالکل سیدھی اور راست، اس واسطے (نازل فرمائی) کہ وہ (مجرموں کو) خدا کی طرف سے آنے والے سخت ہولناک عذاب سے آگاہی دے اور ڈرائے، اور اُن ایمان والوں کو جو اعمال صالحہ کو اپنا معمول اور دستور بنالیں، خوشخبری دے کہ ان کے لئے (ان کے پروردگار کی طرف سے) بڑا اچھا اجر ملنے والا ہے (یعنی جنت اور اس کی نعمتیں) وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، نیز ان (گمراہ اور گستاخ) لوگوں کو (خدائے ذوالجلال) کے شدید عذاب سے) ڈرائے اور آگاہی دے جنہوں نے کہا کہ (معاذ اللہ) خدا اولاد رکھتا ہے، ان کے پاس اس کی کوئی علمی سند نہیں اور نہ ان کے باپ دادوں کے پاس تھی۔ بڑی ہی بھاری اور سنگین بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بالکل ہی جھوٹ کہتے ہیں۔

(اے پیغمبر) تو کیا تم رنج وغم سے اپنی جان کو ہلاک کرڈالو گے ان (بدبخت منکروں) کے پیچھے اگر وہ اس خداوندی فرمان (یعنی قرآن عزیز) پر ایمان نہ لائیں۔

(معلوم ہونا چاہئے کہ) روئے زمین پر جو کچھ ہے اسے ہم نے زمین کی زینت وزیبائش کا سامان بنادیا ہے تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں کون نیکوکار بنتا ہے، اور ہم ہی ایسا کرنے والے ہیں کہ جو کچھ روئے زمین پر ہے اس کو (نیست ونابود کرکے) ایک صاف چٹیل میدان کردیں گے۔

تفسیر وتشریح

سورہ کی فضیلت اور فضیلت کا مطلب

یہ سورۂ کہف شروع ہوئی، یہ بھی مکی سورت ہے اور ان سورتوں میں سے ہے جن کی رسول اللہ ﷺ نے خاص اہمیت اور فضیلت بیان فرمائی ہے۔ میں نے اسی سلسلۂ درس میں

بار بار عرض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اور فرمان ہونے کی حیثیت سے ہر سورت اور ہر آیت کو یکساں اہمیت اور فضیلت ہے اور سب پر ایمان لانا فرض ہے، کسی ایک آیت کا انکار بھی کفر ہے۔ اس کے باوجود بعض سورتوں اور آیتوں کی خود رسول اللہ ﷺ نے خاص فضیلتیں بیان فرمائی ہیں، مثلاً الحمد شریف، اور قل ھو اللہ، قل یا ایھا الکٰفرون، اور سورۂ بقرہ اور آل عمران اور سورۂ ملک وغیرہ سورتوں کے حضورؐ نے خاص خاص فضائل بیان فرمائے ہیں، اسی طرح آیتوں میں آیۃ الکرسی اور سورۂ بقرہ اور آل عمران کی آخری آیتوں کی خاص فضیلتیں اور برکتیں حدیثوں میں وارد ہوئی ہیں۔ ان خاص فضائل اور برکات کا تعلق میرے نزدیک معانی اور مضامین سے ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اس سورۂ کہف کے بھی حضور ﷺ نے خاص فضائل اور برکات بیان فرمائے ہیں۔ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جو شخص شروع سورۂ کہف کی دس آیتیں پڑھے گا وہ دجّال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ (۱) اس پڑھنے سے مراد غالباً یہ ہوگا کہ ان آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس پر دل سے یقین کر کے ان کی تلاوت کو اپنا معمول بنا لیا جائے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جو کوئی جمعہ کو سورۂ کہف پڑھے گا وہ اگلے جمعہ تک ہر فتنہ سے محفوظ رہے گا (۲)۔ ایک اور حدیث کا مضمون ہے کہ جو کوئی سورۂ کہف پڑھے گا اس کے لئے ایک خاص نور پیدا ہوگا جو قیامت کے دن بھی اس کے لئے روشنی فراہم کرے گا۔ (۳)

اس طرح کے بعض اور فضائل بھی اس سورت کے حدیثوں میں وارد ہوئے ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ان فضائل کا تعلق اس کے مضامین سے ہے۔ اس سورت میں ایسے حقائق اور واقعات خاص طور سے بیان ہوئے ہیں جن میں فتنوں سے حفاظت اور بچاؤ کے لئے بڑی رہنمائی اور بڑی روشنی ہے۔ دوسرے مضامین کے علاوہ اس سورت میں تین نہایت اہم اور بصیرت افروز واقعات بیان ہوئے ہیں جن کا ذکر قرآن میں کسی دوسری جگہ بالکل نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں بہت سے واقعات بار بار بھی بیان ہوئے ہیں، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے واقعات قرآن مجید میں

---

(۱) مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ (۲) ابن کثیر بحوالہ مختارہ از ضیاء المقدسی۔
(۳) ایضاً۔ بحوالہ بیہقی (مرتب)

بار بار اور جابجا بیان فرمائے گئے ہیں۔ اور بعض واقعات ایسے بھی ہیں جو نہایت اہم اور سبق آموز ہیں لیکن ان کا بیان قرآنِ پاک میں صرف ایک ہی جگہ کیا گیا ہے، مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ جس کو قرآن میں "أحسن القصص" فرمایا گیا ہے صرف ایک جگہ سورۂ یوسف میں بیان ہوا ہے، اسی طرح سورۂ کہف میں جو خاص تین واقعے بیان فرمائے گئے ہیں، یعنی اصحاب کہف کا واقعہ، حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا واقعہ اور ذوالقرنین کا واقعہ، ان کا ذکر قرآن مجید میں صرف اس سورۂ کہف میں کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں واقعوں میں فتنوں سے اور خاص کر دجالی فتنوں سے حفاظت کے لئے بڑی رہنمائی اور بڑی روشنی ہے۔

اللہ کی طرف سے اپنی حمد و تعریف

اس وقت میں نے اس سورت کی ابتدائی آٹھ آیتیں تلاوت کی ہیں۔ پہلی آیت ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا، قَیِّمًا" اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی حمد کی ہے اور اس احسان اور انعام پر کی ہے کہ اُس نے لوگوں کی ہدایت کے لئے اپنے خاص بندہ محمد ﷺ پر "الکتاب" نازل فرمائی، یعنی قرآن پاک نازل فرمایا۔

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ قرآن پاک کی زبان میں بلکہ تمام صحفِ سماویہ کی زبان میں "کتاب" آسمانی اور خداوندی ہدایت نامہ ہی کو کہتے ہیں، اسی لئے اہلِ کتاب کو "اہلِ کتاب" کہا جاتا ہے۔ یہاں "الکتاب" سے مراد قرآن مجید ہے۔ اگلی آسمانی کتابوں میں اس کی پیشینگوئی اسی عنوان سے کی گئی تھی۔ اس کا نازل فرمانا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے، اس پہلی آیت میں اسی احسان پر اللہ تعالیٰ نے اپنی حمد کی ہے۔

قرآن مجید کی بہت سی سورتیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حمد سے شروع ہوتی ہیں۔ سورۂ فاتحہ اور سورۂ انعام بھی اسی طرح "الحمد لِلّٰہ" سے شروع ہوئی تھیں۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہئے کہ ہماری اس دنیا میں یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا کہ کوئی خود اپنی تعریف کرے، اور بیشک کسی مخلوق کو ہرگز یہ زیبا نہیں کہ وہ اپنی کسی خوبی کی تعریف کرے، کیونکہ اگر کسی میں کوئی خوبی اور کمال یا حُسن و جمال ہے تو وہ خدا کا عطا کیا ہوا ہے، کسی کے پاس کوئی ذاتی خوبی اور کمال نہیں ہے، اس لئے کسی کے لئے ہرگز زیبا نہیں کہ وہ اپنی تعریف کرے، اگر

تعریف کی بھی جائے گی تو اس لحاظ سے کی جائے گی کہ اللہ نے اُس کو یہ کمال دیا ہے اور ایسا بنایا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے بالکل زیبا ہے کہ وہ اپنی حمد کرے اور بندوں کو اپنی حمد کرنے کا حکم دے، کیونکہ اس کی پاک ذات میں سارے کمالات اور ساری خوبیاں ہیں اور سب ذاتی ہیں، اور مخلوق پر اس کے بے انتہا احسانات ہیں، اور ان پر عظیم ترین احسان یہ ہے کہ بندوں کی ہدایت کے لئے اور اُن کو جنت تک پہونچانے کے لئے اُس نے رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں، اور رسول اللہ ﷺ پر قرآن نازل فرما کر اس عظیم نعمت کا بالکل ہی اِتمام فرما دیا۔ "وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ" واقعہ یہ ہے کہ اس نعمت سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے۔ ہمارا آپ کا ایمان ہے کہ دنیا اور اس کی ہر چیز فانی ہے، یہاں جو نعمتیں اور لذتیں ہیں وہ بھی چند روزہ ہیں، لیکن جنت اور اس کی نعمتیں اور لذتیں غیر فانی اور ابدی ہیں۔ اس لئے دنیا کی ساری نعمتیں مل کر بھی جنت کی ایک نعمت کے برابر نہیں، اسی لئے فرمایا گیا ہے۔ "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ" اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا مقام تو جنت سے بھی بلند ہے۔ "وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ" پس جو نعمت جنت تک اور اللہ کی رضا تک پہونچانے والی ہو اُس سے بڑی کوئی نعمت نہیں، اور اس کا حق ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد ہو، اور وہ قرآن پاک کا حضور پر نازل فرمانا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے لفظِ عبد کا راز

تو سورۂ کہف کی اس پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے اسی عظیم احسان پر اس کی حمد فرمائی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے لئے یہاں بھی "عَبْدِهٖ" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ میں اس سے پہلی سورت "بنی اسرائیل" کی پہلی آیت "سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ" کی تشریح میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ کسی بندہ کے لئے عبدیت کے مقام سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے (۱) اس لئے قرآن پاک میں جہاں جہاں رسول اللہ ﷺ پر کسی بڑے انعام کا ذکر فرمایا گیا ہے وہاں یہی لفظ "عبدہٖ" استعمال کیا گیا ہے، اس لفظ میں ایک خاص پیار بھی بھرا ہوا ہے جس کو اہلِ زبان اور اہلِ علم سمجھ سکتے ہیں۔

(۱) سورۂ بنی اسرائیل کی اس پہلی آیت کے درس میں اس نکتے کا بیان نہیں آیا ہے اور مرتب کو تعجب ہوا تھا کہ کیسے چھوٹ گیا۔ اب معلوم ہوا کہ اصل درس میں تو بیان ہوا تھا مگر اس کو جب قلمبند کیا گیا تو یہ بیان رہ گیا۔ (مرتب)

اسی آیت میں قرآن کی صفت میں فرمایا گیا ہے۔ "وَلَمْ یَجْعَلْ لَهٗ عِوَجاً" اس کے بعد فرمایا گیا ہے۔ "قَیِّماً"۔ "لَمْ یَجْعَلْ لَهٗ عِوَجاً" کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی طرح کی ذرا بھی کجی اور کسی قسم کا پیچ وخم نہیں ہے، اور "قَیِّماً" کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جو کچھ ہے سیدھی اور صاف بات ہے، حق ہے اور سچائی ہے۔ قرآن پاک کی یہ صفت دوسری آیتوں میں بھی بیان فرمائی گئی ہے، ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "قُرْآناً عَرَبِیّاً غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ" دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔ "اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ"۔

آگے کی دو تین آیتوں میں قرآن کے نزول کا خاص مقصد بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔ "لِیُنْذِرَ بَأْساً شَدِیْداً مِّنْ لَّدُنْهُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْراً حَسَناً، مَاکِثِیْنَ فِیْهِ اَبَداً"۔

مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ پر یہ کتاب (قرآن) نازل کرنے کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ وہ مجرموں اور نافرمانوں کو خدائے ذوالجلال کی طرف سے آنے والے شدید اور ہولناک عذاب سے خبردار کریں اور ڈرائیں اور ان ایمان والوں کو جو اعمالِ صالحہ کو اپنا معمول اور دستور العمل بنالیں، اُس "اجر حسن" (بہت ہی اچھے صلہ) کی یعنی رضائے الٰہی اور جنت کی خوشخبری دیں جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (ماکثین فیه ابداً)

"بأسٍ شدید" اور "اجرٍ حسن"

اس آیت میں خدا کی طرف سے آنے والے جس عذاب کو "بَأْسٍ شَدِیْد" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ظاہر یہی ہے کہ اُس سے دوزخ کا عذاب مراد ہے، وہی اس کا مستحق ہے کہ اس کو "بَأْسٍ شَدِیْد" کے لفظ سے تعبیر کیا جائے، پھر "مِنْ لَّدُنْهُ" کے لفظ نے اس میں اور بھی شدت اور ہولناکی پیدا کر دی ہے۔ اللّٰھم احفظنا۔

اسی طرح جس انعام اور ثواب کو "اجر حسن" کہا گیا ہے اُس سے مراد جنت اور اُس کی نعمتیں ہیں کیونکہ اسی کی صفت ہے۔ "مَاکِثِیْنَ فِیْهِ اَبَداً" (یعنی مؤمنین صالحین ہمیشہ ہمیشہ اُس میں رہیں گے) ہمارا ایمان ہے کہ دُنیا اور اُس کی ہر نعمت اور لذت فانی اور چند روزہ ہے۔ [illegible] عیش کو بے لطف

اور مکدر کر دیتا ہے۔ کسی فارسی شاعر نے کہا تھا۔

مرا در منزلِ جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم
جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "اَللّٰھُمَّ لَاعَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ" (اے اللہ عیش تو بس آخرت ہی کا عیش ہے) جو انشاء اللہ جنت میں حاصل ہوگا، قرآن پاک میں جنت اور جنتیوں کے بارہ میں جابجا فرمایا گیا ہے "خَالِدِیْنَ فِیْھَا اَبَداً" یہاں اس آیت میں فرمایا گیا ہے۔ "مَاکِثِیْنَ فِیْہِ اَبَداً" واقعہ یہ ہے کہ ابدیت کا پروانہ بجائے خود بہت بڑی نعمت ہے۔

اس سے آگے کی آیت میں اُن مجرمین کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو صاحبِ اولاد قرار دے کر اُس کی شان میں نہایت ناپاک گستاخی کی ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

"وَیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَداً، مَالَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِھِمْ کَبُرَتْ کَلِمَۃً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِباً"۔

اللہ کیلئے اولاد ٹھہرانے کا جرم

مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کے نازل کرنے کا ایک خاص مقصد یہ بھی ہے کہ بالخصوص اُن انتہائی گمراہ اور بد بخت لوگوں کو جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی شان میں یہ ناپاک گستاخی کی ہے کہ اس کو بیٹے بیٹیوں والا قرار دیا ہے خداوند ذوالجلال کے عذابِ شدید سے خبردار کرے اور ڈرائے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کو صاحبِ اولاد کہنا اور کسی کو اس کا بیٹا یا بیٹی بتانا اللہ پاک کی شان میں نہایت ناپاک گستاخی ہے اور بڑا ہی شدید جرم ہے اس لئے اس کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا۔ ہمارے مدرسوں کی زبان میں اس کو "تَخْصِیْص بَعْدَ التَّعْمِیْم" کہتے ہیں۔(۱) قرآن مجید کے اس طرز بیان سے معلوم ہوا کہ یہ نہایت ہی شدید جرم ہے۔ خود اس آیت میں بھی فرمایا گیا ہے۔ "کَبُرَتْ کَلِمَۃً" یعنی یہ بہت ہی سنگین مجرمانہ بات ہے۔ قران پاک میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔ "تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْہُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ

---

(۱) یعنی اللہ کی نازل کردہ کتاب کے مقابلے میں یوں تو کفر کا ہر رویہ سنگین جرم ہے لیکن اس کے لئے اولاد ٹھہرانے کا جرم اور بھی سنگین ہے۔ (مرتب)

اَلْجِبَالُ هَدًّاo اَنْ دَعَوْ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًاo" یعنی کسی کو خدا کی اولاد قرار دینا ایسی خبیث گستاخانہ بات ہے کہ آسمان پھٹ پڑے اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑوں میں زلزلہ آجائے اور وہ لرز کر گر جائیں۔

الغرض اس جرم کی شدت اور سنگینی کی وجہ سے اس کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے۔"مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ "مطلب یہ ہے کہ اس گمراہانہ عقیدہ کی کوئی سند ان لوگوں کے پاس نہیں ہے اور ان کے باپ دادوں کے پاس بھی نہیں تھی یہ بالکل من گڑھت اور سراسر جھوٹ ہے (اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا)۔

قرآن مجید سے ایسے تین گروہوں کا پتہ چلتا ہے جو خدا کے لئے اولاد مانتے تھے، ایک نصاریٰ جو حضرت مسیح علیہ السلام کو "ابن اللہ" کہتے تھے، دوسرے یہودیوں کا کوئی فرقہ تھا جو حضرت عزیر علیہ السلام کو "ابن اللہ" مانتا تھا، اور عرب مشرکین فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اس آیت کا تعلق ان سب ہی سے ہے۔ لیکن اس گمراہی کے سب سے بڑے علمبردار عیسائی رہے ہیں۔

آگے کی چھٹی آیت ہے۔"فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا"۔

رسول اللہؐ کی شانِ خیر خواہی

نحو کی کتابوں میں ہم نے یہی پڑھا تھا کہ "لَعَلَّ"، ترجّی کا کلمہ ہے، یعنی کسی چیز کی امید کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور یہ معنی اس آیت میں بنتے نہیں اس لئے اس میں طرح طرح کی توجیہیں کی جاتی ہیں، لیکن عربیت کے بعض ماہرین نے لکھا ہے کہ "لَعَلَّ" استفہام کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، تو اگر اس آیت میں استفہام انکاری کے معنی میں لے لیا جائے تو کسی تکلف اور توجیہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میرے نزدیک یہی راجح ہے۔ اور اس بناء پر آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر کیا تو ان لوگوں کے پیچھے جو کفر و شرک سے نکل کر ایمان کی طرف نہیں آتے اور ہدایت کو قبول نہیں کرتے، اپنی جان کو غم میں ہلاک کر ڈالو گے؟ یعنی تمہاری ذمہ داری بس یہ ہے کہ ان کو حق کی اور ایمان و توحید کی دعوت دو اور اچھی طرح سمجھانے

کی کوشش کرو، لیکن اگر یہ تمہاری مخلصانہ تبلیغ و دعوت کے بعد بھی کفر و شرک پر جمے رہیں اور ایمان نہ لائیں تو ان کا غم نہ کھاؤ اور اس کے لئے اپنی جان نہ گھلاؤ۔

رسول اللہ ﷺ کا حال یہ تھا کہ مشرکین مکہ آپ کے انتہائی دشمن اور گویا خون کے پیاسے تھے، ہر طرح کی اذیتیں دیتے تھے لیکن آپ کے دل کی انتہائی چاہت یہ تھی کہ ان کو بھی ایمان کی دولت نصیب ہو جائے اور یہ بھی جنتی اور خدا کے محبوب بندے بن جائیں، اور ان کے نہ ماننے کا آپ کو ایسا رنج و غم تھا جیسا کہ کسی کو اپنی اولاد کی مفارقت کا ہو، یہ رنج و صدمہ آپ کو گھلائے دیتا تھا، اسی بارے میں فرمایا گیا ہے، کہ کیا آپ اس غم میں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے؟۔ "فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفاً" قرآن پاک میں یہ بات الفاظ مختلف میں بار بار فرمائی گئی ہے، "کہیں فرمایا "لَاتَحْزَنْ عَلَيْهِمْ" کہیں فرمایا "لَاتَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ" مطلب یہی ہے کہ آپ اپنی جان پر اس رنج اور صدمہ کا بوجھ نہ ڈالیں اور صدمہ سے خون خشک نہ کریں، آپ کا کام بس دعوت دینا ہے، ہدایت ملنے نہ ملنے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، آپ نے دعوت و خیر خواہی کا حق ادا کر دیا، آپ کامیاب ہیں، انہوں نے قبول نہیں کیا یہ ان کی محرومی ہے۔

اس کے آگے جو دو آیتیں ہیں اُن کا مطلب یہ ہے کہ اس دُنیا کو اللہ تعالیٰ نے امتحان اور آزمائش کی جگہ بنایا ہے اور جب امتحان و آزمائش کا یہ کام پورا ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو بالکل نیست و نابود کر دے گا۔

یہ بالکل اُصولی اور بنیادی بات فرمائی گئی ہے، اگر یہ بات سامنے رہے کہ یہ دُنیا اور یہاں کی ساری بہاریں بس چند روزہ ہیں اور یہاں کی زندگی ایک امتحان اور آزمائش ہے تو آدمی میں کبھی غفلت اور سرکشی نہ آئے اور بس خدا کی رضا اور آخرت کی فلاح نصب العین کے طور پر ہمیشہ اُس کے پیش نظر رہے۔ اللہ تعالیٰ یہ چیز ہم سب کو نصیب فرمائے، اگر یہ ہے تو سب کچھ ہے، اور اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں، بس محرومی ہی محرومی ہے، اللہ محروم نہ فرمائے۔

اس کے آگے اصحابِ کہف کے واقعہ کا بیان ہے جو اللہ کے بندوں کے لئے بہترین نمونہ اور مثال ہے

(درس-۱۹)

اصحابِ کہف کا واقعہ، ایک مثالی نمونہ

طوفانی فتنوں کے دور میں دین وایمان کی حفاظت کیلئے ایک راستہ

دین کے راستہ میں قربانی کرنیوالوں کی کس کس طرح مدد کی جاتی ہے

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم ط

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْکَهْفِ وَالرَّقِیْمِ کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا
عَجَبًاo اِذْ اَوَی الْفِتْیَةُ اِلَی الْکَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ
رَحْمَةً وَّهَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًاo فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ فِی
الْکَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًاo ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی
لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًاo نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ۔ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ
اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًیo وَرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا
فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا
لَقَدْ قُلْنَا اِذًا شَطَطًاo هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً۔ لَوْلَا
یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَیِّنٍ۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ
کَذِبًاo وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَی الْکَهْفِ

يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ اَمْرِكُمْ مِرْفَقًا ٥
وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ
وَاِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ۔ ذٰلِكَ
مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ۔ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَالْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ
تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ٥ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ وَّنُقَلِّبُهُمْ
ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ۔ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ
بِالْوَصِيْدِ۔ لَوِاطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ
مِنْهُمْ رُعْبًا ٥ (سورة الكهف ۹ تا ۱۸)

(ترجمہ) کیا تم خیال کرتے ہو کہ کہف اور رقیم والے ہمارے عجائبات قدرت میں سے بہت عجیب چیز تھے، جب اُن (حق پرست) نوجوانوں نے (جو بعد میں اصحابِ کہف کے نام سے معروف ہوئے) کہف (یعنی پہاڑ کی ایک کھوہ) میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا تو دُعا کی، اے ہمارے پروردگار ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما اور ہمارے اس معاملہ میں فلاح اور ہدایت یابی کا سامان فراہم کردے، تو ہم نے سالہا سال تک اُن کے کانوں پر (نیند کا) پردہ ڈال دیا (یعنی بہت طویل مدت تک کے لئے اُن پر خارقِ عادت قسم کی ایک خاص نیند طاری کردی) پھر ہم نے (مدت دراز کے بعد) اُن کو اُٹھایا تاکہ ہم جان لیں کہ دونوں گروہوں میں سے کس نے غار میں رہنے کی مدت کو زیادہ صحیح یاد رکھا۔

ہم ان کا واقعہ (اب کسی قدر تفصیل سے) تم سے ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے اُن کی ہدایت میں اور ترقی کردی تھی، اور اُن کے دلوں کو (یقین بھر کے) خوب مضبوط کردیا تھا۔ جب وہ (ایمانی عزم کے ساتھ) کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے، ہم اُس کے سوا کسی کو معبود بنا کر ہرگز نہیں پکاریں گے، (اگر ہم ایسا کریں) تو ہم بڑی بُری اور ظالمانہ بات کریں گے۔ یہ ہماری قوم والے ہیں، انہوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنا لیے [illegible] کوئی روشن دلیل کیوں پیش نہیں

کرتے، پس اُس سے زیادہ ظالم (اور غضب ڈھانے والا) کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ بہتان باندھے (کہ اس کا کوئی شریک ہے)۔

اور (ان جوانوں نے باہم یہ بھی کہا کہ) جب تم نے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے اپنی قوم والوں سے اور اُن کے معبودانِ (باطل) سے جن کی وہ خدا کے سوا عبادت و پرستش کرتے ہیں، تو چلو (فلاں پہاڑ کی) کھوہ میں پناہ گزیں ہو جاؤ (یقین ہے) تمہارا پروردگار تم پر اپنی رحمت (کی چادر) پھیلا دے گا، اور تمہارے معاملے میں آرام اور سہولت کا سامان فراہم کردے گا۔

(پھر خدا نے اُن کے ساتھ اپنی خاص رحمت وعنایت کا یہ بھی معاملہ کیا کہ) تم دیکھو گے کہ جب دھوپ نکلتی ہے تو اُن کے اُس کہف کے داہنی جانب سے کترا کے نکل جاتی ہے، اور جب ڈوبنے کے لئے ڈھلنے لگتی ہے تو اُن کو بائیں جانب سے کاٹ کر نکل جاتی ہے، اور وہ اُس کہف میں خوب کشادہ جگہ میں ہیں، یہ قدرتِ خداوندی کے خاص معجزوں میں سے ہے۔ اللہ جس کو نورِ ہدایت سے نوازے وہی راہ یاب ہوتا ہے اور جس (بدبخت) کے لئے وہ بے راہی اور گمراہی کا فیصلہ کرے تو تم اس کے لئے کوئی کارساز اور راستہ پر لگانے والا رہنما نہیں پاؤ گے، اور تم (ان کو دیکھو تو) گمان کرو گے کہ وہ بیدار اور جاگے ہوئے ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں اور اُن کا کتا اپنے اگلے دونوں پاؤں پھیلائے کہف کے دروازے پر بیٹھا ہے، اگر تم اُن کو جھانک کے دیکھو تو اُن کی دہشت سے اُلٹے پاؤں بھاگو اور تمہارے اندر ان کا رعب اور ہیبت بھر جائے۔

تفسیر وتشریح

شانِ نزول

ان آیتوں میں اصحابِ کہف کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اکثر مفسرین نے ان آیتوں کے بلکہ اس سورۂ کہف کے شانِ نزول میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، پہلے اس کو بیان کردوں۔

یہ تو معلوم ہے کہ مکہ کے بڑے لوگ عام طور سے رسول اللہ ﷺ کے اور آپ کی دعوت کے مخالف اور سخت مخالف تھے، آپ کی دعوت کے راستے میں ہر طرح کی رکاوٹیں پیدا

کرتے تھے، اس سلسلہ میں انہوں نے ایک حرکت یہ بھی کی کہ باہم مشورہ سے ایک وفد مدینہ کے علمائے یہود کے پاس بھیجا کہ وہ اہلِ کتاب ہیں اور اُن کے پاس وہ علم ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ کچھ ایسے مشکل سوالات بتادیں جن کے ذریعہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا امتحان کریں، مکہ کے اس وفد نے علماء یہود کو یہ ضرور بتلا دیا ہوگا کہ وہ اُمی ہیں، پڑھے لکھے کچھ نہیں ہیں۔ اس لئے انہوں نے ایسے تین سوال بتلا دئے جن کا جواب وہی آدمی دے سکتا ہے جو نبی اور صاحبِ وحی ہو یا اس نے آسمانی کتابوں سے علم حاصل کیا ہو۔ ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ اصحابِ کہف ورقیم کا قصہ کیا ہے؟۔ دوسرا یہ کہ وہ کون شخص تھا جس نے مشرق ومغرب کا ایک عجیب سفر کیا تھا، اور اس سفر میں بعض محیر العقول کارنامے انجام دئے تھے؟۔ تیسرا سوال یہ تھا کہ روح کی حقیقت کیا ہے؟۔ روایات میں یہ بھی ہے کہ ان علماء یہود نے مشرکینِ مکہ کے نمائندوں کو ان تینوں سوالوں کا جواب بتلا بھی دیا تھا، اور ان سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ یہی جواب دیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ سچے نبی اور صاحبِ وحی ہیں، اور اگر اس کے خلاف بتلائیں تو پھر وہ نبوت کے دعوے میں جھوٹے اور مُفتری ہیں۔ چنانچہ قریش کے منتخب سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور وہ سوالات آپ کے سامنے رکھے، آپ نے فرمایا کہ میں کل ان کا جواب دے سکوں گا۔ آپ کو اطمینان تھا کہ اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ آپ کو جواب بتلا دیا جائے گا۔ اس جگہ روایات میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے، (اور قرآن مجید سے اس کی ایک گونہ توثیق ہوتی ہے) کہ آپ نے کل جواب دینے کا جو وعدہ فرمایا تھا اُس کے ساتھ آپ نے ''انشاء اللہ'' نہیں کہا، غالباً آپ بھول گئے، لیکن چونکہ آپ کا مقام بہت بلند ہے اور مقربین کی معمولی لغزشوں پر بھی گرفت ہوجاتی ہے، عارفوں کا مشہور مقولہ ہے ''قریباں را بیش بود حیرانی'' اور کسی کا مصرع ہے۔ ''جن کے رُتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے''۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ذرا سی لغزش پر عتاب ہوگیا، پندرہ دن تک وحی نہیں آئی اور آپ اُن لوگوں کے سوالوں کا جواب نہیں دے سکے، اور یہی فرماتے رہے کہ جب میرے اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ مجھے بتلایا جائے گا جب ہی بتلا سکوں گا۔ اس پر مخالفین نے خوب بغلیں بجائیں، اور ظاہر ہے کہ آپ کو اس بات کا صدمہ اور دُکھ بھی ہوا ہوگا، کہ یہ لوگ اب اپنے کفر میں اور پکے ہوجائیں گے۔ ۱۵ دن کے بعد حضرت جبرئیلؑ یہ سورۂ کہف لے کر نازل ہوئے، جس میں دوسرے اہم مضامین کے علاوہ

اصحابِ کہف اور ذوالقرنین کے واقعے بھی بیان فرمائے گئے ہیں، جن کے بارے میں سوال کیا گیا تھا، اور رُوح کے بارے میں جو سوال تھا اُس کے جواب میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا" نازل ہوئی جو درس میں گذر چکی ہے، اور اس کے بارے میں مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا وہ میں عرض کر چکا ہوں۔(۱)

اصحابِ کہف کا واقعہ روایات میں

سورۂ کہف کی جو آیتیں اس وقت میں نے تلاوت کی ہیں اُن میں اصحابِ کہف کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کو اس طرح بیان نہیں کیا ہے جس طرح مورخین اور وقائع نگار بیان کیا کرتے ہیں، میں نے اسی سلسلۂ درس میں بار بار عرض کیا ہے کہ قرآن پاک تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ کتابِ ہدایت ہے، اس میں جو بھی واقعات اور قصص بیان فرمائے گئے ہیں ہدایت ہی کے نقطۂ نظر سے بیان ہوئے ہیں۔ اس لئے قرآن پاک میں اُن تفصیلات کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے جن کا ہدایت کے مقصد سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ یہی اصحابِ کہف کا واقعہ ہے، اس کے بارے میں یہ بھی بیان نہیں فرمایا گیا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے، کس شہر یا علاقہ کا واقعہ ہے۔ بس اتنا ہی بیان فرما دیا گیا جتنے کا بیان کرنا ہدایت اور سبق آموزی کے مقصد سے مفید ہوسکتا ہے۔

پہلی ۳۔۴ آیتوں میں واقعہ کا اجمالی بیان ہے، اس کے بعد کی آیتوں میں کسی قدر تفصیل ہے۔ آیتوں کی تشریح سے پہلے اصحابِ کہف کا وہ واقعہ بھی سُن لیجئے، جو روایات میں ذکر کیا گیا ہے۔

اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کچھ بعد کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ اور ان اصحابِ کہف کو حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت پہونچی تھی اور یہ اس پر ایمان لے آئے تھے (۲) اور ان کی قوم اور علاقے کے لوگ مشرک اور بُت پرست تھے، اور ان کا بادشاہ یا راجہ بڑا ہی کٹر اور سخت قسم کا بُت پرست تھا، اور جس کے متعلق معلوم ہو جاتا کہ یہ آدمی بُت پرستی کا منکر اور موحّد ہے وہ اس کو قتل کرا دیتا تھا۔ ان لوگوں کا کوئی قومی اور مذہبی سالانہ میلہ بھی ہوتا تھا

---

(۱) افسوس ہے کہ وہ درس دستیاب نہیں ہوا، اس لئے وہ اس مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ (مرتب)

(۲) ابن کثیر نے اس سے اختلاف کیا ہے، ان کی رائے یہ ہے کہ یہ واقعہ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے کا ہے۔ ۱۲

جس طرح ہمارے ملک کے بُت پرستوں کے بڑے بڑے میلے اجودھیا اور ہردوار اور کاشی وغیرہ میں ہوتے ہیں، اس میلہ میں بتوں کی پوجا ہوتی تھی، چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے اور اس طرح کے مشرکانہ رسوم اور مظاہرے کئے جاتے تھے۔ تو ایک دفعہ یہ میلہ ہو رہا تھا کہ چند نوجوانوں کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ اس شرک و بُت پرستی کے منکر اور ”وہابی“ ہو گئے ہیں اور وہ ہماری پوجا پاٹ سے الگ رہتے ہیں۔ (ہو سکتا ہے کہ ان کو عیسیٰ علیہ السلام یا کسی دوسرے پیغمبر کی دعوت توحید کسی ذریعہ سے پہنچی ہو، یا اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نورِ توحید ڈال دیا ہو) تو جب ان نوجوانوں کے بارے میں یہ چرچا ہوا اور بادشاہ تک خبر پہونچی تو اس نے ان کو پکڑوا بلایا اور اُن سے پوچھا کہ تمہاری یہ کیا حرکت ہے؟ اللہ نے انہیں توفیق دی انہوں نے ایمانی جرأت سے کہا، ہاں ہمارا تو ایمان اور عقیدہ یہی ہے کہ عبادت اور پوجا کے قابل وہی اللہ ہے جو زمین و آسمان اور سب مخلوقات کا خالق اور پروردگار ہے، اُس کے سوا جو معبود لوگوں نے بنا لئے ہیں ہمیں ان کی عبادت سے انکار ہے۔ روایات میں ہے کہ یہ نوجوان قوم کے اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور بہت ممتاز اور ہونہار تھے، غالباً انہی وجوہ سے بادشاہ نے فوراً ان کے قتل کا حکم نہیں دیا بلکہ ان کو مہلت دی تاکہ یہ اپنے معاملے پر غور کریں، اور اگر زندہ رہنا چاہیں تو اپنے اس نئے مذہب سے توبہ کریں، اور اگر ایسا نہ کریں تو پھر سنگسار کر کے ختم کر دیئے جائیں۔ ان نوجوانوں نے باہم مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ اس وقت فتنہ سے بچنے کے لئے اور عقیدۂ توحید پر قائم رہنے کے لئے ہمارے واسطے یہ بہتر ہوگا کہ کچھ دنوں کے لئے روپوش ہو جائیں اور پہاڑ کے کسی غار اور کھوہ میں پناہ گزیں ہو جائیں، ہمارا اللہ اپنی قدرت اور رحمت سے ہمارے لئے کوئی راہ نکالے گا۔ چنانچہ وہ ایک وسیع غار میں چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ساتھ رحمت کا یہ خاص الخاص معاملہ کیا کہ ان پر ایسی نیند طاری کر دی کہ وہ سیکڑوں سال تک سوتے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو بیدار کیا، اور پھر عجیب و غریب طریقہ سے ان کا راز کھلا۔

اصحابِ کہف قرآن میں

اب اس سلسلہ میں قرآن مجید میں جو کچھ بیان فرمایا گیا ہے اس کو سنئے اور اُس پر غور کیجئے!

ارشاد فرمایا گیا ہے ”اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا

مِنْ آیٰتِنَا عَجَباً"۔

"کہف" پہاڑوں میں واقع ایسے غار کو کہتے ہیں جو اندر سے بہت کشادہ اور وسیع ہو۔ "رقیم" کا مطلب متعین کرنے میں مفسرین کی رائیں مختلف ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ رقیم مرقوم کے معنی میں ہے، یعنی لکھی ہوئی چیز، ان حضرات کا خیال ہے کہ اصحابِ کہف کے نام ایک کتبے میں لکھے ہوئے تھے، رقیم سے مراد وہی کتبہ ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ رقیم اُس پہاڑ کا نام ہے جس میں وہ کہف واقع تھا، تیسری رائے یہ ہے کہ رقیم اُس شہر کا نام ہے جس کے قریب وہ کہف تھا۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ تورات سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ "رقیم" شہر کا نام ہے، میں نے خود تورات میں اس کو نہیں دیکھا لیکن اگر ایسا ہے تو پھر یہی قول زیادہ راجح ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ "اصحابِ کہف ورقیم" کا واقعہ ہمارے عجائباتِ قدرت میں سے بہت ہی عجیب تھا۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ ان کا واقعہ خارقِ عادت اور عجیب نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آدمی غور کرے تو اس کو خود اپنے اندر اور باہر کی دنیا میں بھی قدم قدم پر ہماری قدرت کے اس سے بھی بڑے عجائبات نظر آئیں گے۔

آدمی اپنی آنکھ کے بارے میں غور کرے، زبان اور کانوں کے بارے میں غور کرے، اپنی روح اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل وفہم کے بارے میں غور کرے تو اسے نظر آئے گا کہ ان میں کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عجیب نشانی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا جو بالکل اُمّی (بے پڑھے لکھے) تھے قرآن پاک جیسی کتابِ ہدایت پیش کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عجیب ترین نشانی ہے۔ پس یہ خیال کرنا کہ اصحابِ کہف ہی کا واقعہ بہت عجیب اور غیر معمولی ہے ایک عامیانہ بات ہے، اس کا واقعہ آگے فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

"اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَہْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً وَّھَیِّیْٔ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَداً"۔

مطلب یہ ہے کہ جب ان حق پرست نوجوانوں نے کہف میں پناہ گزیں ہونے کا فیصلہ اور ارادہ کر لیا تو سب سے پہلے اللہ سے یہ دُعا کی کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنی طرف سے رحمت عطا فرما، ہم نے بُت پرستی کا راستہ چھوڑ کے صرف تیری عبادت کا راستہ جو اختیار کیا ہے، اور اب تیرے بھروسہ پر پہاڑ کی ایک کھوہ میں پناہ لینے کا جو فیصلہ کیا ہے تو اُس میں

ہمارے لئے فلاح اور ہدایت کا سامان فراہم کردے۔ یہ دُعا "رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا" بڑی ہی عارفانہ دُعا ہے۔ "رَبَّنَا" کے لفظ میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ ہم تجھ کو ہی اپنا پروردگار اور کارساز یقین کرتے ہیں اس لئے اپنی حاجت اور اپنے مسئلے کو تیرے ہی سامنے رکھتے ہیں، پھر سب سے پہلی چیز "رَحْمَة" مانگی، اس میں سب کچھ آ گیا ہے، حفاظت بھی آ گئی، روزی بھی آ گئی، اور زندگی کے بلکہ راحت و آسائش کے بھی سارے سامان آ گئے،۔اس کے بعد "رُشد" کی استدعا کی گئی ہے یعنی ہر معاملہ اور ہر حقیقت کو ٹھیک سمجھنے اور ٹھیک فیصلہ کرنے کی توفیق اور اُس پر استقامت۔فی الحقیقت بڑی ہی عارفانہ اور بڑی جامع دُعا ہے، یہ ان نوجوانوں پر خدا کی طرف سے الہام ہوئی ہوگی۔اصحاب کہف کے قصہ کے ضمن میں یہ نہایت ہی جامع اور مبارک دُعا ہم کو تلقین فرمائی گئی ہے، مشکلات اور فتنوں کے زمانہ کے لئے یہ بہت ہی مبارک دُعا ہے۔ "رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا"۔

بظاہر یہ نوجوان پارٹی تھی

اس آیت کے لفظ "فِتْيَة" سے ایک اشارہ یہ بھی ملتا ہے کہ دعوتِ حق کو قبول کرنے والے عام طور سے نئے خون والے جوان ہوتے ہیں، قوم کے بڑے بوڑھے اپنے پرانے راستے سے ہٹنے کے لئے اکثر تیار نہیں ہوا کرتے۔چنانچہ قریش اور مکہ کے اکثر بوڑھے سردار بھی حضور ﷺ کے مخالف اور دشمن تھے، دوسرا اشارہ اس آیت سے یہ بھی ملا کہ جب بندہ کسی اہم اقدام کا ارادہ کرے تو سب سے پہلے خدا کو اپنا کارساز یقین کر کے اُس سے دُعا کرے اور رحمت اور مدد مانگے۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا"۔ "ضرب علی الآذان" کا مطلب ہے ایسی گہری نیند طاری کر دینا جس کے بعد کسی قسم کی کوئی آواز کانوں تک نہ پہونچے۔اس کو نیند اور موت کے درمیان کی ایک کیفیت سمجھنا چاہئے۔مطلب یہ ہے کہ جب وہ ہم پر بھروسہ کر کے اور ہم سے رحمت اور رُشد کی دُعا کر کے کہف میں پناہ گزیں ہوئے تو ہم نے ان کو اپنی خاص الخاص رحمت سے اس طرح نوازا

کہ اُن پر ایسی خارقِ عادت نیند اپنی قدرت سے طاری کردی جس کے نتیجہ میں وہ مدتِ دراز تک بس سوتے ہی رہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاصہ کی چادر اُڑھا کر ان کو سُلا دیا (آگے آنے والی ایک آیت سے معلوم ہوگا کہ یہ لوگ تین سو سال تک بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ مدت تک سوتے رہے)۔

"ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصىٰ لِمَا لَبِثُوْا أَمَداً" (پھر ہم نے انہیں بیدار کردیا تاکہ ہم جان لیں کہ دونوں گروہوں میں سے کس گروہ نے کہف میں رہنے کی مدت کو زیادہ صحیح یاد رکھا) آگے اس کا ذکر آرہا ہے کہ جب یہ لوگ اس نیند سے بیدار ہوئے تو ان میں باہم اس بارے میں گفتگو ہوئی کہ ہم لوگ کتنا سوئے؟ بعض لوگوں نے کہا کہ ایک دن یا کچھ کم سوئے ہوں گے، دوسرے بعض لوگوں نے کہا کہ اللہ ہی کو علم ہے کہ ہم کتنی مدت سوئے۔ بظاہر اس دوسرے فریق کا مطلب یہ تھا کہ ہم بہت لمبے سوئے ہیں اور بس اللہ ہی کو خبر ہے کہ کتنی مدت سو لئے۔ "حِزْبَیْنِ" سے بظاہر یہی دو فریق مراد ہیں۔ اور لِنَعْلَمَ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پہلے سے معلوم نہیں تھی، اب ان لوگوں کے بیدار ہونے کے بعد معلوم ہوگئی۔ یہ دراصل قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے۔ آپ حضرات کو شاید اس طرح سمجھنا آسان ہوگا کہ دُنیا کے ہر واقعہ کا اللہ تعالیٰ کو ایک تو ازل سے علم ہے اور ایک جب وہ واقعہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو علم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہوگیا۔ مثلاً میری پیدائش کا اللہ تعالیٰ کو ازل سے علم تھا، پھر جب میں اس کے حکم سے پیدا ہوگیا اور عالمِ وجود میں آیا تو اللہ تعالیٰ کو یہ علم ہوگیا کہ میں وجود میں آ گیا۔ تو "لِنَعلَمَ" سے یہی دوسرا علم مراد ہے، علماء اس کو "علم ظہور" سے تعبیر کرتے ہیں۔

اصحابِ کہف کا مختصر اجمالی بیان ان تین آیتوں پر ختم ہوگیا، اس سے آگے کی آیتوں میں کسی قدر تفصیل بیان ہے۔ قرآن پاک میں بکثرت ایسا ہے کہ ایک بات پہلے اختصار اور اجمال کے ساتھ بیان کی جاتی ہے، اس کے بعد اس کو تفصیل سے بیان فرمایا جاتا ہے۔ اور موعظت اور تذکیر کے لئے یہ اسلوب زیادہ مفید ہوتا ہے۔

نوٹ! افسوس ہے کہ سورۂ کہف میں ان صفحات کے علاوہ کچھ اور دستیاب نہیں ہے۔ (مرتب)

سورۃ طٰہٰ

درس ۲۰—۲۱

(درس-۲۰)

قرآن مجید کس لئے نازل فرمایا گیا ہے؟ وہ کس پاک ذات اعلیٰ صفات کا نازل فرمایا ہوا ہے

موسیٰ علیہ السلام کے منصب نبوت پر فائز کئے جانے کا عجیب وغریب واقعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم ط

طٰہٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی ۝ اِلَّا تَذْکِرَۃً لِّمَنْ یَّخْشٰی ۝ تَنْزِیْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی ۝ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ۝ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَہُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی ۝ وَاِنْ تَجْہَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّہٗ یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی ۝ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ط لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۝ وَہَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ مُوْسٰی ۝ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَہْلِہِ امْکُثُوْٓا اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ اٰتِیْکُمْ مِّنْہَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَی النَّارِ ہُدًی ۝ (طٰہٰ ۱ تا ۱۰)

(ترجمہ) طٰہٰ (اے ہمارے پیغمبر!) ہم نے قرآن تم پر اس لئے نازل نہیں کیا ہے کہ تم رنج اور دکھ اُٹھاؤ بلکہ ایسے لوگوں کی نصیحت کے لئے نازل کیا ہے جو ڈرتے ہیں (خدا سے اور بداعمالیوں کے بُرے انجام سے) یہ اُس ہستی کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ جس نے زمین کو اور بلند آسمانوں کو پیدا فرمایا، وہ بڑی رحمت والا عرش پر متمکن ہے، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور جو اُن کے درمیان ہے اور جو تحت الثریٰ میں ہے سب اُسی کا اور صرف اُسی کا ہے، اور اس کے وسیع ومحیط علم کی یہ شان ہے کہ (اگر تم پکار کر بات کرو تو وہ اس کو تو سنتا اور جانتا ہی ہے، اس کے علاوہ) بالکل چپکے سے کی ہوئی بات کو بھی وہ جانتا ہے

اوران چیزوں کو بھی جانتا ہے جو اس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہوں، اُس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔اُسی کے لئے سارے "اسمائے حسنیٰ" (اچھے نام اور اچھی صفات) ہیں۔

اور (اے پیغمبر!) موسیٰ کا واقعہ تم نے سُنا! جب (مدین سے آتے ہوئے رات کے وقت) انھیں آگ (اور اس کی روشنی) نظر آئی تو اپنی اہل خانہ سے کہا تم یہاں ٹھہرو مجھے آگ دکھائی دی ہے (میں اُس طرف جاتا ہوں) امید ہے کہ تمہارے لئے اس آگ میں سے (ایک شعلہ یا انگارہ) لے آؤں، یا وہاں سے راستہ کا پتہ پالوں۔

تفسیر وتشریح

یہ سورۂ طٰہٰ بھی مکی سورتوں میں سے ہے، اس کا آغاز کلمۂ طٰہٰ سے ہوا ہے ظاہر یہی ہے کہ "الٓمٓ" اور "الٓمر" وغیرہ کی طرح یہ "طٰہٰ" بھی حروف مقطعات میں سے ہے، جن کی مراد اور معنےٰ ہمیں معلوم نہیں، ان کے بارے میں بار بار تفصیل سے کہا جاچکا ہے۔لیکن ایک قول اس کلمہ طٰہٰ کے بارے میں یہ بھی ہے کہ عرب کے بعض قبائل کی زبان اور بول چال میں طٰہٰ کے معنیٰ ہیں "یارجُل"، یعنی اے مخاطب شخص! اور بعض مفسرین نے بعض قبائل کے حوالہ سے اس کے معنی "یا حبیبی" بھی نقل کئے ہیں یعنی اے حبیب، اے میرے پیارے۔پس اگر اس قول کو لیا جائے تو پھر طٰہٰ حروف مقطعات میں سے نہ ہوگا بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اے پیغمبر! یا اے حبیب!

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے: "مَآ أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ، إِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ" اس کا صحیح مطلب ومقصد سمجھنے کے لئے اس صورت حال کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کی قوم اور آپ کے وطن کے لوگوں کی غالب اکثریت اللہ تعالیٰ کی اُس ہدایت سے روگرداں اور منکر ومکذب تھی جو قرآن پاک کی شکل میں نازل ہورہی تھی، اس کا آپ کو بے حد غم اور دُکھ تھا، قرآن پاک میں جا بجا مختلف عبارات میں اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔اور رسول اللہ ﷺ کو تسلی وتشفی دی گئی ہے کہ آپ انکار وتکذیب کے ان کے رویہ سے رنجیدہ نہ ہوں، آپ نے پیغام پہونچادیا ہے تو آپ کامیاب ہوگئے، انھوں نے نہیں مانا تو یہ اس کا بُرا انجام

دیکھیں گے۔ سورہ طٰہٰ کی اس پہلی آیت میں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ اے ہمارے پیغمبر! قرآن ہم نے اس لئے نازل نہیں کیا ہے کہ آپ دُکھ اٹھائیں اور آپ کا دل غم کے بوجھ سے بھاری ہو وہ تو اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ جن بندوں کے دلوں میں خدا کا خوف اور انجام کی فکر ہو وہ نصیحت حاصل کریں۔ تو جب ایسے بندے اس سے نصیحت حاصل کر رہے ہیں جن کے دلوں میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر ہے (جیسے ابوبکرؓ وغیرہ جو ایمان لا چکے ہیں اور ایمان لا رہے ہیں) تو آپ کو خوش ہونا چاہئے کہ نزول قرآن کا مقصد پورا ہو رہا ہے اور آپ کے ذریعہ اور قرآن کے ذریعہ لوگ ہدایت یاب ہو رہے ہیں۔

آگے کی آیتوں میں یہ بتلا کر کہ کس ذات پاک کا قرآن نازل فرمایا ہوا ہے اور اس کی کیا شان اور کیا صفات ہیں، قرآن مجید کی عظمت بیان فرمائی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے:

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى، اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى، لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى.

مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن اس پاک ذات کا نازل فرمایا ہوا ہے جو اس وسیع وعریض زمین کا اور ان نہایت بلند آسمانوں کا خالق ہے، وہ بے انتہا رحمت والا عرشِ عظیم پر متمکن ہے۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے، کہ آسمانوں اور زمین اور ان کی درمیانی فضا میں اور زمینوں کے بالکل نیچے تحت الثریٰ میں جو کچھ ہے یعنی اعلیٰ سے اسفل تک ساری کائنات اسی کی ملکیت ہے وہی سب کا مالک اور بادشاہ ہے، اس کے آگے اس کے علم کی وسعت کو اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے: "وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى" مطلب یہ ہے کہ اگر تم کوئی بات باآواز اور پکار کے کہو تو وہ اس کو سنتا اور جانتا ہی ہے، اس کے علاوہ اس کو اُن باتوں کا بھی علم ہے جو بالکل چپکے کہی جائیں اور ان چیزوں کا بھی علم ہے جو اِس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہوں مثلاً دل کے خیالات اور ارادوں اور نیتوں کا بھی اس کو علم ہے الغرض اس کا علم ظاہر و باطن سب کو محیط ہے، کوئی بھی چیز اس کے علم سے باہر نہیں۔

اس سب کے بعد فرمایا گیا ہے "اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى" وہ اللہ، اس کے سوا کوئی عبادت و پرستش کے لائق نہیں، اسی کے ہیں سب اچھے نام اور اچھی صفات۔ حاصل یہ ہوا کہ قرآن اس مالک الملک اور رب قدوس کا نازل فرمایا ہوا ہدایت نامہ

ہے، جس کی یہ شان ہے۔ اب جو بد بخت اس سے روگردانی اور اس کی نافرمانی کرتے ہیں وہ خود سوچ لیں کہ اُن کا انجام کیا ہوگا، اے پیغمبر! آپ ان کے غم میں اپنی جان نہ گھلائیں، ہم نے یہ قرآن اس لئے نازل نہیں کیا ہے کہ ان بدبختوں کے نہ ماننے کی وجہ سے آپ رنجیدہ اور غمگین ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی معنویت

آگے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کے لئے تسکین کا بڑا سامان ہے اور مکہ کے منکروں مشرکوں کو تنبیہ ہے کہ اگر وہ اسی طرح انکار وتکذیب اور اللہ کے پیغمبر کی مخالفت ومزاحمت پر اصرار کرتے رہے اور ایمان نہ لائے تو ان کا انجام وہی ہوگا جو موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں فرعون اور اس کی قوم کا ہوا تھا۔ اسی لئے یہاں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ وحی ونبوت کے آغاز اور فرعون کو خدا کی بندگی اور اس کی ہدایت کی پیروی کی دعوت کے قصہ سے شروع کیا گیا ہے۔ "وَهَلْ أَتٰكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا"

میں اسی درس قرآن کے سلسلہ میں پہلے بھی بار بار کہہ چکا ہوں کہ قرآن پاک میں انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات اُس طرح بیان نہیں کئے گئے ہیں جس طرح مؤرخین اور اہل قصص بیان کرتے ہیں۔ مؤرخین اور اہل قصص کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر واقعہ اپنی معلومات کے مطابق تاریخی ترتیب کے ساتھ پوری تفصیل سے ایک ہی جگہ بیان کر دیتے ہیں، لیکن قرآن پاک تاریخ کی یا قصہ کہانی کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ کتاب ہدایت ہے اس میں موقع اور مقام کے تقاضے کے مطابق کہیں واقعہ کا ایک حصہ بیان کر دیا جاتا ہے کہیں دوسرا یا تیسرا حصہ بیان کر دیا جاتا ہے، اور ایسا بھی ہے کہ ایک ہی واقعہ یا واقعہ کا ایک ہی حصہ مختلف سورتوں میں بار بار بیان فرمادیا گیا ہے، ہدایت ونصیحت کے مقصد کے لئے یہی طریقہ زیادہ مناسب ہے، چنانچہ موسیٰؑ کا واقعہ قرآن مجید میں بیسیوں جگہ بیان فرمایا گیا ہے اور کسی ایک جگہ بھی پورا واقعہ اول سے آخر تک بیان نہیں فرمایا گیا ہے۔

حضرت مولانا تھانویؒ نے جب اُردو داں طبقہ کے لئے تفسیر بیان القرآن لکھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پورا واقعہ قرآن مجید کے مختلف مقامات کے بیان سے اخذ کر کے اور اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ قرآن پاک کے مختلف مقامات سے اخذ کر کے مرتب کر دیا اور اس کو ایک مستقل رسالہ کی شکل میں شائع فرما دیا۔ اس وقت مجھے اُس رسالہ کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔

یہاں سورۂ طٰہٰ میں جیسا کہ میں نے عرض کیا، موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ان کی نبوت کے آغاز سے بیان فرمایا گیا، ان کی زندگی کے اس سے پہلے واقعات یہاں بیان نہیں فرمائے گئے، دوسرے مقامات پر خاص کر سورۂ قصص میں قبل نبوت کے واقعات اچھی خاصی تفصیل سے بیان فرمائے گئے ہیں، یہ واقعات بھی بڑے اہم ہیں اور ان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کی بڑی نشانیاں ہیں۔ میں ان کا خلاصہ عرض کرتا ہوں:

قصے کی تفصیل

سورۂ یوسف میں یہ گذر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح یوسف علیہ السلام کو جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے تھے، مصر پہونچایا اور پھر کس طرح ان کو غلامی اور جیل خانوں وغیرہ کی منزلوں سے گزار کر حکمرانی اور فرمانروائی کے منصب تک پہونچایا اور پھر انھوں نے اپنے والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام اور اپنے پورے خاندان کو وہاں بلالیا۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے اور ان کی اولاد کی مختلف شاخیں بنی اسرائیل کہلاتی ہیں۔ الغرض یوسف علیہ السلام کے زمانے سے مصر میں بنی اسرائیل کی آبادی شروع ہوئی۔ ابتدائی دور تو بڑی وجاہت اور عزت کا دور تھا پھر جیسا کہ دنیا میں ہوا کرتا ہے اور قوموں کے حالات بدلتے ہیں اسی طرح مصر میں آباد ہونیوالے بنی اسرائیل کے حالات نے پلٹا کھایا، میرا خیال ہے کہ ان کے اعمال واخلاق اور ظاہری وباطنی حالات میں بھی تبدیلی آئی جسطرح کہ خیر القرون کے بعد مسلمانوں میں تبدیلی آئی، اور بعض علاقوں کے مسلمان بہت ہی پستی میں گر گئے، تو میرا خیال ہے کہ اسی طرح مصر میں رہنے والے بنی اسرائیل بہت پستی میں گر گئے، اور مقامی آبادی جو قبطی کہلاتی تھی اُن کے مقابلہ میں بنی اسرئیل کی حیثیت غلاموں کی

سی ہوگئی۔ انہی حالات میں موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا زمانہ قریب آیا، مفسرین نقل کرتے ہیں کہ اس زمانے کے بادشاہ۔ مصر (فرعون) نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر کاہنوں نے یہ دی کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص پیدا ہوگا وہ تمہاری سلطنت کے زوال کا باعث بنے گا۔ اس نے اس خطرہ کی پیش بندی کے طور پر طے کیا کہ اسرائیلیوں کی طاقت بڑھنے نہ دی جائے اور جو بچے پیدا ہوں ان میں سے لڑکوں کو چن چن کے قتل کرا دیا جائے کیونکہ انہی سے خطرہ ہوسکتا ہے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے، وہ ہمارے گھروں میں باندیوں اور خادماؤں کا کام کریں گی۔ اس اسکیم پر پوری طرح عمل شروع ہوگیا۔ کسی اسرائیلی گھرانے میں جو لڑکا پیدا ہوتا وہ ماں کی گود سے چھین لیا جاتا اور ذبح کر دیا جاتا۔ انہی حالات اور انہی دنوں میں موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اللہ نے ان کی ماں کے دل میں ڈالا کہ وہ ان کو ایک صندوقچہ میں بند کر کے دریائے نیل میں چھوڑ دیں اور اللہ پر بھروسہ کریں، اللہ نے ان کے دل میں یقین پیدا کیا کہ اللہ معجزانہ طور پر تمہارے اس بچے کی حفاظت کرے گا اور اس کو پرورش کے لئے تمہارے ہی پاس پہونچا دے گا اور پوری عمر دے کر نبوت و رسالت کے مقام تک پہونچائے گا۔ سورۂ قصص میں ہے "اِنَّا رَادُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ" موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ایسا ہی کیا۔ ایک صندوقچہ میں بند کر کے ان کو دریائے نیل میں ڈال دیا اور خدا کے سپرد کر دیا، اسی کے ساتھ اپنی بڑی لڑکی کو جو ہوشیار تھی، کہا کہ تم دیکھتی رہو کہ یہ صندوقچہ کدھر جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تم بھی اسی رُخ پر چلتی رہو۔ نیل کی لہروں نے صندوقچہ کو فرعون کے محل کی طرف پہونچا دیا وہاں جو دربان اور سپاہی وغیرہ ہوں گے انہوں نے دیکھا کہ ایک صندوقچہ چلا آ رہا ہے انھوں نے اس کو اٹھایا اور وہ فرعون اور اس کی بیوی کے سامنے کھولا گیا۔ دیکھا کہ اس میں ایک بڑا حسین و جمیل اور تندرست نومولود بچہ ہے۔ فرعون نے اس خطرہ سے کہ شاید یہ اسرائیلی بچہ ہو اس کو قتل کرانے کا ارادہ کیا، بیوی نے کہا کہ ایسے معصوم اور حسین بچہ کو قتل نہ کراؤ، ہمیں تو بڑی امید ہے کہ بڑا ہو کر یہ ہمارے بہت کام آئے گا یا ہم اس کو بیٹا بنالیں گے۔ (کہا جاتا ہے کہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی) بہر حال فرعون کی ملکہ نے کچھ اس انداز سے اپنی بات کہی اور اس پر اصرار کیا کہ وہ بات مان لی گئی اور بجائے اس کے کہ اس بچہ کو قتل کرا دیا جاتا، خاص اہتمام سے اس کی پرورش کا فیصلہ کر لیا گیا، اب اس کے لئے کسی دودھ پلانے والی انّا کی تلاش ہوئی،

جانے کتنی دودھ والی عورتیں جمع کر لی گئیں لیکن حضرت موسیٰ نے کسی کا دودھ قبول نہیں کیا، اور جیسا کہ نومولود بچہ کو رونا بلکنا چاہئے تھا، بھوک سے روتے بلکتے رہے۔ قرآن مجید میں ہے:

"وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ"

موسیٰ علیہ السلام کی بہن جو اپنی ماں کے حکم سے اس صندوقچہ کا پیچھا کرتے ہوئے شاہی محل تک پہونچ گئی تھی، اس نے موقع پا کر کہا کہ میں ایک بی بی کو بتاؤں شاید یہ بچہ ان کا دودھ قبول کرلے، چنانچہ ان کے بتلانے پر موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو ان کے گھر سے شاہی محل بلوایا گیا، کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ بچہ انہی کا ہے۔ انھوں نے جیسے ہی دودھ منھ میں دیا، موسیٰ علیہ السلام نے لے لیا، شاہی محل کی طرف سے دودھ کے لئے ان کی مستقل خدمت لے لی گئی، اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا۔ "اِنَّا رَادُّوْهُ اِلَيْکَ"۔

پھر کیا تھا، شاہی محل کے ایک لاڈلے بچے کی طرح موسیٰ علیہ السلام کی پرورش ہوتی رہی، وہ پل بڑھ کر جوان ہوئے، ان کو اپنی ماں سے ہی معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں اسرائیلی ہوں اور یہ میری ماں ہیں۔ آگے قرآن مجید میں ان کا ایک واقعہ یہ نقل کیا گیا ہے کہ ایک دن انھوں نے مصر ہی میں دیکھا کہ ایک قبطی ایک اسرائیلی سے الجھ رہا ہے اور اسکو پکڑے ہوئے ہے۔ مظلوم اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی کہ مجھے اس ظالم سے بچاؤ! موسیٰ علیہ السلام نے اس قبطی کو ڈانٹا ہوگا کہ وہ ظلم سے باز آجائے، لیکن وہ نہیں مانا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے ایک گھونسہ رسید کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی نیت ہرگز اسے مار ڈالنے کی نہیں تھی، لیکن قضا کا مارا وہ قبطی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے گھونسہ کی ضرب سے مر ہی گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا۔ پھر دوسرے دن اسی طرح کا ایک واقعہ اور پیش آیا، اس میں موسیٰ علیہ السلام نے کسی کو مارا تو نہیں اور نہ کوئی مرا لیکن کچھ ایسی صورت ہوگئی کہ گزشتہ کل ان کے ہاتھ سے جو ایک قبطی قتل ہو گیا تھا اور کسی قبطی کو اس کا علم نہ تھا، دوسرے دن کے واقعہ سے لوگوں کو اس کا علم ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ بننے لگا۔ ایک خیر خواہ نے موسیٰ کو بتادیا کہ تمہارے بارے میں مشورہ ہو رہا ہے کہ تمہیں قتل کرادیا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے مصر سے نکل جانے کا فیصلہ کرلیا، اور مدین کی طرف چل پڑے۔ منزل بہ منزل طے کر کے یہ تھکے ہارے مدین کے

قریب پہونچے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک کنویں پر لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور یہ بھی دیکھا کہ دو شریف سی لڑکیاں بھی اپنے جانوروں کو گھیرے اور روکے ہوئے ایک طرف کھڑی ہیں، انھوں نے ان سے پوچھا کہ تم اس طرح اپنے جانوروں کو روکے ہوئے کیوں الگ کھڑی ہو؟ انھوں نے کہا کہ، ہمیں اس کا انتظار ہے کہ یہ لوگ اپنے اپنے جانوروں کو پانی پلا کر لے جائیں اور جگہ خالی ہو جائے تو ہم اپنے جانوروں کو پانی پلا دیں ہمارے گھر کوئی مرد اس قابل نہیں ہے جو یہ کام کرے، ایک ہمارے والد ہیں جو بہت بوڑھے ہیں، اس لئے ہم کو ہی یہ خدمت انجام دینی ہے، موسیٰ علیہ السلام کے دل نے فیصلہ کیا کہ مجھے ان بے چاریوں کی مدد کرنی چاہئے، اللہ نے بڑی جسمانی طاقت دی تھی، وہ ڈول لے کر کنوئیں پر چڑھے اور ان لڑکیوں کے سب جانوروں کو پانی پلا دیا۔ وہ دونوں بہنیں جانوروں کو لے کر گھر واپس گئیں اور اپنے والد بزرگوار کو یہ واقعہ بتلایا اور ساتھ ہی کہا کہ آپ کو نوکر کی ضرورت ہے۔ یہ آدمی بڑا اچھا، بڑا طاقت ور اور صاحبِ امانت معلوم ہوتا ہے اگر آپ اس کو رکھ لیں تو بہتر ہوگا۔ ان بزرگوار نے موسیٰ علیہ السلام کو بلوایا اور بات چیت کی اور یہ طے ہوا کہ اتنی مدت تک تم یہاں رہو اور ہمارے کام کاج کرو، اسکے بعد ہم اپنی ایک بیٹی کا تم سے نکاح کر دیں گے۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام ایک مدت تک مدین میں ان بزرگوار کے پاس مقیم رہے۔ جب معاہدہ کی مدت پوری ہوئی تو انھوں نے بیٹی ان کے نکاح میں دے دی اور پھر ایک وقت آیا کہ موسیٰ علیہ السلام ان بزرگوار سے اجازت لے کر اور رخصت ہو کر اپنی منکوحہ بیوی کو ساتھ لیکر مصر کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں ایسی جگہ پہونچے جہاں سے پہاڑ طور سینا کچھ قریب تھا۔ رات اندھیری تھی، اور سردی کا موسم تھا، راستہ بھی غالباً بھول گئے تھے، ان سب باتوں کی وجہ سے میاں بیوی دونوں بہت پریشان تھے کہ طور کی جانب سے آگ کی روشنی دکھائی دی۔

موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر اس وقت تک کا جو واقعہ میں نے مختصراً بیان کیا ہے، یہ سورۂ قصص وغیرہ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں سورۂ طٰہٰ میں آگ کی یہ روشنی نظر آنے اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کو بیان فرمایا گیا ہے۔

ارشاد ہے: ”وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا، لَعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى“

(درس-۲۱)

حضرت موسیٰؑ کو منصب نبوت عطا ہونیکا عجیب وغریب واقعہ

پہلی وحی اور عصائے موسیٰؑ وید بیضا کے معجزے

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

وَهَلْ أَتٰكَ حَدِيثُ مُوسٰى إِذْ رَاٰ نَاراً فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوٓا إِنِّىٓ اٰنَسْتُ نَاراً لَعَلِّىٓ اٰتِيكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًىo فَلَمَّآ اٰتٰهَا نُودِىَ يٰمُوسٰىo اِنِّىٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًىo وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰىo اِنَّنِىٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِىْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْo اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰىo فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ فَتَرْدٰىo وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰىo قَالَ هِىَ عَصَاىَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِىْ وَلِىَ فِيهَا مَاٰرِبُ أُخْرٰىo قَالَ اَلْقِهَا يَا مُوسٰىo فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِىَ حَيَّةٌ تَسْعٰىo قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْاُوْلٰىo وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ اٰيَةً أُخْرٰىo لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰىo اِذْهَبْ إِلٰى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغٰىo (طٰهٰ ۸ تا ۲۴)

ترجمہ۔اور (اے پیغمبر) موسیٰ کا واقعہ تم نے سنا! جب (مدین سے آتے ہوئے رات کے وقت) آگ (اور اس کی روشنی) ان کو نظر پڑی تو اپنی اہل خانہ سے کہا تم یہاں ٹھہرو، مجھے آگ دکھائی دی ہے (میں اس طرف جاتا ہوں) اُمید ہے کہ تمہارے لئے اس آگ میں سے ایک شعلہ (یا انگارہ) لے آؤں، یا وہاں سے راستہ کا پتہ لوں، تو جب موسیٰ اس آگ کے پاس آئے تو (منجانب اللہ) اُن کو ندا آئی کہ اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں، پس تم اپنی جوتیاں اُتار دو تم (اس وقت) مقدس وادیِ طویٰ میں ہو، اور میں نے تم کو (پیغمبری کے لئے) انتخاب کرلیا ہے، لہٰذا جو کچھ وحی کیا جارہا ہے اس کو توجہ سے سنو، بالیقین میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا میری ہی عبادت کرو اور میری یادگاری کے لئے نماز قائم کرو، اور بالیقین قیامت (اپنے وقت پر) آنے والی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس (کے وقت) کو سب سے مخفی رکھوں، (قیامت کا آنا) اس لئے ہے کہ ہر نفس کو اس کی سعی وعمل کا بدلہ مل جائے۔پس تم کو وہ لوگ اس کی طرف سے بے فکر نہ کردیں۔ جو اس کا یقین رکھتے، اور اپنی خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں (اگر ایسا ہوا) تو تم ہلاک و برباد ہو جاؤ گے۔

اور اے موسیٰؑ یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے، انھوں نے کہا یہ میری لاٹھی ہے میں اس کا سہارا لیتا ہوں اور اپنی بکریوں کے لئے اس سے پتے جھاڑ لیتا ہوں اور اس سے میرے اور بھی کام نکلتے ہیں۔حکم ہوا اے موسیٰ اپنی اس لاٹھی کو (زمین پر) ڈال دو، تو انھوں نے اس کو ڈال دیا، تو ایک دم وہ سانپ تھا دوڑتا ہوا- ارشاد ہوا کہ اس کو پکڑ لو اور ڈرو نہیں ہم ابھی اس کو پہلی حالت پر کردیں گے۔اور تم اپنا (داہنا) ہاتھ اپنی بغل میں دے لو، (پھر اس کو نکالو تو) وہ نکلے گا روشن چمکتا ہوا، بغیر کسی عیب (مرض وغیرہ) کے، یہ دوسری نشانی ہوگی (یہ نشانیاں) اس لئے کہ ہم تم کو اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھلائیں، اے موسیٰ! اب تم فرعون کے پاس جاؤ، اس نے بہت سر اُٹھایا ہے۔

تفسیر وتشریح

یہ سورہ طٰہٰ ہے پچھلے ہی ہفتے یہ شروع ہوئی تھی، شروع کی آٹھ آیتوں میں جن کا ترجمہ

پچھلے ہفتہ کیا گیا تھا، قرآن مجید کی عظمت بیان ہوئی تھی اس کے بعد ان آیتوں میں جو میں نے اِس وقت تلاوت کی ہیں نبوت عطا ہونے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ نبوت ملنے سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں جو غیر معمولی واقعات اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش آئے اور وہ جن جن منزلوں سے گزرے اُنکا ذکر یہاں سورۂ طٰہٰ میں نہیں کیا گیا ہے، پچھلے ہفتہ کے درس میں میں نے تمہید کے طور پر موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر نبوت ملنے تک کے وہ حالات وواقعات بیان کردیئے تھے جو سورۂ قصص اور سورۂ نمل وغیرہ قرآن پاک کی دوسری سورتوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہاں تک بیان ہو چکا تھا کہ حضرت موسیٰ قریبا دس سال مدین رہنے کے بعد وہاں سے مصر کی طرف واپس ہوئے، اُن کے ساتھ ان کی بیوی بھی تھیں، راستہ چلتے چلتے اُس جگہ پہونچے جہاں سے طور سینا پہاڑ قریب تھا، رات اندھیری تھی اور موسم سردی کا تھا، راستہ کا بھی ٹھیک پتہ نہ تھا کہ اب کدھر چلنا چاہئے، اسی تکلیف اور پریشانی کی حالت میں طور کی جانب حضرت موسیٰ کو آگ کی روشنی دکھائی دی۔ آج جو آیتیں میں نے تلاوت کی ہیں اُن میں اسی واقعہ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا ذکر ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے:

"وَهَلْ أَتٰكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ...... أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى" مطلب یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو طور کی طرف آگ کی روشنی دکھائی دی تو انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ مجھے اُس طرف آگ کی روشنی نظر آرہی ہے، تم تو یہیں ٹھہرو، میں وہاں جاتا ہوں مجھے اُمید ہے کہ وہاں سے آگ لیتا آؤں گا، پھر ہم اس آگ سے الاؤ جلا کر تاپ بھی لیں گے اور اس سے کچھ روشنی بھی ہو جائے گی اور یہ بھی امید ہے کہ وہاں آگ کے پاس کوئی ایسا آدمی مل جائے جس سے راستہ کے بارے میں رہنمائی مل سکے۔ آگے فرمایا گیا ہے: "فَلَمَّا أَتٰهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى، إِنِّيْ أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى" یعنی جب موسیٰ علیہ السلام اس روشنی کے قریب پہونچے تو انھوں نے سنا، اُن کو پکار کے کہا جارہا ہے کہ اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں، تم سے ہمکلام ہو رہا ہوں، پس تم اپنے جوتے اُتار دو، تم مقدس وادی طویٰ میں ہو۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جوتے اُتارنے کا حکم حضرت موسیٰؑ کو اس لئے ہوا تھا کہ ان کے جوتے پاک نہیں تھے۔ لیکن قرآن مجید میں جس انداز میں یہ بات نقل کی گئی ہے اس

سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ اُس وقت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہو رہا تھا اور وہ ایک مقدس وادیِ طویٰ میں تھے اس لئے ادب و احترام کے طور پر جوتے نکال دینے کا حکم ہوا تھا۔ واللہ أعلم۔

نبوت اور اس کا پہلا سبق

اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے: ''وَأَنَا اخۡتَرۡتُکَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا یُوحیٰ'' یعنی میں نے تم کو نبوت و رسالت کے لئے منتخب کرلیا اور منصب نبوت تم کو عطا فرمادیا۔ لہٰذا اب جو وحی کے ذریعہ تم کو بتایا جارہا ہے اس کو اچھی طرح توجہ سے سنو۔ سب سے پہلی اور سب سے اہم اور مقدم بات یہ ہے کہ ''اِنَّنِیۡ أَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا أَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِکۡرِیۡ، اِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَکَادُ أُخۡفِيۡهَا لِتُجۡزیٰ کُلُّ نَفۡسٍ بِمَا تَسۡعیٰ'' یعنی میں ہی معبود برحق ہوں، دوسرا کوئی عبادت اور پرستش کے لائق نہیں، لہٰذا میری ہی عبادت کرو اور میری یادگاری کے لئے نماز قائم کرو۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرمانے کے بعد سب سے پہلے توحید کی تلقین فرمائی اسی کے ساتھ نماز کی ہدایت اور تاکید فرمائی، اس کے بعد قیامت اور آخرت کا برحق ہونا بیان فرمایا، اور یہ بھی بیان فرمادیا گیا کہ آخرت کا برپا ہونا اس لئے ضروری قرار پایا کہ لوگوں کو ان کے اچھے بُرے اعمال کا بدلہ مل جائے۔ ظاہر ہے کہ اس دُنیا میں نیکوں کو ان کے نیک اعمال کا اور بدکاروں کو ان کی بدکرداری کا بدلہ جو ملنا چاہئے وہ نہیں مل پارہا ہے۔ تو کوئی دوسرا عالم ہونا چاہئے جہاں بندوں کو ان کے اچھے برے اعمال کا بدلہ ملے۔ چنانچہ آخرت میں سب کو اپنے اپنے اچھے بُرے اعمال کا بدلہ ملے گا اور سب کا انصاف ہوگا ''لِتُجۡزیٰ کُلُّ نُفۡسٍ بِمَا تَسۡعیٰ'' کا یہی مطلب ہے۔ یہاں قیامت کے بارے میں ایک بات یہ بھی فرمائی گئی ہے ''أَکَادُ أُخۡفِيۡهَا'' یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا ارادہ اس قیامت کو یعنی اس کے خاص وقت کو بالکل مخفی رکھنے کا ہے، مطلب یہ ہے کہ کسی کو بھی قیامت کا متعین وقت نہیں بتلایا جائے گا۔

روزِ قیامت کا علم صرف اللہ کو

قرآن مجید میں دس سے زیادہ آیتیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے خاص وقت کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں کسی کو نہیں دیا، رسول اللہ ﷺ کو بھی نہیں بتلایا گیا۔ آپ کے زمانے کے کفار و مشرکین آپ سے بار بار پوچھتے تھے کہ جس قیامت کی آپ خبر دیتے ہیں اور قرآن سے جس کا بیان آپ پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں وہ کب آئے گی؟ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوتا تھا کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اس کا علم بس اللہ ہی کو ہے، اس کے سوا کسی کو اس کی خبر نہیں۔ کہیں فرمایا گیا ہے "قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ" کہیں فرمایا گیا "قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰه" حدیثوں میں کئی ایسے واقعات کا ذکر ہے کہ حضورؐ سے قیامت کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ وہ کب آئے گی؟ آپ نے یہی جواب دیا کہ اس کا علم بس اللہ ہی کو ہے۔ اور یہ مسئلہ اور عقیدہ کہ قیامت کا علم اللہ نے کسی نبی اور کسی فرشتہ کو نہیں دیا، ایسا اہم مسئلہ اور عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو جب پہلی وحی کی اور توحید اور قیامت و آخرت جیسے بنیادی عقائد کی تعلیم و تلقین فرمائی تو اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی بتلا دیا کہ قیامت کے وقت خاص کا علم کسی کو نہیں دیا جائے گا، اُس کو سب مخلوق سے مخفی رکھنے کا ارادہ اور فیصلہ ہے (أَكَادُ أُخْفِيهَا) بس جب اس کا وقت آئے گا تو وہ اچانک واقع ہوگی۔ پس جو لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے خاص وقت کا علم دیا گیا تھا، ان کی یہ بات قرآن و حدیث کے صریح خلاف اور بلاشبہ ایک گمراہانہ بات ہے۔ ملا علی قاریؒ نے اپنی کتاب "موضوعات کبیر" میں لکھا ہے کہ جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ جہالت سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جتنا بھی غلو کریں گے اتنا ہی ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ کا قرب حاصل ہوگا۔ حالانکہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بالکل بری اور بیزار ہیں۔ اُن لوگوں کا حال ان نصاریٰ کا سا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کو خدائی میں اور خدا کی صفات میں شریک کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے عیسیٰؑ راضی اور خوش ہوں گے، حالانکہ حضرت عیسیٰؑ

قیامت میں ان گمراہوں سے اپنی بیزاری اور بے تعلقی ظاہر کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی گمراہیوں سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

غافلوں کی صحبت کا اثر

آگے فرمایا گیا ہے: ”وَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنْهَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدٰی“ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جنھیں قیامت کا یقین نہیں ہے اور وہ من مانی زندگی گزارتے ہیں، ان کی صحبت اور ان کا رویہ تمہیں قیامت کی طرف سے بے فکر اور بے پروا نہ کردے، اگر ایسا ہوا تو یہ ہلاکت اور بربادی کی بات ہوگی۔ اس میں ہمارے آپ کے لئے اور سب کے لئے بڑا سبق ہے، ہمیں اور آپ کو ایسے لوگوں کی صحبت سے بچنا چاہئے، جو آخرت کی طرف سے بے فکر ہوں، ورنہ خطرہ ہے کہ اس بیماری کی چھوت ہمیں بھی لگ جائے گی۔ اور ہمیشہ اپنے حال پر نظر رکھنی چاہئے کہ ہم آخرت کی طرف سے غافل اور بے فکر تو نہیں ہوگئے، اور غافلوں اور بے فکروں کے اثرات ہم پر تو نہیں پڑ رہے ہیں اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اس بارے میں دُعا کرتے رہنا چاہئے کہ وہ فضا کے بُرے اثرات سے ہماری حفاظت فرمائے، اور خاص کر آخرت کی فکر دل پر ہمیشہ غالب رہے۔

عصا اور ید بیضا

اس کے بعد ارشاد ہوا: ”وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یٰمُوْسٰی“ (اے موسیٰ یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا چیز ہے؟) حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں اُن کی لاٹھی تھی، اللہ تعالیٰ کو اسے سانپ بنا کر دکھانا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزہ عطا فرمانا تھا، اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ فرعون کے پاس جانے سے پہلے اور اُس کو یہ معجزہ دکھانے سے پہلے خود موسیٰ علیہ السلام کو اس کا تجربہ ہوجائے، اللہ تعالیٰ نے پہلے ان سے پوچھا کہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس سوال کا مقصد غالباً یہ تھا کہ موسیٰ اچھی طرح دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ ان کے ہاتھ میں ان کی لاٹھی ہی ہے، تاکہ جب وہ خدا کی قدرت سے اچانک سانپ بن جائے تو انھیں یہ وہم اور شبہ نہ ہو، کہ شاید اپنی لاٹھی کے دھوکے میں کوئی سانپ میں نے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ بہر حال اللہ

نے جب ان سے پوچھا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ "هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ" (کہ یہ میری لاٹھی ہے میں اس سے سہارا لیتا ہوں اور اپنی بکریوں کے لئے اس سے پتے جھاڑتا ہوں اور اس کے علاوہ دوسری ضرورتوں میں بھی اس سے کام لیتا ہوں) اللہ تعالیٰ کے سوال کے جواب میں تو اتنی بات کافی تھی کہ "هِيَ عَصَايَ" (یہ میری لاٹھی ہے) لیکن موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی نصیب ہوئی تو ان کا جی چاہا کہ جتنا بھی ہو سکے اس محبوب سلسلہ کو دراز کریں، اس لئے انھوں نے اصل سوال سے زیادہ یہ سب باتیں کہیں کہ اس سے سہارا لیتا ہوں، اور اس سے اپنی بکریوں کے لئے درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں، اور اس کے علاوہ اور ضرورتوں میں بھی استعمال کرتا ہوں۔ کسی نے ایسے ہی موقع کے لئے کہا ہے ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ عرض کر دیا کہ میرے ہاتھ میں یہ میری لاٹھی ہے جس سے میں یہ یہ کام لیتا ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "أَلْقِهَا يَا مُوسَىٰ" (اے موسیٰ اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دو) موسیٰؑ نے حکم کی تعمیل کی اور وہ لاٹھی زمین پر ڈال دی، اب جو وہ دیکھتے ہیں تو وہ لاٹھی نہیں ہے بلکہ دوڑتا ہوا اور پھنکاریں مارتا ہوا سانپ ہے "فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ" موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے، یہ بشری فطرت کا تقاضا تھا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا، "خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ" یعنی ڈرو مت ہاتھ بڑھا کے اس کو پکڑ لو، ہم اس کو پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔ یعنی جب تم اس کو پکڑ لو گے تو یہ پھر وہی لاٹھی ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے اس کو پکڑ لیا تو ہاتھ میں آنے کے بعد وہ لاٹھی تھی۔ اس کے بعد ارشاد ہوا "وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ" (یعنی اے موسیٰ اب اپنا ہاتھ اپنے پہلو سے ملا لو، یعنی بغل میں دے لو، وہ سفید چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی عیب کے) یعنی ہاتھ میں چمک اور روشنی سورج کی طرح ہوگی، ایسا نہیں ہوگا جیسا برص وغیرہ کسی مرض کی وجہ سے جسم میں سفیدی آ جاتی ہے۔ اور یہ دوسرا معجزہ ہوگا۔ آگے فرمایا گیا "لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَىٰ" یہ دونوں نشانیاں اور دونوں معجزے، یعنی لاٹھی کا سانپ بن جانا اور ہاتھ میں ایک نورانی چمک کا پیدا ہو جانا، ہم نے تم کو دیئے ہیں تاکہ ہم اپنی بڑی

بڑی نشانیوں اور عظیم الشان معجزوں میں سے بعض دکھائیں۔ گویا یہ دونوں نشانیاں، موسیٰ علیہ السلام کو دیئے جانے والے عظیم الشان معجزوں کی پہلی قسط ہیں، ان کے بعد اور بڑی بڑی نشانیاں اور بڑے بڑے معجزے عطا ہوں گے، چنانچہ عطا ہوئے اور سورۂ اعراف میں ان کا ذکر گزر چکا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو یہ دو معجزے دینے کے بعد اور یہ اشارہ فرمانے کے بعد کہ اور بھی بڑے بڑے معجزے عطا ہوں گے۔ ان کو حکم ہوا "اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی" (اے موسیٰ تم ہماری دعوت لے کر فرعون کے پاس جاؤ، اس نے بڑا سر اٹھایا ہے) تمہارے ذریعہ ہمیں اس کی فرعونیت کو توڑنا ہے۔



سورۃ الانبیآء

درس — ۲۲

(درس-۲۲)

حساب کا وقت قریب آ گیا ہے، اور یہ لوگ غفلت میں مدہوش ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں منکرین مکہ کی خرافات اور ان کا جواب

انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخالفین کے بارے میں سنۃ اللہ

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم- بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝ مَا
يَأْتِيْهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ
يَلْعَبُوْنَ ۝ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ج وَاَسَرُّوا النَّجْوَى قلے الَّذِيْنَ
ظَلَمُوا قلے هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ
تُبْصِرُوْنَ ۝ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۝ وَهُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ م بَلِ افْتَرٰهُ بَلْ هُوَ
شَاعِرٌ ج فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ
مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ج اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا
رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا

تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰھُمْ جَسَدًا لَّا یَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا کَانُوْا
خٰلِدِیْنَ ۝ ثُمَّ صَدَقْنٰھُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَیْنٰھُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَھْلَکْنَا
الْمُسْرِفِیْنَ ۝ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ اَفَلَا
تَعْقِلُوْنَ ۝ (سورہ انبیاء آیت ا۔تا۱۰)

(ترجمہ) لوگوں کے بالکل قریب آگیا ہے ان کے حساب کا وقت، اور وہ غفلت میں سرشار منہ موڑے ہوئے ہیں، ان کے رب کی طرف سے جو تازہ نصیحت ان کے پاس آتی ہے (بجائے اس کے کہ وہ اس کو توجہ اور سنجیدگی سے سنیں) اس کو وہ کھیل تماشے ہی کے طور پر سنتے ہیں، اور اس وقت ان کے دل بالکل ہی غافل ہوتے ہیں۔ اور ان لوگوں نے جو ظالم اور مجرم ہیں چپکے چپکے سرگوشیاں کیں کہ یہ شخص (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے سوا کیا ہے کہ تمہاری ہی طرح بس ایک آدمی ہے، پھر تم کیوں (اس کی) جادو والی بات سننے آتے ہو، جبکہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔

(پیغمبر نے) فرمایا کہ میرا پروردگار جانتا ہے ہر بات (خواہ) آسمان میں ہو اور (خواہ) زمین میں، اور وہ خوب سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے، بلکہ ان ظالموں نے (یہ بھی) کہا کہ (یہ قرآن) اضغاث احلام (خواب وخیال کی باتیں) ہیں، بلکہ انہوں نے (پیغمبر نے) اس کو تراش لیا اور گڑھ لیا ہے (نہیں) بلکہ وہ ایک شاعر آدمی ہیں اور قرآن ان کا شاعرانہ کلام ہے، اگر یہ خدا کے رسول ہیں تو انھیں چاہیے کہ ہمارے سامنے کوئی ایسی کھلی نشانی لائیں جیسی کھلی نشانیاں لے کر اگلے پیغمبر بھیجے گئے تھے۔ ان سے پہلے ہم نے جن بستیوں کو ہلاک کیا ان میں سے کوئی بھی (نشانیاں دیکھ کے) ایمان نہیں لایا تو کیا یہ لوگ ایمان لے آئیں گے؟

اور اے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ سب آدمی ہی تھے، جن پر ہماری وحی اترتی تھی، تو (اے منکرو!) اگر تم کو اس کا علم نہیں ہے تو اہل کتاب سے دریافت کرلو۔ اور ہم نے ان پیغمبروں کو ایسا جسم نہیں بنایا تھا کہ کھانا نہ کھاتے ہوں (کھانے پینے سے بے نیاز ہوں) اور وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے (غیر فانی) نہیں تھے، پھر ہم نے ان سے کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا، اور (اس کا ظہور اس طرح ہوا کہ) ہم نے ان پیغمبروں کو اور (ان کے ساتھ)

جن کو ہم نے چاہا نجات دے دی، اور حد سے گذرنے والوں کو ہلاک کر ڈالا۔ ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کردی ہے، اس میں تمہارے لئے ذکر، نصیحت اور موعظت ہے، تو کیا تم سمجھتے (اور مانتے) نہیں؟

تفسیر و تشریح

ان آیتوں کے نزول کا ماحول

یہ سورۂ انبیاء شروع ہوئی ہے، یہ بھی مکی سورتوں میں سے ہے، میں نے پہلے بھی بار بار کہا ہے کہ قرآن کریم کو صحیح طور سے سمجھنے میں بڑی مدد اس سے ملتی ہے کہ حالات کا وہ نقشہ اور وہ فضا سامنے ہو جس میں قرآن پاک نازل ہو رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ صحابۂ کرام نے قرآن مجید کو جو سب سے بہتر سمجھا اور سب سے زیادہ اثر لیا تو اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ جس ماحول میں اور جس فضا میں وہ نازل ہو رہا تھا وہ ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اب سورہ انبیاء کی یہی ابتدائی آیتیں جن کی میں نے اس وقت تلاوت کی ہے ان کا ترجمہ اور نفس مطلب تو کسی درجہ میں ہر عربی داں سمجھ لے گا، لیکن ان کا وزن اور ان کی تاثیر کو تب ہی محسوس کیا جا سکے گا جب اس فضا اور اس ماحول کو جس میں یہ آیتیں نازل ہوئیں تھیں، سامنے رکھ لیا جائے۔ ذرا اس صورت حال کا تصور کیجئے کہ مکہ کی عام آبادی خدا کو بالکل بھلائے ہوئے ہے، خدا کے بجائے کچھ فرضی معبودوں سے اس نے رشتہ جوڑ لیا ہے، وہ اس سے بھی بالکل بے فکر ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا اور کیا پیش آئے گا، بلکہ اس کے سامنے مرنے کے بعد کا سوال ہی نہیں ہے۔ پھر اس شرک اور خدا فراموشی اور آخرت کی طرف سے بے فکری کی وجہ سے اس کی زندگی بڑی گمراہانہ اور غلیظ اور گندی ہے۔ ایسی فضا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوتے ہیں، آپؐ ان کو خدا کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، شرک چھوڑ کر صرف ایک خدا کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں، آخرت میں خدا کے سامنے پیشی اور اعمال کے محاسبہ کی، پھر جنت اور دوزخ کے عذاب و ثواب کی بات ان کو بتلاتے ہیں، اور انتہائی دردمندی اور دلسوزی سے خدا کا فرمان ان کو سناتے ہیں، لیکن وہ ان باتوں کو توجہ سے سنتے بھی نہیں، بس تفریح اور لہو لعب میں مست ہیں

اور کھل کر آپ کی دعوت کی مخالفت کرتے ہیں اور جو نیک دل انسان اس سے متاثر ہوتے ہیں ان کو بہکانے کی اور ستانے کی بھی طرح طرح سے کوششیں کرتے ہیں، حضورؐ کے بارے میں بالکل بے بنیاد خرافاتی باتیں مشہور کرتے ہیں اور پروپیگنڈے کی پوری طاقت سے ان کو پھیلاتے ہیں۔ اس فضا میں اور حالات کے اس نقشہ میں یہ آیات نازل ہوتی ہیں۔ ارشاد ہے:

"اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ .... لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ج" یعنی ان لوگوں کے حساب کتاب کا وقت قریب آ گیا ہے اور یہ غفلت کے نشہ میں مدہوش ہیں اور بجائے فکر اور توجہ کرنے کے بالکل رخ پھیرے ہوئے اور منہ موڑے ہوئے ہیں، ان کے خدا کی طرف سے جو تازہ بہ تازہ نصیحت پیغمبر کے ذریعہ ان کے پاس آتی ہے، جو ان کے لئے پیغام حیات ہے، یہ اس کو توجہ سے سننے کے قابل نہیں سمجھتے بلکہ اس طرح اور اس حال میں سنتے ہیں کہ لہولعب میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ "اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ"...... آگے فرمایا "لاهية قلوبهم" یعنی ان کے دل اور ان کی روحیں بالکل غافل ہوتی ہیں۔

حساب سے کیا مراد ہے؟

یہاں حساب سے مراد بظاہر آخرت ہی کا حساب کتاب ہے، اس کو قریب اس لئے فرمایا گیا کہ جو واقعہ یقیناً ہونے والا اور پیش آنے والا ہے اس کو قریب ہی سمجھنا چاہئے، اور جو گزر گیا، اگرچہ کل ہی گزرا ہو وہ بہت دور ہو گیا کیونکہ وہ اب آنے والا اور ملنے والا نہیں ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کا مرنے کا اور اس دنیا سے آخرت کی طرف سفر کرنے کا وقت قریب ہی ہے، آدمی مر کر آخرت کی پہلی منزل میں پہونچ جاتا ہے اور جو کچھ آخرت میں پیش آنے والا ہے اس کا سلسلہ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے، تو "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ" کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان منکروں کی موت کا وقت قریب ہی آ گیا ہے، اور یہ اس کی طرف سے بالکل غافل اور بدمست ہیں۔ ایک مشہور حدیث ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔ "من مات فقد قامت قيامته" یعنی جو شخص مرا اور اس دنیا سے جس نے سفر کیا تو ایک طرح سے اس کے لئے قیامت آ گئی، بہرحال حساب کے قریب ہونے سے موت کا قریب ہونا بھی مراد ہو سکتا ہے۔

منکرانہ خرافات

آگے فرمایا گیا ہے: "وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ق الَّذِیْنَ ظَلَمُوا......وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ" یعنی ان ظالم اور مجرم منکروں نے آپس آپس میں چپکے چپکے سرگوشی کے طور پر کہا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو خدا کے رسول اور پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور خدا کا فرمان بتا کر ایک کلام سناتے ہیں، یہ تم جیسے ایک آدمی کے سوا کچھ بھی تو نہیں ہیں، ہاں شاید ان کے پاس اور ان کے کلام میں جادو ہے، جس کی وجہ سے لوگ پھنستے ہیں، تو کیا تم لوگ یہ جان بوجھ کر اور دیکھتے بھالتے ان کے پاس جاؤ گے اور ان کے جادو میں پھنسو گے۔ (اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ)

آگے ارشاد فرمایا: "قٰلَ رَبِّیْ یَعْلَمُ الْقَوْلَ فِی السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ٥ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ"، یعنی معصوم پیغمبر نے کہا کہ آسمان میں یا زمین میں جو بات بھی کوئی کرے میرا پروردگار اس کو جانتا ہے۔ وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم لوگ میرے بارے میں اور خدا کے کلام کے بارے میں جو کچھ کہتے ہو وہ سب خدا کے علم میں ہے، جو سمیع و علیم ہے اور مجرموں کو پکڑنے والا اور سزا دینے والا ہے، تمہیں اس کی پکڑ سے ڈرنا چاہئے، اور میں اس کو سمیع و علیم جانتے ہوئے اور اس کی قدرت اور اس کے قہر و جلال پر یقین رکھتے ہوئے پیغمبری کا جھوٹا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں، ایسی مجرمانہ جسارت وہی کر سکتا ہے جو خدا کو جانتا نہ ہو، اور اس کی صفات پر ایمان نہ رکھتا ہو۔

آگے ارشاد ہے: بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ...... كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ۔
مطلب یہ ہے کہ مکہ کے منکروں اور مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اور آپ کے لائے ہوئے کلام الٰہی کے بارے میں ایک خیال تو یہ ظاہر کیا کہ یہ جادو کا دھندا ہے۔ لیکن پھر خود ہی انہیں خیال آیا ہوگا کہ یہ بات چلنے والی نہیں ہے کیونکہ جو شخص بھی حضورؐ کو کچھ جانتا ہے وہ اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تو انہوں نے بات بدل کر کہا کہ جو کلام یہ سناتے ہیں وہ خدا کی وحی نہیں بلکہ "اضغاث احلام"، یعنی خواب و خیال کی باتیں ہیں (جیسے مراقی لوگ آسمان زمین کی باتیں کیا کرتے ہیں) پھر کہا کہ نہیں بلکہ انہوں نے یہ کلام خود

بنایا اور گڑھا ہے، پھر کہا کہ نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ شاعر ہیں اور جو کلام یہ سناتے ہیں وہ ان کے شاعرانہ تخیل کی بلند پروازی ہے۔

اس آیت سے ان منکروں کی ذہنیت کا حال معلوم ہو جاتا ہے اور یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ وہ جو کچھ بھی حضورؐ کے خلاف کہتے تھے وہ خود اس کو صحیح اور واقعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ قوم کے سیدھے سادھے عوام کو فریب دینے کے لئے مختلف طرح کی باتیں بناتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ جادوگر ہے کبھی کہتے تھے کہ جو باتیں یہ کرتے ہیں وہ "اضغاث احلام" ہیں یعنی مراقیوں کے سے خواب پریشان۔ کبھی کہتے تھے کہ مفتری ہیں دانستہ خدا پر افترا کرتے ہیں اور یہ کلام جس کو یہ کلام اللہ کہتے ہیں خود ان کا طبع زاد اور گڑھا ہوا ہے کبھی کہتے تھے کہ یہ شاعر ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ یہ مختلف خیالات ظاہر کرنے والے مختلف لوگ تھے۔

قرآن پاک میں مکہ کے منکروں کی ان سب باتوں کو جا بجا نقل کیا گیا ہے اور رد فرمایا گیا ہے یہاں صرف نقل کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس طرح نقل کیا گیا ہے، جس سے یہ بات خود ہی ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو لوگ یہ باتیں کرتے تھے وہ خود بھی ان کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، ایک بات کہتے تھے اور پھر بدل کر دوسری بات کہہ دیتے تھے۔

آگے انہیں کی یہ بات نقل کی گئی ہے "فَلْيَاتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُوْنَ." یعنی مکہ کے منکروں نے حضورؐ کے متعلق مختلف قسم کی اور بھانت بھانت کی یہ باتیں کیں اور اس کے بعد یہ بھی کہا کہ اگر یہ خدا کے رسولؐ ہیں تو ایسی نشانیاں اور ایسے کھلے معجزے ہمیں دکھائیں جیسے معجزے اگلے پیغمبر لائے تھے، غالباً اس سے ان کی مراد حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ علیہما السلام وغیرہ اگلے نبیوں کے مشہور معجزے ہوں گے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا سانپ بن جانا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے مٹی سے بنائے ہوئے پرندے کا زندہ پرندے کی طرح اُڑ جانا، اور کوڑھیوں اور مادر زاد اندھوں کا اچھا ہو جانا وغیرہ وغیرہ --- ان مکہ والوں کو اگلے انبیاء علیہم السلام کے ان معجزوں کا علم غالباً ان روایات سے ہوا ہوگا جو عام طور سے کہانیوں کی طرح مشہور تھیں، اور خود قرآن مجید میں بھی جا بجا ان کا بیان کیا گیا ہے۔ تو یہ بھی ممکن ہے کہ مکہ کے ان کافروں نے قرآن ہی کے بیان کی بنیاد پر یہ بات کہی ہو کہ اگر تم سچے پیغمبر ہو تو ایسے ہی کھلے معجزے تم بھی دکھاؤ جیسے معجزے اگلے پیغمبروں کے تم خود پڑھ پڑھ کر

سناتے ہو۔

یہ مضمون بھی قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ مکہ کے کفار ومشرکین آپؐ سے ایسی نشانیاں اور ایسے معجزے دکھانے کا مطالبہ کرتے تھے، اور اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ معجزے اور نشانیاں ظاہر کرنا پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے اختیار میں ہے۔(اِنَّمَا الآیَاتُ عِندَاللّٰہِ) وہ جب کسی پیغمبر کے ہاتھ پر کسی معجزہ کا ظہور مناسب سمجھتا ہے تو اس کے ہاتھ پر ظاہر کردیتا ہے۔ اس لئے پیغمبر سے معجزہ کا مطالبہ کرنا جہالت کی بات ہے، اور اسی کے ساتھ قرآن میں جا بجا فرمایا گیا ہے کہ پہلے جن لوگوں کے مطالبہ پر معجزے دکھائے گئے تھے، وہ ان کے دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائے اور پھر وہ ہلاک کردیئے گئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ جب کسی پیغمبر کے ہاتھ پر ایسے کھلے معجزے ظاہر کردیئے جائیں جن کا مطالبہ خود قوم نے کیا ہو اور اس طرح اللہ کی حجت تمام ہوجائے اور پھر بھی وہ ایمان نہ لائیں تو وہ قوم ہلاک کردی جاتی ہے۔ چنانچہ کفار مکہ کے اس مطالبے کے جواب میں کہ یہ پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ایسے معجزے دکھائیں جیسے اگلے پیغمبروں نے دکھائے تھے (فَلْیَاتِنَا کَمَا اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ.) یہاں فرمایا گیا ہے۔ "مَاآمَنَتْ مِنْ قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنَاھَا اَفَھُمْ یُؤمِنُوْنَ" مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانوں میں جن لوگوں نے پیغمبروں سے ایسے معجزے طلب کئے تھے وہ ان معجزوں کے ظہور کے بعد بھی ایمان نہیں لائے پھر وہ خداوندی قانون کے مطابق آسمانی عذاب سے ہلاک کردیئے گئے۔ اسی طرح یہ مکہ کے منکرین بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر یہ بھی ہلاکت اور عذاب کے مستحق ہوجائیں گے۔

واقعہ یہی ہے کہ حضورؐ کے زمانے کے یہ کفار ومشرکین جو خاص خاص معجزوں کا مطالبہ کرتے تھے ان کی نیت یہ ہرگز نہیں ہوتی تھی کہ اگر یہ معجزات ظاہر ہوجائیں تو ہم ایمان لے آئیں گے وہ بدبخت تو صرف شرارت سے یہ باتیں کرتے تھے، اگر وہ معجزے ان کو دکھا دیئے جاتے تو وہ یہی کہتے کہ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ تم جادوگر ہو۔ یہ معجزے تم نے جادو کے زور سے دکھائے ہیں۔ اسی لئے ارشاد فرمایا گیا "اَفَھُمْ یُؤْمِنُوْن" یعنی کیا یہ بدبخت اور شریرالنفس، معجزے دیکھ کر ایمان لے آئیں گے، ہرگز نہیں، یہ تو نہ ماننے کا فیصلہ کئے ہوئے ہیں۔

اوپر کی آیتوں میں ان منکرین کی ایک بات یہ بھی نقل کی گئی تھی کہ انہوں نے حضورؐ کے بارے میں کہا کہ یہ کیسے رسولؐ ہو سکتے ہیں یہ تو ہماری ہی طرح کے ایک بشر ہیں (هَلْ هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ) ان کی یہ بات قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر نقل کی گئی ہے اور اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے انسان ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا جائے۔ انسان ہی انسان کی بیماریوں کو اس کے مزاج اور جذبات اور رجحانات کو سمجھ سکتا ہے۔ اسی واسطے انسانوں کی اس دنیا میں ہمیشہ انسان ہی پیغمبر بنا کر بھیجے گئے۔ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، اور حضرت موسیٰ و عیسیٰ یہ سب پیغمبر انسان تھے۔ اسی سلسلے میں ایک جگہ یہ بھی فرمایا گیا ہے: "لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا۔" یعنی اگر اس دنیا میں انسانوں کے بجائے فرشتے آباد ہوتے اور ان میں کوئی رسول بھیجا جاتا تو فرشتہ ہی کو رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ ان لوگوں کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ انسان کو گھٹیا درجہ کی مخلوق سمجھتے تھے۔ حالانکہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ مخلوقات میں صرف وہی اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک درجہ میں کامل نمونہ ہے، جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت فرشتوں کے لئے سجدے کا جو حکم ہوا تھا وہ دراصل اسی حقیقت کا اظہار تھا۔ بہر حال انسان اگر انسان ہی ہو اور نفس کی شرارت سے شیطان یا حیوان نہ بن جائے تو وہی اللہ تعالیٰ کی سب سے افضل و اشرف مخلوق ہے لیکن جاہلوں نے اس حقیقت کو کبھی نہیں سمجھا۔

یہ مکہ والے اسی سلسلے میں ایک بات یہ بھی کہتے تھے "مَا لِهٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ" یعنی یہ کیسے رسول ہیں جو ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں اور اپنی ضروریات کے لئے اور خرید و فروخت کے لئے بازار بھی جاتے ہیں۔ ان جاہلوں کا خیال تھا کہ پیغمبر ایسی مخلوق ہونا چاہئے جسے کھانے پینے کی اور اپنی ضروریات کے لئے بازار اور کسی دوکان پر جانے کی ضرورت نہ ہو۔ یہاں سورہ انبیاء میں اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا "وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ۔" یعنی اے ہمارے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے جو رسول اور نبی قوموں کی ہدایت کے لئے بھیجے وہ سب آدمی ہی تھے، ان کو ہم وحی کے ذریعہ ہدایت سے متعلق باتیں بتاتے تھے۔

آگے فرمایا، اے مکہ والو! اگر تم اس حقیقت سے واقف نہیں ہو تو "اهل الذکر" یعنی اہلِ کتاب سے معلوم کرلو وہ تم کو بتادیں گے کہ پہلے آنے والے اللہ کے سارے پیغمبر آدمی ہی تھے۔ آگے فرمایا "وَمَا جَعَلْنَا هُمْ جَسَداً لَا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خَالِدِيْنَ." یعنی پہلے بھیجے جانے والے پیغمبر کوئی ایسی مخلوق نہیں تھے جو کھاتے پیتے نہ ہوں اور ایسے بھی نہ تھے جن کو کبھی موت نہ آئے اور وہ ہمیشہ دنیا میں زندہ رہیں۔

آگے ارشاد فرمایا: "ثُمَّ صَدَقْنَا هُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنَاهُمْ وَمَنْ نَشَاءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ." یعنی اگلے پیغمبروں کے ساتھ ہمارا معاملہ یہ رہا ہے کہ ان کی نصرت اور ان کے مخالفین کی ہلاکت یا مغلوبیت کا جو وعدہ ان سے کیا تھا وہ ہم نے سچ کر دکھایا اور ان کے منکرین جو شرارت اور گستاخی میں حد سے بڑھے ہوئے تھے ان کو ہم نے ہلاک کر ڈالا، اور ان پیغمبروں کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو ہم نے نجات دی۔ یہ مکہ کے منکروں کو بہت ہی واضح آگاہی دی گئی کہ اگر تم اپنی مجرمانہ حرکتوں اور شرارتوں سے باز نہ آئے تو پھر یہی ہوگا کہ ہم اپنے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کی اپنے غیبی لشکروں سے مدد فرمائیں گے اور تم اگلے مجرمین کی طرح ہلاک و برباد کردیئے جاؤگے۔ اور یہی ہوا کہ ان میں سے جو لوگ کفر اور شرارت سے باز نہ آئے وہ ختم کردیئے گئے جیسے ابوجہل اور ابولہب وغیرہ اور جو بچے وہ سب اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے، یہاں تک کہ ابوسفیانؓ اور عکرمہؓ بن ابی جہل بھی ایمان لے آئے اور پھر دین کے مخلص خادموں میں ہوگئے۔

اس سب کے بعد آخر میں مکہ کے انہیں منکروں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے "لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ." یعنی ہم نے تمہارے لئے ایک کتاب نازل کردی ہے جس میں تمہارے لئے پوری نصیحت اور ہدایت کا پورا سامان ہے، تو کیا تم سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور ہماری دی ہوئی عقل وفہم سے کام نہیں لیتے، (اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ) ظاہر ہے کہ یہ استفہام اور استفسار نہیں ہے بلکہ استفہام کی شکل میں تنبیہ ہے جس طرح ہم کسی ایسے آدمی سے جو توجہ سے بات نہیں سنتا اور نصیحت پر عمل نہیں کرتا کبھی کہتے ہیں کہ "کیا تم سنتے نہیں، کیا تم سمجھتے نہیں۔" ___ بعض مفسرین نے فیہ ذکرکم کا یہ مطلب بھی لیا ہے کہ ہم نے تمہاری طرف اور تمہارے لئے کتاب نازل کی ہے یعنی قرآن مجید نازل کیا ہے جس میں

تمہارا ذکر ہے اور اس کے ذریعہ تمہاری قوم کی یاد زندہ رہے گی --- تمہیں اس نعمت کی قدر کرنی چاہئے۔ اور سمجھنا چاہئے کہ تمہاری قوم پر یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا انعام ہے --- واقعہ یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوتے اور قرآن مجید عربوں میں نازل نہ ہوتا تو ہرگز دنیا میں اور تاریخ میں عربوں کو وہ مقام نہ ملتا جو حضورؐ کے اور قرآن کے طفیل میں ان کو ملا۔



سورۃ الحج

درس ـــ ۲۳

(درس ۲۴)

امت مسلمہ کا مقام ومنصب اور لائحہ عمل

عبادت، نیکوکاری اور راہِ حق میں جانبازی

اللہ تعالیٰ کی طرف سے پشت پناہی اور مددگاری کا وعدہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ط

یَا اَیُّہَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوْا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ہ وَجَاہِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِہَادِہٖ ہُوَ اجْتَبَاکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ط مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاہِیْمَ ط ہُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ہٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَہِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ط ہُوَ مَوْلٰکُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ہ (سورۃ الحج۔ آیت ۷۷ تا ۷۸)

(ترجمہ) اے ایمان والو! تم رکوع و سجود کیا کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت میں سرگرم رہو، اور نیکی اور بھلائی کے سب کام کیا کرو، تا کہ تم فلاح یاب اور بامراد ہو جاؤ۔ اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو اور جان لڑا دو، جیسی جدوجہد اور جانبازی اس کا حق ہے، اس نے (بڑی سعادت اور اپنے دین حق کی امانت وخدمت کے لئے انسانی گروہوں میں سے) تم کو چن لیا ہے۔ اس نے تمہارے لئے دین میں کوئی مشکل اور تنگی نہیں رکھی (بلکہ وسعت اور آسانی رکھی ہے) راہِ عمل تمہارے پدرِ بزرگوار ابراہیم کی، اس نے تمہارا نام "مسلمین" رکھا ہے پہلے سے اور اس (آخری کتاب قرآن) میں بھی، تا کہ ایسا ہو کہ رسول تم کو بتانے والا ہو اور تم دوسرے سب لوگوں کو بتانے والے ہو جاؤ۔ پس پورا اہتمام کرو تم نماز کا اور ادا کیا کرو زکوٰۃ اور مضبوطی سے تھام لو اللہ کو (اور اس کے دین کو) وہ تمہارا کارساز ہے سو بہت ہی اچھا کارساز ہے اور بڑا اچھا حامی و مددگار۔

تفسیر و تشریح

یہ سورۂ حج کی بالکل آخری دو آیتیں ہیں، انہی پر سورت ختم ہوگئی ہے۔ میں نے اس سے پہلے بھی بار بار بتلایا ہے کہ اکثر ایسا ہے کہ قرآن پاک کی بڑی سورتوں کے آخری حصہ اور خاتمہ میں سورت کا خاص پیغام ہوتا ہے۔ ان دو آیتوں کی نوعیت بھی یہی ہے۔ یہ بہت تھوڑے سے الفاظ میں امت مسلمہ کا جامع منشور ہے، اس میں امت کا نصب العین اور لائحہ عمل متعین کیا گیا ہے اور اس کی پیروی کی شرط پر دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی اور خداوندی حمایت و نصرت کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔

سورت کے شروع میں خطاب منکرین اور مشرکین سے تھا، پہلے رکوع میں جو "یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ" سے شروع ہوا تھا، قیامت کی ہولناکی کا بیان کیا گیا تھا اور ایک حد تک الفاظ میں اس کی تصویر کھینچ دی گئی تھی، اور اسی کے ساتھ قیامت کے منکروں اور اس کے بارہ میں شک شبہ کرنے والوں پر عقلی حجت بھی قائم کی گئی تھی (یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ... الخ) --- پھر دوسرے رکوع میں شرک کی برائی بیان کی گئی تھی اور دلائل سے سمجھایا گیا تھا کہ شرک سب سے گندی معصیت ہے اور عقل و فطرت کے بھی خلاف ہے اور اس کا آخری انجام دوزخ کا بے پناہ عذاب ہے۔

اس کے بعد مشرکین مکہ کے اس ظالمانہ رویّہ کا بیان ہوا تھا کہ وہ ایمان والوں اور خدائے واحد کے پرستاروں کو خانۂ کعبہ میں اور مسجد حرام میں عبادت کرنے سے روکتے ہیں۔ حالانکہ کعبہ کے معمار اوّل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو خدائے واحد کی عبادت ہی کے لئے بنایا تھا اور توحید کا مرکز قرار دیا تھا۔ اس کے بعد ضمناً حج کے اُن ارکان و مناسک کا کچھ بیان فرمایا گیا تھا جن کی بنیاد بحکم خداوندی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ڈالی تھی اور توحید اور خدائے واحد کا ذکر ہی ان سب ارکان و مناسک کی روح تھی اور ہے --- اس کے آگے اُن ظالم مشرکین مکہ کے خلاف جو خانۂ کعبہ پر قابض تھے اور جنہوں نے اہلِ ایمان کو اپنے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنا رکھا تھا اور اللہ کے خاص شہر مکہ میں اُن کو امن سے رہنے بھی نہیں دیتے تھے، اُن کے خلاف جہاد کا اعلان کیا گیا تھا، اور مظلوم مسلمانوں کو طاقت استعمال کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ یہ مضمون اس آیت سے شروع ہوا تھا۔ "اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ۔" اس سلسلہ مضمون میں یہ بشارت بھی دے دی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ

مظلوم مسلمانوں کو مدد کا فیصلہ کر چکا ہے اور وہ ظالم دشمنوں پر غالب آئیں گے اور فتحیاب ہوں گے --- پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان فرمایا گیا تھا اور آپؐ پر ایمان لانے والوں اور انکار و مخالفت کرنے والوں کا اخروی انجام بیان کیا گیا تھا، اور اس مضمون سے متعلق کچھ ضمنی باتیں بیان فرمائی گئی تھیں۔

اس سب کے بعد اس آخری رکوع میں توحید کے حق میں اور شرک و مشرکین کے خلاف ایک بہت ہی عام فہم اور روشن ترین دلیل کھلے چیلنج کے طور پر یہ پیش کی گئی کہ --- اے مشرکو! جن خود ساختہ معبودوں کو تم حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے پکارتے ہو اور ان کی دہائی دیتے ہو وہ تو اتنے عاجز اور بے بس ہیں کہ سب مل کر بھی ایک مکھی نہیں بنا سکتے اور اگر ان کے چڑھاوے وغیرہ میں سے مکھی کچھ اچک لے جائے تو اس سے یہ چھین بھی نہیں سکتے، --- پس ایسی عاجز اور بے بس مخلوق کو حاجت روا سمجھ کر پکارنا اور اُن سے حاجتیں ایک مکھی مانگنا اور ان پر چڑھاوے چڑھانا کتنی بڑی حماقت اور سفاہت ہے --- فرمایا گیا تھا -- إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَّخْلُقُوا ذُبَابًا وَّلَوِاجْتَمَعُوا لَهٗ وَ إِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ. ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ." آگے فرمایا گیا تھا کہ ان کی اس گمراہی کی بنیاد خدا سے اُن کی ناآشنائی اور اس کی معرفت سے محرومی ہے۔ "مَاقَدَرُوْا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ."

بالکل یہی حال ہمارے زمانے کے تعزیہ پرستوں اور قبر پرستوں کا ہے، یہ بھی خدا کی معرفت سے محروم اور اس کی رحمت سے ناامید ہیں، اس لئے بجائے خدا کے تعزیوں اور قبروں کو سجدے کرتے ہیں اور اُن سے حاجتیں اور مرادیں مانگتے ہیں، ان کے لئے نذریں اور منتیں مانتے اور ان پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں --- قرآن مجید ان کو بھی پکار کے کہہ رہا ہے ---

"إِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِاجْتَمَعُوْا لَهٗ......

"مَاقَدَرُوْا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ."

اس کے بعد ایک آیت میں مقام رسالت کا بیان فرمایا گیا ہے۔ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ. إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ. مطلب یہ ہے کہ تمہارے یہ خود ساختہ معبود تو کچھ بھی نہیں، ہاں اللہ تعالیٰ جن ہستیوں کو منصب رسالت یعنی اپنی پیغامبری اور پیام رسانی کیلئے انتخاب فرماتا ہے خواہ وہ فرشتے ہوں یا انسان، وہ اللہ کے برگزیدہ اور صاحب مقام بندے ہوتے ہیں، لیکن خدائی میں دخیل و شریک وہ بھی نہیں ہوتے -- جو کچھ ہوتا ہے اللہ ہی کے حکم سے

ہوتا ہے اور سب کچھ اسی کے اور صرف اسی کے اختیار میں ہے، فرمایا "وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ"

اس کے بعد سورت کی یہ دو آیتیں ہیں جو اس وقت زیر درس ہیں، ان میں خطاب اور روئے سخن اہل ایمان اور امت مسلمہ کی طرف ہے اور ان کو ہدایت دی جارہی ہے کہ تم کو کیا کرنا ہے اور تمہارے لئے فلاح و کامیابی کی راہ کیا ہے اور تمہارا کیا مقام اور منصب ہے۔ ارشاد ہے۔ "يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوْا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ٥ یعنی اے ایمان والو! ایمان لانے کے بعد تمہارا سب سے اہم اور مقدم کام یہ ہے کہ رکوع و سجود یعنی نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبودیت کے رشتہ اور رابطہ کو مضبوط کرو اور اس کی عبادت میں سرگرم رہو اور دوسرے نیک اعمال بھی کرو، مثلاً بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے حقوق کی ادائیگی اور اہل حاجت کی خدمت و اعانت وغیرہ--- یہی تمہارے لئے سرمایۂ فوز و فلاح ہے---لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ٥

اس کے آگے فرمایا گیا ہے "وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط" ---یعنی نماز و عبادت اور دیگر اعمالِ خیر کے علاوہ یہ بھی کرو کہ اللہ کے لئے یعنی اُس کے احکام کی تعمیل میں اور اُس کے دین کے فروغ اور اس کی مرضیات کو پھیلانے کے لئے اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرو اور جان لڑا دو، جیسی جدوجہد اور جانبازی اس کا حق ہے، اُس اللہ نے تم پر یہ خاص الخاص انعام و احسان فرمایا ہے کہ اپنے دین کی امانت اور اس کی دعوت و خدمت کے لئے اور ختم نبوت کے بعد کارِ نبوت کی انجام دہی کے لئے دنیا بھر کے انسانی گروہوں میں سے اس نے تمہارا انتخاب فرمایا ہے اور پیغمبری کی نیابت کے مقام پر تم کو فائز فرمایا ہے، اور تم کو ایسا دین اور ایسی شریعت عطا فرمائی ہے۔ جس میں تنگی اور بیجا مشقت بالکل نہیں بلکہ وسعت اور سہولت ہے اور انسانوں کی کمزوریوں اور مجبوریوں کی پوری رعایت ہے۔ (وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ)

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے مِلَّةَ أَبِيْكُمْ إِبْرَاهِيْمَ ط یعنی خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو دین و شریعت اور جو ضابطۂ حیات تم کو عطا ہوا ہے یہ وہی ہے جو تمہارے پدر بزرگوار ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوا تھا۔ یہ تمہارا بہت بڑا شرف ہے اور اللہ تعالیٰ کا تم پر یہ عظیم انعام و احسان ہے کہ تم کو ملت ابراہیمی (مِلَّةَ أَبِيْكُمْ إِبْرَاهِيْمَ) کا حامل و وارث اور داعی بنایا گیا ہے، لہٰذا اس کی قدر کرو اور اس کا حق ادا کرنے کے لئے جان لڑا دو۔

یہاں شبہ ہو سکتا ہے کہ امت مسلمہ میں تو دنیا کی بہت سی نسلوں کے لوگ ہیں، سب تو

ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے نہیں ہیں، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سب کا باپ کیسے کہا گیا؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور آپ اُن کے نسلی فرزند ہیں تو آپ کی ساری اُمت بھی آپ کے رشتہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں داخل ہوگئی، اس حیثیت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پوری امت مسلمہ کے بھی پدرِ بزرگوار ہیں --- ایک دوسری بات یہ بھی کہی گئی تھی کہ اس آیت کے خاص مخاطب صحابہ کرام تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی براہِ راست دعوت پر ایمان لائے تھے اور ان میں بہت بڑی تعداد انہی حضرات کی تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے۔

آگے فرمایا --- "هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرا اشرف وامتیاز اے اہل ایمان تم کو یہ بخشا ہے کہ اگلے زمانوں اور اگلی کتابوں میں بھی اس نے تمہارا نام "مسلمین" رکھا اور اس آخری کتاب قرآن میں بھی یہی مبارک نام رکھا (جس کے معنی ہیں فرمانبردار اور اطاعت شعار) --- یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت محمدی کے لئے وفاداری اور فرمانبرداری کا سرٹیفکیٹ ہے، اور ساتھ ہی اس میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ تم ہماری رحمت اور نصرت کے مستحق اس وقت تک ہو جب تک تم فرمانبردار اور اطاعت شعار ہو۔

آگے فرمایا گیا ہے "لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" "شہید" کے معنی بتانے والے اور حاضر ونگراں کے بھی ہیں اور گواہ کے بھی، حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اس آیت میں شہید کا ترجمہ بتانے والا کیا ہے، یہاں یہی راجح معلوم ہوتا ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے اہل ایمان اللہ تعالیٰ نے تمہارے انتخاب اس کارِ عظیم کے لئے فرمایا ہے کہ اس کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم الٰہی دین وشریعت اور ملت ابراہیمی کی تم کو تعلیم دیں اور پھر تم یہ تعلیم وہدایت دنیا کے دوسرے انسانی گروہوں کو دو --- اس طرح ختم نبوت کے بعد نبوت کی نیابت والا کام یعنی اللہ تعالیٰ کے نازل فرمائے ہوئے دین وشریعت اور ابراہیمی ملت کو دنیا بھر کے انسانوں تک پہونچانے کی ذمہ داری قیامت تک کے لئے امت مسلمہ کے سپرد کردی۔ (لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ) --- اور بلاشبہ یہ بہت بڑی ذمہ داری اور بہت بھاری کام ہے اور یہ راستہ بڑا کٹھن ہے۔ اس لئے آخر میں فرمایا گیا۔ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ط هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ○ مطلب یہ ہے کہ اس بڑی ذمہ داری کو تم جب ہی ادا کرسکو گے جب ان تین چیزوں کو خاص طور سے اپنا کر

اللہ تعالیٰ سے خاص رابطہ اور تعلق پیدا کرلو اور اس قادر مطلق کی حمایت و سرپرستی حاصل کرلو۔ ایک یہ کہ نماز کا بہت اہتمام کرو اور اسی طرح ادائے زکوٰۃ کا اہتمام کرو۔ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ اور تیسرے یہ کہ اللہ سے پوری طرح وابستہ ہوجاؤ اور اس کی خاص ولایت و سرپرستی حاصل کرلو وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ط ھُوَ مَوْلٰکُمْ جب تم ان چیزوں کو پوری طرح اپنالو گے اور اپنا وظیفہ حیات بنالو گے تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت قاہرہ کے ساتھ تمہارا حامی و والی اور مددگار ہوگا۔ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ۝ اور پھر تم نیابت نبوت کی ذمہ داری ادا کرنے میں کامیاب ہوسکو گے۔

اب یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آ گئی کہ سورۂ حج کی ان دو آخری آیتوں میں امت مسلمہ کا مقام و منصب اور نصب العین اور لائحہ عمل مرتب طور پر بیان فرمادیا گیا ہے۔ صحابہ کرام کی زندگی (جو آج بھی کتابوں میں محفوظ ہے) ان آیتوں کی عملی تفسیر تھی اور قدم قدم پر ''ھُوَ مَوْلٰکُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ'' کا ظہور ہوتا تھا لیکن آج جو ''مسلمان قوم'' موجود ہے اس میں ۹۹ فیصدی سے زیادہ وہ ہیں جن کا ''امت مسلمہ'' کے اس نصب العین اور لائحہ عمل سے کوئی تعلق نہیں یا بس برائے نام تعلق ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اُس نصرت و سرپرستی سے محرومی ہے اور مرنے کے بعد اس کا جو نتیجہ سامنے آنے والا ہے وہ تو بہت ہی سخت ہے ''وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَۃِ اَشَدُّ وَاَبْقٰی'' اللہ تعالیٰ ہمارے اندر اصلاح کی فکر پیدا فرمائے اور سچی توبہ کی توفیق دے۔

اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہدایت ملی ہے کہ امت مسلمہ کا سب سے مقدم فریضہ اور بنیادی کام یہ ہے کہ اقامت صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعتصام و وابستگی کا اہتمام ہو یہی دنیا و آخرت کی فلاح کا وسیلہ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت اور اس کی ولایت کے حصول کا ذریعہ ہے۔۔۔ کس قدر فکر کی بات ہے کہ آج امت کی غالب اکثریت ان بنیادی ایمانی فرائض سے اسی طرح غافل ہے جس طرح اگلی امتیں یہود و نصاریٰ غافل ہو چکے ہیں۔۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ ''مسلمان قوم'' کو ''خیر امت'' کا مصداق سمجھنا بہت بڑا دھوکا ہے۔ اس وقت کا سب سے اہم فریضہ اور مقبول ترین جہاد یہ ہے کہ عام مسلمانوں میں اس کا احساس و شعور پیدا کرنے کی اور اس بگاڑ کے اصلاح کی فکر اور کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین وسلام علی المرسلین.

سورۃ المؤمنون

درس — ۲۴

درس ۲۴

کامل فلاحیابی کے لئے خداوندی منشور
جنت الفردوس کے وارثوں کی لازمی صفات

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ o
وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ
فَاعِلُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ o اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ
اَوْ مَامَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ o فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ
ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْعٰدُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ
رَاعُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ o اُولٰٓئِکَ هُمُ
الْوَارِثُوْنَ o الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ط هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ o

(سورہ المومنون آیات ۱ تا ۱۱)

(ترجمہ) یقیناً فلاحیاب اور کامیاب ہیں وہ ایمان والے جو اپنی نمازیں خشوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور جو لغو وفضول (باتوں اور کاموں) سے الگ اور دور رہنے والے ہیں اور جو اپنے (اعمال واخلاق کا) تزکیہ کرنے والے ہیں، اور جو اپنی جائے شہوت کی حفاظت کرتے (اور اُس پر کنٹرول رکھتے) ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور مملوکہ باندیوں کے (کہیں شہوت رانی نہیں کرتے) تو اُن پر (بیویوں اور شرعی باندیوں سے تقاضائے شہوت پورا کرنے کی بناپر کوئی) ملامت اور سرزنش نہیں، ہاں جو اس کے سوا (حرام محل میں شہوت رانی کے طلبگار اور خواہشمند ہوں تو وہ (اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے) نکلنے والے (اور سخت

مجرم) ہیں، اور (وہ اہل ایمان) جو اپنے ذمہ لی ہوئی امانتوں اور اپنے عہد معاہدوں کی رعایت اور نگہداشت رکھنے والے ہیں، اور وہ جو اپنی نمازوں کی پابندی اور اہتمام کرتے ہیں۔ وہی لوگ وارث ہونے والے ہیں، جو جنت الفردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر وتشریح

یہ سورۂ ''مومنون'' شروع ہوئی۔ اور اٹھارواں پارہ بھی یہیں سے شروع ہوا، یہ بات میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ سورتوں کی تقسیم اور حد بندی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھی، چنانچہ حدیثوں میں سورتوں کے نام آتے ہیں لیکن پاروں کی یہ تقسیم حضور کے زمانہ میں نہیں تھی، بعد میں کسی زمانہ میں غالباً روزانہ تلاوت کا حساب کسی درجہ میں برابر کرنے کے لئے اور مہینے میں دور ختم کرنے کے لئے قرآن پاک کو تیس پاروں میں تقسیم کرلیا گیا ہے۔ میں یہ بھی تحقیق نہیں کرسکا کہ یہ کس زمانہ میں ہوا اور کس نے کیا۔ اور میں یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ اس تقسیم میں کیا اصول اور کیا معیار استعمال کیا گیا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ سب پاروں کے الفاظ وکلمات یا آیتیں برابر ہوں، بلکہ کم وبیش کا اچھا خاصا فرق ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم میں کسی مضمون کے شروع ہونے یا ختم ہونے کا بھی کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ مثلاً پانچواں پارہ "وَالْمُحْصَنَاتُ'' کے لفظ سے شروع ہوتا ہے حالانکہ یہ پہلے کلام کا جز ہے اور اگر اِس سے پہلی آیت کے ساتھ اس کو ملا کر نہ پڑھا جائے تو اس کے کوئی معنی ہی نہیں بنتے اور مثلاً چودھواں پارہ "رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' سے شروع ہوتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے صرف چند لفظوں کی ایک چھوٹی سی آیت ہے جس سے سورۂ ''حِجر'' شروع ہو رہی ہے۔ غور کرنے کے باوجود نہیں سمجھ سکا کہ اسی پہلی آیت سے چودھواں پارہ شروع کیوں نہیں کیا گیا۔

بہر حال جس نے بھی یہ تقسیم کی ہو اُس نے کوئی اصول اور معیار ضرور سامنے رکھا ہوگا اگرچہ میں اس کا علم حاصل نہیں کرسکا اور یہ واقعہ ہے کہ اِس تقسیم سے عوام کے لئے تلاوت کا نظام آسان ہوگیا، اللہ تعالیٰ اُن کو جزائے خیر دے۔

یہ پاروں کی تقسیم کی بات تو یوں ہی ضمناً گفتگو میں آگئی، میں عرض یہ کر رہا تھا کہ آج

درس میں سورۂ مؤمنون شروع ہوئی ہے اور میں نے جو آیتیں تلاوت کی ہیں یہ اُس کی ابتدائی دس گیارہ آیتیں ہیں۔ ان میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں کے لئے فلاح و کامیابی کا پورا نصاب بیان فرما دیا گیا ہے اور یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت مسلمہ کے لئے حصولِ فلاح کا جامع اور مکمل منشور ہے۔ اس لئے یہ آیتیں بڑی اہم ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، تو آپ ﷺ نے ایک خاص کیفیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اُس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھ پر اس وقت ایسی دس آیتیں نازل ہوئی ہیں کہ جو شخص اُن پر پورا عمل کر لے تو سیدھا جنت میں جائے گا، پھر آپ ﷺ نے یہ آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ (۱)

خشوع اور نماز

اِن آیتوں کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے وہ بندے فلاحیاب اور آخرت میں جنت الفردوس کے وارث ہوں گے جو ایمان لانے کے ساتھ وہ چند ایمانی صفات اپنے اندر پیدا کرلیں جن کا اِن آیتوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں پہلی صفت اور پہلی چیز ہے خشوع کی کیفیت کے ساتھ نماز ادا کرنا۔ فرمایا گیا ہے۔ ''**قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ**'' عربی زبان میں ''خشوع'' کے معنی ہیں سکون اور پستی و فروتنی اور یہاں اس سے وہ کیفیت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کے جلال اور ہیبت کی وجہ سے بندے کے ظاہر و باطن پر طاری ہوتی ہے جس کی وجہ سے دل بھی خشیت و انابت اور تذلل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کے اثر سے ظاہری جسم پر بھی سکون اور فروتنی اور نیاز مندی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، یہ خشوع نماز کی روح ہے، یہ جس درجہ میں کسی کو نصیب ہو اُسی درجہ میں اُس کی نماز کامل اور مقبول ہے اور اس میں جتنی کمی ہو اتنا ہی نماز میں قصور اور نقصان ہے۔ ہماری اور خاصانِ خدا کی نمازوں میں بظاہر تو کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ وہ جس طرح نمازوں میں دست بستہ قبلہ رو کھڑے ہوتے ہیں اور رکوع و سجود کرتے ہیں اور قرآن مجید اور التحیات اور درود شریف وغیرہ پڑھتے ہیں وہی سب ہم بھی کرتے ہیں اور اسی طرح ہم بھی سب کچھ پڑھتے

(۱) تفسیر ابن کثیر بحوالہ المسند احمد (مرتب)

ہیں لیکن فی الحقیقت ہماری اور ان کی نمازوں میں شاید زمین وآسمان سے بھی زیادہ فرق ہوتا ہے اور وہ خشوع ہی کی کیفیت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو ہم حاصل نہ کر سکتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ بندوں سے کسی ایسی چیز کا مطالبہ بھی نہیں کرتا جو اُن کے اختیار سے باہر ہو۔ اللہ کا جو بندہ بھی اس کی فکر وکوشش کرے گا اور نماز دھیان کے ساتھ اور خشوع کی کیفیت کے ساتھ پڑھنے کا اہتمام کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق یہ کیفیت ضرور نصیب فرمادے گا۔

بعض اکابر علماء نے لکھا ہے کہ ہر شخص کو اس کی کوشش ضرور کرنی چاہئے کہ کم از کم نماز شروع کرتے وقت دل خشوع کی کیفیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو، اور اسی طرح نماز کے خاتمہ کے وقت دل متوجہ ہو، اگر اتنا بھی ہوا تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں خشوع والے بندوں کے ساتھ شامل فرمادے گا اور انشاء اللہ اس میں ترقی بھی ہوتی رہے گی۔

بہرحال کامل فلاح وکامیابی اور جنت الفردوس حاصل کرنے کی پہلی شرط ایمان کے بعد یہ ہے کہ نماز خشوع کی کیفیت کے ساتھ ادا کرنے کی عادت ڈالی جائے اور اس کا اہتمام کیا جائے۔ (قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ)

اس کے بعد فلاحیابی کی دوسری شرط اور دوسری صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے۔
"وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ" "لغو" ہر وہ بات اور ہر وہ کام ہے جس میں خیر اور منفعت کا کوئی پہلو نہ ہو، ایسی باتوں اور ایسے کاموں کو ہم آپ بھی "لغو" ہی کہتے ہیں۔ تو فرمایا گیا ہے، وہ اہل ایمان فلاحیاب ہوں گے جو نمازیں خشوع کی کیفیت سے ادا کرنے کے ساتھ "لغو" کاموں سے اپنے کو بچانے اور دور رکھنے کی بھی فکر رکھتے ہوں۔ اور ظاہر ہے جو آدمی لغو اور فضول باتوں اور کاموں سے پرہیز کرے گا وہ گناہ کی باتوں اور گناہ کے کاموں سے اور زیادہ دور رہے گا۔ تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ کامل فلاح کا مقام حاصل ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ بندہ گناہوں کے علاوہ لغویات وفضولیات سے بھی اپنے کو بچائے۔ (وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ)۔ اور حدیث شریف میں ہے۔ "مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَایَعْنِیْهِ" یعنی آدمی کے ایمان واسلام کا حسن وکمال یہ ہے کہ جس چیز میں کوئی خیر اور نفع نہ ہو وہ اس کو ترک کردے اور اُس میں مشغول نہ ہو۔

فعل زکوٰۃ کا مطلب

اِس کے بعد کامل فلاحیابی کی تیسری شرط اور فلاح پانے والوں کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ " وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکوٰۃِ فَاعِلُوْنَ" جس کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ ''جو بندے زکوٰۃ کا عمل کرتے ہیں'' یہاں'' زکوٰۃ کے لفظ سے وہ ''زکوٰۃ'' بھی مراد ہوسکتی ہے جو اسلام کا تیسرا رکن ہے اور جس کو سب جانتے ہیں، اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ فلاحیابی کی شرط وہ بھی ہے کہ شریعت کے حکم اور قانون کے مطابق اللہ کے دیئے ہوئے مال کی زکوٰۃ نکالی جائے (اس صورت میں اس آیت کا تعلق صرف اُن لوگوں سے ہوگا جن پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے)

اور ''زکوٰۃ'' کے اس لفظ سے نفس کا اور اعمال واخلاق کا تزکیہ بھی مراد ہوسکتا ہے، قرآن پاک میں یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ سورۂ کہف میں فرمایا گیا ہے ''فَأَرَدْنَا أَنْ یُّبْدِلَھُمَا رَبُّھُمَا خَیْراً مِّنْهُ زَکوٰۃً وَّاَقْرَبَ رُحْماً'' اِس آیت میں ''زکوٰۃ'' کے معنی نفس کی پاکیزگی ہی کے ہیں۔ اور ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا'' اور ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی'' میں بھی ''زکوٰۃ'' کا مادّہ تزکیہ نفس ہی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ بلکہ مال کی جو ''زکوٰۃ'' نکالی جاتی ہے اُس کا نام اسی لئے زکوٰۃ رکھا گیا ہے کہ اُس سے مال پاک ہوجاتا ہے اور نکالنے والے کے نفس کا بھی تزکیہ ہوجاتا ہے۔ سورۂ توبہ میں فرمایا گیا ہے ''خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَةً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا''۔ الغرض سورۂ مؤمنون کی اس آیت ''وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکوٰۃِ فَاعِلُوْنَ'' میں ''زکوٰۃ'' کے معنی نفس اور اعمال واخلاق کے تزکیہ کے بھی ہوسکتے ہیں اور اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کامل فلاح اُن بندوں کو حاصل ہوگی جو ایمان اور نماز میں خشوع اور لغویات وفضولیات سے دور رہنے کے ساتھ اپنے نفس اور اعمال واخلاق کے تزکیہ کا اہتمام بھی کرتے ہوں۔ اور یہی مطلب میرے نزدیک راجح ہے، اس کا ایک قرینہ تو یہ ہے کہ مال کی زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے قرآن مجید میں عام طور سے ''اِیْتَاءِ الزَّکوٰۃ'' کا عنوان استعمال کیا گیا ہے، ''فعل زکوٰۃ'' کا عنوان کہیں نہیں استعمال کیا گیا ''آتُوا الزَّکوٰۃَ'' بیسیوں جگہ فرمایا گیا ہے، ''اِفْعَلُوْا الزَّکوٰۃَ'' ایک جگہ بھی نہیں فرمایا گیا اور ذوق بھی اس کو قبول نہیں

کرتا، دوسرا ایک قرینہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں بھی کسی سلسلہ مضمون میں ''نماز اور زکوٰۃ'' دونوں کا ذکر کیا گیا ہے تو اِن دونوں کا ذکر بلا فصل کیا گیا ہے اور قرآن پاک سے اور احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن دونوں میں ایسا رابطہ ہے کہ گویا یہ دونوں ''توأم'' (جڑواں بہنیں) ہیں، پس اگر اس آیت میں ''زکوٰۃ'' سے مراد ہی مالی زکوٰۃ ہوتی جو ایمان اور نماز کے بعد اسلام کا تیسرا رکن ہے تو سورۃ کی پہلی آیت ''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ'' کے ساتھ متصلاً یہ آیت آنی چاہئے تھی '' وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ''. بہر حال اِن وجوہات سے یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں ''زکوٰۃ'' سے مراد نفس اور اعمال واخلاق کا تزکیہ ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کامل فلاح وکامیابی ان بندوں کو حاصل ہوگی جو ایمان اور نماز میں خشوع اور لغویات وفضولیات سے دور رہنے کے ساتھ اپنے نفس کو رزائل اور گندے جذبات سے اور اپنے اعمال واخلاق کو ریا وغیرہ کی آمیزش سے پاک کرنے کا اہتمام کرنے والے ہوں، اور اس صورت میں اس آیت کا تعلق ماقبل ومابعد کی ساری آیتوں کی طرح تمام اہلِ ایمان سے ہوگا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا یہی بات دل کو زیادہ لگتی ہے۔

آگے فلاحیابی کی چوتھی شرط اور فلاح پانے والوں کی چوتھی صفت یہ بیان کی گئی ہے ''وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ''. واقعہ یہ ہے کہ جو بداعمالیاں بہت سے اچھے خاصے بندوں کو فلاح سے محروم کر دیتی ہیں ان میں بہت خطرناک وہ جنسی بداعمالیاں ہیں جن میں شہوتِ نفس کے بحرانی تقاضے سے کبھی کبھی مبتلا ہو جاتا ہے، مثلاً زنا اور لواطت وغیرہ، تو اس قسم کے فواحش سے پرہیز بھی فلاحیابی کے شرائط میں سے ہے، اس کے لئے قرآن پاک کی اس آیت میں عنوان یہ استعمال کیا گیا ہے کہ وہ اپنی شہوتِ نفس کی حفاظت ونگہداشت اور اُس پر کنٹرول رکھتے ہوں۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ اپنی منکوحہ بیویوں اور شرعی باندیوں کے ساتھ اس فطری تقاضے کو پورا کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس پر کوئی ملامت نہ ہوگی۔ ہاں اگر کسی نے اس جائز حد سے تجاوز کیا اور حرام محل میں شہوت رانی کی تو وہ خدا کے قانون کا باغی ومجرم ہے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو باغیوں اور مجرموں کے ساتھ ہونا چاہئے۔ (اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ، فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ''

اَمانت اور عہد کا مفہوم

آگے پانچویں شرط فلاحیابی کی یا کہیے کہ پانچویں صفت کامل فلاح پانے والے اہل ایمان کی یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ "وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ" "امانت" اور "عہد" یہ دونوں لفظ ایسے ہیں جو ہماری اردو زبان میں بھی مستعمل ہیں لیکن ہماری زبان اور ہمارے محاورہ میں اِن کا مفہوم بہت محدود ہوگیا ہے۔ قرآن مجید کی اور دین کی اصطلاح میں امانت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ ہم پر اور ہمارے ذمہ کسی کا جو حق ہے خواہ خدا کا ہو یا کسی بندے کا، اور خواہ مالی ہو یا غیر مالی اور ہم پر جو ذمہ داری عائد ہے وہ امانت ہے اور اس کو صحیح طور پر ادا کرنا ہم پر واجب ہے۔ مثلاً شوہر کا بیوی پر اور بیوی کا شوہر پر اور چھوٹوں کا بڑوں پر، بڑوں کا چھوٹوں پر جو حق ہے اسی طرح آقا کا نوکروں اور نوکروں مزدوروں کا آقا پر جو حق ہے، علیٰ ہٰذا حکمرانوں کا عوام پر اور عوام کا حکمرانوں پر جو حق ہے یہ سب حقوق "امانت کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں اور کامل فلاح کی یہ بھی شرط ہے کہ یہ حقوق دیانتداری کے ساتھ ادا کئے جائیں۔ اسی طرح "عہد" کا مفہوم بھی وسیع ہے، آپس کے سارے عہد معاہدے، خواہ وہ مالیات سے متعلق ہوں یا دوسرے شعبوں سے اور اسی طرح خدا سے کیا ہوا عہد، سب اس میں شامل ہیں۔ مثلاً کلمہ شریف پڑھ کر ایمان لانا اس بات کا عہد ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہیں کریں گے اور اللہ و رسول کے احکام کی فرماں برداری کریں گے۔ اگر ہم اس کے خلاف کرتے ہیں تو ہم نے عہد شکنی کی اور ہم مجرم ہیں۔ بہر حال اس آیت میں کامل فلاح پانے والے اہل ایمان کی پانچویں صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ امانت کے ادا کرنے اور عہد کو پورا کرنے میں سچے پکے ہوتے ہیں۔ (وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ) "امانت" کے بارے میں ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا" (یعنی اللہ کا تم کو حکم اور فرمان ہے کہ جس کی جو امانت ہو اور جو حق ہو اس کو ادا کرو)۔ اور "عہد" کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ "وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا"۔ (یعنی جو عہد معاہدہ تم نے کیا ہے اس کو پورا کرو، آخرت میں اُس کی تم سے باز پرس ہوگی اور ہر عہد کے بارے میں تمہیں خدا کے حضور میں جواب دینا ہوگا۔

اور غالباً حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ بہت کم ایسا ہوا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ اور وعظ ارشاد فرمایا ہو اور اُس میں یہ نہ فرمایا ہو کہ:

"لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ"(۱)

(جس میں امانت کی صفت نہیں اُس میں ایمان نہیں اور جو عہد معاہدہ کا پابند نہیں اس کا دین میں حصہ نہیں)

قرآن پاک کی آیات اور حضور ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ ادائے امانت اور وفائے عہد ایمان کے لوازم اور ہمارے فرائض و واجبات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق دے کہ دین کے اِن احکام کی اہمیت اور سنگینی کو سمجھیں۔

اس کے بعد چھٹی اور آخری صفت فلاح پانے والے اہل ایمان کی یہ بیان فرمائی گئی ہے، "وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ" (کہ وہ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں) اس محافظت علی الصلوٰۃ سے مراد بظاہر نماز کی پابندی اور احکام و شرائط کے مطابق اس کے ادا کرنے کا اہتمام ہے۔ جس میں جماعت کی پابندی اور مسجد میں ادا کرنے کا اہتمام بھی شامل ہے۔

ایمانی صفات و اعمال میں نماز کا امتیاز اور اُس کی تاثیر

کامل فلاحیابی کی پہلی شرط اور فلاح پانے والے اہل ایمان کی پہلی لازمی صفت شروع کی آیت میں خشوع کی کیفیت کے ساتھ نماز ادا کرنے کو بتلایا گیا تھا، اور آخری شرط اور آخری صفت اِس آیت میں محافظۃ علی الصلوٰۃ یعنی نمازوں کو سنن و آداب وغیرہ کی رعایت کے ساتھ اہتمام اور پابندی سے ادا کرنے کو بتلایا گیا۔ گویا ایمان کے بعد نماز کو ظاہر و باطن کے لحاظ سے بہتر طریقہ سے ادا کرنا اور اس کا خاص اہتمام کرنا فلاحیابی کی اول و آخر شرط ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم نماز، خشوع کی کیفیت کے ساتھ اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کی مطابق پابندی اور اہتمام سے ادا کریں تو اللہ کی توفیق سے ہمارا ظاہر و باطن سب درست ہو جائے اور فلاحیابی کے لئے جو دوسری صفات شرط اور مطلوب ہیں ہمارے اندر وہ بھی پیدا ہو جائیں۔

امام مالک نے اپنی مؤطا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک مراسلہ اور گشتی فرمان نقل

---

(۱) مشکوٰۃ، کتاب الایمان، بحوالہ شعب الایمان۔

کیا ہے جو انہوں نے اپنے دورِ خلافت میں اسلامی قلمرو کے تمام والیوں اور ذمہ دار حاکموں کو بھیجا تھا، اس کے الفاظ مجھے یہ یاد رہ گئے ہیں۔

"ان اھمّ امرکم عندی الصلوٰۃ فمن حفظھا وحافظ علیھا فقد حفظ دینہ ومن ضیعھا فھو لما سواھا اضیع"(۱)

میرے نزدیک تمہارے کاموں میں سب سے زیادہ اہم نماز ہے۔ جس نے اس کی نگہداشت اور پابندی کی اُس نے اپنے دین کو محفوظ کرلیا اور جس نے نماز کو ضائع کیا وہ اس کے سوا دوسرے کاموں کو (جو اس کے ذمہ ہیں) اور زیادہ خراب و برباد کرے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ دینی نظام میں یا یوں کہیے کہ انسانوں کی دینی اور ایمانی زندگی کے نظام میں نماز کی حیثیت وہ ہے جو ہمارے وجود میں اور ہمارے زندگی کے نظام میں قلب اور دل کی ہے، کہ اگر وہ ٹھیک ہے تو ہماری زندگی کا نظام ٹھیک ہے اور اگر اُس میں خرابی آئی تو ہماری زندگی کے نظام میں ضرور خرابی آئے گی، اور اگر اُس کی حرکت بند ہوئی تو زندگی ہی ختم ہو جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث روایت کی گئی جس کا مضمون یہ ہے کہ قیامت میں بعض لوگوں کے اعمال کی جانچ اس طرح ہوگی کہ ان کی بس نماز دیکھ لی جائے گی، جس کی نماز صحیح اور ٹھیک ہوگی اس کے لئے فیصلہ کردیا جائے گا کہ اس کی زندگی ٹھیک ہے اور یہ نجات اور جنت کا مستحق ہے۔

ہماری اس دنیا میں اس کی مثال یہ ہے کہ پرانے زمانہ میں جو صاحبِ فن اور طبیب اور طب و حکمت کے ماہرین ہوتے تھے، آپ لوگوں نے بھی سنا ہوگا کہ وہ صرف نبض دیکھ کر انسانی جسم کی ساری بیماریوں کا پتہ چلاتے تھے اور ان کا علاج کرتے تھے۔ نبض کا تعلق سارے جسم سے نہیں ہے بلکہ صرف قلب سے ہے اور اس سے بس قلب ہی کی حالت اور کیفیت کا پتہ چلتا ہے، تو وہ پرانے طبیب نبض کے ذریعہ قلب کی حالت کو سمجھ کر سارے جسم کی صحت اور بیماری کے بارے میں رائے قائم کر لیتے تھے۔ اس سلسلہ میں عجیب و غریب قصے مشہور ہیں۔ اور طبیبوں حکیموں کے تذکروں میں لکھے ہوئے ہیں آپ حضرات نے بھی سنے ہوں گے، ایک واقعہ خود میرا چشم دید اور ذاتی تجربہ ہے، قریباً پینتالیس سال پہلے کی بات ہے میرے بڑے

(۱) مؤطا۔ وقوت الصلوٰۃ ص ۲۱ (مرتب)

بھائی مولوی محمد حسن صاحب جو مجھ سے قریباً دس سال بڑے ہیں اور الحمد للہ حیات ہیں۔(۱) گردے کے درد کی تکلیف میں مبتلا ہوئے، مرض نے بہت طول کھینچا، مقامی طور پر جو علاج ممکن تھا وہ سب ہوا لیکن مرض نہیں گیا تو علاج کے لئے لکھنؤ آئے، یہاں میڈیکل کالج میں کافی دنوں داخل رہے کئی دفعہ ایکسرے کیا گیا، ڈاکٹروں نے کہا کہ ایکسرے سے تو گردے میں پتھری کا پتہ نہیں چلتا لیکن ہماری رائے یہی ہے کہ پتھری ہے اور درد اسی کی وجہ سے ہے، اس لئے آپریشن کرانا چاہئے۔ بھائی صاحب اس کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔ اس کے بعد علاج کے لئے دہلی گئے۔ میں بھی ساتھ گیا، اس وقت دہلی میں سب سے بڑے طبیب حکیم اجمل خاں مرحوم کے چچازاد بھائی حکیم محمد احمد خاں سمجھے جاتے تھے، جن کے متعلق مشہور تھا کہ نبض سے مرض پہچاننے میں وہ حکیم اجمل خاں صاحب سے بھی فائق ہیں۔ ہم ان کے مطب میں گئے تو دیکھا کہ مریض صف بہ صف حلقہ بنائے بیٹھے ہیں، جس کا نمبر آتا ہے وہ ہاتھ بڑھا دیتا ہے، حکیم صاحب اس کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھ کر نبض دیکھتے ہیں اور فوراً نسخہ بول دیتے ہیں جو ان کے شاگرد لکھ کر مریض کے حوالہ کردیتے ہیں کسی مریض کو اپنا حال بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتے، کبھی کسی مریض سے خود ہی کوئی بات پوچھ لیتے ہیں اور بس چند سکنڈ میں یہ سب کچھ ہوجاتا ہے۔ ان کے اس طریقہ پر طبیعت مطمئن نہیں ہوئی، ہم لوگ ان کا مطب اور یہ عجیب وغریب طریقہ دیکھ کر واپس آگئے، اور اس طرح ان کا علاج کرانے پر دل راضی نہیں ہوا۔ لیکن ان کی مہارت کی شہرت کی وجہ سے جی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کا علاج کرائیں۔ ''جید برقی پریس دلی'' کے مالک حکیم ذکی احمد خاں صاحب جو خود بھی دلی کے بڑے طبیبوں میں تھے حکیم اجمل خاں صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری رہے تھے ان کا حکیم محمد احمد خاں صاحب سے برادرانہ سا تعلق تھا اور میری اپنی کتابوں کی طباعت کے سلسلہ میں ان سے کچھ شناسائی تھی اور علم دین کی نسبت سے وہ میرا لحاظ بلکہ اکرام فرماتے تھے۔ میں اُن کے پاس پہنچا اور اُن سے کہا کہ حکیم صاحب! مجھے آپ سے ایک بہت نامناسب درخواست کرنی ہے۔ میرے بڑے بھائی صاحب مریض ہیں، میں علاج کے لئے ان کو یہاں لے کر آیا ہوں اور حکیم محمد احمد صاحب کا ہم لوگ علاج کرانا چاہتے ہیں مگر یہ چاہتے ہیں کہ وہ مریض کا کچھ حال

---

(۱) یہ ۱۹۷۵ء کی بات ہے جب کہ وہ حیات تھے۔ غفر اللہ لہٗ (مرتب)

سن لیں، حکیم صاحب نے کہا کہ ان کا یہ طریقہ نہیں اور وہ بہت بے ڈھب آدمی ہیں، آپ ایسا کیجئے کہ مختصر حال لکھ کر مجھے دے دیجئے، میں آپ کے ساتھ ان کے مطب میں چلوں گا اور خود ان سے حال بیان کروں گا۔ اگلے دن ہم لوگ حکیم ذکی احمد خاں صاحب کے ساتھ اُن کے مطب میں پہونچ گئے۔ بھائی صاحب وہاں کے قاعدے کے مطابق مریضوں کے حلقہ میں بیٹھ گئے۔ جب اُن کی باری آئی حکیم محمد احمد صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور فوراً نسخہ بول دیا، جس میں صرف دو دوائیں تھیں، جو مجھے اب تک یاد ہیں۔ برگ کسوندی، فلفل سیاہ۔ حکیم ذکی احمد خاں صاحب جو پیچھے بیٹھے تھے انہوں نے کہا اِن مریض کے بارہ مجھے کچھ کہنا ہے۔ حکیم صاحب بولے فرمایئے! حکیم ذکی احمد خاں صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ گردہ میں پتھری ہے، حکیم محمد احمد خاں صاحب نے زور سے ڈانٹ کر کہا ''غلط کہتے ہیں، نبض نہیں کہتی'' بالکل یہی اُن کے لفظ تھے۔ انہوں نے دوبارہ نبض بھی نہیں دیکھی اور نسخہ وہی رہا، برگِ کسوندی، فلفل سیاہ۔ کسوندی ایک جھاڑی ہے جو جنگل میں ہوتی ہے اُس کے دو پتے اور سیاہ مرچ کے سات دانے، بس یہی نسخہ تھا۔ اللہ کی شان کہ اسی سے بھائی صاحب کو اُس وقت صحت ہوگئی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ نبض کا تعلق صرف قلب سے ہے تو سمجھنا چاہئے کہ محمد احمد صاحب نے نبض ہی سے معلوم کرلیا کہ قلب کی وہ حالت نہیں ہیں جو گردے میں پتھری کی صورت میں ہونی چاہئے اسی لئے انہوں نے یقین کے ساتھ کہہ دیا ''گردے میں پتھری نہیں ہے نبض نہیں بتلاتی''۔

بس یونہی سمجھئے کہ نماز دینی زندگی کے نظام کا قلب ہے اگر وہ خشوع کے ساتھ ادا ہوتی ہے اور اس کے بارہ میں جو احکام ہیں اور جو اس کے شرائط اور آداب ہیں اُن کا اہتمام کیا جاتا ہے تو دین کا قلب درست ہے۔ دینی اعمال میں یہ شان صرف نماز کی ہے۔ اس لئے ان آیتوں میں کامل فلاح اور حصولِ جنت کا جو منشور فرمایا گیا ہے اُس میں سب سے پہلے بھی نماز کی بات کہی گئی ہے اور سب سے آخر میں بھی نماز کے لئے فرمایا گیا ہے۔ ''وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ'' تو جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا نماز کی محافظت اور اس کے اہتمام میں یہ سب داخل ہے کہ اس کے لئے طہارت اور وضو اور لباس وغیرہ کا وہ اہتمام کیا جائے جو شریعت میں بتلایا گیا ہے، اگر کوئی عذر اور مجبوری نہ ہو تو جماعت سے اور مسجد میں ادا کی جائے،

اور جو کچھ اس میں پڑھا جاتا ہے اور اُس کے ارکان رکوع وسجود وغیرہ کے ادا کرنے کا جو صحیح اور مسنون طریقہ ہے اس کو اہتمام سے سیکھا جائے اور اپنے امکان کی حد تک سنّت کے مطابق بہتر سے بہتر طریقہ پر نماز ادا کرنے کی کوشش کی جائے، حدیث شریف میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "صَلُّوا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ" تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو، تو یہ سب باتیں "وَهُمْ عَلٰی صَلٰوتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ" میں آ گئیں۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "اُولٰٓئِکَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ" یعنی وہ اہل ایمان جن میں یہ صفات ہوں جن کا اوپر کی آیتوں میں ذکر کیا گیا۔ یعنی وہ نماز خشوع کی کیفیت کے ساتھ ادا کرتے ہوں۔ فضولیات ولغویات سے بھی الگ رہتے ہوں اور اپنے نفس واخلاق کا تزکیہ کرتے ہوں، شہوت نفس کا تقاضا پورا کرنے میں اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کی پابندی کرتے ہوں، اور امانتوں اور ذمہ داریوں کے ادا کرنے اور عہد معاہدوں کے پورا کرنے کا اہتمام رکھتے ہوں اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہوں تو یہ اہل ایمان "جنت الفردوس" کے وارث ہوں گے وہ ان کی میراث ہے (اُولٰٓئِکَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ) حدیثوں میں بیان کیا گیا ہے کہ جنت میں مختلف درجے اور طبقے ہیں اور "فردوس" اس کا ممتاز اور اعلیٰ درجہ ہے۔

جنت کے لئے وراثت کی تعبیر

اللہ تعالیٰ ایمان اور اعمال صالحہ کے صلہ میں اپنے بندوں کو جو جنت عطا فرمائے گا اُس کے لئے قرآن مجید میں متعدد جگہ یہ عنوان اختیار فرمایا گیا ہے کہ ہم ان کو جنت کا وارث بنائیں گے اور وہ جنت کے وارث ہوں گے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔ "تِلْکَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ کَانَ تَقِیًّا" دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔ "وَنُوْدُوْا اَنْ تِلْکُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ" اس تعبیر میں بڑی لطافت ہے۔ ہماری اس دنیا میں تجارت اور کاروبار وغیرہ کے ذریعہ آدمی جو کچھ حاصل کرتا اور کماتا ہے وہ یقینی نہیں ہے، تجارت میں کبھی خسارہ بھی ہو جاتا ہے، اسی طرح کھیتی باڑی اور کاشتکاری وغیرہ کا نتیجہ بھی مشکوک ہے، بارش نہ ہونے یا کسی اور حادثہ کی وجہ سے کبھی کبھی کھیتی بالکل تباہ ہو جاتی ہے، لیکن وراثت کے ذریعہ جو

کچھ ملتا ہے وہ بالکل یقینی ہے اور اس کے لئے محنت مشقت بھی نہیں اٹھانی پڑتی تو ان آیتوں میں جنت کو اللہ کے نیک بندوں کو جنت کا ملنا بالکل یقینی ہے اس میں کوئی شک وشبہ نہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہوگی، اس کے حاصل کرنے کے لئے وہاں کوئی محنت مشقت نہیں کرنی ہوگی، دنیا میں جو نیک اعمال بندے کرتے ہیں وہ تو بندگی کا وظیفہ ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں دنیا میں ملی ہوئی ہیں، اس دنیا والے ہمارے اعمال تو اس کی بھی قیمت نہیں ہیں، جنت تو گویا صرف انعام کے طور پر ملے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا انتہائی کرم ہے کہ وہ اپنے نیک بندوں کو جنت کا وارث اور وارثوں کی طرح حقدار اور جاگیردار قرار دیتا ہے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے "ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ" یعنی وہ بندے اُس جنت الفردوس میں ہمیشہ رہیں گے، قرآن مجید میں جابجا اہل جنت کو یہ بشارت سنائی گئی ہے "ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ" غور کیا جائے ان دو لفظوں میں کتنی بڑی بشارت ہے کہ وہ ابدالآباد تک جنت میں رہیں گے، نہ کبھی وہ خود فنا ہوں گے اور نہ جنت کبھی فنا ہوگی۔

"خَالِدِیْنَ فِیْھَا" کا راز

انسان کی فطرت میں یہ خواہش اور آرزو ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہے اس کو کبھی موت نہ آئے اور ہمیشہ ہی راحت وآرام اور چین سے رہے۔ اُس کا جس چیز کو جی چاہے وہ ملتی رہے لیکن آپ سب جانتے ہیں کہ اس دنیا میں یہ کسی کے لئے ممکن نہیں۔ یہ دنیا اور یہاں جو کچھ ہے سب فانی ہے "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" اور "کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ". لیکن دل کہتا ہے اور عقل سلیم کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کرم اور اس کی رحمت سے یہ بہت بعید ہے کہ وہ اپنے بندوں کی فطرت میں ایسی خواہش اور تمنا پیدا کرے جس کا پورا ہونا ممکن ہی نہ ہو، یہ تو ایسے ہوگا جیسے کہ اللہ تعالیٰ انسان میں بھوک اور پیاس تو پیدا کرے لیکن پانی اور غذا پیدا نہ فرمائے۔ اس لئے عقل سلیم یہ کہتی ہے کہ انسان کی اس فطری خواہش اور آرزو کے پورا ہونے کی بھی کوئی صورت ہونی چاہئے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہے کبھی موت نہ آئے، اس کو ہر طرح کی راحتیں اور لذتیں نصیب رہیں۔ تو واقعہ یہ ہے کہ آخرت میں جنت بندوں کی اسی فطری خواہش اور دلی تمنا کے پورا ہونے کا انتظام ہے۔ "ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ" میں یہی بشارت سنائی

گئی ہے اور دوسری جگہ اسی جنت کے بارہ میں فرمایا گیا ہے " فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنْتُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ" اور ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے " وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ" یعنی جنت میں وہ سب کچھ ہے جس کی تمہیں خواہش اور چاہت ہو اور جس سے تمہارے دلوں اور آنکھوں کو لذت اور مسرت ملے۔

افسوس ہے کہ ان آیتوں پر ہم اُس طرح غور نہیں کرتے جس طرح غور کرنا چاہئے اور ہمیں ویسا یقین نہیں جیسا یقین ہونا چاہئے، اگر وہ یقین ہوتو اُس جنت کی فکر اور اُس کے حاصل کرنے کی کوشش سے کبھی غفلت نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ جو اِس زمانہ میں دین دار اور ان میں بھی خواص سمجھے جاتے ہیں، ہمارا خود یہ حال ہے کہ جنت کی اتنی فکر اور طلب بھی نہیں ہے جتنی دنیا کی معمولی معمولی چیزوں کی ہے، دراصل یہ یقین کی کمی اور کمزوری کا نتیجہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جنت جیسی عظیم اور قیمتی چیز کوئی نہیں جس کے طالب سوئے ہوئے ہوں اور غافل ہوں" (۱) ہم لوگ حضور ﷺ کے اس ارشاد کے پورے مصداق اور نمونہ ہیں، تمام انبیاء علیہم السلام اس لئے آئے کہ وہ اللہ کے بندوں کو جنت اور اللہ کی رضا و رحمت حاصل کرنے کا طریقہ بتلائیں، اُس کی دعوت و ترغیب دیں، اور اس کے غضب و عذاب سے ڈرائیں اور بچانے کی کوشش کریں۔

سورۂ مؤمنون کی ان آیتوں میں ابدالآباد تک کے لئے جنت اور اس کی نعمتیں حاصل کرنے کا پورا نسخہ بتلا دیا گیا ہے کہ ایمان اور یہ چند ایمانی صفات و اعمال اپنے اندر پیدا کرلو (جن کا ان آیتوں میں ذکر کیا گیا ہے) پھر تم جنت کے وارث ہو اور ہمیشہ ابدالآباد تک اس جنت میں رہو گے، نہ تم فنا ہوگے اور نہ جنت فنا ہوگی۔ اور نہ کبھی تم اس جنت سے بے دخل کئے جاؤ گے۔ بلکہ جائداد کے ایک حق دار وارث کی طرح جنت تمہاری جاگیر بنادی جائے گی۔

"أُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ"

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

---

(۱) مشکوٰۃ۔ باب البکاء والخوف۔ بروایت ترمذی (مرتب)

سورۃ الفرقان

درس — ۲۵

(درس-۲۵)

قرآن مجید کی عظمت اور عقیدہ توحید و رسالت

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ
نَذِیْرَاۨ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا
وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ
تَقْدِیْرًا ۝ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّهُمْ
یُخْلَقُوْنَ وَلَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِكُوْنَ
مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ
اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَیْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۝ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝
وَقَالُوْۤا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰی عَلَیْهِ بُكْرَةً
وَّاَصِیْلًا ۝ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ۔ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ
یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ۔ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَكٌ
فَیَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا ۝ اَوْ یُلْقٰۤی اِلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ یَّاْكُلُ
مِنْهَا۔ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا اُنْظُرْ
كَیْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا ۝

(سورہ فرقان۔ آیت ۱ تا ۹)

(ترجمہ) بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے خاص بندہ (محمد ﷺ) پر حق وباطل کے درمیان فیصلہ کردینے والا قرآن نازل فرمایا تا کہ وہ دنیا جہان والوں کیلئے (کفر وشرک اور بداعمالیوں کے برے انجام سے) ڈرانے والے اور خبردار کرنے والے ہوں۔

وہ ذات عالی کہ اُس کی بادشاہت اور فرمانروائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اس نے کسی کو اپنی اولاد قرار نہیں دیا اور کوئی اُس کی بادشاہت اور فرماں روائی میں شریک ساجھی نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا وجود بخشا، پھر ہر چیز کو (اُس کے مناسب) انداز پر رکھا۔

اور ان مشرکوں نے بنالئے ہیں اللہ کے سوا اور معبود جو کسی چیز کے بھی خالق نہیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور خود اپنے نقصان اور نفع کا بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ کسی کی موت وحیات کا اور نہ حیات بعد الموت کا انہیں اختیار حاصل ہے۔

اور حق کا انکار کرنے والے کافروں نے (قرآن کی نسبت) کہا کہ یہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک گڑھا ہوا جھوٹ ہے، جس کو اُس نے (یعنی اُس کے پیش کرنے والے محمد ﷺ نے اپنے جی سے) گڑھ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اُس میں اُس کی مدد کی ہے (یہ معاندانہ بات کہہ کر) یہ منکرین بڑے ظلم اور دانستہ جھوٹ بہتان کے مرتکب ہوئے ہیں۔

اور یہ کافر (قرآن کے بارہ میں) یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ "اساطیر الاولین" ہے (یعنی اگلے زمانے کے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں) جن کو اس (مدعئ رسالت محمد ﷺ) نے لکھا لیا ہے، وہی صبح وشام اُس کے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔

(اے ہمارے رسول) آپ کہئے کہ (یہ اساطیر الاولین نہیں ہے بلکہ) اس کو نازل فرمایا ہے اُس علیم کل نے جو آسمانوں اور زمین (ساری علوی اور سفلی کائنات) کے مخفی رازوں کو بھی جانتا ہے، یقیناً وہ بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

اور یہ کافر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو (ہماری ہی طرح) کھاتا ہے اور (اپنی ضروریات کے لئے عام آدمیوں کی طرح) بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیج دیا گیا کہ وہ اس کے ساتھ رہ کر (لوگوں کو انکار اور نافرمانی کے برے انجام کے بارہ میں) آگاہی دیتا (پھر کوئی انکار نہ کرسکتا)۔

(یا اُس کے پاس غیب سے) کوئی خزانہ اتار دیا جاتا یا (اسی طرح غیب سے) اُس

کے لئے کوئی باغ ہو جاتا جس سے وہ (پھل وغیرہ) کھایا کرتا (اور پھر اسے معاش کی فکر اور بازاروں میں گھومنے پھرنے کی ضرورت نہ رہتی) اور اِن کافروں نے (اہل ایمان سے) یہ بھی کہا کہ تم لوگ تو ایک ایسے آدمی کی پیروی کر رہے ہو جو سحر زدہ ہے (کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے)

(اے رسول) آپ دیکھئے کہ یہ (منکر اور معاند) لوگ آپ کے متعلق کیسی کیسی مثالیں اڑاتے ہیں۔ پس یہ لوگ بالکل گمراہ ہو گئے اب یہ کسی طرح راہ ہدایت پر نہیں آسکتے۔

تفسیر و تشریح

سورۂ نور ختم ہو کر یہ سورۂ فرقان شروع ہوئی۔(۱)

یہ سورۃ مکی ہے یعنی ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام میں نازل ہوئی، اس میں بنیادی عقائد، توحید، رسالت، قیامت و آخرت اور قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کا بیان ہے اور ان کے ماننے والوں کا انجام بیان فرمایا گیا ہے۔ پھر اس سلسلہ میں عبرت و نصیحت کے لئے بعض انبیاء سابقین اور ان کے منکروں مخالفوں کی سرگزشت بھی بیان فرمائی گئی ہے اور بالکل آخر میں اللہ کے بندوں کے اوصاف بیان فرمانے کے ساتھ ان کے اچھے انجام کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

"الفرقان"

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ وہ ذات بڑی بابرکت اور بڑی عظمت والی ہے جس نے اپنے "عبد" پر یعنی اپنے خاص الخاص بندے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر فرقان یعنی قرآن نازل فرمایا، "الفرقان" قرآن مجید کا اسی طرح وصفی نام ہے جس طرح "الرحمٰن" اللہ تعالیٰ کا وصفی نام ہے اس کے معنی ہیں حق و باطل کے درمیان امتیاز اور فیصلہ کر دینے والا۔ اور بلاشبہ قرآن مجید کی یہی شان ہے۔

---

(۱) افسوس ہے کہ سورہ نور کا کوئی درس دستیاب نہ ہو سکا۔ (مرتب)

مقامِ عبدیت

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لئے "عبدہٖ" کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے نبیہٖ یا رسولہٖ یا حبیبہٖ کا لفظ استعمال نہیں فرمایا گیا، میں سورۂ "اسراء" کے درس میں ذکر کر چکا ہوں کہ بندوں کی صفات میں سب سے اعلیٰ صفت اور ان کے مقامات میں سب سے بلند وارفع مقام "عبدیت" کا ہے، جو بندہ "عبدیت" میں جتنا کامل ہے وہ اللہ سے اتنا ہی قریب اور ساری مخلوق سے اتنا ہی بلند ہے، اسی لئے قرآن مجید میں جہاں بھی رسول اللہ ﷺ پر کسی عظیم انعام کا ذکر فرمایا گیا ہے وہاں آپ کے لئے "عبد" ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے، چنانچہ معراج کے بیان میں فرمایا گیا ہے "سُبۡحَانَ الَّذِیۡ أَسۡرَیٰ بِعَبۡدِہٖ" اور حضور پر قرآن مجید کا نازل کیا جانا معراج سے بھی بڑا انعام ہے اس لئے اس کے بیان میں سورۂ الفرقان کی اس پہلی آیت میں فرمایا گیا "تَبَارَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلیٰ عَبۡدِہٖ". آگے قرآن مجید کی تنزیل کا مقصد بیان فرمایا گیا ہے "لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡراً" یعنی حضرت محمد ﷺ پر قرآن اس لئے نازل فرمایا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ آپ تمام اقوام عالم کو اعمال کے نتائج کے بارہ میں آگاہی دیں تاکہ اُن میں اصلاح کی فکر پیدا ہو۔

عالمی نبوت

یہ آیت بھی اُن آیتوں میں سے ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت تمام اقوام عالم کے لئے ہے۔

آگے دوسری آیت میں قرآن نازل کرنے والی ذات کی عظمت کا بیان ہے کہ اُس کی شان یہ ہے کہ وہ ساری کائنات کا فرمانروا اور سب کا خالق و مالک ہے اور اپنی اس صفت اور شان میں وحدہ لاشریک ہے۔ اس کی ذات اس سے بھی اور بالاتر ہے کہ کسی کو اُس سے ولدیت کی نسبت ہو اور کوئی اس کا ساجھی اور شریک ہو۔

آگے اس سلسلہ میں مشرکین کی اس حماقت اور سفاہت کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ انھوں نے ایسی چیزوں کو معبود بنالیا ہے جن میں خدائی کی کوئی بھی صفت نہیں وہ کسی چیز کی بھی خالق

نہیں بلکہ مخلوق ہیں، اور اتنی عاجز و بے بس ہیں کہ خود اپنے بھی نفع نقصان کا اور موت وحیات کا اور مرنے کے بعد کسی کو جلانے کا انھیں اختیار نہیں، ایسی عاجز اور بے بس چیزوں کو معبود بنانا اور ان کی عبادت اور پوجا کرنا یقیناً عقل کا اندھا پن اور انسانیت کی تذلیل ہے۔

آگے چوتھی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ایسی ہی ان کی ایک گمراہی یہ بھی ہے کہ وہ خداوند جل شانہ کے نازل فرمائے ہوئے قرآن کے بارہ میں (جس کا کلام اللہ ہونا اہل عرب اور خاصکر مکہ والوں کے لئے ظاہر و باہر تھا) کہتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے بلکہ انھوں نے یعنی محمد ﷺ نے کچھ دوسروں کی مدد سے اس کو خود گھڑ لیا ہے، تفسیری روایتوں میں ذکر کیا گیا ہے کہ بعض قریشی سرداروں کے غلام وہ تھے جو اہل کتاب میں سے تھے ان کو حضور کی باتوں سے بہت مناسبت تھی وہ آپ کے پاس آتے جاتے تھے، یسار اور بوفکہ وغیرہ اُن کا نام بھی ذکر کئے گئے ہیں، تو مکہ کے منکرین اور مکذبین انہی کے متعلق کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) نے انہی کی مدد سے اور انہی سے باتیں سن کر یہ کلام گھڑ لیا ہے اور (معاذ اللہ) مفتریانہ طور پر خدا کی طرف نسبت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان ظالموں کی یہ بات نقل کر کے فرمایا "فَقَدْ جَآءُ وْ ظُلْماً وَّزُوْراً" یعنی ہمارے رسول اور ہمارے نازل فرمائے ہوئے قرآن کے بارہ میں اُن کا یہ کہنا بڑی ظالمانہ اور مجرمانہ بات ہے، اور دانستہ جھوٹ بہتان ہے۔

بندوں کی سرکشی اور اللہ کی غفاری

اسی طرح ان ظالموں نے قرآن کے بارہ میں یہ بھی کہا کہ یہ "أَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ" یعنی اگلے زمانہ کے لوگوں کے قصے کہانیاں اور ان کی باتیں ہیں، انھوں نے (یعنی محمد ﷺ نے) ان کو لکھالیا ہے، انہی کو خدا کا کلام بنا کر صبح و شام ان کی تلاوت کی جاتی ہے۔ ان منکرین اور مجرمین کی یہ معاندانہ اور گستاخانہ باتیں نقل کر کے فرمایا گیا ہے" قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِىْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْراً رَّحِيْماً" یعنی اے رسول آپ فرما دیجئے کہ یہ میرا یا کسی دوسرے انسان کا گھڑا ہوا نہیں ہے بلکہ اُس کو اُس خداوند قدوس نے نازل فرمایا ہے جو آسمان و زمین کے یعنی سارے عالم، علوی و سفلی کے چھپے رازوں کا بھی علم رکھتا ہے یعنی وہ علام الغیوب اور علیم کل ہے اور ماضی اور حال اور مستقبل سب یکساں طور پر اس کے سامنے

ہے۔ اسی لئے اس میں اُن غیبی حقائق کا بیان ہے جن تک کسی انسان کے علم کی رسائی نہیں اور اس میں وہ تعلیمات اور ہدایات ہیں جو قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کی رہنمائی کیلئے کافی ہیں (۱) آخر میں فرمایا گیا ہے ''اِنَّہٗ کَانَ غَفُوْراً رَّحِیْماً'' اس میں رسول اللہ ﷺ اور قرآن پاک کے منکرین اور مکذبین کو ارشارہ دیا گیا ہے کہ اگر چہ تمہارا جرم بڑا سنگین ہے لیکن اللہ غفور و رحیم ہے، بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے، اب بھی اگر تم عناد اور باطل پرستی کو چھوڑ کے حق و صداقت کی راہ اختیار کرلو اور ایمان لے آؤ تو اس کی رحمت کا دروازہ تمہارے لئے کھلا ہوا ہے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ — گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ مادرگہ نومیدی نیست — گر ہزار بار توبہ شکستی باز آ





(۱) بالفاظ دیگر قرآن کے یہ مضامین اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ یہ کسی بندے کا کلام نہیں ہوسکتا۔ یہ صرف کسی ایسی ہستی ہی کا کلام ہوسکتا ہے جس کا علم ازل سے ابد تک محیط ہو اور جس کے لئے نہ آسمانوں کی بلندیاں کوئی چیز ہیں اور نہ زمین کی گہرائیاں، ساری کائنات اور اس کے تمام زمانے اس کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہیں۔ (مرتب)

سورۃ الاحزاب

درس ــ ۲۶

(درس-۲۶)

اُمت محمدیہ کے مردوں اور عورتوں کیلئے ولایت الٰہی کا منشور عام

دس اوصاف جو مسلمان مردوں اور عورتوں میں مطلوب ہیں

اللہ کے ذکر وفکر کی دین میں خاص اہمیت اور اصحابِ ذکر کا درجہ

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم- بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ
وَالْقَانِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ
وَالصّٰبِرَاتِ وَالْخَاشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ
وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصَّآئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ
وَالْحٰفِظٰتِ وَالذَّاكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرَاتِ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ
مَغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِیْمًاه (سورۂ احزاب آیت ۳۵)

(ترجمہ) بیشک دین اسلام اختیار کرنے والے مرد اور دین اسلام اختیار کرنے والی عورتیں، اور ایمان ویقین والے مرد اور ایمان ویقین والی عورتیں، اور (اللہ ورسول کی) فرمانبرداری کرنے والے مرد، اور فرمانبرداری کرنیوالی عورتیں اور صدق وسچائی والے مرد، اور صدق وسچائی والی عورتیں، اور صبر وبرداشت کرنے والے مرد، اور صبر وبرداشت کرنے والی عورتیں، اور انکسار وفروتنی اختیار کرنے والے مرد اور انکسار وفروتنی اختیار کرنے والی عورتیں، اور (راہ خدا میں) صدقہ خیرات کرنے والے مرد، اور صدقہ خیرات کرنے والی

عورتیں، اور روزے رکھنے والے مرد، روزے رکھنے والی عورتیں، اور (شہوت نفس کے ناجائز تقاضوں سے) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد، اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اور اللہ کو زیادہ یاد کرنے اور یاد رکھنے والے مرد اور زیادہ یاد کرنے اور یاد رکھنے والی عورتیں، اللہ نے ان سب کے واسطے طے کر رکھی اور تیار کر رکھی ہے بخشش اور اجر عظیم۔

تفسیر وتشریح

ایک نہایت اہم آیت

پچھلے ہفتے سورۂ احزاب کے چوتھے رکوع کا درس ہوا تھا۔ اُس کا خاص روئے سخن حضور ﷺ کی ازواج مطہرات کی طرف تھا، اُن کے خاص مقام ومرتبہ کے لحاظ سے ان کو کچھ خصوصی ہدایتیں فرمائی گئی تھیں، نماز، وزکوٰۃ جیسے اعمال صالحہ کو اہتمام سے ادا کرنے کی اور منکرات ومکروہات سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی گئی تھی، اگرچہ یہاں اوامر ونواہی امت کی سب خواتین کے لئے ہیں، پچھلے رکوع میں ان احکام کی خاص مخاطب ازواج مطہرات ہی تھیں۔ اب یہ پانچواں رکوع شروع ہوا ہے اس کی پہلی آیت اپنے مضمون کے لحاظ سے بڑی جامع اور اہم آیت ہے، اس میں وہ سارے اوصاف جمع کر دیے گئے ہیں جو اللہ کو اپنے بندوں اور بندیوں میں مطلوب ہیں۔ جو بندہ یا جو بندی یہ اوصاف وخصائل جس درجہ اپنے اندر پیدا کر لے وہ اسی درجہ میں مومن کامل اور ''ولی اللہ'' ہے یہ آیت گویا ''ولایت الٰہی'' کا منشور ہے۔ اس آیت کا روئے سخن امت محمدیہ کے تمام مردوں اور عورتوں کی طرف ہے۔ اس میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر صراحت کے ساتھ کر کے گویا یہ اعلان فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے آئی ہوئی روحانی دولت میں عورتیں مردوں کی برابر کی شریک ہیں اور ان کے لئے ولایت اور قرب الٰہی کے وہ سب دروازے کھلے ہوئے ہیں جو مردوں کے لیے کھلے ہیں۔

بہرحال اس آیت میں امت محمدیہ کے تمام مردوں اور عورتوں کو سنایا جا رہا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری چھوٹی بڑی ساری خطائیں، سارے گناہ اور ساری لغزشیں معاف فرما دے اور تم سے آخرت میں کوئی باز پرس نہ ہو اور اُس رب کریم کی طرف سے

''اجر عظیم'' تم کو عطا ہو (جس میں بلاشبہ رضائے مولیٰ اور دیدارِ الٰہی بھی شامل ہے) تو یہ دس اوصاف اپنے اندر پیدا کرلو۔

(۱) ایک اسلام۔ جس کا مطلب ہے اللہ کے حضور میں سر افگندہ ہو جانا، اس کے دین کو قبول کر کے اس کے حکموں پر چلنے کا فیصلہ کر لینا اور اس کی بندگی کو اپنی زندگی کا اصول بنالینا۔ (اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ) میں اسی وصف کا ذکر ہے۔

(۲) دوسرا ایمان۔ ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے پیغمبر نے جو ایسی باتیں اور ایسی حقیقتیں بتلائیں جن کو ہم بطور خود نہیں جان سکتے، اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، اپنی عقلوں سے نہیں سمجھ سکتے (جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، قیامت، آخرت، جنت، دوزخ، فرشتوں کا وجود، وحی کا آنا، قرآن شریف کا کلام اللہ ہونا، وغیرہ وغیرہ) تو ایسی ساری باتوں اور حقیقتوں پر، صرف اللہ کے پیغمبر کے اعتبار واعتماد پر دل سے ایسا یقین کر لینا اور مان لینا جیسا کہ آنکھوں دیکھی چیزوں پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ (وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ) میں اسی کا ذکر ہے۔

(۳) تیسرا وصف ہے۔ عملی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری کرنا (وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ) میں اسی وصف کا ذکر ہے۔

(۴) چوتھا وصف ہے سچائی وراستبازی۔ اپنے اقوال میں بھی اور اعمال ومعاملات میں بھی (وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ) میں اسی کا ذکر ہے۔

(۵) پانچواں وصف ہے صبر۔ ''صبر'' کا لفظ ہماری آپ کی زبان میں یعنی اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن ہماری زبان میں اس کے معنی بہت محدود ہیں جو ہم آپ سب جانتے ہیں، لیکن قرآن پاک کی زبان میں صبر کے معنی بہت وسیع ہیں اور وہ بہت اونچا وصف ہے، یعنی کسی اعلیٰ مقصد کے لئے تکلیفیں اٹھانا، مصیبتیں جھیلنا، اپنے نفس پر کنٹرول رکھنا۔ (وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرَاتِ) کا یہی مطلب ہے۔

(۶) چھٹا وصف ہے خشوع۔ اس کے معنی ہیں فروتنی، عاجزی وانکساری، اللہ تعالیٰ کے حضور میں بھی اور بندوں سے برتاؤ میں بھی، باطن میں بھی اور ظاہر میں بھی یہ وصف عبدیت اور بندگی کی روح اور جان ہے ''وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ'' میں اسی کا ذکر ہے۔

(۷) ساتواں وصف ہے اللہ کی راہ میں اپنے مال کی قربانی۔ یعنی اس کی رضا جوئی کیلئے صدقہ وخیرات کرنا، جس سے بخل وکنجوسی کی روحانی بیماری کا علاج بھی ہوتا ہے اور اللہ کے حاجتمند بندوں کی مدد بھی ہوتی ہے "وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ" میں اسی وصف کا ذکر ہے۔

(۸) آٹھواں وصف ہے روزہ داری۔ یعنی اللہ کی رضا اور اپنے نفس کے علاج کے لئے اور اپنے اندر تقوے کی صفت پیدا کرنے کے لئے روزے رکھنا، فرض بھی اور حسب توفیق نفلی بھی "وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ" میں اس وصف کا ذکر ہے۔

(۹) نواں وصف ہے عفت وپاکبازی۔ یعنی شہوتِ نفس کے غلط اور ناجائز تقاضوں سے اپنی حفاظت کرنا۔ "وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ" میں اس کا ذکر ہے۔

(۱۰) دسواں اور آخری وصف اللہ کا ذکر نہ صرف ذکر بلکہ ذکر کثیر۔ یعنی اللہ سے غافل نہ ہونا اُس کا دھیان رکھنا اور زیادہ سے زیادہ اُس کا ذکر کرنا۔ اس میں نماز، قرآن پاک کی تلاوت، اللہ کی حمد وتسبیح اور دعا واستغفار وغیرہ ذکر اللہ کی سب شکلیں شامل ہیں۔ "وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْراً وَّالذّٰكِرٰتِ" میں اسی کا ذکر ہے۔

یہ دس صفتیں، جو بندہ اپنے اندر پیدا کرلے وہ بامراد اور کامیاب ہے۔ وہ اللہ کا اور اللہ اس کا ہوگیا، ایسے بندوں کو اس آیت میں بشارت سنائی گئی ہے "أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّأَجْراً عَظِيْماً" یعنی اللہ نے ایسے بندوں کے لئے مغفرت وبخشش اور "اجر عظیم" کا تحفہ تیار کررکھا ہے۔ جس "اجر" کو خود اللہ تعالیٰ "عظیم الشان" فرمائے اس کی عظمت کا کوئی بندہ یہاں تصور بھی نہیں کرسکتا۔

ایک حدیث قدسی

ایک مشہور حدیث قدسی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی کی طرف سے امت کو پہنچایا "أعددتُ لعبادی الصالحين مالاعينٌ رأت ولاأذنٌ سمعت ولاخطر علىٰ قلب بشر" میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے جنت میں راحت ولذت اور مسرت کے وہ سامان اور وہ نعمتیں تیار کرکے رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے

نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں کبھی اُن کا خیال ہی آیا ہے، یعنی جو انسانی خیال و تصور کی پرواز کی حد سے بھی بالاتر ہیں، بس وہیں پہنچ کر معلوم ہوگا کہ وہ کیا نعمتیں ہیں اور اُن میں کیسی لذت، اور مسرت کا کیسا سامان ہے (۱) اس کی صحیح مثال یہ ہے کہ ہم آپ جب اس دنیا میں آنے سے پہلے اپنے ماؤں کے پیٹ میں تھے تو ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ ہم کسی اور دنیا میں پہنچیں گے اور وہاں لذت و راحت کے عجیب و غریب سامان ہوں گے، وہاں زعفرانی، بریانی، فیرنی اور کباب قورمہ جیسی لذیذ غذائیں ہوں گی، روح افزا جیسے لذیذ مشروب ہوں گے مشکی حنا اور شمامۃ العنبر اور روح گلاب اور کیوڑہ جیسے عطریات ہوں گے۔ سیر و تفریح کے لئے پارک اور چمن ہوں گے، سواری کے لئے موٹریں ہوں گی، عالیشان محلات ہوں گے، تو ماں کے پیٹ والی ہماری پہلی دنیا میں ان چیزوں کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا، لیکن جب اللہ کے حکم سے یہاں آئے اور اللہ نے یہ چیزیں نصیب فرمائیں تو اس کے بعد ہی ان کو جانا، بالکل اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لئے جو نعمتیں جنت میں تیار کر رکھی ہیں اُن کا یہاں ہم تصور بھی نہیں کر سکتے وہ ہمارے ادراک و خیال کی پرواز سے بھی وراء الوراء ہیں بس وہاں پہنچ کر ہی ہم اُن سے آشنا ہوں گے۔

آخرت اور جنت میں عطا ہونے والی اُن سب نعمتوں کو اس آیت میں ''اجر عظیم'' فرمایا گیا ہے، ان نعمتوں کے حاصل کرنے کا راستہ کیا ہے؟ اور ان کی قیمت کیا ہے جو ہم کو ادا کرنی ہے؟ بس وہی اعمال و اوصاف جن کا اس آیت میں ذکر فرمایا گیا ہے، میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ کے جو بندے جس درجہ میں یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کر لیں وہ اسی درجہ میں ''مومن کامل'' اور ''اللہ کے ولی'' ہیں، اور یہ آیت ''ولایت الٰہی کا منشور'' ہے۔

تصوف اور صوفیہ

بزرگانِ دین کی خانقاہوں کا اصل موضوع یہی تھا کہ اللہ کے طالب بندے وہاں کے خاص ماحول میں رہ کر یہ ایمانی اوصاف اور یہ اخلاق و اعمال اپنے اندر پیدا کر لیں اور ان کی ایسی مشق کر لیں کہ یہی ان کی طبیعت ثانیہ ہو جائے بس یہی تصوف ہے

---

(۱) مشکوٰۃ۔ باب صفۃ الجنۃ.......... بحوالہ بخاری و مسلم

اس کے سوا کچھ نہیں۔

ان مطلوبہ اوصاف میں آخری اور انتہائی چیز ''اللہ تعالیٰ کا ذکر کثیر'' ہے، سب سے آخر میں فرمایا گیا ہے ''وَالذّٰاکِرِیْنَ اللّٰهَ کَثِیْراً وَّالذّٰاکِرَاتِ''۔ پھر آگے اسی سورت میں چند ہی آیتوں کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰهَ ذِکْراً کَثِیْراً'' (اے ایمان والے بندو اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا کرو اور اس کو بہت یاد رکھو)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے انہی آیتوں کی روشنی میں فرمایا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو جن عبادتی اعمال کا حکم دیا گیا ہے، اُن سب کی ایک حد مقرر ہے کہ بس اتنا ضروری ہے اس کے بعد چھٹی۔ نماز، روزہ، حج وغیرہ سب کا یہی حال ہے۔ لیکن ''ذکر اللہ'' کے لئے ایسی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے بلکہ حکم ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں اس کو یاد کرو اور یاد رکھو۔ ارشاد فرمایا گیا ہے ''فَاذْکُرُوا اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْداً وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ'' (یعنی اللہ کا ذکر کرو کھڑے ہونے کی حالت میں، اور بیٹھے ہونے کی حالت میں اور جب تم لیٹے ہوئے ہو) اس کا کھلا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد تمہارے دل و دماغ میں اس طرح بس جانی چاہئے کہ کسی حال اُس سے غفلت نہ ہو، یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ امت کے تمام طبقوں میں یہ دولت صرف مشائخ ربانی کا حصہ ہے، جن کو ''صوفیہ'' کہا جاتا ہے۔

ایک حدیث شریف کا مضمون ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اللہ کے بندوں میں کون لوگ افضل اور زیادہ بلند مرتبہ ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا ''وَالذّٰاکِرِیْنَ اللّٰهَ کَثِیْراً وَّالذّٰاکِرَاتِ'' یعنی اللہ کا بہت زیادہ ذکر کرنے والے بندوں اور بندیوں کا درجہ اور مرتبہ سب سے اعلیٰ و بالا ہے (۱)۔ اللہ تعالیٰ اس دولت کا کچھ نہ کچھ حصہ ہم آپ سب کو نصیب فرمائے۔ اور اللہ کی رحمت سے یقین کے ساتھ امید ہے کہ ہم آپ میں جو بھی سچے دل سے اس کا طالب ہوگا، اور اُس کے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتا رہے گا انشاء اللہ وہ محروم نہ رہے گا۔

سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ
نَسْتَغْفِرُکَ وَنَتُوْبُ اِلَیْکَ.

---

(۱) مشکوٰۃ۔ باب ذکر اللہ عزوجل بروایت احمد و ترمذی

سورۃ المؤمن

درس ۲۷ تا ۳۵

(درس - ۲۷)

حٰمٓ سے شروع ہونے والی مسلسل سات سورتیں اور اُن کا امتیاز

ایک آیت جو گنہگاروں کو جنتی بنا دینے کے لئے کافی ہے

مجرمین کو تنبیہ و تہدید اور مومنین کو بشارتِ عظمیٰ

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللّٰه من الشَّیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم ط

حٰمٓ ٥ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ٥ غَافِرِ الذَّنْبِ
وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَیْهِ
الْمَصِیْرُ ٥ مَا یُجَادِلُ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَلَا
یَغْرُرْکَ تَقَلُّبُهُمْ فِی الْبِلَادِ ٥ کَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ
وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ۔ وَهَمَّتْ کُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ
لِیَاْخُذُوْهُ وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ۔
فَکَیْفَ کَانَ عِقَابِ ٥ وَکَذٰلِکَ حَقَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ عَلَی
الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ٥ اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ
وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ
لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ رَبَّنَا وَسِعْتَ کُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا

فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ٥
رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ۣ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ
اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ٥
وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ٥ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ۔
وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ٥ (سورۂ مومن، آیت ۱تا۹)

(ترجمہ) حٰم ۔ یہ کتاب نازل فرمائی گئی ہے اللہ کی طرف سے جو عزیز وعلیم ہے، گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت عذاب دینے والا اور قدرت والا ہے۔ اُس کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں، اُسی کے پاس سب کو واپس جانا ہے۔

اللہ کی آیتوں میں وہی لوگ جھگڑے نکالتے ہیں جو کافرومنکر ہیں، پس اُن کا شہروں ملکوں میں چلنا پھرنا اور دَور دَورہ تم کو دھوکے میں نہ ڈال دے۔ ان سے پہلے ہمارے پیغمبر نوح کی قوم نے اور اُن کے بعد کے بہت سے گروہوں نے (اپنے پیغمبروں کی) تکذیب کی اور اُن کو جھٹلایا اور (اُن میں سے) ہر امت نے اپنے رسول کو گرفتار کرنے کی فکر (اور کوشش) کی اور ناحق کے جھگڑے نکالے تاکہ اس (ناحق جنگ وجدال) کے ذریعہ حق کو ناکام بنادیں تو میں نے اُن کو پکڑ میں لے لیا، پھر ان پر ہمارا کیسا عذاب آیا اور کیسی مار پڑی، اور اسی طرح تمام کافروں پر اللہ کا یہ فرمان ثابت ہو چکا ہے کہ وہ دوزخی ہیں۔

وہ فرشتے جو حاملین عرش ہیں اور جو اُس کے اردگرد ہیں اپنے پروردگار کی تسبیح وحمد کرتے ہیں اور اُس پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان والوں کے لئے مغفرت وبخشش مانگتے ہیں (عرض کرتے ہیں) اے ہمارے رب تیری رحمت اور علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہیں پس تو اُن بندوں کو بخش دے جنھوں نے توبہ کرلی اور تیری راہ پر چلے اور انھیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اور اے ہمارے رب اُن کو غیر فانی جنتوں میں داخلہ دیدے جن کا تو نے اُن سے وعدہ فرمایا ہے اور (اُن کے ساتھ) اُن کے اُن ماں باپ اور بیویوں اور اولاد کو بھی جو اس لائق ہوں، تو عزیز وحکیم ہے۔ اور اے ہمارے رب اُن کو گناہوں کی شامت سے بچالے، اور جس کو تو نے اُس دن گناہوں کی شامت سے بچالیا اُس پر تو نے مہربانی فرمائی اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر وتشریح

آج یہ سورۂ ''مومن'' شروع ہوئی، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، قرآن پاک کی سورتوں کے نام اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے اور آسمانی نہیں ہیں، بلکہ علامت کے طور پر مقرر کر لئے گئے ہیں، اور اکثر ایسا ہے کہ سورت کے کسی خاص مضمون یا کسی خاص لفظ ہی کی بنا پر نام رکھ دیا گیا ہے۔ مثلاً ''سورۂ بقرہ'' کا نام ''بقرہ'' اس بنا پر رکھ دیا گیا کہ اس سورت میں حضرت موسیٰؑ کی قوم کے ''بَقَرَہ'' یعنی گائے کی قربانی کا ذکر آیا ہے اسی طرح سورۂ آل عمران کا نام ''آل عمران'' اس لئے رکھا گیا کہ اُس میں حضرت مریم کے والد عمران کی اولاد یعنی حضرت مریم اور پھر اُن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور اُن کے غیر معمولی واقعات کا ذکر ہے، اس سورۂ مومن سے پہلی سورت کا نام ''زُمَر'' صرف اس لئے ہو گیا کہ اُس کے آخری رکوع میں دو جگہ ''زُمَراً'' کا لفظ آیا ہے (وَسِیْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی جَهَنَّمَ زُمَراً''. اور. وَسِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَی الْجَنَّةِ زُمَراً)۔ اس سورت کا نام ''مومن'' اس لئے ہو گیا کہ اس میں فرعون کے گھرانے کے ایک ایسے ''مردِ مومن'' کا ذکر کیا گیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر ایمان لے آیا تھا لیکن حالات کی مجبوری سے یا مصلحۃً اپنا ایمان ظاہر نہیں کیا تھا، اس سورت کے چوتھے رکوع کے شروع میں اُس کا ذکر ''رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ'' کے الفاظ میں کہا گیا ہے تو اسی لفظ ''مومن'' کی وجہ سے اس سورت کا نام ''مومن'' رکھ دیا گیا یعنی یہ وہ سورت ہے جس میں فرعون کے گھرانے کے ایک ''مردِ مومن'' کا ذکر ہے۔

حروفِ مقطعات کا مسئلہ

یہ سورت کلمہ ''حٰمٓ'' سے شروع ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی سورتوں کے شروع میں اس طرح کے حروف تہجی ہیں جیسے ''الٓمّٓ'' ''الٓمّٓرٰ'' وغیرہ ان کو حروف ''مقطعات'' کہتے ہیں، جیسا کہ بار بار ذکر کیا جا چکا ہے ان حروف مقطعات کے متعلق ہمیں یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ ہم ان کی مراد اور ان کا مطلب نہیں جانتے بس اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اور جو بھی مراد ہے وہ برحق ہے۔ ان حروف مقطعات کے معنی معلوم نہ

ہونے کا اقرار کرنا ہی علم ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارہ میں اپنی بے علمی اور نارسائی کا اقرار کرنا ہی صحیح علم ہے۔ بعض مفسرین نے ان حروف کو سورتوں کا نام کہا ہے، اور بعض نے اپنے اپنے ذوق اور ذہن کے مطابق ان کے بارہ میں کچھ نکات اور اشارات لکھے ہیں لیکن کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یہی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے۔

حٰمٓ والی سورتوں کی خصوصیت

یہ سورۂ ''مومن'' پہلی سورت ہے جو ''حٰمٓ'' سے شروع ہوتی ہے، اس کے آگے کی مسلسل چھ سورتیں بھی ''حٰمٓ'' ہی سے شروع ہوتی ہیں، یہ سات سورتیں ہیں جو ''حوامیم'' کہلاتی ہیں، ان کے مضمون میں بھی بہت یکسانیت ہے اور حافظوں کے لئے لفظی متشابہ بھی بہت ہیں، ان کا مرکزی مضمون توحید اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کی دعوت ہے۔

قرآن مجید کی ہر سورت اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے ''مقدس'' ہے لیکن مضامین کے لحاظ سے یقیناً بعض سورتوں کو خاص فضیلت حاصل ہے۔ مثلاً سورۂ اخلاص یعنی قل ہو اللہ شریف، یا سورۂ یسین وغیرہ، جنکی خاص فضیلتیں حدیثوں میں وارد ہوئی ہیں اسی طرح ان حوامیم یعنی ان ساتوں سورتوں کو بھی جو ''حم'' سے شروع ہوتی ہیں خاص امتیاز اور فضیلت حاصل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ''حوامیم'' گویا قرآن پاک کا لباب یعنی مغز اور جوہر ہیں (۱) اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ''حوامیم'' گویا قرآن کی وادی میں سرسبز وشاداب اور خوش باغیچے ہیں۔ (۲)

زیر تلاوت آیات کی تفہیم

اب آیئے سورۂ مومن کی ان ابتدائی آیتوں کا مطلب اور پیغام سمجھنے کی کوشش کریں جن کی تلاوت کی گئی ہے ''حٰمٓ'' کے بعد پہلی آیت ہے '' تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ

(۱و۲) ان دونوں روایتوں کے اصل مآخذ تک رسائی نہیں ہوسکی، البتہ معارف القرآن از مفتی محمد شفیع صاحبؒ میں یہ روایات ابوعبید قاسم بن سلام کی فضائل قرآن کے حوالے سے نقل کی گئی ہیں (مرتب)

الْعَلِیْمِ، غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ'' مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کا نازل کیا ہوا فرمان اور پیغامِ ہدایت ہے، وہ اللہ جو عزیز اور علیم ہے، ''عزیز'' وہ ہے جو زبردست، ہر چیز پر قابو یافتہ اور غالب ہو اور ''علیم'' وہ ہے جو سب کچھ جانتا ہو کوئی چیز اس کے احاطۂ علم سے باہر نہ ہو، یہ اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں ہوئیں، اس کے آگے اُس کی یہ صفتیں اور ذکر کی گئی ہیں، غَافِرِ الذَّنْبِ، یعنی گناہوں کا معاف کردینے اور بخش دینے والا ہے، قَابِلِ التَّوْبِ، توبہ قبول فرمانے والا ہے۔ ان دونوں باتوں میں کچھ فرق ہے اس کو سمجھ لینا چاہئے۔ مغفرت کا مطلب ہے گناہ کی معافی یعنی یہ فیصلہ کہ اس گناہ پر سزا نہیں دی جائے گی اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ گناہ کا کوئی اثر ہی باقی نہ رہے۔ لیکن توبہ کے بارہ میں حدیث شریف میں ہے کہ ''التائب من الذنب کمن لاذنب لہ'' کہ سچی توبہ کرنے کے بعد آدمی ایسا ہو جاتا ہے جیسا کہ اُس نے گناہ کیا ہی نہیں، اور ایک روایت میں ہے ''کیوم ولدتہ امہ'' یعنی سچی توبہ کے بعد بندہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ اُس دن بے گناہ تھا جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، سچی توبہ یہ ہے کہ گناہ پر دل سے رنج و افسوس ہو اور آئندہ اُس سے دور رہنے اور بچنے کا عزم ہو، اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں صفتیں (غَافِرِ الذَّنْبِ'' اور ''قَابِلِ التَّوْبِ'') رحمت کی لائن کی صفتیں ہیں، آگے فرمایا گیا ہے ''شَدِیْدِ الْعِقَابِ'' یعنی مجرموں کو، جو معافی اور مغفرت کے مستحق نہ ہوں وہ سخت عذاب دینے والا ہے، اُس کا عذاب بڑا سخت ہے جس کا اس دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا تقاضا ہے کہ اُس میں جو صفت بھی ہو وہ بدرجہ کمال ہو، جس طرح اس کی رحمت اور بخشش بے حد وسیع ہے اسی طرح اس کا عذاب بے پناہ اور انتہائی شدید ہے، دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے ''نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ، وَاَنَّ عَذَابِیْ ھُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ (یعنی میرے بندوں کو خبردار کردو کہ میں بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان بہت رحمت والا ہوں۔ اور اسی کے ساتھ یہ کہ میرا عذاب بڑا دردناک ہے)۔ آگے فرمایا گیا ہے ذِی الطَّوْلِ ''طَوْل'' کے معنی قدرت کے بھی ہیں اور ہر طرح کی خیر اور نوازش و بخشش کے بھی ہیں۔ اس لفظ کے معنی میں بڑی وسعت اور جامعیت ہے، تو ''ذِی الطَّوْلِ'' کا مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ بڑی قدرت والا، بے انتہا خزانوں والا اور بہت نوازش فرمانے والا ہے۔

یہاں تک اللہ تعالیٰ کی چھ صفتیں ذکر کی گئیں۔ اَلْعَزِیْز، اَلْعَلِیْم، غَافِرِ الذَّنب، قَابِلِ التَّوْب، شَدِیْدِ الْعِقَاب، ذِیْ الطَّوْل. اس کے بعد فرمایا گیا "لاَ اِلٰهَ اِلَّاھُوَ" ظاہر ہے کہ جس ہستی میں جمال وجلال اور رحمت وعذاب کی یہ ساری صفتیں جمع ہوں وہی اور صرف وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت اور بندگی کی جائے اُس کے سوا اور کوئی نہیں (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه)۔ آگے ارشاد فرمایا گیا "اِلَیْهِ الْمَصِیْر" یعنی اے لوگو! موت کے بعد بالآخر سب کو اسی طرف واپس جانا اور اسی کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ لہٰذا ہر ایک اپنا حال اور اپنے اعمال دیکھ کر اپنا انجام سوچ لے، اگر اب تک غافل رہا ہے تو اُس کے حضور میں حاضری کے لئے اب تیاری کرلے۔ اگر شیطان کے اغوا یا اپنی بدنفسی سے گناہوں میں ملوث رہا ہے، بلکہ اگر خدانخواستہ کفر یا شرک میں مبتلا رہا ہے تو مایوس نہ ہو، جس اللہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے وہ غافر الذنب ہے قابل التوب ہے اُس سے مغفرت اور معافی کی استدعا کر کے مغفرت اور بخشش کا استحقاق پیدا کرلے اور سچے دل سے توبہ کر کے اپنے کو بالکل بے گناہ اور پاک صاف کرلے، ورنہ انجام بہت برا ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ شدید العقاب ہے۔

اس آیت میں بڑی بشارت اور بڑی تنبیہ اور آگاہی ہے۔ اگر اللہ توفیق دے تو آدمی کی ہدایت اور اس کو دوزخ سے بچانے اور جنتی بنانے کے لئے یہی ایک آیت کافی ہے۔

جنتی بنادینے والی آیت

تفسیر ابن کثیر وغیرہ میں حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ علاقۂ شام کے ایک صاحب جو خواص اور اہل وجاہت میں سے تھے حضرت عمرؓ کی خدمت میں آتے جاتے تھے، پھر اُن کی آمد ورفت ختم ہوگئی، حضرت عمر نے ایک دن لوگوں سے دریافت کیا کہ فلاں صاحب جو آیا کرتے تھے ان کا کسی کو کچھ پتہ ہے؟ کسی نے بتلایا وہ شراب کے عادی رہے تھے، شامتِ نفس سے وہ پھر اس میں مبتلا ہو گئے اس لئے وہ غائب ہیں، حضرت عمر نے اپنے کاتب کو بلایا اور اُن کے نام خط لکھوایا، اس میں سلام اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد سورۂ مومن کی یہی آیت لکھوائی "غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِیْ الطَّوْلِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ" یہ خط اُن صاحب کے نام لکھوایا اور جو حضرات اُسوقت آپ کے پاس تھے (جو غالباً

صحابہ کرام ہی رہے ہوں گے) اُن سے آپ نے فرمایا کہ اپنے اُس بھائی کے لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اُس کو انابت اور توبہ کی توفیق دے اور اس کی توبہ قبول فرمائے، آگے روایت میں ہے کہ جب حضرت فاروق اعظمؓ کا یہ خط اللہ کے اُس بندے کے پاس پہنچا اور اس نے اس کو دیکھا تو بار بار رورو کے پڑھتا تھا "غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ" پھر وہ بہت رویا اور اُس نے توبہ کی اور قطعی طور سے چھوڑ دینے کا عہد کیا اور اللہ نے اس کو توفیق دی۔

اصلاح کا حکیمانہ طریقہ

دراصل اصلاح کا یہی طریقہ ہے، آگے روایت میں یہ بھی ہے کہ جب حضرت عمر کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ جب تمھارا کوئی بھائی اغوائے شیطانی سے غلط راستہ پر پڑ جائے تو اس کو دھتکار، پھٹکار کے اور رسوا کر کے شیطان کی مدد نہ کرو بلکہ اُس کو اپنا کے اس کی اصلاح کی کوشش کرو اور اس کے لئے اللہ سے دعائیں کرو۔ یہ طریقہ صبر و تحمل کا اور دلسوزی کا ہے اور اس میں خود اپنی بھی اصلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق دے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ گناہ میں مبتلا ہو جانے والے کسی بھی بھائی کو بُرا بھلا کہنا اکثر اپنی نفسانیت سے ہوتا ہے اور اکثر اس کی صورت غیبت کی ہو جاتی ہے جو سخت حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے نفسوں کے شر اور فریب سے ہماری حفاظت فرمائے۔

دیر ہے اندھیر نہیں

آگے ارشاد ہوا ہے "مَايُجَادِلُ فِيْ آيَاتِ اللّٰهِ..... فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ" مطلب یہ ہے کہ آپ کے مخالفین ومنکرین، لوگوں کو بہکانے کے لئے طرح طرح کے جو اعتراضات اور سوالات اُٹھاتے ہیں مثلاً یہ کہ اگر آپ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں اور آپ کا خدا "شَدِيْدُ الْعِقَابِ" ہے تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا اور ہمیں کفر و شرک کی اور دنیا میں گھومنے پھرنے کی آزادی کیوں ملی ہوئی ہے اور ہم کو تمھارے مقابلہ میں دنیوی برتری کیوں حاصل ہے؟ (اور اسی طرح کے دوسرے اعتراضات اور سوالات) تو رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے اس کا جواب دیا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کے یہ اعتراضات و سوالات تحقیق حق کے لئے نہیں ہیں

بلکہ یہ لوگ آپ کی تکذیب اور کفر و انکار کا پہلے ہی سے فیصلہ کئے ہوئے ہیں اور ان کی یہ باتیں صرف ان کی کٹ حجتی ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کو دنیا میں جو آزادی اور بظاہر عیش وراحت کی زندگی ملی ہوئی ہے یہ ہماری طرف سے مہلت اور ڈھیل ہے۔ دنیا کے لئے ہمارا دستور و قانون یہی ہے کہ ایسے مجرموں کو ڈھیل دی جاتی ہے اور ان کی رسی دراز کی جاتی ہے ایک دم نہیں پکڑا جاتا یہی قرین حکمت ہے، اس دور سے پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے، ہمارے پیغمبر نوح اور اُن کے بعد بھیجے جانے والے پیغمبروں کی امتوں نے بھی ان کفارِ مکہ کی طرح اپنے پیغمبروں کی تکذیب اور اُن کا انکار کیا تھا اور اسی طرح کی کٹ حجتی اور ان کے ساتھ شرارتیں کی تھیں اور ان کو پکڑ کے ختم کرنے تک کے منصوبے بنائے تھے۔ اُن کو بھی ایک حد تک مہلت دی گئی تھی اور جب وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے اور شرارتوں اور گستاخیوں میں آگے بڑھتے ہی رہے تو وہ عذاب کی گرفت میں لے لئے گئے۔ الغرض ان منکرین اور مخالفین کو ان قوموں کی تاریخ اور اُن کے انجام سے سبق لینا چاہئے اور اے رسول آپ کو اور اہل ایمان کو صبر کے ساتھ انجام کا انتظار کرنا چاہئے۔ ان منکرین کے آزادی سے شہروں اور ملکوں میں گھومنے پھرنے سے کسی کو کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اگر ان کا رویہ نہ بدلا تو وہی ہوگا جو نوح اور اُن کے بعد میں آنیوالے پیغمبروں کی اُن قوموں کے ساتھ ہوا جو اپنی شرارتوں اور گستاخیوں سے باز نہیں آئی تھیں۔

اس کے آگے فرمایا گیا ہے "وَكَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ" اوپر والی آیت میں اگلے پیغمبروں کے اُن بدبخت مکذبین اور منکرین پر آنے والے دنیوی عذاب کا ذکر فرمایا گیا تھا جو اپنے پیغمبروں کے خلاف شیطانی سازشوں اور شرارتوں، گستاخیوں سے باز نہیں آئے تھے، "فکیف کان عقاب" کا اشارہ اسی دنیوی عذاب کی طرف تھا اور رسول اللہ ﷺ کے شریر منکرین و مکذبین کو آگاہی دی گئی تھی کہ اگر وہ باز نہیں آئے تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا اور اُن پر بھی اسی دنیا میں اسی طرح کا عذاب آئے گا۔

اس آیت (وَكَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ) کا مطلب یہ ہے کہ بہر حال اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے کہ آخرت میں کافروں منکروں کو جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا اور ابد الآباد تک وہ اسی میں رہیں گے اور بلاشبہ وہ عذاب دردناک اور بے پناہ ہوگا۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا! اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا!!

مومنین صالحین کو بے نظیر بشارت

یہاں تک اہل کفر کو تنبیہہ وتہدید تھی، آگے کی آیتوں سے اس کے بالمقابل اہل ایمان کو ایک ایسی بشارت سنائی گئی ہے جو غالباً قرآن پاک میں کسی دوسری جگہ نہیں سنائی گئی۔ارشاد ہے:

"اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْماً فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ" مطلب یہ ہے کہ اللہ کے وہ مقرب اور بلند مقام فرشتے جو عرش الٰہی کے حامل ہیں اور وہ جو اُس کے گرد مصروفِ طواف رہتے ہیں اور اس طرح ان کو دائمی قرب خاص حاصل ہے وہ اللہ کی تسبیح وحمد کرتے اور اس کے حضور میں ایمان کا اظہار اور اطاعت ووفاداری کا عہد واقرار کرتے ہیں، اور اسی کے ساتھ وہ اُن بندوں کے لئے جو پیغمبر پر ایمان لائے اور اُن کی دعوت کو قبول کیا، اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور بخشش کی درخواست کرتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کی حمد وتسبیح اور اس کی اطاعت ووفاداری کے عہد واقرار کے ساتھ اُن کا یہ وظیفہ ہے کہ اہل ایمان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور بخشش کی استدعا کرتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں، آپ کو سمجھنے کی توفیق دے۔ کتنی عظیم بشارت ہے یہ!۔اللہ کے ایمان والے بندے جن اوقات میں اپنے دنیوی کاروبار میں یا کھانے پینے جیسی بشری ضروریات میں مشغول ہوں یا جب پڑے سو رہے ہوں، اُن اوقات میں بھی اللہ کے وہ مقرب ترین فرشتے جن کا درجہ ملائکہ کی صفوں میں بہت ہی بلند ہے، جو حاملین عرش ہیں اور جو عرش الٰہی کے گرد طواف میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں جن کو کرّوبین کہا جاتا ہے وہ اُن بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور بخشش مانگتے رہتے ہیں، اور حمد وتسبیح کی طرح اہل ایمان کے لئے مغفرت طلبی بھی اُن کا وظیفہ اور ان کی عبادت ہے۔اور ظاہر ہے کہ وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے کرتے ہیں، قرآن پاک میں دوسری جگہ ملائکہ کی یہ صفت بیان فرمائی گئی ہے کہ "یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ" (یعنی فرشتے وہی کام کرتے ہیں جس کا ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوتا ہے)

تو اللہ تعالیٰ کا اپنے ایمان والے بندوں پر یہ کتنا بڑا انعام ہے کہ اُس نے اپنے مقرب ترین فرشتوں (حاملین عرش اور کروبین) کو یہ حکم دے رکھا ہے کہ میری تسبیح اور حمد اور میرے حضور میں ایمان کا اظہار اور اطاعت و وفاداری کے عہد و اقرار کے ساتھ میرے ایمان والے بندوں کے لئے دعا کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ قبول بھی فرمائیں گے، آگے اُن کی دعا کے یہ الفاظ بھی ہم کو سنائے گئے ہیں "رَبَّنَا وَسِعۡتَ كُلَّ شَيۡءٖ رَّحۡمَةٗ وَعِلۡمٗا فَاغۡفِرۡ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمۡ عَذَابَ الۡجَحِيمِ" یعنی وہ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ "اے ہمارے پروردگار تیری رحمت عام ہے، کائنات کی ہر چیز تیری رحمت سے فیض یاب ہے اور تیرا علم ہر چیز کو محیط ہے، کسی کا کوئی اچھا برا عمل تجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے، تو اے پروردگار تو ان بندوں کے گناہ قصور معاف کر دے اور ان کی بخشش فرما دے جنہوں نے کفر و شرک اور دوسرے گناہوں سے توبہ کر کے تیری طرف رخ کر لیا اور شیطانی طریقوں کو چھوڑ کر تیری راہِ ہدایت اور شریعت کی پیروی اختیار کر لی۔ اور اُن کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

یہاں تک کی دعا کا حاصل یہ ہے کہ اُن کے گناہ قصور معاف کر دئے جائیں اور اُن کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھا جائے۔ آگے اُن کے لئے داخلۂ جنت کی دعا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اُن کے ساتھ اُن کے ماں باپ، اولاد اور بیویوں کو بھی جنت میں اُن کے ساتھ کر دیا جائے۔ اس دعا کے الفاظ یہ ہیں۔

"رَبَّنَا وَاَدۡخِلۡهُمۡ جَنّٰتِ عَدۡنِ ۨالَّتِيۡ وَعَدۡتَّهُمۡ وَمَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَاَزۡوَاجِهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ، وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ، وَمَنۡ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمۡتَهٗ، وَذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ"

مطلب یہ ہے کہ خداوندا، اپنے اُن بندوں کو جنہوں نے کفر و شرک اور نافرمانی والی زندگی سے توبہ کر کے تیری بھیجی ہوئی ہدایت اور شریعت کو قبول کر لیا، تو اُن کے لئے مغفرت اور دوزخ کے عذاب سے نجات کا فیصلہ فرمانے کے علاوہ، اپنی رحمت سے ان کو وہ جنت بھی عطا فرما دے جس کا تو نے ایسے مؤمنین صالحین کے لئے وعدہ فرمایا ہے، اور ان کے ساتھ اُن کے اُن ماں باپ اور بیویوں اور اولاد کو بھی جو اِس لائق ہوں جنت عطا فرما دے اور جنت میں اُن کے ساتھ کر دے۔

جنت محض بخشش ہے کسی کا حق نہیں

یہاں کسی کو شبہ ہو سکتا ہے کہ جو مؤمنین صالحین ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ انہوں نے کفر وشرک اور نافرمانی سے توبہ کر کے اللہ ورسول کے راستہ کو اپنالیا ہے اور شریعت کی پیروی اختیار کرلی ہے وہ تو خود ہی مغفرت اور جنت کے مستحق ہیں پھر اُن کے لئے مغفرت اور جنت کی دعا کی کیا اہمیت؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کفر وشرک سے اپنے کو بچانا اور اللہ کی بندگی اور فرماں برداری کرنا اور اُس کی نافرمانی سے بچنا، یہ تو اللہ تعالیٰ کا حق اور ہم بندوں کا فریضہ ہے۔ یہ جنت اور اُس کی نعمتوں کا معاوضہ اور اس کی قیمت نہیں ہے۔ جنت تو جس کو بھی ملے گی بس اللہ تعالیٰ کی رحمت اور بخشش ہی سے ملے گی، جنت کا معاوضہ کوئی ادا کر ہی نہیں سکتا، حدیث شریف میں ہے کہ ایک دن صحابہ کرام کے سامنے حضور نے ارشاد فرمایا کہ ''کسی شخص کا بھی عمل اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا، جو بھی جنت میں جائے گا اللہ کی رحمت ہی سے جائے گا۔ ایک صحابی نے عرض کیا ''وَأَنتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟'' (اور حضرت آپ؟) تو آپ نے ارشاد فرمایا '' وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ'' (یعنی میں بھی اللہ کی رحمت اور اس کے کرم ہی سے جنت میں جاؤں گا) (۱) ہاں ایمان اور اعمال صالحہ اور توبہ اور تقویٰ وغیرہ بندوں کو رحمت اور بخشش کا مستحق بنا دیتے ہیں اور ایسے بندوں کے لئے اللہ کی طرف سے مغفرت ورحمت اور جنت کا وعدہ ہے، لیکن یہ وعدہ رحمت ہی کی بنیاد پر ہے۔ بہر حال جنت کسی بندہ کا ایسا حق نہیں ہے جو اللہ کے ذمہ واجب ہو بلکہ جس کو وہ عطا فرمائے گا اپنے خاص کرم ہی سے عطا فرمائے گا۔ بس اسی لئے دعا کی بھی ضرورت ہے۔

اور حاملِ عرش ملائکہ مقربین اور کروبیین کی اس دعا کا ایک مقصد اِن مؤمنین صالحین کا اعزاز واکرام بھی ہے کہ اللہ کے ہاں ان کا یہ مقام اور درجہ ہے کہ عرش الٰہی کے حامل فرشتے اور کروبیین اللہ کی تسبیح وحمد کے ساتھ اُن کے لئے مغفرت وجنت کی دعا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اس پر مامور ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اس سے آگے کسی اعزاز واکرام کا

(۱) مشکوٰۃ۔ باب الاستغفار والتوبہ [illegible]

شاید تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اللہ تعالیٰ ہم آپ کو بھی اپنے اُن خوش نصیب بندوں میں شامل فرمادے! اور یہ بات ہم جیسے گنہگاروں کے لئے بھی ناممکن نہیں ہے بلکہ توفیق ہو تو کچھ مشکل بھی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے کفر و شرک سے ہمیں محفوظ رکھا ہے لیکن گناہوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ تو اپنے گناہوں سے ہم اللہ کے حضور میں توبہ کریں، اور آئندہ کے لئے اُن سے بچنے کا اور اللہ و رسول کی فرماں برداری اور شریعت کی پیروی کا فیصلہ کریں اور اللہ تعالیٰ سے اس کی توفیق مانگیں اور پھر جب کبھی گناہ ہو جائے تو پھر اسی طرح توبہ کریں، اور اس کو زندگی کا اصول اور معمول بنالیں تو ہم بھی حامل عرش ملائکہ مقربین اور کروبیین کی ان دعاؤں میں شامل ہو جائیں گے اور انشاء اللہ ان کی دعا ہمارے حق میں قبول ہو گی اور اللہ کی رحمت سے ہم کو بھی جنت نصیب ہو گی، قرآن مجید میں اس آیت کے پڑھنے کے بعد اگر ہمارے اندر ملائکہ مقربین کی اس دعا میں شامل ہونے کا داعیہ اور اس کا شوق نہ پیدا ہو تو بڑی محرومی کی بات ہے۔

کرم بالائے کرم

ان حامل عرش ملائکہ مقربین اور عرش الٰہی کا ہر دم طواف کرنے والے کروبیین کی اس دعا میں آگے یہ بھی ہے کہ اے اللہ تیرے جو بندے کفر و شرک اور نافرمانی سے توبہ کر کے اور تیری راہِ ہدایت اور شریعت کی پیروی اختیار کر کے تیری رحمت کے مستحق ہو جائیں (اور تو ان کے لئے جنت کا فیصلہ فرمادے) تو اُن کے اُن ماں باپ اور اُن بیوی بچوں کو بھی اُن کے ساتھ جنت عطا فرمادے جو اس لائق ہوں، میں یہ قرآن مجید کے لفظ "مَنْ صَلَحَ" کا مطلب عرض کر رہا ہوں، بسا اوقات ایسا ہوتا ہی کہ اللہ کا ایک بندہ صاحبِ ایمان اور صاحبِ صلاح و تقویٰ ہے، لیکن اُس کے ماں باپ یا اُس کی بیوی، یا اولاد کا حال یہ ہے کہ ان کا اعمال نامہ اچھا نہیں ہے، تو اگر خدانخواستہ اُن میں کفر و شرک جیسی نجاست ہے یا سخت درجہ کا فسق و فجور ہے جس کی وجہ سے وہ اس لائق نہیں ہیں کہ بغیر سزا کے اُن کے لئے مغفرت اور جنت کا فیصلہ ہو سکے۔ تو اُن کے بارہ میں تو یہ فرشتے کچھ عرض نہیں کرتے لیکن اگر وہ اس درجہ کے مجرم نہیں ہیں اگرچہ گناہگار اور قصوروار ہیں مگر قابلِ معافی ہیں تو ان کے لئے یہ فرشتے اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ اے پروردگار اپنے صاحب ایمان اور صاحبِ صلاح و تقویٰ بندوں کے طفیل میں اُن کے

اُن ماں باپ اور بیوی بچوں کو بھی بخش دے اور جنت میں اُن کے ساتھ ہی کر دے! اور جب یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے یہ دعا کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ بھی قبول ہوگی اور متقی اور صالح بندوں کے ساتھ اُن کے اُن ماں باپ اور بیوی بچوں وغیرہ قریبی اعزہ کی بھی مغفرت فرمادی جائے گی اور جنت میں اُن کے ساتھ ہی کر دیا جائے گا جو خود اپنے اعمال کی وجہ سے اس کے مستحق نہیں ہوں گے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرماں بردار اور وفادار بندوں کا خاص اعزاز واکرام ہے کہ اُن کی رعایت سے اور اُن کے تعلق کی وجہ سے وہ اُن کے گناہگار عزیزوں قریبوں کے لئے بھی اپنے ملائکہ مقربین سے مغفرت اور رحمت کی دعا کراتا ہے۔

فرشتوں کی اس دعا کا آخری حصہ یہ ہے ''وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ، وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ، وَذَالِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ'' مطلب یہ ہے کہ خداوندا، اپنے ان بندوں کو (جن کا اوپر ذکر ہوا) گناہوں کی شامت اور وبال سے بچالے، یعنی زندگی میں گناہوں سے حفاظت فرما تا کہ آخرت میں ان گناہوں کا عذاب نہ ہو۔ اور اگر اغوائے شیطانی یا شرارتِ نفس سے گناہ ہو جائیں تو معاف فرما کر آخرت کے عذاب و وبال سے ان کو بچالے۔ اور جن بندوں کے ساتھ تو یہ عنایت فرمائے گا وہ اُن پر تیری رحمت ہوگی اور تیرا ہی کرم ہوگا اور یہ ان کی بڑی خوش نصیبی ہوگی۔ ''وَذَالِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ''

ان آیتوں کے سننے اور سمجھ لینے کے بعد ہم میں سے ہر ایک میں یہ فکر پیدا ہو جانی چاہئے کہ ہم بھی ان بندوں میں شامل ہو جائیں جن کے لئے حامل عرش فرشتے اور کروبیین یہ دعائیں کرتے ہیں، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے، اب تک کی غلطیوں اور غفلتوں سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری اور شریعت کی پیروی کا عزم کر لیں اور جب کبھی گناہ ہو جائے تو ہمیشہ توبہ کر کے اس کا اثر دھونے کی کوشش کریں۔ اگر اتنا نصیب ہو جائے تو یقیناً ہم بھی ان بندوں میں شامل ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے!!



(درس-۲۸)

کفروشرک سے خدا کی انتہائی ناراضگی اور آخرت کا بُرا انجام عذاب سے چھٹکارے کیلئے جہنمیوں کی فریاد اور اُس کا جواب ہر ایک اپنے کیئے کی جزا پائے گا کسی پر رتی بھر ظلم نہ ہوگا

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللّٰه من الشّيطٰن الرجيم۔ بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِّنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ٥ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ٥ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ۔ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ٥ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا۔ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ٥ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ٥ رَفِيْعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ٥ يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ۔ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ٥ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ۔ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ٥ (سورۃ المومن۔ آیت ۱۰ تا ۱۷)

(ترجمہ) یقینی ہے کہ جن لوگوں نے کفر وانکار کے جرم کا ارتکاب کیا (قیامت کے دن) اُن سے پکار کے کہہ دیا جائے گا کہ (آج) تم کو اپنے پر جیسا غصہ اور جیسی ناراضی ہے،

اللہ کو اُس سے زیادہ غصہ اور ناراضی تھی (تم پر) جب تم کو ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم ماننے سے انکار کرتے تھے، وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار تو نے ہم پر دو دفعہ موت طاری کی اور دو بار ہمیں زندگی عطا فرمائی۔ اب ہم کو اپنے گناہوں کا اعتراف ہے، تو کیا اب (اس عذاب سے) نکلنے کی کوئی راہ ہے؟ (اُن سے کہا جائے گا کہ) یہ عذاب اس وجہ سے ہے کہ جب (تمہارے سامنے) ایک اللہ (وحدہٗ لاشریک لہ) کی عبادت کی اور اسی کو پکارنے کی بات کی جاتی تھی تو تم کفر و انکار کا رویہ اختیار کرتے تھے (اور اُس کے سننے سے بیزاری ظاہر کرتے تھے) اور جب اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جاتا (اور شرک کے لئے بلاوا دیا جاتا) تو تم (دل و جان سے اس کو) قبول کرتے تھے، پس اب فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جو سب سے بلند و بالا اور بڑے جلال و عظمت والا ہے۔ (جس کو تم نے اپنے کفر و انکار اور بدکاریوں سے انتہائی ناراض کر دیا ہے)۔

وہی اللہ ہے جو تم کو دکھلاتا ہے اپنی نشانیاں اور اتارتا ہے تمہارے لئے آسمان سے رزق۔ اور نصیحت وہی بندے قبول کرتے ہیں جو (فکرمندی کے ساتھ) رجوع ہوتے ہیں۔ پس اللہ ہی کو پکارو اس طور پر کہ خالص اسی کی عبادت اور بندگی ہو، اگرچہ کافر منکر لوگ ناراض ہوں، وہ بلند مرتبہ ہے، مالکِ عرش ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وحی سے نوازتا ہے (اور اس کو نبوت و رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے) تاکہ وہ ''یوم التلاق'' (اللہ کے حضور میں پیشی کے دن سے لوگوں کو) ڈرائیں۔ وہ دن جب وہ سب بالکل کھلے (میدان میں) ہوں گے (کسی کے لئے کوئی حجاب اور پردہ نہ ہوگا) اُن کی کوئی بات اور کوئی چیز اللہ سے مخفی نہیں ہوگی، (اس کی طرف سے پوچھا جائے گا) آج حکومت اور بادشاہت کس کی ہے؟ (ندا آئے گی) (آج) اللہ واحد قہار ہی کی حکومت اور بادشاہی ہے۔ (اس کے سوا آج کوئی مجازی حاکم اور فرماں روا بھی نہیں ہے۔ خداوندی عدالت کی طرف سے اعلان ہوگا) آج ہر شخص کو اس کے اعمال کا (پورے انصاف اور رحم کے ساتھ) بدلہ دیا جائے گا، کسی کے ساتھ آج کوئی بے انصافی اور زیادتی نہیں ہوگی، بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب کر دینے والا ہے۔

تفسیر وتشریح

یہ سورۂ مؤمن کا دوسرا رکوع تھا جس کی اس وقت تلاوت کی گئی ہے۔ اس سے پہلی آیتوں میں مؤمنین صالحین کو وہ عظیم بشارت سنائی گئی تھی جس کے بارہ میں میں نے کہا تھا کہ یہ بشارت قرآن پاک میں غالباً کسی اور جگہ نہیں سنائی گئی ہے، یعنی یہ کہ اللہ کے وہ مقرب ترین فرشتے جو اُس کے عرش کے حامل ہیں۔ یہ سب اللہ کی حمد و تسبیح کے ساتھ مؤمنین صالحین کے لئے اور اُن کے متعلقین کے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور جنت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں، میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اُن کا اکرام واعزاز ہے کہ اپنے مقرب ترین فرشتوں کو اُن کا مستقل دعا گو بنا دیا ہے۔

منکروں کا انجام

اس کے بعد اس دوسرے رکوع کی ابتدائی آیتوں میں مؤمنین صالحین کے بالمقابل اہل کفر وشرک اور اشرار کا برا انجام بیان فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے۔ "إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا...... فَتَكْفُرُوْنَ" مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے پیغمبروں کی خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ ایمان اور دعوت توحید کو نہیں مانا اور کفر و انکار کا رویہ اختیار کیا، جب قیامت اور آخرت میں وہ اُس کا انجام اور خدا کا عذاب دیکھیں گے تو اُن کو اپنے اوپر بڑا غصہ آئے گا۔ اور گویا وہ اپنی بوٹیاں نوچیں گے کہ ہم نے خدا اور اس کے رسول کی بات نہ مان کر اپنے پر کیسا ظلم کیا، اس کو اس مثال سے سمجھئے کہ کوئی شخص غصہ میں زہر کھالے، پھر جب زہر کا اثر شروع ہو اور پیٹ میں آنتیں کٹنے لگیں اور ایسا معلوم ہونے لگے جیسے کوئی چھریوں سے آنتوں کو اور جگر کو کاٹ رہا ہے تو اُسے اپنی حماقت پر کیسا غصہ آئے گا۔ بس اسی طرح کا غصہ آخرت کا عذاب دیکھ کر اہل کفر وشرک کو اور اللہ ورسول کے نہ ماننے والوں کو اپنے اوپر آئے گا اور وہ واویلا کریں گے تو اُن سے کہا جائے گا (غالباً عذاب کے فرشتے کہیں گے) کہ آج تم کو جیسا غصہ اپنے اوپر آرہا ہے، اُس سے زیادہ غصہ تمہارے خالق و مالک خداوند تعالیٰ کو اس وقت تم پر آتا تھا جب تم کو ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم انکار کرتے اور ٹھکراتے تھے اور

طرح طرح کی گستاخیاں کرتے تھے، آگے ارشاد ہے "قَالُوْا رَبَّنَا...... فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ؟" یعنی یہ اہل کفر وشرک جو عذاب میں گرفتار ہوں گے اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے، خداوندا آپ نے دو دفعہ ہمیں موت کی حالت سے گزارا (ایک دفعہ پیدائش سے پہلے جب ہم کو زندگی نہیں ملی تھی تو وہ موت ہی کی حالت تھی، اور دوبارہ دنیوی زندگی کے بعد ہم پر آپ نے موت کی حالت طاری کی) اور اسی طرح دو دفعہ آپ نے ہم کو زندگی بخشی (ایک اس وقت جب دنیا میں پیدا فرمایا اور دوسری بار جب اِس عالمِ آخرت میں ہم کو زندہ کیا گیا) اب ہم کو اپنے سب گناہوں کا اعتراف واقرار ہے، بے شک ہم مجرم اور سزا کے مستحق ہیں۔ لیکن کیا اِس کی کوئی صورت ہے کہ جس طرح آپ نے پہلے دو دفعہ ہمیں موت اور زندگی کی حالتوں سے گزارا اسی طرح پھر ایک دفعہ موت یا نئی زندگی دے کر یہاں سے چھٹی دے دی جائے اور ہم اس عذاب سے نجات پا جائیں؟ تو انہیں جواب ملے گا "ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ" مطلب یہ ہے کہ تم اِس عذاب اور سزا کے اس لئے مستحق ہو کہ دنیا میں تمہارا رویہ یہ تھا کہ جب تم کو اللہ وحدہ لاشریک ہی کو اپنا مالک ومعبود بنانے اور صرف اسی کی عبادت اور بندگی کرنے کی دعوت دی جاتی تھی تو تم اُس سے انکار کرتے اور ٹھکراتے تھے۔ تو ایسے مجرموں کے لئے خداوند ذوالجلال اور اللہ علی وعظیم کا حکم اور فیصلہ یہی ہے کہ وہ یہ عذاب اور سزا پائیں اُس کی صفتِ عدل اور رحمت کا یہی تقاضا ہے، لہٰذا اب تمہارے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔

قرآن پاک میں اس کی علاوہ بھی متعدد جگہ یہ مضمون بیان فرمایا گیا کہ جو لوگ کفر وشرک کے مجرم اور دنیا میں خدا کے باغی رہے ہیں وہ جب آخرت میں جہنم کا عذاب دیکھیں گے اور چکھیں گے تو واویلا کریں گے اور درخواست کریں گے کہ ہمیں اب معافی دے کر ایک دفعہ پھر دنیا میں بھیج دیا جائے اب ہم اللہ ورسول کی فرماں برداری والی زندگی گزاریں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کے قانونِ عدل وحکمت میں یہ درخواست قابل قبول نہیں ہوگی، اور نہ اس دنیا میں یہ قاعدہ ہے کہ کسی ڈاکو یا قاتل کو جب سزا دی جانے لگے اور پھانسی کے تختہ پر چڑھایا جانے لگے اور اس وقت وہ آئندہ کے لئے نیک چلنی کا وعدہ کر کے معافی مانگے تو اُسے معاف کر دیا جائے اور چھٹی دے دی جائے، سورۂ فاطر میں ارشاد ہے:

''وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحاً غَيْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ، أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَ كُمُ النَّذِيرُ، فَذُوْقُوْا فَمَا لِظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَصِيْرٍ'' ۔ (سورۃ فاطر۔ ع۴۔ آیت ۳۷)

اور وہ مجرم دوزخ میں چیخ چلا رہے اور واویلا مچا رہے ہوں گے اور کہیں گے خداوندا ہمیں یہاں سے نکال دے (اور دنیا میں بھیج دے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) ہم اب نیک اعمال کریں گے وہ حرکتیں نہیں کریں گے جو پہلے کیا کرتے تھے، (جواب ملے گا) کیا ہم نے تم کو دنیا میں اتنی عمر اور زندگی نہیں دی تھی جس میں نصیحت حاصل کر سکتا، اور تمہارے پاس (آخرت کے اس انجام سے) باخبر کرنے والے اور ڈرانے والے (پیغمبر یا اُن کے داعی اور مبلغ) بھی آئے، (لیکن اُن کی بات کو ٹھکرایا) پس اب تم (اپنے کیئے کا نتیجہ بھگتو اور) عذاب کا مزا چکھو، اور ان مجرموں کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہوگا۔

اہل کفر و شرک کا یہ اُخروی انجام بیان فرمانے کے بعد بندوں کو اللہ کے احسانات اور اس کی قدرت اور ربوبیت اور نشانیوں کی طرف توجہ دلا کر توحید الٰہی کی دعوت دی جا رہی ہے۔ ارشاد ہے:

توحید کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں

''هُوَ الَّذِیْ يُرِيكُمْ آيٰتِهٖ...... فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ'' مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ جس کی عبادت اور بندگی اور توحید کی دعوت دی جا رہی ہے وہ ہے جو تمہارے اندر اور باہر اپنی قدرت کی نشانیاں تم کو دکھاتا ہے، اور تمہارے لئے رزق اور روزی کا سامان آسمان سے اتارتا ہے، (انسان کی غذا بلکہ اس کی زندگی کی ساری ضروریات بالواسطہ یا بلاواسطہ زمین کی پیداوار ہی سے پوری ہوتی ہیں، غلہ پھل وغیرہ سب زمین ہی میں پیدا ہوتے ہیں، حلال جانوروں کا گوشت اور اُن کا دودھ جانوروں کی اس غذا ہی سے بنتا ہے جو زمین سے پیدا ہوتی ہے اور زمین کی ساری پیداوار اللہ کی نازل کی ہوئی بارش کا طفیل ہے)۔ آگے فرمایا گیا ہے '' وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَنْ يُّنِيبُ'' مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی یہ نشانیاں اور اُس کے یہ احسانات تو سب کے سامنے ہیں لیکن جس کو ان چیزوں کی طرف توجہ ہی نہ ہو اور کوئی فکر ہی نہ ہو وہ ان سے کوئی نصیحت اور سبق نہیں لے سکتا، وہی خوش نصیب بندے

ان سے نصیحت لیتے اور خدا کی معرفت حاصل کرتے ہیں جنہیں اپنے انجام کی فکر ہو اور جو ہدایت کے طالب ہوں، آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ" پس اے بندو! صرف اللہ ہی کو اپنی حاجتوں کے لئے پکارو اور اخلاص کے ساتھ اسی کی عبادت اور بندگی کرو، خواہ اہل کفر و شرک کو یہ بات کتنی ہی نا گوار ہو، اُن کی اور کسی کی بھی اس راہ میں پروا نہ کرو۔

وہی صاحبِ عظمت ہے اور پیغمبر بھیجتا ہے کہ بندوں کو خبردار کریں

آگے اللہ تعالیٰ کی شان کی عظمت و رفعت کی طرف اشارہ فرما کے اُس کی طرف سے نازل ہونے والی وحی اور نبوت و رسالت کے نظام کا اور پھر قیامت و آخرت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

ارشاد ہے۔ "رَفِيْعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ أَمْرِهٖ...... إِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ" مطلب یہ ہے کہ وہ خداوند ذوالجلال بہت بلند مرتبہ ہے عرش عظیم کا مالک ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم کی وحی کرتا ہے اور اُن کو نبوت و رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے جن کا ایک خاص کام یہ ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے دن خداوند ذوالجلال کے حضور میں حاضری اور حساب کتاب کے بارہ میں آگاہی دیں اور اس دن کی ہولناکیوں سے ڈرائیں۔ (لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ) اس آیت میں قیامت کے دن کے لئے "يَوْمَ التَّلَاقِ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے "ملاقات کا دن" جس طرح قیامت کا ایک نام "الساعة" یا "الآزفة" ہے اور ان کے علاوہ بہت سے نام ہیں، اسی طرح "يَوْمَ التَّلَاقِ" بھی اسی کا ایک نام ہے۔ اس زندگی میں اللہ تعالیٰ پر ہمارا ایمان ہے لیکن اس کی جھلک دیکھنے کا بھی یہاں ہمارے لئے امکان نہیں ہے، قیامت کے دن اُس کی بارگاہ میں حاضری نصیب ہوگی، اسی کو "تلاقی" (ملاقات) کہا گیا ہے، اس کے علاوہ اُس دن ان شاء اللہ اگلے پچھلے سب بچھڑے ہوئے ملیں گے، اس لحاظ سے بھی قیامت کا دن "ملاقات کا دن" ہوگا، اس "یوم التلاق" کا مزید یہ حال بیان فرمایا گیا ہے "يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ" یعنی اُس دن سب اولین و آخرین اس حال میں ہوں گے کہ کوئی بھی آڑ اور پردے میں نہ ہوگا اور کسی کی کوئی بات اللہ سے مخفی نہ ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا

ہوگی "لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ" (آج کس کی حکمرانی اور فرماں روائی ہے؟) دنیا میں بہت سوں کو چھوٹے یا بڑے درجہ کی حکومت اور فرماں روائی حاصل ہوتی ہے لیکن قیامت کے دن اللہ کے سوا کسی کی نام کو بھی حکومت نہ ہوگی، اللہ کے حضور میں سب عاجز بندے ہونگے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے "لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ؟" کے جواب میں اعلان ہوگا کہ "لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ" کہ آج بادشاہی اور فرماں روائی صرف اللہ واحد قہار کی ہے، اسی کے ساتھ فرمایا جائیگا "اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ لَاظُلْمَ الْیَوْمَ، إِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ" مطلب یہ ہے کہ آج کا دن خداوندی عدالت کا دن ہے، آج ہر شخص کو اس کے کیئے کی، اس کے اچھے یا برے اعمال وافعال کی پورے انصاف کے ساتھ جزا دی جائے گی۔ کسی پر ذرہ برابر ظلم اور کسی کے ساتھ رتی بھر بے انصافی نہیں ہوگی، وہ دن چونکہ خداوندی قہر وجلال کے ظہور کا دن ہوگا اور اوپر اہل کفر وشرک اور خدا کے باغیوں اور نافرمانوں کا اور ان کے عذاب کا ذکر کیا جاچکا ہے اس لئے یہاں خصوصیت کے ساتھ اس کی وضاحت فرمادی گئی کہ اس دن کسی مجرم کے ساتھ بھی بے انصافی نہیں ہوگی، اگر وہ سزا کا مستحق ہے تو اس کو اتنی ہی سزا اور وہی سزا دی جائے گی جو اُس کی جرم کے حساب سے قانونِ عدل کا تقاضہ ہوگا، اسی طرح کسی بندے کی رتی بھر نیکی نظر انداز نہیں کی جائے گی ہر نیکی کا پورا پورا اجر عطا فرمایا جائے گا۔

آگے ارشاد فرمایا "إِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ" کسی کو شبہ ہوسکتا ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک پیدا ہونے والے سارے بندوں کا اور تمام اولین وآخرین کا حساب کتاب تو ہزاروں یا لاکھوں برس میں ہوسکے گا؟ تو آیت کے اس آخری کلمے "إِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ" نے بتلایا کہ اللہ تعالیٰ سب کا حساب آناً فاناً کردے گا، قرآن پاک ہی ہیں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔ "وَمَا أَمْرُنَا إِلاَّ وَاحِدَۃٌ کَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ" اللہ تعالیٰ کا فیصلہ پلک جھپکنے کی طرح بس ایک لحہ اور ایک آن میں ہوتا ہے، اس کو کسی کام کے لئے وقت کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم بندوں کو توفیق دے کہ ہم اُس دن اور اس حساب کے لئے یہیں تیاری کرلیں۔ حدیث شریف میں ہے "حاسبوا قبل ان تحاسبوا" یعنی تم خود اپنا محاسبہ کرتے رہو اُس دن کے آنے سے پہلے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارا حساب ہوگا اور تمہاری زندگی کا اعمال نامہ دیکھا جائے گا۔ اور پھر دوزخ یا جنت کا فیصلہ ہوگا۔

(درس-۲۹)

قیامت کا دن اور حشر کا منظر کتنا دہشت ناک اور لرزہ خیز ہوگا

کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ زمانہ قدیم کی بعض بڑی طاقتور اور ترقی یافتہ قوموں کا پیغمبروں کی مخالفت کی پاداش میں کیا حشر ہوا؟

حضرت موسیٰ، فرعون، ہامان، قارون

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم- بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِالْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِيْنَ ٥
مَالِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَاشَفِيْعٍ يُّطَاعُ ٥ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ
وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ٥ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِهٖ لَايَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ- اِنَّ اللّٰهَ هُوَالسَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ٥ اَوَلَمْ
يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا
مِنْ قَبْلِهِمْ- كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَاراً فِي الْاَرْضِ
فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ- وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ٥ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ
اللّٰهُ- اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ٥ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا

وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ، إِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ
كَذَّابٌ ۝ فَلَمَّا جَآءَ هُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا اقْتُلُوْا أَبْنَآءَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَ هُمْ، وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ
إِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ أَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ
رَبَّهٗ، إِنِّيْٓ أَخَافُ أَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ أَوْ أَنْ يُّظْهِرَ فِي الْأَرْضِ
الْفَسَادَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰٓى إِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ
مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ (سورۂ مؤمن۔ آیت ۱۸ تا ۲۷)

(ترجمہ) اور (اے ہمارے پیغمبر) آپ ان لوگوں کو آنے والی بڑی مصیبت کے اُس دن (روز قیامت) سے آگاہ کیجئے اور ڈرائیے جب یہ حال ہوگا کہ دل (اچھل کر) گلوں کے پاس آ جائیں گے اور وہ کچھ بول نہ سکیں گے، (اُس دن) اِن مجرموں کا کوئی مخلص دوست نہ ہوگا (جو ساتھ دے سکے اور کام آ سکے) اور کوئی ایسا سفارشی نہ ہوگا جس کی سفارش مانی جائے۔ (جس اللہ سے اُس دن واسطہ ہوگا اس کی شان یہ ہے کہ) وہ آنکھوں کی چوری کو بھی جانتا ہے اور سینوں اور دلوں کے مخفی رازوں کو بھی، اور وہ اللہ فیصلہ کرتا ہے اور کرے گا حق وانصاف سے، اور یہ مشرکین اللہ کے سوا جن (معبودانِ باطل) کی عبادت کرتے اور جن کو (حاجت روائی کے لئے) پکارتے ہیں وہ کوئی بھی فیصلہ نہیں کر سکتے (اُن کے اختیار ہی میں کچھ نہیں) حق یہ ہے کہ اللہ ہی سب کچھ دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔ کیا یہ لوگ (اللہ کی) زمین میں چلے پھرے نہیں تو یہ دیکھ لیتے کہ کیسا (بُرا) انجام ہوا اُن سے پہلے والوں کا (جو حق کے اور ہمارے پیغمبروں کے منکر تھے) وہ اِن لوگوں سے قوت وطاقت میں بھی بڑھے ہوئے تھے اور زمین میں (چھوڑی ہوئی) نشانیوں اور یادگاروں کے لحاظ سے بھی (بالاتر تھے)۔ پس اللہ نے اُن کے گناہوں اور نافرمانیوں کے سبب ان کو اپنی پکڑ میں لے لیا، اور کوئی نہیں تھا اللہ (کے عذاب اور اس کی پکڑ) سے ان کو بچانے والا۔ یہ اس لئے ہوا کہ اُن کے پاس اللہ کے پیغمبر آیا کئے کھلی نشانیاں اور واضح ہدایات لے کر تو انہوں نے کفر وانکار کا رویہ اختیار کیا تو اللہ نے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا، وہ بڑی قوت والا اور سخت سزا دینے والا ہے

اور ہم نے بھیجا (اے پیغمبر) موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور واضح دلیل و برہان لے کر فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف تو انہوں نے کہا جادوگر ہے اور قطعی جھوٹا ہے۔ پھر جب وہ اُن کے پاس ہماری طرف سے حق کا پیغام لے کر پہنچا تو انہوں کہا کہ جو لوگ ایمان لا کر اس کے ساتھ ہو گئے ہیں ان کے بیٹوں کو قتل کر ڈالو اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رہنے دو۔ اور کافروں کی تدبیر و سازش کو رائگاں ہی جانا ہے۔

اور فرعون نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو میں موسیٰ کا خاتمہ کر دوں اور وہ (اپنی مدد کے لئے) اپنے خدا کو (بھی) بلا لے، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل ڈالے یا ملک میں فساد برپا کر دے۔ اور موسیٰ نے کہا کہ میں نے پناہ لے لی اپنے رب کی جو تمہارا بھی (اور سب کا) رب ہے ہر ایسے متکبر و مغرور (کے شر اور شرارت) سے جو یوم حساب (روز قیامت) پر یقین نہ رکھے۔

تفسیر و تشریح

دو تین ہفتے پہلے سورۂ ''مؤمن'' شروع ہوئی تھی، اس کے قریباً دو رکوع ہو چکے ہیں پچھلے ہفتے جو درس ہوا تھا اس کی آخری آیتوں کا مضمون یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جن کو رسالت اور پیغمبری کے لئے منتخب فرماتا ہے ان کو وحی کے ذریعہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو قیامت کے دن اور اس کے حساب کتاب اور آخرت کی جزا سزا سے آگاہ کریں اور ڈرائیں اسی کے ساتھ قیامت اور میدانِ حشر کی ہولناکی کا بھی نہایت مؤثر اور لرزہ خیز انداز میں ذکر فرمایا گیا تھا۔

یہ گویا تمہید تھی ان آیتوں کی جو اِس وقت تلاوت کی گئی ہیں۔ ارشاد فرمایا گیا ہے ''وَاَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡاٰزِفَةِ اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَى الۡحَـنَاجِرِ كٰظِمِيۡنَ'' یہاں قیامت کا ذکر ''یوم الآزفة'' کے لفظ سے کیا گیا ہے۔ اس سے دو چار ہی آیتیں پہلے اُس کا ذکر ''یوم التلاق'' کے نام سے کیا گیا تھا، وہاں میں نے بتلایا تھا کہ قیامت کو قرآن مجید میں بہت سے ناموں سے یاد کیا گیا ہے جیسے ''الساعة'' ''الواقعة'' ''یوم الحساب'' ''یوم التلاق'' وغیرہ انہی ناموں میں سے ایک ''الآزفه'' بھی ہے، اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے ''اے ہمارے پیغمبر آپ ان

لوگوں کو "یوم الأزفه" یعنی قیامت کے دن سے آگاہ کیجئے اور ڈرایئے جس دن اُس کی ہولناکیاں دیکھ کر لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ گویا اُن کے دل اچھل کر گلوں میں آرہے ہیں، "دلوں کا گلوں میں آنا" عربی زبان کا ایسا ہی محاروہ ہے جیسا کہ ہماری زبان میں "کلیجہ منھ کو آنا" محاورہ ہے۔ جب آدمی کو کسی دہشت ناک حادثہ کا سامنا ہوتا ہے تو اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ گویا دل سینہ سے نکل جانا چاہتا ہے، اسی کیفیت کو اس آیت میں "اذالقلوب لدی الحناجر" کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے اور ایسی حالت میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دل کی جگہ کو اوپر سے دبا لیتا ہے۔ اور گلا گھٹا گھٹا سا معلوم ہوتا ہے۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کے لفظ "کاظمین" کا یہی مطلب بیان کیا ہے اور چونکہ اُس وقت آدمی کچھ بولنے بات کرنے کے لائق نہیں ہوتا اس لئے بعض مفسرین نے اُس کی تفسیر "ساکتین" "صامتین" سے بھی کی ہے۔ تو آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے پیغمبر آپ ان لوگوں کو آنے والے قیامت کے اُس دن آگاہ کیجئے اور ڈرایئے جب حال یہ ہوگا کہ دل اچھل کر گلوں میں آرہے ہوں گے، یا اپنی زبان کے محاورہ کے مطابق کہہ لیجئے کہ کلیجے منھ کو آرہے ہوں گے، اور وہ اپنے دل کو دبائے ہوئے ہوں گے کچھ بولنے بات کرنے کے حامل نہ ہوں گے۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ " مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ." مطلب یہ ہے کہ اس وقت ان مجرموں کا کوئی عزیز قریب اور کوئی مخلص دوست ایسا نہ ہوگا جو اُن کے کام آسکے، اور نہ کوئی ایسا سفارشی ہوگا جس کی سفارش اللہ کے یہاں قابل سماعت اور قابل قبول ہو۔ آگے فرمایا گیا ہے " يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ"، یعنی وہاں اس علیم وخبیر خدا سے واسطہ ہوگا جو آنکھوں کی چوری بھی جانتا ہے، اور دلوں اور سینوں کے راز بھی جس سے مخفی نہیں ہیں۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے " وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ. اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ". مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ ہی فیصلہ فرمائے گا، اور اس کا فیصلہ حق و انصاف کا ہوگا، اور ان مشرکوں نے جن واقعی یا فرضی ہستیوں کو دیوتا اور معبود بنالیا ہے اور جن کو یہ مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر پکارتے اور جن کی دہائی دیتے ہیں اُن کی وہاں کچھ نہ چلے گی اور وہ کچھ بھی نہ کرسکیں گے۔ اللہ سمیع وبصیر ہے وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے، وہی سب کا فیصلہ فرمائے گا اس لئے ان منکر ین حق کو اور سب کو ...

دُشمنانِ حق کی دُنیاوی پکڑ

یہاں تک انکارحق اور کفروشرک کے اُخروی انجام کی طرف توجہ دلائی گئی اور اُس سے خبردار کیا گیا۔آ گے فرمایا جارہا ہے کہ جن لوگوں اور جن قوموں نے پہلے زمانوں میں انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ حق کے مقابلہ میں کفروانکار کا رویہ اختیار کیا اور ہر طرح اتمام حجت کے بعد بھی وہ مخالفت اور کفر کے رویہ ہی پر اصرار کرتے رہے اُن پر دنیا میں بھی خدا کی طرف سے عذاب نازل ہوا اور وہ ہلاک وبرباد ہوئے،ان کی انجام سے بھی ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ارشاد فرمایا جارہا ہے۔

" اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ. كَانُوْا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَاراً فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ.وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ"۔

مکہ کے لوگ خاص کر بڑے اور دولت مند لوگ،تجارت پیشہ تھے،اُن کے تجارتی قافلے شام اور یمن کی طرف جایا کرتے تھے۔گرمی کے موسم میں وہ شام کی طرف سفر کیا کرتے تھے جو ٹھنڈا ملک ہے اور سردی کے موسم میں یمن کی طرف۔اُن کے اِن سفروں کا ذکر سورۃ "ایلٰف"میں "رحلة الشتاء و الصيف" کے الفاظ میں کیا گیا ہے،اِن تجارتی سفروں میں وہ اُن علاقوں سے بھی گزرتے تھے جہاں قوم عاد وثمود اور قوم لوط وغیرہ ان قوموں کی تباہ شدہ بستیاں اور اُن کے کھنڈر تھے جنہوں نے حجت حق پوری ہوجانے کے بعد بھی اللہ کے پیغمبروں کی گستاخانہ مخالفت کی اور پھر ان پر خدا کا عذاب نازل ہوا،اور وہ بستیاں تہس نہس کردی گئیں، ان مکہ والوں کے کانوں میں مشہور قصوں کی طرح یہ باتیں بھی پڑی تھیں کہ ان بستیوں پر پیغمبروں کی وجہ سے خدا کا عذاب آیا تھا۔تو اس آیت (اولم یسیروا فی الارض الخ) میں فرمایا گیا ہے کیا اِن لوگوں نے سفروں میں چل پھر کر دیکھا نہیں کہ ہمارے پیغمبروں کی مخالفت اور ان کی دعوتِ حق کا انکار کرنے والی ان قوموں کا کیسا انجام ہوا جن کے پاس قوت وطاقت ان مکہ والوں سے بدرجہا زیادہ تھی اور ان کی عظمت وترقی کی بڑی شاندار یادگاریں اور نشانیاں تھیں،الغرض ان مکہ والوں کے مقابلہ میں وہ قومیں بہت طاقت ور اور بڑی ترقی یافتہ تھیں۔

پھر اُن کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے، اُن کے کافرانہ رویہ کی وجہ سے اللہ نے ان کو اپنی پکڑ میں لے لیا، وہ تباہ و برباد کردی گئیں، اُن کا نام ونشان مٹ گیا۔ " وما کان لهم من الله من وّاق "اور پھر اللہ کی پکڑ اور اُس کے عذاب سے اُن کو بچا سکنے والا کوئی نہیں تھا- آگے فرمایا گیا ہے۔

"ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ کَانَتْ تَّاْتِیْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَکَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ. اِنَّهٗ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ" اِس آیت میں پھر وضاحت کی گئی ہے کہ ان لوگوں پر جو خدا کا عذاب نازل ہوا اور ان کو جو تباہ و برباد کیا گیا تو وہ اُن کے اس سنگین جرم کی دنیوی سزا تھی کہ ہمارے پیغمبر اُن کے پاس ایسے روشن دلائل اور ایسی واضح ہدایات لے کر آئے جن کے بعد کفر وانکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن انہوں نے از راہِ ضد وشرارت سرکشی اور کفر وانکار کا رویہ اختیار کیا اور ہمارے پیغمبروں اور ان کی دعوتِ حق کی مخالفت پر کمر باندھ لی، انہوں نے خود اللہ کے عذاب کو دعوت دی پھر اللہ کا عذاب نازل ہوگیا اور اللہ کو ہر طرح کی قوت وقدرت حاصل ہے اور وہ شدید العقاب ہے۔ اس کی مار بے پناہ اور اس کا عذاب بڑا سخت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان اہل مکہ کو چاہئے کہ اللہ کے دئے ہوئے کانوں، آنکھوں اور عقل سے کام لیں، ان قوموں اور بستیوں کے انجام سے سبق حاصل کریں جن کے کھنڈر انہوں نے اپنے سفروں میں دیکھے ہیں۔ اگر یہ کفر وانکار سے باز نہ آئے اور اسی طرح ہمارے پیغمبر کی اور دعوتِ حق کی مخالفت کرتے رہے تو ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو عاد وثمود اور قوم لوط وغیرہ کا ہوا۔

فرعون اور اس کے ساتھیوں کا انجام

اس کے آگے خصوصیت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اُن کو اپنا رسول بنا کر اور پیغام ہدایت دے کر فرعون وہامان وغیرہ کی طرف بھیجا تھا، انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت حق کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور تکذیب ومخالفت کی، بلکہ اُن کو قتل کردینے تک پر آمادہ ہوگئے، اور وہی رویہ اختیار کیا جو مکہ کے صنادید کفار ابوجہل، ابولہب وغیرہ نے اختیار کیا تھا لیکن انجام یہ ہوا کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں بلکہ سارے لاؤ لشکر پر خدا کا عذاب نازل ہوا اور وہ سب غرقاب ہوکر موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اور موسیٰ

علیہ السلام اور اُن پر ایمان لانے والے اللہ کی مدد سے فتحیاب اور کامیاب ہوئے۔ مقصد یہی ہے کہ مکہ کے اِن دشمنانِ حق وصداقت ابوجہل وغیرہ کو اپنے پیش روؤں فرعون وہامان وغیرہ کے انجام سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ارشاد فرمایا گیا ہے:

''وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ، اِلٰی فِرْعَوْنَ وَھَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ کَذَّابٌ.'' مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے پیغمبر موسیٰ کو''آیات''اور'' سلطان مبین'' دے کر فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف بھیجا۔''آیات'' اور ''سلطان مبین'' بظاہر دونوں سے مراد وہ روشن اور کھلے معجزات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائے تھے خاص کر عصا کا اژدہا بن جانا اور ہاتھ سے روشنی کا ظاہر ہونا جن کو مختصر لفظوں میں ''عصائے موسیٰ اور ید بیضا'' کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزے رسالت اور پیغمبری کی سند کے طور پر عطا فرمائے تھے۔اور حکم دیا تھا کہ سب سے پہلے مصر کے فرماں روا فرعون اور اس کے وزیر اعظم ہامان اور ملک کے سب سے بڑے دولت مند قارون کو جا کر دین حق کی دعوت دو اور رسالت اور پیغمبری کی سند اور دلیل کے طور پر یہ معجزات پیش کرو چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر ان کو خدا رسول نہیں مانا بلکہ کہا کہ ''سٰحِرٌ کذاب''،یہ جادوگر ہے، یعنی یہ جو کرتب دکھارہا ہے یہ خدائی معجزے نہیں ہیں بلکہ یہ اس کی جادوگری ہے اور یہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر نہیں ہے بلکہ جھوٹا مدعی ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے۔'' فَلَمَّا جَآءَ ھُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ وَاسْتَحْیُوْا نِسَآءَ ھُمْ، وَمَا کَیْدُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ. ''یعنی جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون، ہامان وغیرہ کو اور قوم کو بھی اللہ کے حکم کے مطابق حق کی (یعنی اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی اور ایمان کی) دعوت دی اور اللہ کے بندے متاثر ہونے لگے تو انہوں نے اُن لوگوں کو حق وہدایت سے اور ایمان لانے سے روکنے کے لئے حکم جاری کیا کہ جو کوئی ان کی دعوت کو قبول کر کے اور ایمان لا کے ان کے ساتھ ہو جائے، اُس کے لڑکے کو قتل کر دیا جائے اور صرف لڑکیوں کو باقی رکھا جائے۔ظاہر ہے کہ اس فرعونی حکم اور آرڈر کا مقصد یہ تھا کہ لوگ دہشت زدہ ہو جائیں اور کوئی ایمان لانے کی ہمت نہ کرے اور جو لوگ اس کے بعد بھی ایمان لا کر ان کے ساتھ ہو جائیں تو اس نسل کشی کی وجہ سے اُن کی قوت وطاقت بڑھنے

نہ پائے۔ بظاہر فرعون اور اس کے حواریوں کا یہ حکم اور اقدام ایسا تھا جس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " وما کید الکفرین إلا فی ضلال"، یعنی دشمنانِ حق کے منصوبے اور ان کے داؤ پیچ فیل ہی ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرعونی حکومت کا یہ خونی آرڈیننس بھی اللہ کے بندوں کو ایمان لانے سے نہیں روک سکا اور کچھ لوگ ایمان لا کر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہو گئے اور کچھ خفیہ طور پر ایمان لے آئے انہوں نے ایمان کا اظہار مناسب نہیں سمجھا، جیسا کہ آگے کی آیتوں سے معلوم ہوگا۔ آگے ارشاد ہے۔

''وَقَالَ فِرْعَوْنَ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّہٗ، اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَکُمْ اَوْاَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ. وَقَالَ مُوْسٰی اِنِّی عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ.''

واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کچھ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ حق اور اُن کے روشن معجزات سے متاثر ہو کر ایمان لانے لگے تو فرعون اور اس کے حواریوں کو زیادہ فکر ہوئی، اور معلوم ہوتا ہے کہ خود فرعون کا دل متاثر ہو چکا تھا اور وہ معجزات دیکھ کر سمجھ چکا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی بڑی غیبی طاقت ہے، اس لئے وہ اندر سے خوف زدہ تھا مگر چاہتا تھا کہ دوسرے لوگ اس کو خوف زدہ نہ سمجھیں۔ اس لئے اُس نے اپنے لوگوں کو سنا کر کہا کہ "ذرونی اقتل موسیٰ ولیدع ربہ الخ"، بھئی مجھے چھوڑ دو میں اس موسیٰ کو قتل کر دوں یا کرا دوں اور وہ اپنی مدد کے لئے اپنے خدا کو بھی بلا لے، مجھے اس سے خطرہ ہے کہ وہ تمہارا دین بدل دے۔ تمہیں باپ دادا کے دین سے ہٹا کر اپنے دین کا پیرو بنا لے اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ ملک میں فساد برپا کر دے یعنی موجودہ حکومت جو قبطی قوم کی اور تمہاری حکومت ہے اس کو ختم کر کے اپنی حکومت قائم کر لے۔ فرعون کے اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ دعوت کے انداز اور اُس کی تاثیر اور ان کے معجزات دیکھ کر اُس کا دل خوف زدہ ہو گیا تھا، اور اُس کے چھپانے ہی کے لئے اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا تھا کہ ''مجھے چھوڑ دو میں اس موسیٰ کا خاتمہ کر دوں'' ورنہ ظاہر ہے کہ وہاں کوئی بھی اُس کو روکنے والا اور اُس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا۔ اور اپنی بہادری اور بے خوفی ظاہر کرنے کے لئے اس نے یہ بھی کہا کہ موسیٰ اپنی مدد کے لئے اپنے خدا کو بھی بلا لے۔

نہتے اہلِ حق کا ہتھیار

بہر حال موسیٰ علیہ السلام کو جب اُس کی یہ بات پہنچی تو آپ نے پیغمبرانہ انداز میں اور پورے اعتماد کے ساتھ فرمایا۔ "إنی عذت بربی وربکم من کل متکبر لایؤمن بیوم الحساب" یعنی میں نے اپنے اُس پروردگار کی جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور جس کے قبضہ واختیار میں ہماری تمہاری سب کی موت وحیات ہے پناہ لے لی ہے ہر ایسے متکبر ومغرور کے شر اور اس کی شرارت سے جو قیامت، وآخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اس وجہ سے وہ ہر نا کردنی کرنے پر آمادہ ہوسکتا ہے۔ مطلب یہ ہی کہ میں اپنے اور ساری کائنات کے پروردگار کی پناہ میں ہوں اس لئے فرعون وہامان اور اُن جیسا کوئی بھی متکبر وغرور میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔

اس کے بعد جو کچھ پیش آیا اور فرعون اور اس کی حکومت اور لاؤ لشکر کا جو حشر وانجام ہوا، اُس سے سب کو معلوم ہو گیا کہ حالات کے بالکل برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے پروردگار کی حفاظت اور پناہ پر اعتماد کتنا برحق تھا۔ کچھ ہی پہلے سورۂ زمر میں گزر چکا ہے "ألیس اللّٰہ بکفٍ عبده" (کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے) یعنی بلاشبہ کافی ہے۔

اس میں ہمارے اور آپ کے لئے سبق ہے کہ اگر بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق صحیح ہو اور اس کو ایمان ویقین نصیب ہو اور وہ انتہائی ناسازگار اور خطرناک حالات میں بھی پورے اخلاص اور اعتماد ویقین کے ساتھ اللہ کی پناہ پکڑ لے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی حفاظت اور مدد ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی دشمن کے شر اور حملہ کا خطرہ ہوتا تو آپ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے تھے۔ "اللّٰھم إنا نعوذ بک من شرورھم ونجعلک فی نحورھم" (اے اللہ ہم تیری پناہ لیتے ہیں اِن دشمنوں کے شر سے اور تجھے کرتے ہیں اُن کے سامنے اور اُن کے مقابلہ میں) لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اللہ پر یقین واعتماد اور اُس کے ساتھ بندگی کا صحیح تعلق شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کو نصیب فرمائے۔

(درس-۳۰)

فرعون اور اُس کے ارکانِ حکومت کو آل فرعون کے ایک مرد مؤمن کا خطاب جس نے اپنا ایمان ظاہر نہیں کیا تھا

حکمت کے ساتھ دعوت اور موعظہ حسنہ کا بہترین نمونہ

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللّٰه من الشّیطٰن الرجیم- بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیمط

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا
اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ط وَاِنْ
يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ج وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ
الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ٥
يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ
بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ط قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ
اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ٥ وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ
اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ٥ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ
وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ط وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا
لِّلْعِبَادِ ٥ (سورہ مؤمن آیات ۲۸ تا ۳۱)

(ترجمہ) اور ایک مرد مؤمن جو فرعون کے لوگوں میں سے تھا اور اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا اس نے کہا کہ کیا آپ ایک شخص کو صرف اس بات پر قتل کر ڈالیں گے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب بس اللہ ہے، حالانکہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے (اپنی صداقت کے ثبوت میں) روشن دلائل و معجزات بھی لایا ہے، (ایسی حالت میں عقل کا تقاضا یہ ہے کہ عجلت میں اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کرو) اگر بالفرض وہ کاذب اور مفتری ہے تو اس کے جھوٹ (اور خدا پر افترا پردازی) کا وبال اُس پر پڑ کر رہے گا (جس خدا پر وہ افترا کر رہا ہے وہ ہی اُس کو نیست و نابود یا ذلیل و رسوا کر دے گا) اور اگر فی الواقع وہ سچا اور راست باز ہے تو پھر (یہ بات یقینی ہے کہ تکذیب و انکار اور مخالفانہ رویہ پر برے عواقب اور دنیا و آخرت کے مصائب کی) وہ تمہارے بارے میں جو پیشین گوئی کر رہا ہے اس میں سے کچھ ضرور تمہارے سامنے آ جائے گا۔ اور یہ بات حق ہے کہ اللہ کسی ایسے شخص کو راہ یاب اور کامیاب نہیں کرتا جو حد سے گزرنے والا اور سراسر جھوٹا ہو۔

اے میری قوم آج تمہاری حکومت ہے اور تم کو پورا اقتدار حاصل ہے ملک میں (اور تم بظاہر جو چاہو کر سکتے ہو، مگر بتاؤ) اگر ہم پر عذاب الٰہی آ جائے تو کون ہماری مدد کر سکے گا اور ہم کو اُس سے بچا سکے گا؟ (لہٰذا جو کچھ کرنا ہو خوب سوچ سمجھ کے کرو)

فرعون نے کہا کہ میں تم کو وہی سمجھاتا ہوں اور وہی رائے دیتا ہوں جو میری (سوچی سمجھی) رائے ہے اور میں تم کو اس راستہ کی رہنمائی کرتا ہوں جو صحیح راستہ ہے۔

اور اس شخص نے جو ایمان لے آیا تھا کہا کہ اے میری قوم والو مجھے تم پر ایسے روز بد کا اندیشہ ہے جو اگلی قوموں پر آیا تھا، جیسا کہ قوم نوح اور عاد و ثمود اور اُن کے بعد والی قوموں کا حال ہوا، اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا بالکل نہیں چاہتا (وہ خود سرکشی اور نافرمانی کر کے عذاب الٰہی کو دعوت دیتے ہیں۔

تفسیر و تشریح

یہ سورۂ مؤمن کے چوتھے رکوع کی ابتدائی آیتیں ہیں۔ ان سے اوپر کی آیتوں میں یہ مضمون تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو نبی بنا کر اور ہدایت کا پیغام اور معجزات دے کر مصر کے ارباب حکومت فرعون، ہامان وغیرہ کی طرف بھیجا، آپ نے ان لوگوں کو خدا پرستی اور توحید

کی دعوت دی اور اپنی صداقت کے ثبوت میں وہ معجزات بھی پیش کیے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائے تھے، لیکن وہ بدبخت بہت گستاخی سے پیش آئے اور آپ کو خدا کا نبی ماننے کے بجائے "ساحر و کذاب" کہا۔ اور آخر میں فرعون نے آپ کو قتل کر ڈالنے کی دھمکی دی، بلکہ اس کے لئے اپنے قطعی عزم اور فیصلہ کا اظہار کیا اور کہا "ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں خدا کی پناہ لیتا ہوں وہ میری حفاظت فرمائے گا۔

آلِ فرعون کا مردِ مؤمن

اس کے آگے کا واقعہ ان آیتوں میں بیان فرمایا گیا ہے جن کی اس وقت تلاوت کی گئی ہے۔ اور یہ واقعہ جو یہاں ان آیتوں میں بیان ہوا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں جہاں تک میرا خیال ہے قرآن پاک میں کسی دوسری جگہ بیان نہیں فرمایا گیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے قرآن مجید میں بیسیوں جگہ بیان ہوا ہے، بعض سورتوں میں جیسے سورۂ اعراف، سورۂ طٰہٰ اور سورۂ قصص وغیرہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے، لیکن اس واقعہ کے سلسلہ کی یہ کڑی جس کا سورۂ مؤمن میں یہاں ذکر فرمایا گیا ہے (جہاں تک میرا خیال ہے) اس کا ذکر کسی دوسری جگہ نہیں فرمایا گیا۔

ان آیتوں میں بیان فرمایا گیا ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالنے والی بات کہی تو فرعون ہی کے لوگوں میں سے (من ال فرعون) غالباً اُس کے بہت قریبی رشتہ داروں میں سے ایک شخص نے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت سے متاثر ہو کر ایمان لا چکا تھا مگر ابھی تک اس نے اپنے ایمان کو چھپایا تھا ظاہر نہیں کیا تھا، فرعون اور دوسرے ارکان حکومت کو مخاطب کر کے کہا کہ " اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ " یعنی کیا آپ لوگ اللہ کے ایک بندہ کو صرف اس جرم میں قتل کر دیں گے کہ وہ اللہ ہی کو اپنا رب اور مالک و معبود مانتا ہے اور اسی کی بندگی اور پرستش کی دعوت دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ لوگ ذرا سوچیں کہ یہ بات عقل اور انسانیت کے کس قدر خلاف ہے۔ آگے اس مردِ مؤمن نے یہ بھی کہا کہ "وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ" مطلب یہ ہے کہ یہ شخص یا تو اپنے اس دعوے میں

کہ ''خدا نے اُس کو رسول مقرر کر کے اور ہدایت کا پیغام دے کر بھیجا ہے'' سچا ہے، یا جھوٹا اور مفتر ہے۔ اگر بالفرض یہ جھوٹا ہے اور خدا پر افترا کرتا ہے تو اُس کا اتنا بڑا جھوٹ اور خداوند تعالیٰ پر افترا یہ خود ہی اس کو لے ڈوبے گا۔ اور اگر یہ سچا ہے اور فی الواقع خدا کا رسول ہے تو پھر یقیناً ایسا ہوگا کہ انکار و تکذیب کرنے والوں کے لئے یہ دنیا میں جس برے انجام کی اور آخرت کے جس عذاب کی پیشین گوئی کرتا ہے اور وعیدیں سناتا ہے اُس میں سے کچھ ضرور اسی زندگی میں تمہارے سامنے آجائے گا۔ یعنی آخرت کے عذاب کی بات تو مرنے کے بعد کی ہے، لیکن جس دنیوی عذاب کی یہ پیشین گوئی کرتا ہے کم از کم وہ تم پر اسی دنیا میں اور اسی زندگی میں آجائے گا۔ (''یصبکم بعض الذی یعدکم'' کا یہی مطلب ہے)

آگے ہے کہ فرعون کے گھرانے کے اس ''مردمؤمن'' نے یہ بھی کہا کہ ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ''، یعنی یہ بات یقینی ہے اور اس کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ خدا کسی ایسے شخص کو راہ یاب نہیں اور مقصد میں کامیاب نہیں کرتا اور نہیں کرے گا جو ''مسرف و کذاب''، یعنی حد سے گزرنے والا بے لگام اور بے محابا جھوٹ بولنے والا ہو۔ پس اس شخص (موسیٰ) کے ساتھ جو خدا کا معاملہ نظر آرہا ہے کہ اس کو معجزات دئے گئے ہیں اور اس کی دعوت میں تاثیر اور کشش ہے، یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ شخص ''مسرف و کذاب'' نہیں ہے بلکہ اللہ کا صادق بندہ ہے، جب ہی تو خدا اس کی مدد کر رہا ہے۔ آگے ہے کہ اس ''مردمؤمن'' نے اس خطاب میں آخری بات یہ کہی کہ ''یٰقَوْمِ لَکُمُ الْمُلْکُ الْیَوْمَ ظَاھِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ فَمَنْ یَّنْصُرُنَا مِنْ م بَاْسِ اللّٰہِ اِنْ جَآءَنَا''، یعنی اے میری قوم یہ صحیح ہے کہ اس وقت حکومت اور بادشاہت تمہاری ہے اور بظاہر تم سیاہ و سفید کے مالک ہو اور جو چاہو کر سکتے ہو، کوئی تمہارا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے، لیکن ذرا سوچو کہ اگر خدا کی طرف سے ہم پر کوئی عذاب بھیجا گیا (جیسا کہ بہت سی قوموں پر پہلے خدا کا عذاب آیا ہے) تو اُس وقت کون ہماری مدد کرے گا اور کون ہم کو اُس عذاب الٰہی کی زد سے بچا سکے گا؟۔

جس ماحول میں اس ''مردمومن'' نے فرعون اور فرعونیوں کے سامنے یہ تقریر کی تھی اُس ماحول اور اُس فضا میں یہی بہترین انداز ہو سکتا تھا، لیکن فرعون پر بدبختی سوار تھی اس نے یہ سب کچھ سنکر کہا ''مَآ اُرِیْکُمْ اِلَّا مَآ اَرٰی وَمَآ اَھْدِیْکُمْ اِلَّا سَبِیْلَ الرَّشَادِ'' اس کا مطلب

یہ تھا کہ ہم نے تمھاری بات سن لی، تم کچھ نہیں سمجھتے، ہم جانتے اور سمجھتے ہیں، اور ہم جس راستہ کی طرف قوم کی رہنمائی کر رہے ہیں وہی صحیح راستہ ہے۔ یعنی موسیٰ کی بات نہ ماننا اور اس کی تکذیب ومخالفت کرنا ہی ٹھیک ہے۔

فرعون کا جواب سنکر پھر اُس مردمومن نے کہا۔ "یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ مِّثۡلَ یَوۡمِ الۡاَحۡزَابِ ۝ مِثۡلَ دَاۡبِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ وَالَّذِیۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ ؕ وَمَا اللّٰهُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ" مردمومن نے جو بات پہلے اشاروں میں کہی تھی اب اس کو کھل کر صاف لفظوں میں کہا کہ۔ اے میری قوم والو سن لو مجھے ڈر ہے کہ موسیٰ کی تکذیب اور مخالفت کے نتیجہ میں تم پر اس طرح کا روز بد اور ویسا عذاب نہ آجائے جیسا اگلی سرکش اور نافرمان قوموں پر آیا تھا، جیسا کہ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور اُن کے بعد آنے والی اُن قوموں پر آیا جنھوں نے خدا کے پیغمبروں کی گستاخانہ تکذیب اور خدا کے مقابلہ پر سرکشی کی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا، لیکن جب بندے اپنی سرکشی اور شرارت سے اُس کے عذاب کو دعوت دیتے ہیں تو پھر اُن پر عذاب نازل کر دیا جاتا ہے۔ تو اے میری قوم کے لوگو! عذاب الٰہی سے تباہ وبرباد ہونے والی ان قوموں کے انجام سے سبق حاصل کرو، اور اللہ کے اس پیغمبر اور داعی (موسیٰ) کے مقابلہ میں وہ رویہ اختیار نہ کرو جو قوم نوح اور قوم عاد وثمود وغیرہ نے اپنے پیغمبروں کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا، ورنہ تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو ان کا ہوا۔

اس مردمومن کی تقریر کا سلسلہ ابھی جاری ہے، بلکہ اس کا جو حصہ ان آیتوں میں آیا ہے وہ تقریر کا چوتھائی حصہ بھی نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ پوری تقریر عجیب وغریب ہے۔ "اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ" کا بہترین نمونہ ہے۔



(درس-۱۳۱)

آل فرعون کے مردِ مؤمن کا خطاب

مجھے ڈر ہے کہ تم پر خدا کا عذاب نہ آجائے پھر کوئی اس سے تم کو بچا نہ سکے ایسا نہ ہو کہ ہدایت کا دروازہ ہی تم پر بند ہو جائے

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ط

وَیٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ یَوْمَ التَّنَادِo یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَo
مَالَکُمْ مِنَ اللّٰہِ مِنْ عَاصِمٍo وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَالَہٗ مِنْ
ھَادٍo وَلَقَدْ جَآءَ کُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَازِلْتُمْ فِیْ
شَکٍّ مِّمَّا جَآءَ کُمْ بِہٖ۔ حَتّٰٓی اِذَا ھَلَکَ قُلْتُمْ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ
مِنْ م بَعْدِہٖ رَسُوْلًاo کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ
مُّرْتَابٌo نِ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰھُمْ ط
کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰہِ وَعِنْدَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ط کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی
کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍo وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰھَامٰنُ ابْنِ لِیْ
صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَo اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓی اِلٰہِ
مُوْسٰی وَاِنِّیْ لَاَظُنُّہٗ کَاذِبًا ط وَکَذٰلِکَ زُیِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ
عَمَلِہٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِیْلِ ط وَمَا کَیْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ۔
(سورۂ مومن آیات ۳۲ تا ۳۷)

(ترجمہ) اور اے میری قوم کے لوگو مجھے ڈر ہے کہ تم پر چیخ ہانک پکار کا دن آجائے جس دن تم پیٹھ پھیر کے بھاگو گے اور تم کو خدا (کی پکڑ اور عذاب) سے بچانے والا کوئی نہ ہو

گا۔ اور جس کو اللہ ہدایت سے محروم کر دے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ اور (اللہ کے ایک پیغمبر) یوسف اس سے پہلے تمہارے پاس آئے تھے کھلی نشانیاں لیکر تو تم انکی لائی ہوئی تعلیمات کے بارے میں برابر شک ہی میں رہے (ایمان نہیں لائے) یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہوگئی تو تم نے کہا کہ اب ان کے بعد اللہ کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا، اسی طرح اللہ ان لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے جو حدود سے تجاوز کرنے والے اور شک شبہ پڑے رہنے والے ہوتے ہیں۔ جو اللہ کی آیات کے بارہ میں اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کسی سند اور دلیل کے بغیر جھگڑتے اور کٹ حجتی کرتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک اور ایمان والوں کے نزدیک (ان کی یہ کٹ حجتی) بڑی مبغوض ہے (اور وہ اس سے سخت بیزار ہیں) اللہ اسی طرح مہر کر دیتا ہے ہر مغرور و سرکش کے دل پر۔

اور فرعون نے کہا اے ہامان میرے لئے ایک بلند عمارت بناؤ کہ میں اُن راہوں تک پہنچ جاؤں آسمانوں کی راہوں تک، پس وہاں سے موسیٰ کے رب کو دیکھ لوں اور میں تو اس کو جھوٹا ہی خیال کرتا ہوں۔ اور اس طرح فرعون کی بدعملی اُس کے لئے (اس کی نگاہ میں) خوشنما کر دی گئی اور وہ راہِ حق سے روک دیا گیا، اور فرعون کا داؤں برباد ہی ہو کر رہا۔

تفسیر و تشریح

یہ آیتیں جو اس وقت تلاوت کی گئی ہیں سورۂ مومن کے چوتھے رکوع کی آیتیں ہیں۔ ان سے اوپر کی آیتوں میں یہ مضمون تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ کو پیغمبری عطا فرمائی اور حکم دیا کہ مصر جا کر وہاں کے ارباب حکومت فرعون ہامان وغیرہ کو اور ان کی قوم کو ایمان اور خدا پرستی کی دعوت دو، اور حضرت موسیٰ نے آ کر ان لوگوں کو دعوت دی اور اُن کے مطالبہ پر عصائے موسیٰ اور ید بیضا وغیرہ معجزات بھی دکھائے تو ان لوگوں نے بہت ہی گستاخانہ ردیہ اختیار کیا اور فرعون نے حضرت موسیٰ کو قتل کرا دینے کا اعلان کر دیا، تو فرعون کے گھر ہی کے لوگوں میں سے ایک بندے نے جو حضرت موسیٰ کی دعوت اور معجزات سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا تھا، مگر اُس نے اپنا ایمان ظاہر نہیں کیا تھا، ان لوگوں یعنی فرعون اور اُس کے درباریوں کے

سامنے بظاہر ایک دوراندیش اور خیر خواہِ قوم کی حیثیت سے ایک بڑی دانشمندانہ اور موثر نصیحت کی اوران کو سمجھانا چاہا کہ آپ لوگ جس ڈھنگ سے سوچ رہے ہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر یہ شخص (موسیٰ) سچا نبی نہیں ہے، مفتری اور کذاب ہے تو اس کا نبوت کا جھوٹا دعویٰ اور خدا پر اس کی افترا پردازی خود ہی اس کو لے ڈوبے گی اور اگر یہ خدا کا سچا رسول اور پیغمبر ہے تو اس کی تکذیب اور مخالفت کے نتیجہ میں تم پر خدا کا عذاب آجائے گا جیسا کہ پیغمبروں کی مخالفت کرنے والی پہلی بہت سی قوموں پر آیا ہے۔ لیکن ان لوگوں نے اس کی نصیحت کو قبول نہیں کیا اور فرعون نے کہا، تم نہیں سمجھتے میں سمجھتا ہوں، میری ہی رائے ٹھیک ہے یعنی ہمیں اس موسیٰ کو ختم ہی کر دینا چاہیے۔ تو اُس مردمومن نے پھر تقریر شروع کی جو آج کی آیتوں میں آئی ہے اور صاف صاف کہا "یٰقَوْمِ اِنِّیْٓ أَخَافُ عَلَیْکُمْ مِّثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِھِمْ وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ" مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی اور اللہ کے اس بندے موسیٰ پر جو اپنی صداقت کے ثبوت میں معجزے بھی دکھا چکا ہے تم نے ہاتھ ڈالا تو مجھے ڈر ہے کہ جس طرح اللہ کے اگلے پیغمبروں کی مخالفت کرنے والی اور اُن کیساتھ گستاخی سے پیش آنے والی قوموں پر عذاب آیا تھا جیسا کہ قوم نوح اور عاد و ثمود پر آیا تھا، اسی طرح کا عذاب تم پر آجائے۔ تقریر کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے اُس مردمومن نے کہا:

"وَیٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ یَوْمَ التَّنَادِ ...... وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَالَہٗ مِنْ ھَادٍ" مطلب یہ ہے کہ اے میری قوم والو سن لو اور سمجھ لو کہ اگر تمہارا رویہ یہی رہا اور تم نے اللہ کے اس پیغمبر موسیٰ کے خلاف کوئی گستاخانہ اقدام کیا جیسا تم سوچ رہے ہو تو ایک دن تم پر خدا کی طرف سے ایسا عذاب آجائے گا جس میں تم چیخو چلاؤ گے اور ایک دوسرے کو پکارو گے اور کوئی اُس دن تمھاری مدد نہ کر سکے گا، تم اُس دن خدا کے عذاب سے بھاگنا چاہو گے مگر بھاگ کے کہیں نہ جا سکو گے اور اللہ کی پکڑ سے کوئی تم کو بچانے والا نہ ہوگا۔

حق کی اندھی مخالفت کرنے والوں پر راہِ ہدایت بند ہو جاتی ہے

آیت کے آخری جز "وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَالَہٗ مِنْ ھَادٍ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی سنت اور اُس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ حق کی مخالفت پر جمے رہنے اور باطل پر اڑے رہنے کا

فیصلہ کر لیتے ہیں اور اس عقل سے کام نہیں لیتے جو اللہ نے ان کو حق و باطل میں امتیاز کرنے اور اپنا بھلا برا سمجھنے کے لئے دی ہے تو اللہ ان کو ہدایت سے محروم کر دینے اور گمراہی میں پڑے رہنے کا فیصلہ فرما دیتا ہے، پھر کہیں سے ان کو نور ہدایت نہیں مل سکتا۔ تو اگر تم لوگ اسکتبار اور ضد کی بنا پر اسی ظالمانہ اور گمراہانہ روش پر قائم رہے تو پھر تمہارے لئے ہدایت کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔

آگے ہے "وَلَقَدْ جَآءَ كُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ ...... كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ" مطلب یہ ہے کہ اس مرد مومن نے تقریر کرتے ہوئے فرعون اور اس کے درباریوں سے یہ بھی کہا کہ پہلے زمانہ میں بھی اللہ کے ایک پیغمبر یوسف (علیہ السلام) تمہارے پاس یعنی تمہارے آباء و اجداد کے پاس اسی مصر میں ہدایت کا پیغام اور واضح دلیلیں لیکر آئے تھے تو تم نے ان کی ہدایت کو بھی قبول نہیں کیا، ایمان نہیں لائے، شک شبہ ہی میں پڑے رہے، پھر جب وہ وفات پا گئے تو تم نے (یعنی اس زمانہ کے تمھارے آباء و اجداد اور قوم کے بڑوں نے) کہا کہ اللہ اب ان کے بعد کوئی رسول نہیں بھیجے گا، یعنی حضرت یوسف کے زمانہ کے مصر کے اور قبطی قوم کے لوگوں نے ان کی زندگی میں تو ان کو خدا کا رسول مان کر اُن کی ہدایت کو قبول نہیں کیا، اپنے باپ دادا ہی کے مشرکانہ طریقہ پر قائم رہے لیکن جب مصر ہی میں حضرت یوسفؑ وفات پا گئے تو ظاہر و باطن کے لحاظ سے اُن کی حسین و جمیل شخصیت، ان کی پاکیزہ زندگی، اور اُن کے زمانہ کی برکتوں کو یاد کر کے اُن سے عقیدت کا اظہار کرنے لگے اور کہنے لگے بڑے ہی بابرکت تھے، ان کی برکتیں انھیں کے ساتھ ختم ہو گئیں اب ان کے بعد اللہ کی طرف سے کوئی ایسا رسول نہیں آئے گا۔ اس مرد مومن کا مطلب یہ تھا کہ تمہیں پرانے زمانہ کے اس واقعہ سے سبق لینا چاہئے اور اللہ نے تمھارے پاس جو پیغمبر ہدایت لیکر بھیجا ہے (یعنی موسیٰؑ) اس پر ایمان لا کر اس کی ہدایت کی پیروی کرنا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ کل کو جب یہ موسیٰ نہ رہیں تو تم بھی اسی طرح پچھتاؤ اور افسوس کرو جس طرح حضرت یوسف کی وفات کے بعد تمہارے اُن آباء و اجداد نے کیا تھا جنھوں نے زندگی میں اُن کی بات نہیں مانی تھی۔

آگے ہے "كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ...... كذالک يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ" مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی حقیقت کو بھول کر حد سے تجاوز کریں اور اللہ اور اس کے رسولوں کی باتوں پر ایمان لانے اور یقین کرنے کے بجائے اُن میں شک شبہ پیدا

کریں اور کسی الٰہی اور آسمانی سند کے بغیر اللہ کی آیات کا انکار اور اس سلسلہ میں کٹ حجتی کریں تو اللہ کے نزدیک اور اللہ والوں کے نزدیک ایسے لوگ بہت ہی مبغوض ہیں اور وہ اِن لوگوں سے انتہائی ناراض اور بیزار ہیں اور ایسے لوگوں کے لئے اللہ ہدایت سے محرومی کا فیصلہ کر دیتا ہے، اسی طرح جو لوگ تکبر اور ظلم و جباریت کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں اور اس کی وجہ سے پیغمبرانِ حق کی دعوت اور ہدایت کو قبول نہیں کرتے بلکہ اُن کے ساتھ گستاخانہ رویہ اختیار کرتے ہیں، ان کے دلوں پر بھی اللہ تعالیٰ مہر کر دیتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے ایمان اور ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

میں نے آپ کے سامنے بار بار یہ مضمون بیان کیا ہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جو قوانین نافذ اور جاری ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب کوئی آدمی حق و ہدایت کو قبول نہ کرنے اور اس کی مخالفت کرنے ہی کا فیصلہ کر لے اور سرکشی و بدکرداری کو اپنا شیوہ بنا لے اور ان چیزوں میں حد سے بڑھ جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دنیا ہی میں اُس پر کبھی یہ عذاب بھی آتا ہے کہ اُس کے قلب سے ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے۔ دل پر مہر لگنے کا اور کسی بندے کو گمراہی میں ڈال دینے کا یہی مطلب ہوتا ہے، تو فرعون کے گھرانے کے اُس مردمومن نے، فرعون اور اُس کے درباریوں سے اپنی اس تقریر میں پہلے تو کہا کہ اللہ کے پیغمبر موسیٰ کے ساتھ تمھارا جو رویہ ہے اسے دیکھتے ہوئے مجھے ڈر ہے کہ تم پر اگلی قوموں، قوم نوح اور عاد و ثمود وغیرہ کی طرح عذاب نہ آجائے اور ایسا وقت نہ آجائے کہ تم چیخو چلاؤ ایک دوسرے کو مدد کے لئے پکارو اور کوئی اس وقت تمہیں خدا کے عذاب سے نہ بچا سکے۔ اس کے بعد اللہ کے پیغمبر یوسفؑ کا واقعہ یاد دلایا کہ وہ اسی مصر میں آئے تھے، اس دور کے تمھارے آباء واجداد نے ان کی زندگی میں تو اُن کی دعوت و ہدایت کو قبول نہیں کیا پھر جب ان کی وفات ہوگئی تو ان پر عقیدت کے پھول چڑھائے اور ان کی بات نہ ماننے پر پچھتائے، اور یہاں تک کہا کہ پیغمبری بس یوسف ہی پر ختم ہوئی اب اللہ کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا۔

فرعون کی شگوفہ سازی

اس کے بعد اُس مردمومن نے اپنی اس تقریر میں فرعون اور اس کے درباریوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اس کفر و طغیان اور متکبرانہ و جبارانہ رویہ کی سزا میں

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے دلوں پر مہر لگ جائے اور ہمیشہ کے لئے ہدایت سے محرومی کا فیصلہ ہو جائے کیونکہ اللہ کی یہ سنت اور اس کا قانون ہے کہ حق کے مقابلہ میں سرکشی کرنے والوں اور باطل پر اڑے رہنے والوں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے اور اُن سے ہدایت کی صلاحیت سلب کر لیتا ہے۔ لیکن اُن بد بختوں پر ''مردِ مومن'' کی اس مخلصانہ نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا، بلکہ فرعون نے غالباً اس اندیشہ سے کہ لوگ اس شخص کی مخلصانہ اور موثر نصیحت سے متاثر نہ ہو جائیں یہ نیا شگوفہ چھوڑا، اس نے اپنے وزیر اور رفیق کار ہامان کو مخاطب کر کے کہا کہ ''ہامان تم ایک بہت بلند عمارت بنوانے کا انتظام کرو، میں اُس پر چڑھ کے آسمان پہ موسیٰ کے خدا کو دیکھنے کی کوشش کروں گا، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ جو کچھ کہتا ہے جھوٹ ہے'' جیسا کہ میں نے کہا فرعون کا ہامان سے یہ کہنا صرف ایک فریب تھا تا کہ درباریوں کے ذہن کو دوسری طرف موڑ دے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے صرف تمسخر اور مذاق کے طور پر کہا ہو، اور اس تمسخر کا مقصد بھی یہی ہو کہ اُس مردِ مومن کی تقریر سے متاثر ہو کر لوگ حضرت موسیٰ کی دعوت کو قبول نہ کر لیں۔

آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے'' وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ.'' مطلب یہ ہے کہ فرعون نے جو رویہ اختیار کیا وہ بہت بُرا تباہی اور بربادی کا رویہ تھا، لیکن جب کوئی آدمی غلط روی اور بد عملی ہی کو اپنا لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس سے نورِ عقل سلب کر لیتا ہے اور پھر اس کو برائی ہی میں بھلائی اور ہلاکت ہی میں خیریت نظر آتی ہے۔ تو فرعون کے ساتھ بھی یہی ہوا اُس نے اسی میں اپنی خیریت سمجھی کہ حضرت موسیٰ کی دعوت کو خود بھی قبول نہ کرے اور ایسی تدبیریں کرے اور چالیں چلے کہ دوسرے لوگ بھی قبول نہ کریں، لیکن اس کی یہ تدبیریں اور چالیں چلنے والی نہیں تھیں، سب ناکام ہو گئیں اور انجام یہ ہوا کہ وہ مع اپنے لاؤ لشکر کے غرقاب ہوا۔

یہ بات آپ کے ذہن میں رہے کہ فرعون کے گھرانے کے مردِ مومن کی تقریر ہو رہی تھی، درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے فرعون نے لوگوں کا ذہن موڑنے کے لئے ہامان سے بلند عمارت بنوانے کی بات کہی، اللہ تعالیٰ نے اس کے بارہ میں فرمایا کہ یہ اُس کی ایک چال تھی جس کو وہ سمجھتا تھا کہ کامیاب ہوگی لیکن وہ ناکام ہو کے رہ گئی۔ (وما کید فرعون الا فی تباب) آگے پھر اس مردِ مومن کی تقریر ہے اور بڑی موثر تقریر ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک لفظ دل سے نکل رہا ہے۔

(درس-۳۲)

آلِ فرعون کے مردِ مومن کا خطاب

یہ دُنیا چند روزہ ہے اور ہمیشہ رہنے کی جگہ آخرت ہے اس کی فکر کرلو

عنقریب وقت آئے گا کہ تم یاد کرو گے میں تم سے کیا کہتا تھا

فرعون و آلِ فرعون اور اُس مردِ مومن کا آخری انجام

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللّٰه من الشّیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم ط

وَقَالَ الَّذِیۡۤ اٰمَنَ یٰقَوۡمِ اتَّبِعُوۡنِ اَهۡدِكُمۡ سَبِیۡلَ الرَّشَادِ ۝ یٰقَوۡمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الۡحَیٰوةُ الدُّنۡیَا مَتَاعٌ ۫ وَّاِنَّ الۡاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الۡقَرَارِ ۝ مَنۡ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجۡزٰۤی اِلَّا مِثۡلَهَا ۚ وَمَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ یُرۡزَقُوۡنَ فِیۡهَا بِغَیۡرِ حِسَابٍ ۝ وَیٰقَوۡمِ مَا لِیۡۤ اَدۡعُوۡكُمۡ اِلَی النَّجٰوةِ وَتَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَی النَّارِ ۝ تَدۡعُوۡنَنِیۡ لِاَكۡفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشۡرِكَ بِهٖ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِهٖ عِلۡمٌ ۫ وَّاَنَا اَدۡعُوۡكُمۡ اِلَی الۡعَزِیۡزِ الۡغَفَّارِ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡهِ لَیۡسَ لَهٗ دَعۡوَةٌ فِی الدُّنۡیَا وَلَا فِی الۡاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَی اللّٰهِ وَاَنَّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ هُمۡ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۝ فَسَتَذۡكُرُوۡنَ مَاۤ اَقُوۡلُ لَكُمۡ ؕ وَاُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

بَصِيْرٌ م بِالْعِبَادِہ فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ
سُوْءُ الْعَذَابِ ہ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ
تَقُوْمُ السَّاعَةُ قف اَدْخِلُوْآ اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ہ
(سورۂ مومن آیات ۳۸ تا ۴۶)

(ترجمہ) اوراس مردمومن نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو میری پیروی کرو میں صحیح راستہ کی طرف تمہاری رہنمائی کروں گا، اے میری قوم والو یہ اس دنیا کی زندگی تو بس چندروزہ متاع ہے اوراصل دارالقرار (یعنی ہمیشہ رہنے کی جگہ) تو دار آخرت ہے (اور اللہ کا مقرر کیا ہوا قانون یہ ہے کہ) جوکوئی برائی کا ارتکاب کرے گا تو وہ اُسی کے مطابق بدلہ پائے گا۔اور جو کوئی مرد یا عورت نیک عمل کرے گا اور وہ صاحب ایمان بھی ہو تو وہ سب جنت میں جائیں گے اور وہاں وہ (اپنے خداوند کریم کی طرف سے) بے حساب رزق وفضل پائیں گے۔

اور اے میری قوم کے لوگو یہ کیا ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف بلارہا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی طرف بُلا رہے ہو اور مجھے اس کی دعوت دے رہے ہو کہ میں خدا کا کافر ہو جاؤں اوراس کے ساتھ اُن چیزوں کو شریک کروں جن کا مجھے علم ہی نہیں اور میں تمھیں خدائے عزیز وغفار کی (بندگی اور عبادت کی) دعوت دے رہا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ تم مجھے جس کی طرف بلاتے ہو اُس کی کوئی دعوت اور پکار نہیں ہے نہ دنیا میں نہ آخرت میں، اور ہم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کے جانا ہے، اور بلاشبہ جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں وہ دوزخی ہیں، اور (سن لو) عنقریب یاد کرو گے تم میری وہ باتیں جو میں تم سے کہہ رہا ہوں، اور میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں، بے شک وہ اللہ سب بندوں کو پوری طرح دیکھ رہا ہے۔ تو اللہ نے اس بندہ کو اُن کی بری سازشوں سے محفوظ رکھا اور فرعون والوں کو بدترین عذاب نے گرفت میں لے لیا۔ان کو صبح شام دوزخ پر پیش کیا جاتا ہے، اور جس دن قیامت قائم ہوگی تو حکم ہوگا کہ فرعون اوراس کے آل واتباع کو شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔

تفسیر وتشریح

یہ سورۂ مومن کے پانچویں رکوع کی آیتیں ہیں، اس سے پہلے رکوع میں بیان فرمایا گیا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو نبوت عطا فرمائی اور انھوں نے اس کے حکم سے مصر آکر

فرعون اور مصر کے دوسرے اکابر و اعیان کو دین حق کی اور خدا کی بندگی اور نیک عملی کی دعوت دی، تو وہ لوگ بہت گستاخی کے ساتھ پیش آئے اور فرعون نے حضرت موسیٰ کو قتل کرادینے کا ارادہ ظاہر کیا تو اُسی کے گھرانے کے ایک مردِ خدا نے ، جو موسیٰؑ کی حقانی دعوت اور اُن کے روشن معجزات سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا تھا لیکن اس نے اپنا ایمان ظاہر نہیں کیا تھا بلکہ پوشیدہ رکھا تھا۔ قوم کے ایک خیر اندیش اور دردمند و خیر خواہ کی حیثیت سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے بڑی دانشمندانہ اور موثر تقریر کی۔ اس تقریر کا بڑا حصہ پچھلے ہفتے چوتھے رکوع میں گزر چکا ہے۔ اور فرعون نے اس تقریر کے اثر کو زائل کرنے کے لئے تقریر کے درمیان ہی میں بار بار جو مداخلت کی تھی اس کا بھی ذکر آچکا ہے۔ اس وقت پانچویں رکوع کی جن آیتوں کی تلاوت کی گئی یہ اُسی تقریر کا آخری حصہ ہے۔

تقریر کا ماحول

اس تقریر کی اہمیت اور معنویت جب اچھی طرح سمجھ میں آئیگی جب اس فضا اور ماحول کو ذہن کے سامنے رکھ لیا جائے جس میں اس مردِ مومن نے یہ تقریر کی تھی۔ صورت حال یہ بن گئی ہوگی کہ حضرت موسیٰؑ کی دعوتِ حق اور اُن کے روشن معجزات نے اور پھر اس مردِ مومن کی دلسوزی سے بھری ہوئی مدلل تقریر نے قوم کے بہت سے لوگوں کو متاثر کر دیا ہے اور انہوں نے اس دعوت کو حق سمجھ لیا ہے، لیکن اُس کے قبول کر لینے میں بڑے خطرات ہیں، فرعون جیسے سرپھرے ظالم وجلاد سے کچھ بعید نہیں کہ وہ یہ حکم دیدے کہ جو کوئی موسیٰ کے دین کو قبول کرے اس کو سولی پر لٹکا دیا جائے، اس کا گھر لوٹ لیا جائے اور آگ لگا دی جائے۔ اور وہ اِس مردِ مومن کی تقریر کے درمیان میں مداخلت کر کے لوگوں کو یہ بھی جتا چکا ہے کہ قوم کے لئے صحیح راستہ وہی ہے جس کی طرف میں رہنمائی کر رہا ہوں یعنی یہ کہ وہ موسیٰ کی بات نہ مانیں اور اپنے باپ دادا کے دین اور طریقہ ہی پر جمے رہیں (وما أهديكم الا سبيل الرشاد) بہر حال یہ فضا اور یہ ماحول ہے جس میں وہ مردِ مومن پوری دلسوزی کے ساتھ قوم سے یہ خطاب کر رہا ہے۔ اُس نے کہا " وَيٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ...... يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ" مطلب یہ ہے کہ "اے میری قوم والو، میرے بھائیو عزیزو، میری بات مانو، میرے

بتائے راستہ پر چلو وہی ہدایت اور تمھارے لئے فلاح وکامیابی کا راستہ ہے، (فرعون جس راستہ کی طرف تم کو بلا رہا ہے وہ ہلاکت اور بربادی کا راستہ ہے)

سودا پھر بھی سستا ہے

حق کے قبول کرنے اور حضرت موسیٰ پر ایمان لانے میں اُس وقت لوگوں کے سامنے جو خطرات تھے، جو ایمان لانے کے راستہ میں بڑی رکاوٹ تھے، اُن کے سلسلہ میں اس مرد مومن نے فرمایا" یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ" مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی یہ زندگی تو بس چند روزہ ہے، اگر بالفرض دعوتِ حق قبول کرنے کے نتیجہ میں یہاں کچھ تکلیف بھی اٹھانی پڑی تو وہ بس چند روزہ ہوگی، مرنے کے ساتھ یہاں کی تکلیفیں اور راحتیں سب ختم ہو جائیں گی۔ ہاں مرنے کے بعد جس عالمِ آخرت میں پہنچنا ہوگا وہ "دارالقرار" ہے وہاں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ اس لئے عقل اور خود غرضی کا بھی تقاضا ہے کہ وہاں کے بے پناہ عذاب اور تکلیفوں سے بچنے کی اور وہاں کی دائمی اور بے حساب راحتیں، لذتیں اور نعمتیں حاصل کرنے کی فکر کی جائے اور اُس کے لئے اگر اس چند روزہ اور فانی زندگی کی کچھ راحتیں لذتیں یا جان بھی قربان کرنی پڑے تو اُس سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔ یہ سودا بہرحال نفع بخش ہے۔ اس کے آگے اس مرد مومن نے کہا کہ اُس دارآخرت کے بارہ میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ " مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجْزٰٓی اِلَّا مِثْلَهَا ...... بِغَیْرِ حِسَابٍ"، یعنی جو کوئی یہاں اس زندگی میں برے عمل کرے گا (کفر، شرک یا اللہ کے بندوں پر ظلم وغیرہ) تو وہ اُسی کے مطابق سزا پائے گا، کوئی وہاں اس کو اللہ کی پکڑ اور عذاب سے بچا نہ سکے گا۔ خواہ وہ دنیا میں بادشاہ یا وزیر یا بڑا سردار یا سرمایہ دار رہا ہو) اور جو کوئی ایمان لاکر یہاں نیک اعمال کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت، اُن سب کا مقام جنت میں ہوگا، جہاں اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے حساب نعمتوں سے نوازا جائیگا (یرزقون فیھا بغیر حساب)

مومن کی سوچ کا انداز

آگے جو تقریر کا حصہ ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ دنیا پرست لوگوں نے خیر خواہ

بنکر اس مردِ مومن سے کہا ہوگا کہ تم باپ دادا کا دین اور طریقہ چھوڑ کے اور موسیٰ کی دعوت قبول کر کے بادشاہِ وقت فرعون کو اور پوری قوم کو اپنا دشمن بنا رہے ہو اور بڑے خطروں کو دعوت دے رہے ہو، اس سے باز آجاؤ اپنی جان پر رحم کرو۔ غالباً ان دنیا پرستوں کے اسی ''ناصحانہ'' مشورہ کا جواب دیتے ہوئے اس مردِ مومن نے اپنی تقریر میں کہا ہے ''وَيٰقَوْمِ مَالِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ...... وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّار'' اے میری قوم کے لوگو! یہ کیا ہو رہا ہے (اور اس کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے) کہ میں آپ لوگوں کو نجات اور فلاح کے راستہ کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی طرف بلا رہے ہو۔ تم مجھ کو دعوت دیتے ہو کہ میں خدا کا کافر بن جاؤں اور اُس کے ساتھ خدائی میں ایسی چیزوں کو شریک کروں جن کا مجھے کچھ علم نہیں، وہ محض تمھارے وہم وخیال کی ایجاد ہیں، حقیقت میں اُن کا کوئی وجود نہیں۔ اور میں تمھیں اُس خداوند عزیز وکریم پر ایمان لانے اور اس کی عبادت و بندگی کی دعوت دیتا ہوں جو ''العزیز'' ہے یعنی کائنات کی ہر چیز پر اس کا قابو ہے، اور ''الغفار'' یعنی بہت بخشنے والا بھی ہے۔ تو سوچو کہ کس کی دعوت قابل قبول ہے، تمہاری یا میری؟

''لاجرم'' یعنی حقیقت یہ ہے کہ تم اپنے جن معبودوں کی عبادت و بندگی کی طرف مجھے بلاتے ہو اُن کا حال یہ ہے کہ ان کو پکارنے اُن سے دعا کرنے کا نہ دنیا میں کوئی حاصل اور فائدہ ہے نہ آخرت میں، اور ہم سب بالآخر اللہ کی طرف لوٹنا اور اس کے حضور ہونا ہے، اور جو لوگ اس دنیوی زندگی میں حد سے تجاوز کرنے والے ہوں گے یعنی کفر وشرک کے اُس راستہ پر چلیں گے جس کی تم مجھے دعوت دے رہے ہو اُن کے لئے قطعی فیصلہ ہے کہ وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے اور اس کا ایندھن بنیں گے (وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّار)

اس مردِ مومن نے اپنا خطاب ختم کرتے ہوئے آخر میں کہا:

''فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادُ''

مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنا فرض ادا کرنے کے لئے اور تمھاری خیر خواہی میں جو کچھ کہنا تھا وہ میں کہہ چکا، اگر تم آج میری بات قبول نہ کرو گے تو عنقریب یعنی مرنے کے بعد وہ وقت آجائے گا کہ تم یاد کرو گے کہ میں نے تم سے کیا کہا تھا اور کس طرح کہا تھا، میں حجت تمام کر چکا اور اب میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں کہ وہ ''بصیر بالعباد'' ہے سب بندے اور اُن کے اعمال واحوال اور

اُن کا ظاہر و باطن سب اس کی نگاہ کے سامنے ہے، میں نے جس طرح تم کو راہ ہدایت دکھانے کی کوشش کی اور تمہارا جو رویہ رہا وہ سب اس کے سامنے ہے، اب وہی میرا اور تمہارا فیصلہ فرمائے گا۔

جرأت ایمانی کا صلہ

اس آیت پر آل فرعون کے اُس مردِ مؤمن کی تقریر ختم ہوگئی۔ اس کے بعد کی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دونوں فریقوں کا انجام بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے "فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَامَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ...... اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ".

"سَيِّاٰتِ مَامَكَرُوْا" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آل فرعون کے اس مرد مؤمن نے فرعون اور اس کے حواریوں کو اور پوری قوم کو موسیٰؑ کی دعوت قبول کر لینے اور ایمان لے آنے کی ایسے واضح اور مؤثر انداز پر دعوت دی۔ اور فرعون اور اس کے حواریوں کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ ہمارے ہی گھر کے اس شخص کی نصیحت سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ مرد مومن کی دعوت قبول کر کے اُس کے ساتھ ہو جائیں گے تو اُن ظالموں نے اُس مرد خدا کو شہید کرا دینے کا منصوبہ بنایا، یا اسی طرح کے کسی اور خطرناک اقدام کی سازش کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندہ کی حفاظت فرمائی اور ان کے منصوبے اور ان کی سازش کو ناکام کر دیا۔ اور فرعون اور اس کے حواریوں اور سارے لاؤ لشکر کو عذاب الٰہی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسی کو فرمایا گیا ہے "فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَامَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ" ظاہر یہی ہے کہ اس عذاب سے مراد فرعون اور اس کے سارے لاؤ لشکر کی غرقابی ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے "اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ قف اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ" یعنی ان ظالموں کو ہر روز صبح و شام دوزخ پر پیش کیا جاتا ہے اور جب قیامت قائم ہوگی تو حکم دیا جائے گا کہ فرعون اور اس کے تمام آل و اتباع کو دوزخ کے سخت ترین عذاب میں جھونک دیا جائے!

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں اور تمام لاؤ لشکر کو ڈبو کر ختم کر دیا اور ... صبح اور ہر شام دوزخ کا

وہ مقام اُن کے سامنے کر دیا جاتا ہے جو عالمِ آخرت میں اُن کا اصل ٹھکانا بننے والا ہے، اُس کا صرف نظر کے سامنے آجانا ہی سخت ترین عذاب ہے۔ اللہ کی پناہ! گویا مرنے سے لیکر قیامت تک جو ہزار ہا ہزار سال کا زمانہ ہے جس کو عالمِ برزخ کہا جاتا ہے اس میں تو وہاں کے مستقل عذاب کے علاوہ ایک یہ عذاب اُن کو دیا جارہا ہے کہ روزانہ صبح شام ان کو دوزخ کا اپنا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے، جس کو صرف دیکھ کر اُن کا جو حال ہوتا ہوگا اور اُن کی روح پر جو گزرتی ہوگی اس کو وہی جانتے ہوں گے، یہاں کوئی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ "وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ قف اَدْخِلُوْا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ"، یعنی جب دنیا کی عمر پوری ہوجانے پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے قیامت قائم ہوگی تو فرعون اور اس کے تمام آل واتباع اور اعوان وانصار کے بارہ میں حکم ہوگا کہ ان کو دوزخ کے بدترین اور شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔

عذاب قبر کی قرآنی دلیل

اللہ تعالیٰ ہم کو ان آیات کے مضامین سے سبق لینے اور عبرت حاصل کرنے کی توفیق دے۔ (فائدہ) اس آخری آیت کے الفاظ "اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا" سے صراحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہوئی کہ قیامت سے پہلے عالم برزخ میں بھی مجرمین کو عذاب ہوتا ہے۔ قبر کے عذاب کے بارہ میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں اُن میں رسول اللہ ﷺ نے مجرمین کے اسی برزخی عذاب کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ لیکن عذاب قبر اور عذاب آخرت، ان سب کی حقیقی اور واقعی نوعیت جب ہی معلوم ہوگی جب اُن سے واسطہ پڑے گا۔ اَللّٰهم انا نعوذ بک من عذاب القبر ومن عذاب النار ومن فتنة المحيا والممات"



(درس-۳۴)

دوزخ میں مجرمین کی عبرتناک کسمپرسی

فرشتے بھی اُن کے حق میں کسی دعاوسفارش کے لئے آمادہ نہ ہوں گے
اللہ اپنے رسولوں اور مومنین صادقین کی اس دنیا میں بھی مدد فرماتا ہے
اور آخرت میں بھی یہ اُس کا ازلی قانون اور محکم وعدہ ہے اس پر شبہ اور اس کا جواب

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللّٰه من الشَّيطٰن الرجيم- بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيمط

وَإِذْ يَتَحَاجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْباً مِّنَ النَّارِ٥ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْآ إِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ٥ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْماً مِّنَ الْعَذَابِ٥ قَالُوْا أَوَ لَمْ تَكُ تَأْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِط قَالُوْا بَلٰىط قَالُوْا فَادْعُوْاج وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ إِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ٥ إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْأَشْهَادُ٥ يَوْمَ لَايَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ٥ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَأَوْرَثْنَا بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ٥ هُدًى وَّذِكْرٰى لِأُولِي الْأَلْبَابِ٥ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ٥

(سورہ مومن- آیت ۴۷ تا ۵۵)

(ترجمہ) اور جب وہ دوزخ میں آپس میں جھگڑیں گے تو کمزور اور زبردست لوگ اُن لوگوں سے جو بڑے بنے تھے کہیں گے کہ ہم تمہارے تابع اور پیرو تھے تو کیا تم دوزخ کے عذاب کا کوئی حصہ ہم سے ہٹا سکو گے؟ وہ کہیں گے آج ہم سب اسی دوزخ میں ہیں (جب ہم اپنے ہی کو اس آگ سے نہیں بچا سکے تو تم کو کیا بچا سکیں گے) اللہ نے سب بندوں کے درمیان (جزا سزا کا) فیصلہ کر دیا ہے (اور اس کا فیصلہ اٹل ہے)

اور جو (مجرمین) دوزخ میں پڑے ہوں گے وہ خزانۂ جہنم (یعنی دوزخ کے محافظ اور منتظم فرشتوں) سے کہیں گے کہ آپ ہی اپنے رب سے دعا کریں کہ کسی دن ہمارا عذاب ہلکا کر دیا جائے۔ وہ (فرشتے جواب میں) کہیں گے کیا تمہارے رسول تمہارے پاس کھلی نشانیاں لیکر نہیں آئے تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہاں (آئے تھے) وہ (فرشتے) کہیں گے تو اب تم ہی دعا کرو۔ اور نہ ماننے والوں کی دعا تو بس بے کار ہی جائے گی۔

اور ہم بے شک مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی اِس زندگی میں بھی اور اُس دن بھی (مدد کریں گے) جس دن گواہ پیش ہوں گے۔ جس دن مجرموں کو اُن کی معذرت خواہی کچھ بھی نفع نہ دے گی، اور ان کے لئے خدا کی لعنت ہو گی اور اُن کے واسطے بدترین گھر ہو گا۔ (دوزخ)

اور ہم نے موسیٰ کو عطا کی (کتابِ) ہدایت اور وارث بنایا بنی اسرائیل کو اُس کتاب کا۔ اہل دانش کی رہنمائی اور نصیحت کے لئے۔ پس (اے پیغمبر) آپ صبر و ثابت قدمی کا رویہ اختیار کیجئے، اللہ کا وعدہ قطعاً برحق ہے، اور اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگتے رہئے اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح شام و صبح کرتے رہئے۔

تفسیر و تشریح

گذشتہ آیتوں سے ربط

آپ حضرات کو یاد ہو گا، اوپر کی آیتوں میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ فرعون کے گھرانے کے ایک مردِ مؤمن نے اپنی قوم کو اور خاص کر قوم کے بڑوں کو بڑی دل سوزی سے نصیحت کی اور حضرت موسیٰ کی دعوتِ حق کو قبول کرنے اور اس کی مخالفت نہ کرنے کا بڑے مؤثر اور خیر

خواہانہ انداز میں مشورہ دیا، اور جب اُس مردِ مومن نے محسوس کیا کہ یہ لوگ حضرت موسیٰ کی دعوتِ حق کو قبول نہ کرنے اور اس کی مخالفت پر اڑے رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور گویا ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے تو اتمام حجت کے بعد اُس مردِ مومن نے یہ کہا تھا "فَسَتَذْكُرُوْنَ مَا اَقُوْلُ لَكُمْ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادْ". جس کا مطلب یہ تھا کہ آج تم میری بات ماننے کو تیار نہیں ہو لیکن ایک وقت آئے گا جب تمہارے اس کفر و انکار کا نتیجہ تمہارے سامنے آئے گا اس وقت تم حسرت و افسوس سے یاد کرو گے کہ میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ اور اب میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ سب بندے اور اُن کے اعمال و کردار اُس کی نگاہ کے سامنے ہیں۔

اس کے بعد والی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ فرعون اور فرعونیوں نے غالباً یہ محسوس کر کے کہ اس شخص کی اس طرح کی باتوں سے قوم متاثر ہو کر موسیٰ کی دعوت کو قبول کر لے گی، اُس مردِ مومن کے خلاف کوئی خطرناک سازش کی، ظاہر یہی ہے کہ اُن کا خاتمہ کر دینے کا کوئی منصوبہ بنایا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مومن و مخلص بندے کی حفاظت فرمائی اور اُن کے منصوبہ کو فیل کر دیا، اور فرعون اور اُس کے سارے لاؤ لشکر پر خداوندی عذاب نازل ہو گیا اور وہ سب غرقاب کر دیئے گئے۔

اس کے بعد فرمایا گیا تھا کہ قیامت تک کے لئے اُن پر ایک خاص عذاب یہ مسلط کر دیا گیا ہے کہ دوزخ کا وہ خاص عذاب گھر جہاں اپنے کفر و سرکشی کی اصل سزا بھگتنے کے لئے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے ڈالے جائیں گے، وہ ہر صبح شام اُن کے سامنے کیا جاتا ہے اور قیامت قائم ہونے پر وہ اُسی میں جھونک دئے جائیں گے۔

اس کے بعد یہ آیتیں ہیں جن کی میں نے اس وقت آپ کے سامنے تلاوت کی ارشاد فرمایا گیا ہے "وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ...... اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادْ"۔

اہلِ دوزخ کی کسمپرسی

مطلب یہ ہے کہ جب قیامت قائم ہوگی اور حساب کتاب کے بعد وہ کفار و مشرکین

جنھوں نے اللہ کے پیغمبروں کی نہیں مانی اور اُن کی دعوتِ حق کی مخالفت ہی پر جمے رہے، خداوندی قانون اور فیصلہ کے مطابق دوزخ میں جھونک دیئے جائیں گے، ان میں وہ بھی ہوں گے جو قوم کے لیڈر اور چودھری تھے اور وہ بھی ہوں گے جوان کے جھنڈے کے نیچے تھے اور بس پیروکار تھے، تو یہ دوسرے تیسرے درجہ والے متبعین اپنے بڑوں اور چودھریوں سے کہیں گے کہ ہم تو آپ کے پیروکار تھے تو کیا آپ لوگ ہماری یہ مدد کر سکتے ہیں کہ ہمارا عذاب کچھ کم کر دیں؟ وہ بڑے اور چودھری لوگ کہیں گے کہ ہم سب ہی دوزخ کے اس عذاب میں مبتلا ہیں، اللہ نے سب بندوں کا اُن کے اعمال واحوال اور کردار کے مطابق فیصلہ کر دیا ہے ہم نے تم نے جو بویا تھا وہی ہم سب کو کاٹنا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے ہی اوپر سے عذاب نہیں ہٹا سکتے تو تم سے کیا ہٹا سکیں گے۔ آگے فرمایا گیا ہے:

وَقَالَ الَّذِیْنَ فِی النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ ...... وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ"۔

مطلب یہ ہے کہ جو مجرمین کفر وشرک اور ظلم جیسے جرائم کی وجہ سے جہنم میں پڑے ہوں گے وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر دوزخ کے منتظم فرشتوں سے کہیں گے کہ آپ اپنے خداوند سے ہمارے واسطے استدعا کیجئے کہ کسی دن ہمارا عذاب ہلکا ہی کر دیا جائے (یُخَفِّفْ عَنَّا یَوْمًا مِنَ الْعَذَابِ) وہ فرشتے جواب میں کہیں گے کیا تمھاری ہدایت کے لئے خدا کے پیغمبر تمھارے پاس اُس کے واضح احکام اور نشانیاں لیکر نہیں پہنچے تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہاں پہنچے تھے! تو فرشتے کہیں گے پھر ہم تمھارے لئے خدا کے حضور میں کچھ عرض نہیں کر سکتے) تم خود ہی اس سے عرض کرو۔ آگے فرمایا گیا ہے۔ "وَمَادُعَاءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلَالٍ" مطلب یہ ہے کہ آخرت میں خداوندی فیصلے کے مطابق دوزخ میں جھونکے جانے والے کفار ومشرکین کی دعا اور عرض ومعروض وہاں لاحاصل اور بے فائدہ ہی رہے گی۔

یہاں تک پیغمبروں کی بات نہ ماننے والے اور ان کی مخالفت کرنے والے کفار ومشرکین کے انجام کا بیان ہوا۔ آگے اللہ کے پیغمبروں اور ان کی دعوتِ ایمان قبول کرنے والے اور ان کا ساتھ دینے والے اہل ایمان کا انجام بیان فرمایا گیا ہے۔

اہل ایمان کو مدد کی بشارت

ارشاد ہے۔ "اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْھَادُ۔ یَوْمَ لَایَنْفَعُ الظّٰلِمِیْنَ مَعْذِرَتُھُمْ وَلَھُمُ اللَّعْنَۃُ وَلَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ"

اللہ تعالیٰ اس آیت میں ارشاد فرماتا ہے کہ ہمارا یہ دستور و معمول ہے کہ ہم اپنے پیغمبروں اور اُن کی دعوتِ ایمان کو قبول کر کے اُن کا ساتھ دینے والوں کی ضرور مدد کرتے ہیں اس دنیوی زندگی میں بھی، اور قیامت کے اُس دن بھی یقیناً اُن کی مدد کریں گے جب کہ گواہ پیش ہوں گے اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے ہر شخص کے عمل و کردار اور ظاہر و باطن کا اس کو پورا علم ہے، کسی کی کوئی بات بلکہ دل کا کوئی ارادہ بھی اس سے چھپا ہوا نہیں ہے (یہ بات قرآن مجید ہی میں بیسیوں جگہ بیان فرمائی گئی ہے) اس کے باوجود اُس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ آخرت میں کسی کے عذاب و ثواب کا فیصلہ وہ صرف اپنے ذاتی علم سے ہی نہ فرمائے گا، بلکہ گواہوں کے بیانات ہوں گے، اللہ کے فرشتے گواہی دیں گے، اور ہم انسانوں کے اعضا ہاتھ پاؤں وغیرہ بھی اُس دن اللہ کے حکم سے گواہی دیں گے، اس لئے اس آیت میں قیامت اور حساب کتاب کے اس دن کو "یوم یقوم الاشھاد" فرمایا گیا ہے (یعنی گواہوں کی پیشی کا دن) آگے ارشاد ہے کہ اُس دن مجرموں کا کوئی حیلہ بہانہ اور کوئی معذرت اُن کو نفع نہیں پہنچائے گی اور ان کے لئے خدا کی رحمت سے محرومی کا اور دوزخ کے عذاب کا فیصلہ ہوگا (یَوْمَ لَایَنْفَعُ الظّٰلِمِیْنَ مَعْذِرَتُھُمْ وَلَھُمُ اللَّعْنَۃُ وَلَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ)

میں ذکر کر چکا ہوں کہ یہ سورۂ مومن مکی ہے اور بظاہر اس دور میں نازل ہوئی ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ حق کی مخالفت کرنے والے کفار و مشرکین کو ہر طرح کا غلبہ حاصل تھا اور وہ رسول اللہ ﷺ کو طرح طرح کی ایذائیں دیتے اور آپ پر ایمان لانے والوں کو بڑے ظالمانہ طریقوں سے ستاتے تھے۔ ظاہری حالات میں اُس وقت اس کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ ان دشمنانِ حق کے مقابلہ میں کبھی رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کو غلبہ حاصل ہوسکے گا۔ اسی حالت اور اسی فضا میں بہت سی دوسری آیتوں میں بھی اور سورۂ مومن کی اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے اس منشور ازلی کا اعلان فرمایا کہ ہمارا دستور و معمول ہے کہ ہم

اپنے پیغمبروں اور اُن پر ایمان لانے والوں کی اس دُنیا میں بھی مدد کرتے ہیں (جس کے نتیجہ میں اُن کی دعوتِ حق دیر سویر کامیاب ہوتی ہے) اور آخرت میں بھی اُن کو رحمت اور جنت سے نوازتے ہیں جو حقیقی کامیابی ہے۔ اور اس کے برعکس کفر وشرک جیسے جرائم کے مجرمین کے ساتھ آخرت میں ہمارا معاملہ یہ ہوگا کہ اُن کا کوئی عذر کوئی حیلہ بہانہ نہ سنا جائے گا اور ان کے لئے لعنت کا (یعنی رحمت سے قطعی محرومی کا) اور دوزخ کے بدترین عذاب کا فیصلہ ہوگا۔ (ولهم اللعنة ولهم سوء الدار)

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو اور ایمان لا کر آپ کا ساتھ دینے والوں کو تسلی دی گئی ہے کہ اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے انتظار کرو، وہ اس دنیا میں بھی تمھاری مدد فرمائے گا اور آخرت میں بھی تم پر اُس کی خاص رحمت وعنایت ہوگی، اور جو کفار ومشرکین آپ کو اور صحابہ کرام کو ستاتے تھے ان کو آگاہی دی گئی ہے کہ بالآخر وہ اس دنیا میں بھی مغلوب ومقہور ہوں گے اور آخرت میں وہ خدا کی رحمت سے قطعی محروم رہیں گے اور دوزخ کے بدترین عذاب میں جھونکے جائیں گے۔

پیغمبروں اور اہل ایمان کی مدد کا مطلب

اس آیت کے مضمون سے متعلق ایک عامیانہ شبہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں بڑی تاکید اور قطعیت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ "ہم اپنے پیغمبروں کی اور اُن پر ایمان لانے والوں کی اس دنیا میں بھی مدد کرتے ہیں اور کریں گے"۔ حالانکہ ہم خود دیکھ رہے ہیں اور تاریخ میں بھی اسکی بے شمار مثالیں ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے کافر دشمنوں کے مقابلہ میں شکستیں کھائیں اور ان کے مغلوب ہوکر رہے، خود ہمارا حال اور ہماری تاریخ بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے اور میں بار بار اس کا ذکر کر چکا ہوں کہ قرآن پاک میں کہیں بھی "مسلمان قوم" یا مسلمان کہلانے والوں کی مدد کا وعدہ نہیں فرمایا گیا ہے جہاں بھی اس طرح کا وعدہ کیا گیا ہے "مومنین" یا "الذین آمنوا" جیسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اور ان سب آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس امت کی مدد فرمائے گا جو حاملِ ایمان ہوں گی اور جس کی زندگی ایمان والی زندگی ہوگی، جس کا صحیح نمونہ صحابہ کرام تھے۔

اور آج کی مسلمان قوم کا حال یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کی زندگی میں ایمانی صفات اور ایمان والے اعمال وافعال کے مقابلے میں کفار ومنافقین اور فاسقوں تاجروں کی صفات اور اُن کے اعمال وافعال زیادہ ہیں، اُن کا حال قرآن پاک کے الفاظ میں اس وقت یہ ہے کہ "هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ" الغرض ایسی کسی قوم کے لئے ہرگز اللہ کی طرف سے مدد کا وعدہ نہیں ہے، بلکہ ایسی قوم اور ایسے لوگوں کے لئے تو خدا کی مدد سے محرومی اور دنیا و آخرت میں ذلت ورسوائی کے عذاب کی آگاہی دی گئی ہے۔ آج مسلمانوں کی اکثریت کا حال تھوڑے فرق کے ساتھ وہی ہے جو بگڑے ہوئے بنی اسرائیل کا تھا جن کو قرآن پاک میں جا بجا خدا کی لعنت اور اس کے غضب کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

ایک دوسرا شبہ اس آیت کے مضمون پر یہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے پیغمبروں کی مدد فرمانے کا وعدہ فرمایا گیا ہے (اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا) اور قرآن پاک ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے بعض پیغمبر شہید بھی کئے گئے اور بعض کو جلاوطن ہونا پڑا۔ جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے ان کی مدد نہیں ہوئی، اگر اللہ کی مدد ہوئی ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ زندگی ہی میں ان کا مشن کامیاب ہوجائے، اُن کا لایا ہوا دین قبول کرلیا جائے اور ان کے دشمن مغلوب ومقہور ہوجائیں۔ ایسی مدد اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوئی۔ اور اسی طرح کی مدد ایک درجہ میں حضرت موسیٰ وہارونؑ کو بھی حاصل ہوئی تھی۔

ایک دوسری صورت مدد کی یہ ہے کہ پیغمبر کو اور ان کے متبعین کو اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت میں لے لے اور دشمن قوم آسمانی عذاب سے نیست ونابود کردی جائے۔ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیبؑ کی مدد اسی صورت میں ہوئی۔

ایک تیسری صورت یہ ہے کہ پیغمبر کی دینی دعوت اگرچہ اُن کی زندگی میں دنیا میں نہ پھیلے لیکن اس کی نسل کے لئے نصرت وبرکت اور دینی امامت مقدر فرمادی جائے اور دنیا ہمیشہ عزت واحترام سے اس کا نام لے، حضرت ابراہیمؑ کو اسی طرح کی مدد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیب ہوئی۔ آج ابراہیمؑ کا نام پوری دنیا میں جیسے احترام سے لیا جاتا ہے غالباً دنیا کی کسی ہستی کا بھی نہیں لیا جاتا، مسلمانوں کی طرح یہود ونصاریٰ بھی اُن کو "امام" مانتے ہیں، تو یہ بھی

اللہ تعالیٰ کی خاص مدد ہی کا ظہور ہے۔ ایک صورت مدد کی یہ بھی ہے کہ دشمن کسی پیغمبر کو شہید کرنا چاہتے ہوں اور عالم اسباب میں اس کا پورا انتظام کر چکے ہوں لیکن اللہ تعالیٰ معجزانہ طور پر اُن کو بچا لے اور بعد میں اُن کے ماننے والوں کو دشمنوں پر غالب کردے۔ حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ یہی کیا گیا۔ اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ پیغمبر دشمنوں کے ہاتھ سے شہید ہو جائیں۔ پھر اس کی سزا میں قوم پر عذاب آئے اور یہ بات سب کے سامنے آ جائے کہ یہ اللہ کے صادق پیغمبر تھے، پھر بہت سوں کو ایمان نصیب ہو جائے اور ایمان والے بندے ہمیشہ اُن پر سلام بھیجیں اور ان کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہیں۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مدد ہی کی صورت ہے۔ الغرض اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ہر رسول کو اس کی مدد حاصل رہی ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بلا شک وشبہ برحق ہے کہ "اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ. يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ"

اصل سلسلہ کلام کی طرف واپسی

یہ چند آیتیں درمیان میں ایک ضمنی مضمون کے طور پر آگئیں، ورنہ آپ کو یاد ہوگا کہ اوپر حضرت موسیٰؑ کا واقعہ بیان ہو رہا تھا، پھر اسی سلسلہ میں فرعون کے گھرانے کے ایک مرد مومن کی تقریر ذکر کی گئی تھی جو بڑی موثر تقریر تھی۔ پھر بیان فرمایا گیا تھا کہ فرعون اور اُس کے لوگوں نے اُس مرد مومن کے خلاف کوئی خطرناک منصوبہ بنایا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے ناکام کر دیا، اس مرد مومن کی حفاظت فرمائی، اور فرعون مع اپنے لاؤ لشکر کے غرقاب ہو کر جہنم رسید ہو گیا، اور قیامت سے پہلے عالم برزخ میں وہ برابر مبتلائے عذاب رہیں گے اور قیامت آ جانے پر جہنم کے بدترین عذاب میں جھونک دیے جائیں گے۔

اس سب کے بعد فرمایا گیا تھا کہ موسیٰؑ اور اُن کی دعوت کو قبول کر کے اُن کے ساتھ ہو جانے والے مرد مومن کے ساتھ اللہ کی مدد کا جو معاملہ ہوا یہ کوئی استثنائی معاملہ نہیں تھا بلکہ اپنے رسولوں اور اُن پر ایمان لانے والوں کے ساتھ یہ معاملہ کرنا ہمارا دستور و معمول ہے۔ اس

ضمنی اور درمیانی مضمون کے بعد پھر موسیٰؑ کا اور اُن پر اللہ تعالیٰ کے خاص فضل وانعام کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

”وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْهُدٰی وَاَوْرَثْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْكِتٰبَ۝ هُدًی وَّذِكْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ۝ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْكَارِ۝ “

مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے پیغمبر موسیٰ کو اور اُن پر ایمان لانے والوں کو فرعون کے ظلم وستم سے نجات دینے کے بعد اور فرعون اور اس کے سارے لاؤ لشکر کو غرقاب کر کے نیست ونابود کر دینے کے بعد موسیٰؑ کو کتاب ہدایت تورات عطا فرمائی اور اُن کے بعد ان کی قوم بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث وامین بنایا، تا کہ اہل عقل ودانش اُس سے رہنمائی اور نصیحت حاصل کرتے رہیں۔

اس میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو اشارہ ہے کہ آپ کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہوگا، دشمنوں کے ظلم وستم سے اللہ تعالیٰ آپ کو نجات عطا فرمائے گا، آپ کے دشمن (ابوجہل وغیرہ جو گویا آپ کے زمانہ کے فرعون وہامان تھے) اگر باز نہ آئے تو نیست ونابود کیے جائیں گے یا مغلوب ومقہور ہوں گے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ غلبہ عطا فرمائے گا، اور کتاب ہدایت بھی عطا فرمائے گا اور آپ کے بعد آپ کے وفادار اور پیروکار امتی اس کے وارث وامین ہوں گے۔ اور دنیا بھر کے اصحاب عقل وخرد اس سے ہدایت ونصیحت حاصل کرسکیں گے ...... اس کے آگے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب فرما کے آپ کو اور بالواسطہ آپ کے امتیوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ ”فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْكَارِ“۔

مطلب یہ ہے کہ آپ صبر واستقامت کے ساتھ دین حق کی دعوت کا کام کرتے رہیں اور یقین رکھیں کہ اللہ کا وعدہ (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے) برحق ہے پورا ہو کر رہے گا۔ اور اپنی تقصیرات اور غلطیوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے رہیں اور خاص کر صبح وشام کے اوقات میں اس استغفار اور اللہ کی حمد وتسبیح میں مشغول رہا کریں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اس آخری آیت کے مخاطب بظاہر اور براہ راست تو رسول اللہ ﷺ ہیں لیکن بالواسطہ آپ پر سارے ایمان لانے والے اور ہم آپ بھی مخاطب ہیں۔ یہ آیت ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کا خاص منشور ہے، اس کا پیغام یہ ہے کہ مضبوطی سے دین پر جمے رہو اور صبر و ثابت قدمی کے ساتھ اس کی دعوت دیتے رہو اور اپنے قصوروں گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی و مغفرت مانگتے رہو۔ اور خاص کر صبح و شام (جو دن رات کی ابتدا اور انتہا کے اوقات ہیں) اُن میں توبہ واستغفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کو اپنا معمول و وظیفہ بنالو۔ اگر ایسا کرو گے تو ''اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ'' کا یقیناً ظہور ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اور اس کے بعد صحابہ کرام کے دور میں جو کچھ ہوا وہ دراصل اس آیت کی اور اس مضمون کی دوسری آیتوں کی عملی تفسیر تھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کو یقین اور اس کے مطابق عمل نصیب فرمائے۔ رسول اللہ ﷺ نے حمد و تسبیح اور استغفار کا بڑا ہی جامع کلمہ تعلیم فرمایا ہے اور خود آپ کی زبان مبارک پر اکثر یہ کلمہ رہتا تھا۔ ''سُبْحَانَکَ اَللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ أَسْتَغْفِرُکَ وَأَتُوْبُ اِلَیْکَ''(۱)



(۱) مشکوٰۃ میں نسائی کی روایت سے اس کلمہ میں وَبِحَمْدِکَ کے بعد لا الہ الا انت کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ دیکھئے مشکوٰۃ باب الاستعاذہ۔ (مرتب)

(درس-۳۴)

قرآن کے منکرین ومخالفین کا اصل مرض

کبر اور بڑائی کا گھمنڈ

جزا وسزا کے لئے عالم آخرت کا برپا ہونا عقل وفطرت کا تقاضا ہے

اپنی حاجتیں اللہ ہی سے مانگو، دعا عین عبادت ہے اور اللہ ہی کا حق ہے

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم- بسم اللہ الرحمٰن الرحیمط

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ إِن فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَّا هُم بِبَالِغِيهِ ج فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ط إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ٥ لَخَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ٥ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ لا وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ط قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ ٥ إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ٥ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ط إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ٥ (سورۂ مومن آیات ۵۶ تا ۶۰)

(ترجمہ) جو لوگ کٹ حجتی کرتے ہیں اللہ کی آیت میں بغیر کسی دلیل اور سند کے جو (خدا کی طرف سے) اُن کے پاس آئی ہو، اُن کے دلوں میں بس کبر ہے (بالاتری کا وہ احساس اور غرور

ہے) جس کو وہ کبھی نہیں پہنچ سکتے، بس تم اللہ کی پناہ مانگو وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق انسانوں کو پیدا کرنے سے بڑی (اور بہت مشکل) بات ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور اندھے اور سہانکے برابر نہیں، اور (اسی طرح) ایمان اور نیک اعمال والے، اور بدکردار لوگ (یکساں نہیں ہوسکتے) تم لوگ بہت کم سبق حاصل کرتے ہو۔ بالیقین قیامت آنے والی ہے، اس میں شک وشبہ نہیں، مگر بہت سے لوگ یقین نہیں لا رہے ہیں --- نہیں مان رہے ہیں۔

اور تمہارے رب کا فرمان ہے کہ مجھے پکارو مجھ سے دعا کرو میں تمہاری استدعا قبول کروں گا، جو لوگ میری بندگی سے سرتابی کررہے ہیں وہ سخت ذلت وخواری کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔

تفسیر وتشریح

یہ سورۂ مومن کا سلسلہ چل رہا ہے۔ میں نے ذکر کیا تھا کہ قرآن پاک میں سات سورتیں ہیں جو "حٰمٓ" کے لفظ سے شروع ہوتی ہیں یہ سب مسلسل ہیں، ان میں پہلی یہ سورۂ "مومن" ہے، یہ سب مکی سورتیں ہیں اوران کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اُس دور کی ہیں جب مکہ کے کفار ومشرکین کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ ایمان اور دعوتِ توحید کی سخت مخالفت اور مزاحمت ہورہی تھی، ان سب سورتوں کا بنیادی مضمون اکثر مکی سورتوں کی طرح توحید اور عقیدۂ آخرت پر ایمان لانے کی دعوت ہے۔ قرآن مجید کے خاص انداز واسلوب میں ان دونوں بنیادی عقیدوں کے دلائل بھی ان سورتوں میں پیش کیے گئے ہیں اور ان کو قبول کرنے اور ان کا انکار کرنے کے نتائج بھی بیان فرمائے گئے ہیں --- اس کے علاوہ اُس وقت کے اہل کفر وشرک کے متکبرانہ اور ظالمانہ رویہ سے اہل ایمان کے دلوں پر جو اثرات پڑتے تھے یا پڑ سکتے تھے اور جو مایوسی پیدا ہوسکتی تھی اُس کے بارہ میں بھی ہدایات دی گئی ہیں۔ جو آیتیں اس وقت تلاوت کی گئی ہیں ان سے پہلی آیت جس پر گزشتہ ہفتے درس ختم ہوا تھا یہ تھی۔ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ"۔

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرکے براہ راست آپ کو اور بالواسطہ آپ پر ایمان لانے والے آپ کے اصحاب ورفقاء کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ دعوت کی راہ میں آپ کو جن

مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، آپ اُن کا مقابلہ اللہ کے وعدہ نصرت پر یقین کرتے ہوئے صبر و ثابت قدمی سے کریں، اللہ کا جو وعدہ ہے (کہ دین حق غالب ہو کے رہے گا) وہ یقیناً پورا ہوگا۔ آپ کا معمول اور دستور العمل یہ رہنا چاہئے کہ برابر، بالخصوص صبح وشام کے اوقات میں اپنے قصوروں اور گناہوں کی اللہ سے معافی اور مغفرت مانگتے رہیں اور اس کی تسبیح وحمد میں مشغول رہیں۔

انبیاءؑ کی معصومیت اور گناہ

میں یہ بات اس درس کے سلسلے میں بار بار بیان کر چکا ہوں کہ حضورؐ اور تمام انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں، ان سے ایسا کوئی عمل صادر نہیں ہوتا جو "گناہ" کے خانہ میں آتا ہو لیکن کبھی کبھی اُن سے کوئی ایسی لغزش ہو جاتی ہے جو اُن کے بلند مقام کے مناسب نہیں ہوتی وہ اُسی کو اپنا قصور وگناہ سمجھتے ہیں اور اُس سے وہ اتنا رنجیدہ ہوتے ہیں جتنے ہم گناہگار اپنے گناہوں سے بھی رنجیدہ اور متاثر نہیں ہوتے۔ اور اس پر وہ اللہ کے حضور میں ایسا روتے ہیں اور اس سے اس طرح معافی اور مغفرت کے طالب ہوتے ہیں کہ ہم اپنے بدترین گناہوں پر بھی ایسا استغفار نہیں کرتے، یہی ان کی عظمت اور بڑائی ہے "قربیاں رابیش بود حیرانی"۔

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے

کفار کی کٹ حجتی اور اس کا سبب

آج جو آیتیں تلاوت کی گئی ہیں اُن کا مطلب اور پیغام سمجھنے کے لئے اُس صورت حال کو پیش نظر رکھ لینا چاہئے جس سے ان آیتوں کا خاص تعلق ہے۔ وہ صورت حال یہ ہے۔

قرآن پاک میں توحید اور عقیدہ آخرت کا جس طرح بیان ہوتا تھا اور اس سلسلہ میں جو دلائل پیش کئے جاتے تھے اُن سے بہت سے سادہ دل عوام متاثر ہوتے تھے، ان کے اس تأثر کو مٹانے کے لئے اور راہ ہدایت سے اُن کو روکنے کے لئے اُن کے لیڈر طرح طرح کے اعتراضات اور سوالات اُٹھاتے تھے اور کٹ حجتی کرتے تھے، کبھی کہتے تھے کہ اگر یہ عقیدے ٹھیک ہوتے تو ہمارے باپ دادے انہی عقیدوں پر ہوتے، کبھی کہتے تھے کہ سارے معبودوں کو ختم کر کے بس ایک خدا کو ماننا عجیب اور ناقابل فہم ہے (اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا، اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ)، کبھی کہتے کہ ہم نے آج تک نہیں دیکھا کہ کوئی مردہ زندہ ہوا ہو، اس

لئے مرنے کے بعد پھر زندہ کئے جانے کی بات ماننے کے لائق نہیں ہے۔ کبھی کہتے کہ ہمارے باپ دادوں کو زندہ کر کے دکھا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اُن میں سے کسی بات میں بھی کوئی معقولیت نہیں، یہ اُن کی صرف کٹ حجتی تھی۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ "اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ......اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ"۔ مطلب یہ ہے کہ جو منکرین اللہ کی آیات، اس کے ارشادات، اور اس کے بیان فرمائے ہوئے دلائل و براہین کے بارہ میں کٹ حجتی کرتے ہیں اُن کے انکار و اختلاف کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اِس انکار و اختلاف کے لئے اُن کے پاس کوئی دلیل یا اللہ کی نازل فرمائی ہوئی کوئی سند ہے، بلکہ اُن کی بیماری یہ ہے کہ ان کے دلوں میں کبر ہے یعنی اپنی سرداری و بالاتری کا گھمنڈ اور اپنا جھنڈا اونچا رکھنے کا شوق و جذبہ ہے، حالانکہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ بات اُن کو نصیب نہیں ہوگی (ما هم ببالغيه). آگے حضور ﷺ کو حکم دیا گیا ہے "فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" یعنی آپ اِن متکبرین شیاطین کی شرارتوں سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ سے حفاظت اور پناہ کی استدعا کرتے رہیں، وہ سمیع و بصیر ہے، سب کچھ دیکھ رہا ہے سن رہا ہے۔

اس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کی دعوتِ حق کے اولین مخالفین مکہ کے کفار و مشرکین کے کفر و انکار اور مخالفت کا اصل سبب ان کے دلوں کا کبر یعنی اپنی بالاتری کا احساس اور گھمنڈ تھا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ایسے حالات میں حق کے داعیوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر اس یقین کو تازہ کرتے رہیں کہ اللہ سمیع و بصیر ہے وہ سب کچھ دیکھ رہا اور سن رہا ہے اور متکبر مخالفین کے شر سے حفاظت و پناہ کی اُس سے استدعا کرتے رہیں۔

قیامت اور آخرت تقاضائے فطرت ہے

اس کے آگے پھر قیامت اور آخرت کے مسئلہ کو سمجھایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے "لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝" مطلب یہ ہے کہ تم خود اُس بات کو مانتے ہو کہ آسمان و زمین یعنی سارا عالم علوی و سفلی اللہ نے پیدا کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس سب کا پیدا کرنا انسان کے پیدا کرنے کے مقابلہ میں زیادہ مشکل کام ہے اور انسان کا پیدا کرنا اس کے مقابلہ میں آسان ہے، تو جس اللہ نے یہ سارا عالم علوی و سفلی بنایا اس کے لئے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، اتنی موٹی بات تمہاری سمجھ میں

نہیں آتی۔ آگے فرمایا گیا ہے۔ "وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ؀". پہلی آیت سے قیامت اور بعث بعد الموت کا امکان ثابت کیا گیا تھا، اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ جزا سزا کے لئے انسانوں کا دوبارہ زندہ کیا جانا اور عالم آخرت کا برپا ہونا انسان کی عقل وفطرت کا تقاضا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک بدیہی بات ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ایک اندھا جس کی آنکھ میں روشنی اور بینائی بالکل نہ ہو اور وہ کچھ نہ دیکھ سکتا ہو اور ایک سہانکا جس کی آنکھ بالکل صحیح سالم اور بینا ہو اور اس کو سب کچھ نظر آتا ہو۔ ان دونوں کا حال اور مآل ایک نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ایک ایسا آدمی جس کو ایمان ویقین کا نور اور حسنِ عمل نصیب ہے۔ اور ایک بدکردار بدفعل آدمی ان دونوں کا حال وانجام بھی ایک نہیں ہونا چاہئے، پہلے آدمی کو ایمان اور عمل صالح کا صلہ اور پھل ملنا چاہئے اور دوسرے کو اس کی بدکرداری اور بدافعالی کی سزا ملنی چاہئے، اور اس دنیوی زندگی میں ایسا نہیں ہو رہا تو ہماری عقل کہتی ہے کہ پھر کسی دوسرے عالم اور کسی دوسری زندگی میں یہ جزا و سزا ملنی چاہئے۔ اور وہ وہی عالمِ آخرت ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے سب پیغمبروں نے دی ہے، اس لئے عالمِ آخرت ہماری عقل وفطرت کا بھی تقاضا ہے۔ لیکن تم لوگ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور سمجھنا نہیں چاہتے۔ (قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ)

آگے فرمایا گیا ہے "اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۡ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ؀".

مطلب یہ ہے کہ قیامت جس کی خبر دی جا رہی ہے اُس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے وہ یقیناً اور قطعاً آنے والی ہے، اور عقل وفطرت کا تقاضا اور تمام انبیاء علیہم السلام کی اطلاع بھی یہی ہے کہ وہ وقت پر برپا ہوگی اور کسی صحیح العقل اور سلیم الفطرت انسان کے لئے اس کے نہ ماننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن بہت سے آدمی ہیں جو اس کو نہیں مان رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُن کا نہ ماننا قیامت کو آنے سے تو روک نہیں سکتا البتہ وہ اس نہ ماننے کا انجام دیکھ لیں گے۔

راہِ نجات

آگے ارشاد ہوا ہے " وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ؀"

قیامت اور آخرت کے ذکر کے بعد یہ اُس توحید کی دعوت دی گئی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا اولین اور سب سے اہم سبق ہے، بلکہ اُسی کے لئے اس عالم کی تخلیق کی گئی ہے (وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ) مطلب یہ ہے کہ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ قیامت کا آنا اور آخرت میں جزا وسزا کا ہونا برحق ہے۔ تو تمہیں یہ معلوم کرنا چاہئے کہ پھر نجات کا راستہ کیا ہے؟ سنو! نجات کا راستہ یہ ہے کہ اللہ ہی کو وحدہ لاشریک اور پروردگار و کارساز یقین کرتے ہوئے، اُسی سے اپنی حاجتیں مانگی جائیں اُسی سے دعائیں کی جائیں، وہی دعا سننے والا اور قبول کرنے والا ہے، اُس سے اپنی حاجتیں مانگنا اور دعا کرنا عین عبادت ہے۔ حدیث شریف میں ہے " الدعاء هو العبادة" یعنی دعا ہی اصل عبادت ہے۔ (۱)

ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں "الدعاء مخ العبادة" یعنی دعا عبادت کا جوہر اور اس کی روح ہے۔ (۲)

بہر حال قیامت اور آخرت کے ذکر کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ''وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ'' سنو! تمہارے رب کا فرمان ہے کہ اپنی حاجتوں کے لئے مجھ سے دعا کرو، مجھ سے مانگو میں سنوں گا اور تمہاری دعا قبول کروں گا۔

دنیا کی اکثر قوموں کا شرک یہی رہا ہے کہ وہ اپنے دیوتاؤں یا بزرگوں کی روحوں کو کارساز اور حاجت روا سمجھ کر اپنی حاجتیں اُن سے طلب کرتے تھے اور انہیں راضی کرنے کے لئے چڑھاوے چڑھاتے اور اپنے طریقوں سے ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے۔ اور جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا یہ دعا اور حاجت طلبی عین عبادت ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ اپنی حاجتوں کے لئے مجھ سے ہی دعا کرو مجھ سے ہی مانگو، میں ہی تمہاری دعا قبول کرسکتا ہوں اور تمہاری مراد پوری کرسکتا ہوں۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر جابجا فرمایا گیا ہے کہ میرے سوا جن سے تم مانگتے ہو ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے (مَا یَمْلِکُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ)

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ٥"۔

---

(۱) ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ کتاب الدعوات۔ (۲) ترمذی، مشکوٰۃ کتاب الدعوات۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ کے اس فرمان کے بعد اور توحید کی دعوت پہنچ جانے کے بعد جو سر پھرے اُس کی بندگی سے سرتابی کریں گے اور شرک سے توبہ کر کے خداوند وحدہ لاشریک لہ کے حضور میں نہیں جھکیں گے اُن کے لئے قطعی فیصلہ ہے کہ وہ نہایت ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں پڑیں گے (سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ)

دُعاؤں کی قبولیت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو براہ راست مخاطب کر کے فرمایا ہے "اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ" (مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا) اس پر شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بندوں کی بہت سے دعائیں قبول نہیں ہوتیں حتیٰ کہ جن کو اولیاء اللہ سمجھا جاتا ہے ان کی بھی سب دعائیں قبول نہیں ہوتیں، اور قرآن شریف ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ بعضے انبیاء علیہم السلام کی بھی بعض دعائیں قبول نہیں ہوئیں، جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا اُن کے بیٹے کے بارہ میں قبول نہیں ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کی قبولیت کا وعدہ دو باتوں سے مشروط ہے ایک یہ کہ دعا کسی ناجائز بات کے لئے نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف نہ ہو، اور دوسری یہ کہ دعا کرنے والا کسی ایسے گناہ میں مبتلا نہ ہو جس کی وجہ سے بندہ خدا کی رحمت اور نظر عنایت کے قابل نہیں رہتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں دعا قبول نہیں ہوتی وہاں انہیں میں سے کوئی بات رکاوٹ بن جاتی ہے۔

اس کے علاوہ حدیث شریف میں دعا کی قبولیت کے بارہ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ دعا کے قبول ہونے کی مختلف صورتیں ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ بندہ جس چیز کے لئے دعا کرے وہ اُس کو عطا فرما دی جائے" ہم لوگ اپنی کم نظری سے صرف اسی کو دعا کی قبولیت سمجھتے ہیں" حالانکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت، اُس کی صفتِ رحمت کے بھی خلاف ہے کہ بندہ جو مانگے وہ اُس کو بہر حال دے دیا جائے، بندہ تو نادان اور ظلوم وجہول ہے وہ بسا اوقات ایسی چیز مانگتا ہے جو انجام کے لحاظ سے اس کے لئے مضر بلکہ مہلک اور تباہ کن ہو سکتی ہے، ایسی صورت میں اللہ کی حکمت اور رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ اُس کو نہ دی جائے۔ تو اللہ تعالیٰ جو حکیم ورحیم ہے وہ چیز اُس کو عطا نہیں فرماتا لیکن اُس کے بجائے اُس دعا ہی کے حساب میں دنیا یا آخرت کی کوئی اور نعمت اُس کے واسطے مقدر فرما دیتا ہے اور اُس بندہ کے حق میں یہی بہتر ہوتا

ہے۔ تو یہ بھی دعا کی قبولیت کی ایک صورت ہے۔ پس جب کوئی بندہ دیکھے کہ کوئی دعا جو میں نے کسی جائز مقصد کے لئے کی تھی بظاہر وہ قبول نہیں ہوئی تو اللہ تعالیٰ کی حکمت اوراس کی رحیمی کریمی پر نظر رکھتے ہوئے یقین کرے کہ میری یہ دعا رائیگاں اور لاحاصل نہیں رہے گی، جو کچھ میں نے اپنے اللہ سے مانگا تھا وہ مجھے نہیں ملا ہے تو اُس رب کریم نے اُس سے بہتر کوئی چیز ضرور میرے لئے مقدر فرمادی ہے جو مجھے اسی دنیا میں یا آخرت میں جاکر ملے گی، اوراس طرح اللہ تعالیٰ کا دعا کی قبولیت کا وعدہ "استجب لکم" پورا ہوگا۔

انسانی اعمال میں دُعا کا مقام اور درجہ

میں نے ابھی ذکر کیا تھا کہ حدیث شریف میں ہے کہ "دعا عین عبادت ہے" اور دوسری حدیث میں ہے کہ "عبادت کا مغز جوہر اوراس کی روح ہے"۔ افسوس ہے کہ ہم لوگ دعا کی اس قدر و قیمت سے بالکل غافل ہیں۔ ایک حدیث شریف کا مضمون ہے کہ اللہ کو بندہ کا کوئی عمل اوراس کی کوئی بات دعا سے زیادہ عزیز اور پیاری نہیں "لیس شیئی اکرم علیَ اللہ من الدعاء"(۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندہ سے ناراض ہوتا ہے جو اُس سے نہ مانگے، دعا سوال نہ کرے "من لم یسئل اللہ یغضب علیه"(۲)

ایک حدیث پاک کا مضمون ہے کہ جس بندہ کے لئے دعا کا دروازہ کھل گیا یعنی اُس کو دعا کی توفیق مل گئی اوراس کو حقیقی دعا نصیب ہوگئی تو سمجھنا چاہئے کہ اس کے واسطے خدا کی رحمت کے دروازے کھل گئے (من فتح له باب الدعاءِ فتحت له ابوابُ الرّحمة)(۳)

بلاشبہ وہ بندے بڑے مبارک ہیں جن کو دعا کا ذوق نصیب ہوجائے اور وہ اللہ کے در کے فقیر اور بھکاری بن جائیں، اللہ تعالیٰ نے یہ دولت سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کو نصیب فرمائی تھی اور جس کو یہ نعمت جس درجہ میں نصیب ہوجائے وہ اتنا ہی خوش نصیب ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق دے کہ اس کا یہ ارشاد ہے "ادعونی استجب لکم" برابر یاد رہے اور دعا کی حقیقت ہمیں نصیب ہوجائے اور ہمارا حال بن جائے۔ والحمد لِلّٰہ رب العٰلمین وسلامٌ علیَ المرسلین۔

---

(۱) ترمذی۔ مشکوٰۃ کتاب الدعوات (۲) ایضاً (۳) ایضاً.

(درس-۳۵)

اللہ تعالیٰ کا یہ عظیم احسان ہے کہ اس نے رات اور دن کا نظام قائم فرمایا

اسی نے تمہارے لئے زمین وآسمان کو بنایا، اور تمہاری بہترین صورتگری کی
اسی نے تمہیں کھانے پینے کی پاکیزہ اور نفیس چیزیں عطا فرمائیں
وہی "الحیّ" ہے عبادت، اور دعا اور حمد صرف اسی کا حق ہے

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ط

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًاؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا یَشْكُرُوْنَ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ٘
فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ۝ كَذٰلِكَ یُؤْفَكُ الَّذِیْنَ كَانُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ
یَجْحَدُوْنَ۝ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً
وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِؕ ذٰلِكُمُ
اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۝ هُوَ الْحَیُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝
(سورۃ المومن آیت ۶۱ تا ۶۵)

(ترجمہ) اللہ ہی ہے جس نے بنائی تمہارے واسطے رات (اندھیری) تاکہ تم اس میں آرام کرو، اور دن کو بنایا روشن (کہ تم اس میں اپنے کام کاج کرسکو) واقعہ یہ ہے کہ اللہ لوگوں

پر بڑا فضل واحسان فرمانے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ وہی اللہ ہے تمہارا رب ہر چیز کا خالق، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو پھر تم لوگ کس طرح بہکے جاتے ہو، اسی طرح بہکتے رہے ہیں وہ لوگ جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں۔

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مستقر (ٹھکانا) اور آسمان کو (گنبد کی طرح کی) ایک عمارت بنایا۔ اور تمہاری صورت گری کی تو بہت ہی اچھی تمہاری صورتیں بنائیں۔ اور تم کو پاکیزہ اور لذیذ و نفیس چیزیں رزق کے طور پر عطا فرمائیں، وہی اللہ ہے تمہارا رب، پس بڑا ہی برکت والا ہے وہ اللہ رب العٰلمین، صرف وہی ہے زندہ (ازلی ابدی) اس کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں، پس اس کو پکارو، (اُسی سے دعا والتجا کرو) صرف اسی کی بندگی کرتے ہوئے ساری حمد وستائش اللہ ہی کے لئے ہے جو رب العالمین ہے۔

تفسیر وتشریح

یہ سورۂ مؤمن کے چھٹے رکوع کی آیتیں ہیں ان میں بندوں پر کئے جانے والے اللہ تعالیٰ کے بعض ہمہ گیر انعامات واحسانات کا ذکر فرما کے اس کی شکر گزاری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ساتھ ہی بتلایا گیا ہے کہ عبادت اور بندگی صرف اُس اللہ کا حق ہے جس کے بندوں پر یہ انعامات اور احسانات ہیں اور وہی اس کا مستحق ہے کہ بندے اپنی حاجتوں میں اس کو پکاریں اور اس سے دعا والتجا کریں۔ الغرض اِن آیتوں کا حاصل بھی توحید کی دعوت وتعلیم ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ارشاد فرمایا گیا ہے "اَللّٰهُ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ○"

مطلب یہ ہے کہ بندوں پر یہ اللہ ہی کا فضل واحسان ہے کہ اس نے رات اور دن کا یہ نظام قائم کیا ہے، رات کو اس نے ایسا تاریک اور خنک بنایا جو انسانوں بلکہ دوسرے حیوانات کے آرام کے لئے بھی مناسب وموزوں ہے، اس کی خنکی اور تاریکی میں فطری طور پر ہر ایک آرام کرنا چاہتا ہے اور اس کو آرام ملتا ہے۔ اور دن کو آفتاب کے ذریعہ روشن بنایا تاکہ اس کی روشن فضا میں سب اپنی معاش وغیرہ کے کام کاج کر سکیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر رات نہ

ہوتی، ہمیشہ دن کا اجالا رہتا تو رات میں جو آرام ہم کو اور ساری مخلوقات کو ملتا ہے وہ ہمیں حاصل نہ ہوتا، اور اس آرام چین کی نعمت سے ہم محروم رہتے، اسی طرح اگر دن کا اجالا نہ ہوتا، ہمیشہ رات کی تاریکی رہتی تو دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے ہرگز نہ ہوسکتا۔ الغرض رات اور دن کا یہ نظام اللہ کی بڑی نعمت اور اس کا بڑا فضل و احسان ہے، لیکن بلاشبہ انسانوں کی غالب اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی اس کے اس فضل و احسان کا خیال بھی نہیں کرتے، اس کا شکر ادا کرنا تو بعد کی بات ہے۔ (وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ)

جو پروردگار ہے وہی معبود ہے

اس کے آگے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس اللہ نے تم پر یہ فضل و کرم فرمایا ہے وہی تمہارا رب ہے، ہر چیز کا وہی خالق ہے وہی اور صرف وہی معبود برحق ہے، عبادت اور بندگی صرف اسی کا حق ہے (ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ)

آگے مشرکین کو مخاطب کر کے فرمایا گیا (فانّی تؤفکون) کہ تمہاری کیسی عقل ماری گئی ہے کہ تم اس اللہ کو چھوڑ کر (جس کے یہ انعامات و احسانات ہیں) دوسروں کے آگے اور غیروں کے آستانوں پر جھک رہے ہو۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ہماری آیتوں کے اور ہماری نازل کی ہوئی ہدایت کے منکر ہوتے ہیں وہ ان سے روشنی حاصل کرنا نہیں چاہتے، اُن کی عقلیں ایسے ہی ماری جاتی ہیں، اور وہ اسی طرح گمراہ ہوتے ہیں (كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ٥).

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے:

"اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَاءَ بِنَاءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ٥"

اوپر اللہ تعالیٰ کے اس عظیم احسان کا ذکر فرمایا گیا تھا کہ اس نے دن رات کا نظام قائم فرمایا، رات کو ایسا بنایا کہ اس میں ہم آرام اور چین حاصل کریں اور دن کو ایسا بنایا کہ ہم اس میں اپنی معاش وغیرہ کے لئے جدوجہد کرسکیں۔

اب اس آیت میں اسی طرح کے چار اور اہم انعامات و احسانات کا ذکر فرمایا گیا ہے

جن سے بندے ہمیشہ اور ہر وقت مستفید ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ زمین کو تمہارا مستقر اور مسکن بنایا (بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت ہی بڑا انعام واحسان ہے یہ زمین ساری نعمتوں کے، کبھی نہ ختم ہونے والے خزانے اپنے اندر لئے ہوئے ہے) دوسرا انعام یہ فرمایا کہ آسمان کو تمہارے لئے بطور چھت عمارت بنا دیا (چونکہ آسمان ہمارے ادراک کی دسترس سے باہر ہے اس لئے اس کی پوری حقیقت ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ہاں اتنا دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ سورج چاند ستارے جو آسمانی فضا میں ہیں اور زمینی نہیں بلکہ آسمانی چیزیں ہیں، یہ سب ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں) بہرحال آسمان بھی زمین کی طرح ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ تیسرا انعام یہ ذکر فرمایا کہ اسی اللہ نے تمہاری صورت گری کی اور بہت اچھی صورت گری کی (ظاہر ہے کہ اپنی شکل وصورت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے انسان اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ حسین وجمیل اور کامل وممتاز ہے)۔ اسی کو دوسری جگہ فرمایا گیا ہے " لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ " چوتھا انعام یہاں یہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ اللہ ہی نے تم کو پاکیزہ اور لذیذ ونفیس غذائیں عطا فرمائیں۔

یہ سب انعامات واحسانات وہ ہیں جن سے ہم انسان ہر وقت اور ہر لمحہ فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس کو کبھی یاد نہیں کرتے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات ہیں ظاہر ہے کہ یہ بڑی ناشکری اور ناسپاسی ہے۔ قرآن مجید کی ان آیتوں کا سبق یہ ہے کہ یہ بات ہمیشہ ہمارے ذہن میں اور ہمارے پیش نظر رہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں جن سے ہم مستفید ہوتے ہیں اور جب یہ بات ہوگی تو بندہ اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا رب اور معبود سمجھے گا اور شرک کی گندگی سے محفوظ رہے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ان انعامات واحسانات کا ذکر فرما کر آگے فرمایا گیا ہے "ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" مطلب یہ ہے کہ ان احسانات وانعامات کا دھیان کر کے تمہیں اس نتیجہ پر پہنچ جانا چاہئے اور تمہارے دل کی یہ آواز ہونی چاہئے کہ یہی اللہ جس کے یہ انعامات واحسانات ہیں ہمارا رب ہے۔ بڑی برکتوں والا ہے وہ اللہ جو رب العٰلمین ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ان انعامات واحسانات کا استحضار، ان کا دھیان اور ان میں غور وفکر اللہ تعالیٰ کی معرفت کا اور دل میں اس کی محبت اور عبادت کا داعیہ پیدا ہونے کا ذریعہ ہے۔ ہم

لوگوں کا حال یہ ہے کہ اللہ کے فضل سے ہمیں یہ عقیدہ تو نصیب ہے کہ دن رات کا نظام اللہ تعالیٰ ہی نے قائم فرمایا ہے اور زمین کو اسی نے ہمارا مستقر اور مسکن بنایا ہے اور آسمان بھی اسی نے ہمارے لئے بنایا ہے اور ساری مخلوق میں سب سے بہتر ہماری صورت گری اسی نے فرمائی ہے۔ اور کھانے پینے کی جو پاکیزہ اور لذیذ و نفیس چیزیں ہم کو نصیب ہیں سب اس کے کرم سے نصیب ہیں لیکن ہم کو اس کا کماحقہ استحضار اور دھیان نصیب نہیں۔ ان انعامات واحسانات کا جتنا استحضار و دھیان اور ان میں جتنا غور وفکر کیا جائے گا اتنی ہی اللہ کی معرفت نصیب ہوگی اور دل میں اس کی محبت اور اس کی عبادت کا شوق پیدا ہوگا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات کے ذکر کا خاص مقصد یہی ہے۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ " هُوَ الْحَيُّ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ". مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا جو کچھ اور جو کوئی ہے کسی کو دوامی حیات و بقا نہیں، سب فانی ہیں۔ سب کی حیات مستعار مجازی، اور اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہستی ہے جس کی حیات حقیقی اور ذاتی ہے جس کو کبھی فنا نہیں۔ صرف وہی معبود برحق ہے۔ اسی کی عبادت کرو اور اپنی حاجتوں کے لئے اسی سے دعا کرو، اسی سے لو لگاؤ! آخر میں ارشاد فرمایا "الحمد لِلّٰه رب العٰلمین" ساری حمد و ستائش اللہ ہی کے لئے ہے اور اسی کا حق ہے جو رب العالمین ہے، سب کا خالق و پروردگار ہے یہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" بڑا ہی مبارک کلمہ ہے۔ یہ حمد و شکر کا کلمہ بھی ہے اور کلمۂ توحید بھی ہے، اس کے مضمون پر یقین کے بعد شرک کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد لِلّٰه رب العٰلمین۔



سورۃ الفتح

درس ۳۶ ـــ ۴۲

(درس-۳۶)

صلح حدیبیہ جوظاہر بیں نظر میں ذلت آمیز شکست تھی

وہ حقیقت میں "فتح مبین تھی۔اس سے فتح مکہ کا دروازہ کھلا

واقعہ حدیبیہ کے بعد خصوصی انعامات الٰہیہ کا اعلان

خطبہ مسنونہ کے بعد

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًاo لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ
وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًاo
وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًاo (سورہ فتح آیات ۱ تا ۳)

(ترجمہ) بے شک ہم نے آپ کو ایک فتح مبین عطا فرمائی، کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اگلی پچھلی سب تقصیرات کو بخش دے اور اپنی نعمت کا آپ پر اتمام کرے۔ اور آپ کو صراط مستقیم پر چلائے اور اپنی ناقابل شکست نصرت سے آپ کو نوازے۔

تفسیر وتشریح

سورۂ محمد کے بعد یہ سورۂ فتح شروع ہوئی ہے، بعض پہلوؤں سے یہ قرآن مجید کی خاص اہمیت رکھنے والی سورتوں میں سے ہے، اس کے مضامین سے آپ حضرات کو بھی اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس سورت کا ایک خاص پس منظر ہے جس کو کسی قدر تفصیل سے بیان کر دینا ضروری ہے۔

سورت کا پس منظر

آپ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت و رسالت کے

منصب پر فائز ہونے کے بعد ۱۳ سال تک مکہ معظمہ ہی میں رہے اور کفار و مشرکین کی طرف سے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتے رہے اور برابر توحید کی اور دین حق کی دعوت دیتے رہے، جن لوگوں کے دلوں میں کچھ بھی نیکی اور سعادت تھی انہوں نے دیر سویر آپ کی دعوت کو قبول کرلیا اور ایمان لے آئے۔ اُس کے بعد مکہ میں وہی لوگ رہ گئے جنہوں نے اپنے دلوں کے دروازے توحید کے پیغام اور دین حق کی دعوت کے لئے بند کر لئے اور کفر و شرک ہی پر قائم رہنے کا قطعی فیصلہ کرلیا اور آپ کی دعوت توحید کے اس درجہ میں دشمن ہوگئے کہ آپ کی زندگی ہی کو ختم کردینے کی سازشیں اور منصوبے بنانے لگے۔ اس مرحلہ پر آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے اور اسی کو اپنی دعوت کا مرکز اور وطن بنالینے کا حکم ملا۔ چنانچہ آپ مکہ معظمہ سے ترک وطن کرکے مدینہ ہجرت فرما گئے، اور جو لوگ آپ کی دعوت قبول کر چکے تھے اور ایمان لے آئے تھے وہ سب بھی۔ سوا ان لوگوں کے جو کسی وجہ سے مجبور و معذور تھے۔ ہجرت کرکے مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔ یہ واقعہ نبوت کے تیرہویں سال پیش آیا۔ اس ہجرت کی وجہ سے گھر بار چھوٹا، لوگوں کے کاروبار ختم ہوئے عزیز و اقارب چھوٹے اور وہ سب نقصانات اور مصائب اٹھانے پڑے جو دیس سے بے دیس اور گھر سے بے گھر ہونے کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ لیکن حضور ﷺ اور آپ کے خاص اصحاب کے لئے سب سے بڑا روحانی صدمہ اور گویا دل کا زخم یہ تھا کہ ''بیت اللہ'' اور ''قبلۂ ابراہیمی'' چھوٹا۔ یقیناً آپ کے قلب و روح میں اس کی شدید خواہش اور تمنا رہی ہوگی کہ اللہ وہ دن لائے کہ مکہ معظمہ جاکر حج یا عمرہ کریں، بیت اللہ کا طواف نصیب ہو۔ صورتحال یہ تھی کہ اہل مکہ اگرچہ حج یا عمرہ سے کسی دشمن کو بھی نہیں روکتے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ سے اُن ظالموں کو ایسی دشمنی تھی کہ آپ کے لئے وہ کسی طرح اس کے روادار نہیں تھے کہ آپ حج یا عمرہ کے لئے مکہ آئیں اور بیت اللہ کا طواف کریں۔ ۵۔ ۶ سال اسی حال میں گزر گئے۔

ہجرت کے چھٹے سال آپ ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ اپنے اصحاب و رفقا کے ایک بڑے مجمع کے ساتھ عمرہ کے لئے مکہ معظمہ گئے ہیں اور وہاں آپ نے امن و اطمینان کی حالت میں قاعدہ کے مطابق عمرہ کیا ہے اور عمرے سے فارغ ہوکر آپ نے اور آپ کے اصحاب و رفقا نے حلق یا قصر کرایا ہے، جو عمرے کا آخری اور اختتامی عمل ہوتا ہے۔ آپ نے

صحابہ کرام کے سامنے اپنے اس خواب کا تذکرہ فرمایا۔ اس کو سن کر دلوں میں عمرے اور بیت اللہ کی زیارت وطواف کے شوق کی آگ بھڑک گئی۔ اور چونکہ خواب رسول اللہ ﷺ کا تھا جس کے "سچا خواب" ہونے میں شبہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے صحابہ کرام نے عرض کیا کہ حضرت عمرے کا ارادہ فرمالیں اور ہم خدام بھی ساتھ ہوں گے۔ غالباً فرط شوق میں کسی کا بھی ذہن اس طرف نہیں گیا کہ خواب میں اس کا کوئی اشارہ نہیں تھا کہ یہ عمرہ ابھی اسی مہینے اور اسی سال ہوگا، بلکہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ اِدھر کسی کا ذہن نہ جائے اور خواب کی بنیاد پر عمرہ کے لئے ابھی سفر ہو اور وہ واقعات پیش آئیں جو پیش آئے اور بغیر عمرہ کئے بظاہر ناکام واپس آنا پڑے اور پھر یہ ظاہری ناکامی عظیم فتوحات اور برکات کا وسیلہ بنے، جیسا کہ ظہور میں آیا۔

بہر حال اس خواب نے دلوں میں عمرے کے لئے مکہ معظمہ کے سفر کا شوق اور تقاضا پیدا کردیا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا فیصلہ فرمالیا، اور چونکہ اس کا اندیشہ بہر حال تھا کہ مشرکین مکہ مزاحمت کریں اس لئے آپ نے مناسب سمجھا کہ جتنے زیادہ لوگ آپ کے ساتھ چل سکیں چلیں، تاکہ تعداد کی کثرت سے مشرکین مرعوب ہوجائیں، کوئی شرارت نہ کریں اور جنگ وقتال کی نوبت نہ آئے۔ چنانچہ آپ نے منادی کرادی کہ جو اہل ایمان چل سکتے ہوں عمرے کے لئے ہمارے ساتھ چلیں۔ قریباً ڈیڑھ ہزار مخلص صحابہ کی جماعت تیار ہوگئی، اور جن کے دلوں میں نفاق تھا وہ جنگ کے خطرہ سے سفر میں ساتھ نہیں ہوئے۔

مدینہ منورہ سے ۵-۶ میل کے فاصلہ پر ایک مقام "ذوالحلیفہ" ہے، جہاں سے حج یا عمرے کے واسطے جانے والوں کو احرام باندھ لینے کا حکم ہے۔ یہاں پہنچ کر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے تمام اصحاب ورفقاء نے احرام باندھا اور مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے، ساتھ میں قربانیوں کے اونٹ بھی تھے جن کی گردنوں میں اس وقت کے رواج کے مطابق ایسے پٹے ڈال دیے گئے تھے جو اس بات کی علامت تھے کہ یہ وہ اونٹ ہیں جو حج یا عمرہ کرنے والے بیت اللہ پر لے جاکر اللہ کے حضور میں قربان کرتے ہیں، جنگ کا سامان بھی ساتھ نہیں لیا گیا تھا تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ہم جنگ کے ارادے سے آرہے ہیں اور یہی چیز مشرکین کے لئے شرارت کا بہانہ بن جائے صرف تلواریں ساتھ تھیں جو میانوں میں بند تھیں (اور اُس زمانہ میں ہر مسافر تلوار ساتھ رکھنا ضروری سمجھتا تھا)

بہر حال یہ قافلہ عمرے کی نیت سے مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوا، جب مکہ والوں کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے جمع ہو کر طے کیا کہ ہم ان کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے اور اس کیلئے اگر جنگ کرنی پڑی تو ہم جنگ کریں گے خواہ خون کی ندیاں بہہ جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش مکہ کے اس فیصلہ کی اطلاع ہوگئی، آپ نے مکہ معظمہ سے قریباً ۱۵ میل پہلے حدیبیہ کے مقام پر قیام فرمایا اور ایک آدمی یہ پیغام دے کر اہل مکہ کے پاس بھیجا کہ ہم صرف عمرہ کیلئے آئے ہیں اس کے سوا ہماری کوئی غرض نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے قاصد کو بھی پکڑ لیا۔ جب اُس کی واپسی میں زیادہ دیر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو اپنا خاص سفیر اور نمائندہ بنا کر بھیجا، انہوں نے بھی قریش کو اطمینان دلانے کی پوری کوشش کی، لیکن وہ اپنی ضد اور ہٹ پر قائم رہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہم نے اجازت دی اور یہ لوگ عمرہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سارے ملک میں یہ سمجھا جائے گا کہ ہم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکے اور ان سے دب گئے۔ بہر حال اس خیال سے انہوں نے حضرت عثمانؓ کی بات بھی نہیں مانی، البتہ ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی بلکہ عزت واحترام کا معاملہ کیا اور یہ پیش کش کی کہ اگر آپ چاہیں تو بیت اللہ کا طواف کر سکتے ہیں، حضرت عثمانؓ نے کہا میں اس وقت تک طواف نہیں کروں گا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہ کریں۔

حضرت عثمانؓ نے قریش کے مختلف سرداروں سے ملاقاتیں کیں اس کے لئے ان کو مکہ میں ٹھہرنا پڑا، اِس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے ذمہ یہ کام بھی کیا تھا کہ مکہ میں مجبور و معذور قسم کے جو مسلمان ہیں، ہجرت نہیں کر سکے ہیں اور مشرکین کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھا رہے ہیں، اُن سے مل کر اُن کو تسلی دیں اور ان کو یہ پیام پہنچا دیں کہ انشاء اللہ جلدی ہی ان کی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی وہ صبر و استقامت سے کام لیں۔ اس کام کی وجہ سے بھی حضرت عثمانؓ کو وہاں ایک دو دن ٹھہرنا پڑا۔ حضرت عثمانؓ کی واپسی میں اس دیر کی وجہ سے فکر و تشویش پیدا ہوئی۔ اسی حالت میں یہ افواہ کسی طرح پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ مکہ میں شہید کر دئے گئے، مسلمانوں پر اس کا جو اثر پڑنا چاہئے تھا وہ پڑا اور پوری جنگی فضا پیدا ہوگئی، اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام حاضرین صحابہ سے جہاد اور اس میں ثابت قدمی کی بیعت لی۔ ہر ایک نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر عہد کیا کہ اگر جہاد کی نوبت آئی تو زندگی کی آخری سانس تک جنگ کریں گے اور خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔ (بعد میں حضرت عثمانؓ

بخیریت واپس آ گئے اور معلوم ہوا کہ ان کی شہادت کی افواہ غلط اور بے اصل تھی)۔ قریش کو جب اس صورت حال کی خبر پہنچی تو وہ مرعوب اور خوف زدہ ہو گئے اور اُن کی طرف سے صلح کی بات چلی۔ صلح کی گفتگو کے لئے اُن کے نمائندے آئے، انہوں نے ایسی شرطیں پیش کیں جو بظاہر مسلمانوں کی شکست کے مرادف تھیں۔ ان میں ایک شرط یہ تھی کہ اس وقت آپ لوگ بغیر عمرہ کئے اور بغیر مکہ میں داخل ہوئے یہیں سے واپس ہو جائیں اور اگلے سال عمرے کے لئے آئیں ہم اس وقت تین دن کے لئے شہر خالی کر دیں گے تا کہ کسی تصادم کا امکان ہی نہ رہے۔ (ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ شرط سخت ناگوار تھی)

دوسری شرط یہ تھی کہ دس سال تک فریقین میں سے کوئی جنگ نہ کرے۔ اس مدت میں اگر مکہ کا کوئی شخص اسلام قبول کر کے مدینہ جائے تو مکہ والوں کے مطالبہ پر مسلمان اس کو واپس کر دیں، اور اگر مدینہ سے کوئی مسلمان مکہ آ جائے تو اہل مکہ اس کو واپس کرنے کے پابند نہیں۔

بظاہر یہ دونوں شرطیں بڑی دھاندلی کی اور مسلمانوں کے لئے سخت ذلت آمیز تھیں لیکن قریش کے نمائندے نے اِن شرطوں پر اصرار کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سفر چونکہ عمرے کی نیت سے کیا تھا اس لئے اور اس واسطے بھی کہ جنگ ہونے کی صورت میں اللہ کے حرم کی بے حرمتی کا اندیشہ تھا، حضور ﷺ جنگ سے بچنا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی آپ کے قلب میں یہ ڈالا گیا کہ جنگ سے بچنے کے لئے یہ شرطیں بھی قبول کر لی جائیں اور اس بارہ میں آپ کو شرح صدر ہو گیا کہ اسی میں خیر ہے تو آپ ﷺ نے یہ سب شرطیں قبول فرمالیں۔ حضرت عمرؓ اور بہت سے دوسرے صحابہؓ کو بھی یہ صلح اس وقت ہضم نہیں ہو سکی اور ان شرطوں میں مسلمانوں کے لئے خیر اور منفعت کے جو پہلو تھے جذبات کی شدت میں اُن کی طرف ان حضرات کی نظر نہیں گئی، انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ جب ہم حق پر ہیں تو اِن کافروں مشرکوں سے دب کر ایسی ذلت آمیز شرطوں پر کیوں صلح کریں، کیوں نہ تلوار سے فیصلہ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ ورسولہٗ اعلم'' (یعنی اونچ نیچ اور اچھائی برائی کو اللہ ورسول زیادہ جانتے ہیں۔)

بہر حال انہی شرائط پر صلح ہو گئی اور آپ ﷺ نے وہیں احرام ختم کر کے مدینہ واپسی کا ارادہ فرمالیا اور صحابہؓ کو حکم دیا کہ سب لوگ حلق یا قصر کرا کے احرام ختم کر دیں اور یہیں قربانیاں کر دی جائیں، انشاء اللہ صلح نامہ کے مطابق اگلے سال آ کے عمرہ کریں گے۔ لیکن عام صحابہؓ جو

یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ صلح دب کر ہوئی ہے اور ہم نے اِن کافروں کے مقابلہ میں ذلت قبول کی ہے حالانکہ ہم اس پوزیشن میں تھے کہ تلوار سے ان کافروں کا دماغ درست کر دیتے۔ وہ ایسے غمزدہ اور ایسے ماؤف تھے کہ اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اُم المومنین حضرت اُم سلمہؓ جو اس سفر میں حضور ﷺ کے ساتھ تھیں انہوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ پہلے آپ ﷺ خود حلق کرا کے احرام اتار دیں اور قربانی کر دیں، آپ کو دیکھ کر سب کرنے لگیں گے، پھر ایسا ہی ہوا حضور ﷺ کو حلق کرا کے احرام ختم کرتا دیکھ کر سب حلق یا قصر کرانے لگے، اور اس کے بعد پورا قافلہ مدینہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ ہے اس سورت کا پس منظر اور شانِ نزول۔

بظاہر شکست میں فتح در فتح

حدیبیہ سے واپسی کے اِس سفر ہی میں یہ "سورہ فتح" نازل ہوئی جس میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ان اصحاب و رفقاء کو جو اس سفر میں ہمرکاب تھے وہ عظیم بشارتیں سنائی گئی ہیں جو غالباً قرآن مجید کی کسی دوسری سورت میں نہیں سنائی گئی ہیں۔ اس کی پہلی آیت ہے "اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاً مُّبِیْناً" (ہم نے آپ کو ایک فتح مبین عطا فرمائی) اس آیت میں حدیبیہ کی اس صلح کو جو بظاہر مغلوبانہ اور ذلت آمیز صلح تھی اور جس کو حضرت عمرؓ اور دوسرے بہت سے صحابہؓ ہضم نہیں کر سکے تھے "فتح مبین" قرار دیا گیا ہے۔ اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا اور سب کی سمجھ میں آ گیا بلکہ سب نے گویا آنکھوں سے دیکھ لیا کہ یہ "صلح حدیبیہ" اسلام اور مسلمانوں کے حق میں فتح مبین تھی۔ اس میں مسلمانوں کے لئے فتح کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ قریش نے جو عرب کی سب سے بڑی طاقت اور اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے دشمن نمبر ایک تھے اور آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی جماعت کو "قومی مجرم" اور گردن زدنی سمجھتے تھے انہوں نے اس صلح نامہ میں مسلمانوں کو ملک کی ایک حریف طاقت اور حکومت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ اور بیت اللہ پر بھی ان کا حق تسلیم کر لیا اور یہ تک قبول کر لیا کہ اگلے سال جب رسول اللہ ﷺ اور مسلمان عمرہ کو آئیں گے تو وہ تین دن کے لئے شہر مکہ کو خالی کر دیں گے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ دس سال تک کے لئے ناجنگ معاہدہ کی شرط خود انہوں نے رکھی، جو رسول اللہ ﷺ کی عین مراد تھی، اس ناجنگ معاہدہ کے نتیجہ میں مسلمانوں کو قریش مکہ کی طرف سے اطمینان

ہو گیا اور دعوت اسلام کے راستہ کی اس وقت کی سب سے بڑی رکاوٹ ختم ہو گئی۔ معاہدہ میں یہ شرط بظاہر بڑی مغلوبانہ تھی کہ مکہ کا کوئی آدمی اگر اسلام قبول کر کے مدینہ چلا جائے گا تو قریش کے مطالبہ پر رسول اللہ ﷺ اس کو واپس کرنے کے ذمہ دار ہوں گے اور اگر مدینہ سے کوئی مسلمان مکہ چلا آئے گا تو قریش اس کی واپسی کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ لیکن فی الحقیقت یہ شرط بھی سراسر مسلمانوں کے حق میں تھی، مکہ کا جو شخص اسلام قبول کر کے مدینہ پہنچ جاتا تو حضور ﷺ کی صحبت، آپ کی تعلیم و تربیت اور وہاں کے ایمانی ماحول میں چند دنوں میں اس کا ایمان کامل اور اس کی زندگی اسلامی زندگی کا نمونہ بن جاتی اور دعوت کی روح اس میں سرایت کر جاتی۔ پھر جب اُس کو قریش کے مطالبہ پر مکہ واپس کیا جاتا تو وہ مکہ میں اسلام کا داعی اور اسلامی زندگی کا نمونہ ہوتا۔ اور مدینہ سے جو مسلمان مکہ جاتا اور قریش اس کو روک لیتے مدینہ واپس نہ آنے دیتے، تو وہ بھی وہاں دین حق کا داعی اور اسلام کا چلتا پھرتا پیغام ہوتا۔ اور اگر وہ منافق ہوتا تو مدینہ سے اُس کا چلا جانا ہی اچھا تھا۔ ''خس کم جہاں پاک''۔

پھر اس صلح اور ناجنگ معاہدہ کے نتیجہ میں جو امن و امان کی فضا قائم ہوئی اس کی وجہ سے اسلام کی دعوت اور اس کی قبولیت کی رفتار بہت تیز ہو گئی، اور اُن لوگوں کے لئے بھی جو قریش مکہ کے لیڈر اور رسول اللہ ﷺ اور دعوت اسلام کے سخت ترین دشمن تھے، صلح کی ٹھنڈی فضا میں ٹھنڈے دل سے معاملہ پر غور کرنے کا امکان پیدا ہو گیا، اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ عمرو بن العاصؓ نے جو قریش کی سیاست کے درجہ اوّل کے ماہر تھے اور خالد بن الولیدؓ نے جو ایک ماہر فوجی کمانڈر تھے، اس صلح ہی کے نتیجہ میں اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور خود مدینہ منورہ حاضر ہو کر ایمان لے آئے اور اپنی ساری صلاحیتیں بلکہ زندگی ہی اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ یہی خالد بن الولیدؓ ہیں جن کی قیادت میں خلافت صدیقی میں شام کا بڑا علاقہ فتح ہوا اور یہی عمرو بن العاصؓ ہیں جن کی قیادت میں حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مصر اسلامی قلمرو میں شامل ہوا۔

صلح حدیبیہ کے نتیجہ میں اسلام کی دعوت اور قبولیت کی رفتار کس قدر تیز ہو گئی، اس کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۶ھ ہجری میں جب آپ ﷺ نے عمرے کے لئے سفر کیا تھا (جس کے لئے آپ ﷺ نے منادی بھی کرائی تھی کہ جو چل سکتا ہو ہمارے ساتھ چلے) اس وقت آپ کے ساتھ جانے والوں کی تعداد چودہ، پندرہ سو کے درمیان تھی، لیکن اس کے دو ہی سال

بعد ۸ھ میں جب قریش مکہ نے ناجنگ معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے عہد شکنی کی اور آپ ﷺ نے مکہ معظمہ کو بھی اسلامی قلمرو میں شامل کر لینے کے لئے مکہ کی طرف کوچ فرمایا تو اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ دس ہزار کے قریب صحابہ کرام تھے۔ یہ سب ''صلح حدیبیہ'' کے نتائج تھے، اس لحاظ سے یہ صلح ہی ''فتح مبین'' تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ متعدد صحابہ کرامؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ تو ''فتح مکہ'' کو ''فتح مبین'' سمجھتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک ''صلح حدیبیہ'' ''فتح مبین تھی۔

سورۂ فتح کی اس پہلی آیت ''اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحاً مُّبِیۡناً'' کی دوسری تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ ''فتح مکہ'' کی پیشین گوئی ہے۔ گویا جو صحابہ کرام ''صلح حدیبیہ کے واقعات سے غمزدہ تھے اور اس کو اپنی ذلت آمیز شکست سمجھ رہے تھے، اُن کے زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کے لئے یہ آیت حدیبیہ سے واپسی میں نازل ہوئی اور بطور پیشین گوئی کے ان کو بشارت دی گئی کہ اس صلح کے غم کو بھول جاؤ ہم نے تمہارے لئے ''فتح مبین'' یعنی ''فتح مکہ'' مقدر کر دی ہے اور اس کا تقدیری فیصلہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ دو ہی سال کے بعد ۸ھ میں اُس کا ظہور ہو گیا اور مکہ معظمہ اس وقت کی اسلامی مملکت کا جز بن گیا۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ ''صلح حدیبیہ'' ہی سے ''فتح مکہ'' کی راہ ہموار ہوئی، گویا صلح حدیبیہ فتح مکہ کی تمہید تھی، اس بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ''صلح حدیبیہ'' سے لے کر ''فتح مکہ'' تک جو کچھ ہوا وہ سب ''فتح مبین'' کا مصداق ہے۔ اور بعد کی تمام اسلامی فتوحات کا دروازہ بھی اسی سے کھلا ہے۔

چار عظیم انعامات کی بشارت

اس کے بعد والی دوسری اور تیسری آیتوں میں اس ''فتح مبین'' کے بعد رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہونے والے چار عظیم ترین انعامات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ یہ انعامات گویا صلح حدیبیہ ہی کی برکات اور ثمرات ہیں۔ پہلا انعام کامل مغفرت کا پروانہ جس کو ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے ''لِیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ'' دوسرا انعام، نعمت کا اتمام اور اس کی تکمیل۔ ارشاد فرمایا گیا ہے ''وَیُتِمَّ نِعۡمَتَہٗ

عَلَیْکَ"۔ تیسرا انعام، صراط مستقیم پر چلانے کی ضمانت۔ فرمایا گیا ہے۔ "وَیَھْدِیَکَ صِرَاطاً مُّسْتَقِیْماً"۔ چوتھا انعام، اعلاء کلمۃ اللہ کی جد و جہد میں دشمنوں کے مقابلہ میں ناقابل شکست نصرت وحمایت۔ فرمایا گیا ہے "وَیَنْصُرَکَ اللّٰہُ نَصْراً عَزِیْزاً"

مغفرت سب سے بڑا انعام

یہاں سب سے پہلے اس انعام کا ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اوّل سے آخر تک آپ کی تمام تقصیرات کی مغفرت کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ اگر چہ کامل مغفرت کے اس انعام کا ظہور دوسرے تمام انعامات کے بعد عالم آخرت میں ہونے والا ہے اور اس کا اصل تعلق عالم آخرت ہی سے ہے لیکن چونکہ وہ سب سے بڑا انعام ہے اور رسول اللہ ﷺ کے لئے اس کی اطلاع سب سے زیادہ خوش کن اور لذت بخش بشارت تھی اس لئے یہاں اس کا ذکر سب سے پہلے فرمایا گیا، کسی بھی صاحب ایمان اور خدا شناس بندے کے لئے اس سے بڑی کوئی نعمت اور خوشخبری نہیں ہو سکتی کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامل مغفرت کی خوشخبری سنا دی جائے۔ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ سے وہ سب کچھ مانگتے تھے جو مانگنا چاہئے جیسا کہ آپ کی ان دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے جو حدیث کی کتابوں میں مروی ہیں، لیکن آپ ﷺ کی سب سے بڑی مراد جس کو آپ اللہ تعالیٰ سے سب زیادہ مانگتے تھے وہ یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کامل مغفرت فرما دے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ دن رات میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں دفعہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگتے تھے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ حدیث آپ کے سامنے بار بار ذکر کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اتنی کثرت سے استغفار فرماتے تھے کہ آپ کی ایک ایک مجلس اور ایک ایک نشست میں میں نے سو سو تک تعداد گنی ہے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ وظیفہ کے طور پر یہ استغفار پڑھتے تھے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ مجلس میں اثنائے گفتگو میں زبان مبارک پر سو سو دفعہ استغفار کا کلمہ آتا تھا۔

بہر حال جو شخص حدیث کی کتابوں کے ذریعہ حضور ﷺ کے حالات سے کچھ بھی واقف ہے وہ جانتا ہے کہ آپ کی سب سے بڑی مراد جس کو آپ دن رات میں سیکڑوں ہزاروں دفعہ رو رو کے اللہ تعالیٰ سے مانگتے اور نماز کے رکوع اور سجدوں میں بھی جس کی دعا کرتے تھے وہ یہی تھی کہ آپ کی کامل مغفرت ہو جائے۔

دراصل آپ کا یہ حال آپ کے کمالِ معرفت کی دلیل ہے، جس بندے کو اللہ تعالیٰ کی جتنی معرفت ہوگی وہ اس کے قہر وجلال سے اتنا ہی لرزاں وترساں اور اپنے بارے میں اتنا ہی فکرمند رہے گا۔ قریباں را بیش بود حیرانی "رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "اَنَا اَعْلَمُکُمْ بِاللّٰہِ وَاَخْشَاکُمْ "(یعنی مجھے اللہ تعالیٰ کے بارہ میں تم سب سے زیادہ علم ہے اور میں تم سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں) اس لیے آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے بڑا انعام اور سب سے بڑی بشارت یہی ہوسکتی تھی کہ آپ کو اس کی اطلاع دے دی جائے کہ آپ کی کامل مغفرت کا فیصلہ فرمادیا گیا "لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَاتَأَخَّرَ" کے ذریعہ آپ کو یہی خوشخبری سنائی ہے۔

اس درس ہی کے سلسلہ میں یہ بات بار بار ذکر میں آچکی ہے کہ اہل حق کا عقیدہ ہے کہ تمام انبیاءؑ معصوم ہیں، اور معصوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے کوئی ایسا فعل واقع نہیں ہوتا جو اللہ کی نافرمانی کی حد میں آتا ہو اور جو شریعت کی رو سے گناہ ہو۔ لیکن ان سے بعض اوقات ایسی باتیں سرزد ہوجاتی ہیں جو گناہ اور معصیت کی حد میں تو نہیں آتیں لیکن ان کی شان اور ان کے بلند مقام کے مناسب نہیں ہوتیں ان کو "زلّات" (لغزشیں) کہا جاتا ہے مثلاً رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ اپنی کریم النفسی سے بعض منافقوں کے جھوٹے عذر قبول فرمالئے جو قبول نہیں فرمانے چاہیے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی "عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ"(۱)
یا مثلاً وہ واقعہ کہ آپ ایک دفعہ قریش مکہ کے سرداروں سے کچھ دینی گفتگو فرمارہے تھے، اس درمیان میں ایک مخلص غریب صحابی عبداللہ ابن ام مکتوم جو نابینا بھی تھے آگئے اور انھوں نے آپ ﷺ کو اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا، حضور ﷺ کو ان کی یہ بات اس وقت ناگوار ہوئی اور آپ ﷺ نے ان کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی گناہ کی بات نہیں تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ رویہ آپ ﷺ کے شایان شان نہیں تھا چنانچہ اس پر پکڑ ہوئی اور سورۂ عبس کی آیتیں نازل ہوئیں۔ یا مثلاً غزوہ بدر میں گرفتار ہونے والے مشرکین کو آپ ﷺ نے فدیہ لے کر چھوڑ دینا مناسب سمجھا اور یہی فیصلہ فرمادیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی کوئی گناہ نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ مناسب نہیں تھا، تو اجتہاد کی اس غلطی پر عتاب ہوا۔ الغرض اس طرح کی لغزشیں انبیاءؑ سے ہوجاتی ہیں اور رسول اللہ ﷺ سے بھی ہوئی ہیں، اور اپنے مقام قرب کی

---

(۱) سورۂ توبہ آیت ۴۳

وجہ سے اس طرح کی باتوں کو آپ ﷺ گویا اپنی تقصیرات اور اپنے ''گناہ'' سمجھتے تھے اور آپ ﷺ کا قلب مبارک ان سے اتنا متاثر اور متفکر ہوتا تھا جتنا ہم اپنے موٹے موٹے گناہوں سے بھی متفکر نہیں ہوتے تو ''لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ'' میں اسی طرح کی لغزشوں، اول سے آخر تک تمام لغزشوں کی مغفرت کی بشارت سنا کر آپ کو مطمئن کیا گیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ کسی بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے بڑا انعام یہی ہوسکتا ہے کہ اس کی مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے۔ ''مغفرت'' میں اللہ تعالیٰ کی رضا بھی آ گئی اور سب کچھ ہی آ گیا۔ پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ہر بندے کی مغفرت اس کے درجہ کے مطابق ہے تو حضور ﷺ کی مغفرت کا درجہ یقیناً سب سے اعلیٰ و بالا ہے۔

بہر حال ان آیتوں میں پہلی خوشخبری آپ کو یہی سنائی گئی کہ آپ کی اول سے آخر تک سب تقصیرات کی مغفرت کا فیصلہ آپ کے اللہ نے فرما دیا ہے۔ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس انعام کی خبر پا کر اس کے شکر میں آپ نے عبادت کی مقدار بہت بڑھا دی تھی یہاں تک کہ رات کی نماز میں طولِ قیام کی وجہ سے آپ کے پائے مبارک پر ورم آ جاتا تھا۔ جب آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ عبادت میں اتنی مشقت کیوں برداشت فرماتے ہیں، آپ کے لیے تو آپ کے اللہ نے کامل مغفرت کا فیصلہ فرما دیا ہے اور اس کی اطلاع بھی دیدی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا ''أَفَلَا أَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا'' (کیا میں اپنے کریم رب کے اس انعام واحسان کا شکر گزار بندہ نہ بنوں) (۱)

میں عرض کر رہا تھا کہ کامل مغفرت چونکہ سب سے بڑا انعام تھا اس لیے اس کا ذکر سب سے پہلے کیا گیا اگرچہ اس کا ظہور سب کے بعد آخرت میں ہوگا۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر فرمایا گیا ''وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ''.

نعمتِ وحی کی تکمیل کا وعدہ

کامل مغفرت کے بعد دوسرے درجہ کا سب سے بڑا انعام اور سب سے بڑی خوشخبری رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ ہوسکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو یہ اطلاع دیدی جائے

(۱) ابن کثیر بحوالہ بخاری و مسلم و مسند احمد وغیرہ

اور اطمینان دلادیا جائے کہ وحی کے ذریعہ جو نعمت آپ پر نازل ہو رہی ہے جس کا سلسلہ آغاز نبوت سے شروع ہوا تھا اس کی تکمیل ہوگی اور اس تکمیل و اتمام تک اس کا سلسلہ جاری رہے گا، ''وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ'' کے ذریعہ یہی اطلاع دی گئی ہے۔ اس میں اس طرف بھی کھلا اشارہ ہے کہ اس نعمت کی تکمیل تک آپ کو اس دنیا میں رکھا جائے گا۔ چنانچہ ان آیتوں کے نزول کے بعد اس نعمت کا سلسلہ برابر جاری رہا، زندگی کے ہر شعبہ کے بارہ میں آسمانی وحی کے ذریعہ احکام وقوانین نازل ہوتے رہے اور جب اس نعمت کی تکمیل ہوگئی تو ۴ سال کے بعد حجۃ الوداع میں یہ آیت نازل ہوئی ''اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْناً'' اور اس کے ذریعہ اس نعمت عظمیٰ کی تکمیل و اتمام کی خوشخبری سنادی گئی۔

صراط مستقیم کی ضمانت

کامل مغفرت اور اتمامِ نعمت کے بعد تیسرا سب سے بڑا انعام اور سب سے بڑی خوشخبری رسول اللہ ﷺ کے لئے یہ ہوسکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطمینان دلادیا جائے کہ جس صراط مستقیم پر چلنے کا اس کی طرف سے حکم ہے اور جس پر اُس کی رضا اور بندے کی نجات و فلاح کا دارومدار ہے، استقامت کے ساتھ اُس پر چلتے رہنے کی توفیق برابر ملتی رہے گی اور نفس وشیطان کے شرور سے ہمیشہ حفاظت ہوتی رہے گی۔

اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم ہے، جس میں اللہ کی حمد اور اقرار توحید کے بعد ''صراط مستقیم کی ہدایت'' ہی کی دعا کی جاتی ہے بلکہ وہی گویا حرف مطلب ہے۔ دوسری کوئی بھی دعا اس طرح لازمی نہیں کی گئی ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ بھی نماز کی ہر رکعت میں اور نماز کے علاوہ بھی اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے ''صراط مستقیم کی ہدایت'' کی استدعا کرتے تھے۔ تو ''کامل مغفرت'' اور ''اتمام نعمت'' کے بعد رسول اللہ ﷺ کے لئے عظیم انعام اور تیسری مسرت بخش بشارت یہی ہوسکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو مطمئن کردیا جائے کہ آپ کو برابر صراط مستقیم پر چلتے رہنے کی توفیق ملتی رہے گی اور آپ اس صراط مستقیم پر چلتے ہوئے ہمارے پاس پہنچ جائیں گے۔ ''وَيَهْدِيَكَ صِرَاطاً مُّسْتَقِيْماً'' میں کو یہی بشارت سنائی گئی ہے۔ ہم اور آپ اس کا اندازہ

نہیں کر سکتے کہ اس بشارت سے رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک کو کیسا سکون ہوا ہوگا۔

اس کے بعد چوتھے انعام کی خوشخبری اِن الفاظ میں سنائی گئی ہے "وَیَنْصُرَکَ اللّٰہُ نَصْراً عَزِیْزاً". اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی طے فرمادیا ہے کہ اب آپ کی ایسی مدد فرمائی جائے گی جو ناقابل شکست ہوگی اور اس کے بعد آپ کے لئے فتوحات کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ بظاہر واقعہ حدیبیہ کے بعد ہونے والی فتوحات اور خاص کر فتح مکہ کی خوش خبری ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ آیتیں حدیبیہ والے سفر سے واپسی میں نازل ہوئی ہیں۔ جیسا کہ تفصیل سے بیان ہو چکا ہے آپ نے یہ سفر عمرہ کے لئے کیا تھا، لیکن مشرکین نے آپ کو مکہ معظمہ میں داخل ہی نہیں ہونے دیا اور بغیر عمرے کے آپ کو واپس آنا پڑا۔ اگرچہ اس میں بڑی مصلحتیں اور حکمتیں تھیں جن کا بعد میں ظہور ہوا، لیکن اُس وقت تو آپ کا اس طرح واپس ہونا بظاہر شکست بلکہ ذلت آمیز شکست کی صورت تھی اور اس وجہ سے آپ کے بہت سے اصحاب و رفقاء بھی اس سے سخت رنجیدہ تھے۔ یہ آیتیں اسی سفر سے واپسی میں انہی حالات میں نازل ہوئیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتلایا گیا کہ یہ صلح فی الحقیقت "فتح مبین" ہے۔ اور اسی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے لئے چار عظیم انعامات کا اعلان فرمایا گیا جن میں آخری انعام یہ "نصر عزیز" کی خوشخبری ہے۔ یعنی ایسی مدد جس کو کوئی طاقت شکست نہ دے سکے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بظاہر واقعہ حدیبیہ کے بعد آنے والی فتوحات کی اور خاص کر فتح مکہ کی خوش خبری ہے، گویا اس آیت میں آپ کو اور آپ کے رفقاء کو بشارت سنائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اب تمہاری ایسی مدد کرنے کا فیصلہ فرمالیا ہے جس کو تمہاری کوئی دشمن طاقت شکست نہیں دے سکے گی۔ اُس وقت کی خاص دشمن طاقت مشرکین مکہ ہی کی طاقت تھی، انہوں نے ہی آپ کو عمرہ کرنے سے روکا تھا۔ اس آیت میں گویا ضمانت دے دی گئی کہ اب تمہاری ایسی مدد ہوگی کہ دشمن تمہارا راستہ نہ روک سکے گا۔ میرا خیال ہے کہ اُس وقت کے حالات میں یہ اس کی اطلاع اور بشارت تھی کہ مکہ معظمہ بھی تمہارے زیر اقتدار و انتظام آجائے گا اور کوئی طاقت تمہارا راستہ نہیں روک سکے گی۔ چنانچہ دو سال کے بعد ایسا ہی ہوگیا۔ اور اُس سے پہلے صلح حدیبیہ کے فوراً ہی بعد خیبر بہت سہولت سے فتح ہوگیا یہ بھی "وَیَنْصُرَکَ اللّٰہُ نَصْراً عَزِیْزاً" کا ظہور تھا۔

(درس-۳۷)

واقعہ حدیبیہ کے سلسلہ میں

مومنین صادقین پر ہونے والے خداوندی انعامات

اور جنت وفوز عظیم کی بشارت

منافقین ومشرکین کیلئے عذاب جہنم اور خداوندی غضب ولعنت

خطبہ مسنونہ کے بعد

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ط

هُوَ الَّذِىٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِىْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ط وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ٥ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ط وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ٥ وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ط عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ج وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ط وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ٥ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ٥

(سورۂ فتح آیات ۴ تا ۷)

(ترجمہ) وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر سکینت وطمانیت نازل فرمائی تاکہ ان کے ایمان میں ایمان کی اور زیادتی ہو، اور زمین وآسمان کے سارے لشکر اللہ ہی کے ہیں، اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ تاکہ داخلہ دے ایمان والوں اور ایمان والیوں کو بہشتی باغات میں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ اُن باغات میں ہمیشہ رہیں گے اور تاکہ اُن کے گناہوں کو معاف کردے، اور اللہ کی نزدیک بڑی کامیابی یہی ہے۔ اور تاکہ اللہ سزا دے منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو جو اللہ کے بارہ میں بُرے بُرے گمان رکھتے ہیں، انہی پر بُرا وقت پڑنے والا ہے اور اُن پر اللہ کا غضب ہے اور اللہ کی لعنت ہے اور اُن کے واسطے اس نے جہنم تیار کر رکھا ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ اور اللہ ہی کے ہیں آسمان وزمین کے سارے لشکر، اور اللہ تعالیٰ عزیز وحکیم ہے۔

تفسیر وتشریح

سورہ کی پہلی آیت "اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاً مُّبِیْناً" میں براہ راست رسول اللہ ﷺ کو اور بالواسطہ آپ کے تمام رفقا کو حدیبیہ کے معاہدہ صلح کے "فتح مبین" ہونے کی خوش خبری سنائی گئی تھی۔ پھر اس کے بعد دو آیتوں میں اسی واقعہ حدیبیہ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ پر ہونے والے خصوصی انعامات کا ذکر فرمایا گیا تھا۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا یہ سب انعامات بھی حدیبیہ کے واقعہ ہی کے برکات وثمرات تھے۔ آگے کی اِن آیتوں میں اسی واقعہ ہی کے سلسلہ کے اُن انعامات کا ذکر فرمایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست اِن مومنین مخلصین پر ہوئے جو اس سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے "هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْا اِیْمَاناً مَّعَ اِیْمَانِهِمْ" (اسی اللہ نے مومنین کے دلوں میں سکینت وطمانیت نازل فرمائی تاکہ اُن کی ایمانی کیفیت میں اور ترقی واضافہ ہو)

سکونِ دِل اور شرح صدر کی نعمت

میں نے ذکر کیا تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے عمرے کا ارادہ فرمایا تو چونکہ مشرکین مکہ کی طرف سے مزاحمت کا خطرہ تھا اس لئے آپ نے مناسب سمجھا کہ جہاں تک ہوسکے آپ

کے ساتھ بڑی سے بڑی جمعیت ہوتا کہ قریش، کثرت تعداد سے مرعوب ہو کر مزاحمت سے باز رہیں، اور جنگ کی نوبت نہ آئے اس غرض سے آپ نے عمرے کے اس سفر کے بارے میں اعلان عام کرا دیا کہ اہل ایمان میں سے جو بھی چل سکتا ہو عمرے کے لئے ہمارے ساتھ چلے تو مدینہ منورہ اور آس پاس کے مومنین مخلصین بڑی تعداد میں تیار ہو گئے، لیکن جن لوگوں کے دلوں میں نفاق تھا ابھی حقیقی ایمان ان کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے اس سفر کو خطرے کا سفر سمجھا، اُن کا خیال تھا کہ قریش مکہ ضرور مزاحمت کریں گے اور جنگ ہو کے رہے گی، اور قریش کو اس جنگ میں یہ سہولت حاصل ہو گی کہ وہ اپنے شہر اور اپنے گھروں میں ہوں گے، اُن کے پاس وہ سب کچھ ہو گا جس کی ان کو ضرورت ہو گی اور مسلمان اپنے مرکز اور اپنے شہر مدینہ سے ڈھائی سو میل دور ہوں گے اور ان کے ساتھ زندگی کی اور جنگ کی ضروریات بھی نہ ہوں گی، نتیجہ یہی ہو گا کہ قریش ان سب کا خاتمہ کر دیں گے اور یہ اپنے گھر واپس بھی نہ آ سکیں گے۔ شیطان نے اُن کے دلوں میں یہی ڈالا اور وہ اس سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔ اور مومنین صادقین کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں ایک خاص قسم کا ایمانی اطمینان پیدا فرما دیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بھروسہ کر کے اور راہِ خدا میں پیش آنے والی ہر مصیبت پر دل سے راضی ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ سفر کیا۔ پھر وہاں پہنچ کر جب وہ صورتِ حال سامنے آئی جس کا پہلے تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے اور ایک مرحلہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد پر بیعت لی تو ان سب مومنین صادقین نے پورے قلبی اطمینان اور سرفروشی کی صادق جذبہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی اور عہد کیا کہ اگر قریش کی ضد اور شرارت سے جنگ کی صورت پیدا ہوئی تو اللہ کی راہ میں خون کا آخری قطرہ بھی بہا دیں گے، اللہ کی رحمت سے انہیں یقین تھا کہ اگر یہاں شہید ہو گئے تو اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائے گا اور وہاں زندگی اور لطف و لذت کے وہ سامان ہوں گے جن کا ہزارواں لاکھواں حصہ بھی یہاں نصیب نہیں ہے۔ یہ یقین و اطمینان بھی اُن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا تھا۔ پھر اس کے بعد جب صلح کی بات چیت ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی وہ شرطیں منظور کرنے پر آمادہ ہو گئے جن میں بظاہر اپنی شکست محسوس ہوتی تھی اور اس کی وجہ سے بہت سے صحابہ کی طبیعت اِن شرطوں کے منظور کرنے پر راضی اور مطمئن نہیں تھی لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن شرطوں کو منظور فرما لیا

تو سب نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اللہ نے اُن کے دلوں میں یہ بات ڈال دی کہ جب اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن شرطوں پر صلح کر لی ہے تو پھر اسی میں خیر ہے۔

الغرض اس سفر کے ہر مرحلہ میں ان اہلِ ایمان کے قلوب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینت وطمانیت نازل کی گئی۔ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر قلوب میں سکینت کی کیفیت کا نزول ہی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کے بعد اسی کے نتیجہ میں اس سے بھی بڑی نعمت ان مومنین کو یہ عطا ہوئی کہ اِن کی ایمانی کیفیت میں بہت ترقی ہوئی (لِيَزْدَادُوْا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ) آگے فرمایا گیا ہے "وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا" (آسمان وزمین کے سارے لشکر اللہ ہی کے ہیں اور اللہ علیم وحکیم ہے)

اس عاجز کا خیال ہے کہ آیت کے ان آخری کلمات کے ذریعہ یہ انتباہ دیا گیا ہے کہ اللہ کو اپنی مشیت پوری کرنے اور اپنے دین اور اپنے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے، آسمان وزمین کی ساری طاقتیں اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں وہ جس مخلوق سے چاہے کام لے، چاہے تو آسمان کے فرشتوں سے کام لے، چاہے تو ہواؤں اور آندھیوں سے کام لے، چاہے تو سیلابوں اور طوفانوں سے کام لے، چاہے تو ابابیل جیسے پرندوں اور حقیر سے حقیر مخلوق مچھروں اور جوؤں سے کام لے۔ ایسی صورت میں جن بندوں کو وہ اپنے دین کی نصرت اور اپنے پیغبر کی رفاقت کے لئے استعمال کرتا ہے ان پر اللہ کا فضل واحسان ہے لہٰذا ان کو اللہ علیم وحکیم کے اس کرم واحسان کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمیں کنی
منت شناس از وکہ بخدمت بداشتت

فلاحِ اُخروی کی بشارت

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ...... وَسَاءَتْ مَصِيْرًا"۔

ان دو آیتوں میں بتلایا گیا ہے کہ حدیبیہ کے اس واقعہ میں جو کچھ ہوا (کہ اہلِ ایمان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے سکینت نازل فرمائی اور ان کو اللہ ورسول کی وفاداری کی توفیق ملی اور

اس کے نتیجہ میں اُن کے نور ایمان میں ترقی ہوئی اور دوسری طرف اہل نفاق نے جو منافقانہ روش اختیار کی اور عمرے کے لئے حضور ﷺ کے ساتھ جانے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے اور اللہ کے بارے میں انہوں یہ بدگمانی کی کہ وہ اپنے رسول کی اور ان کے ساتھ جانے والے مومنین مخلصین کی مدد نہیں کرے گا اور اُن کے دشمنوں مشرکین مکہ کو موقع دے دے گا کہ وہ اِن سب کو شہید کر کے دین کا چراغ ہی گل کر دیں۔ اور اسی طرح حدیبیہ کے اس واقعہ میں تیسرے گروہ مکہ کے کفار و مشرکین کا جو عمل و کردار رہا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رفقا کو عمرہ نہیں کرنے دیا اور اللہ کے بارے میں انہوں نے بھی منافقین کی سی بدگمانی کی)

تو اِن دونوں آیتوں میں ان تینوں فریقوں کے کردار و عمل کا آخری انجام اور نتیجہ بیان فرمایا گیا ہے جس کا تعلق عالم آخرت سے ہے اور وہی سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابل فکر مسئلہ ہے کیونکہ آخرت کی زندگی اور وہاں کا ثواب و عذاب دائمی ہے کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

فرمایا گیا ہے "لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ" مطلب یہ ہے کہ مومنین صادقین کے ساتھ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ ہوگا کہ ان کو ایسے بہشتی باغات دئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں جن کی وجہ سے وہ برابر سر و سبز شاداب رہیں گے، وہ باغ کبھی خزاں رسیدہ نہیں ہوں گے سدا بہار ہی بہار رہے گی، اور وہ اِن باغوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یعنی وہاں ان کو دوامی زندگی بھی بخشی جائے گی اور یہ بہشتی باغات بھی کبھی فنا نہیں ہوں گے۔ الغرض جنتی اور جنت اور اس کی ساری نعمتیں اور بہاریں سب کو اللہ تعالیٰ بقائے دوام عطا فرمائے گا۔ اور اُن کے گناہ قصور سب ختم کر دئے جائیں گے سب پر قلم عفو پھیر دیا جائے گا۔ (وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ)۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا" (اور یہ انجام اللہ کے نزدیک "فوز عظیم" ہے یعنی بندے کی بہت بڑی کامیابی ہے) بلاشبہ کسی بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہوسکتی ہے کہ اس کے قصوروں گناہوں پر قلم عفو پھیر دیا جائے، آخرت میں باز پرس بھی نہ ہو، اور اُس کو دوامی زندگی اور سدا بہار جنت عطا فرما دی جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم سب جنت کا نام لیتے ہیں اور اس کا ذکر کرتے ہیں اور سنتے ہیں لیکن جنت اور اس کی نعمتوں بہاروں کا صحیح تصور اور پورا یقین ہم کو نصیب نہیں ہے، اگر وہ نصیب ہو جائے تو اُس کا شوق اور اُس کی طلب وآرزو دوسری تمام چاہتوں اور آرزوؤں پر غالب آ جائے اور یہ بات پوری طرح سمجھ میں آ جائے کہ کسی بندے کو جنت عطا ہونا ہی ''فوز عظیم'' اور سب سے بڑی کامیابی ہے اور اُس سے محرومی سب سے بڑی ناکامی ہے۔

منافقوں اور مشرکوں کا انجام

اس کے آگے والی آیت میں منافقین اور مشرکین کا اُخروی انجام بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

''وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْراً'' مطلب یہ ہے کہ حدیبیہ کے اس واقعہ میں منافق مردوں اور منافق عورتوں کا اور اسی طرح مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کا جو رویہ اور کردار رہا اور اللہ تعالیٰ کے بارہ میں جو انہوں نے بدگمانی کی (جس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے) اس کے نتیجہ میں اُن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ آخرت میں یہ ہوگا کہ وہ ان کو عذاب میں مبتلا کریگا اور ان پر خدا کا غضب ہوگا اور اس کی لعنت ہوگی اور اُن کے لئے اللہ نے جہنم تیار کی ہے جو اللہ کے قہر وجلال کا مظہر اور عذاب گھر ہے اور بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے (وَسَاءَتْ مَصِيْراً)

میں نے جنت کے بارہ میں عرض کیا تھا کہ ہم کو اس کا صحیح تصور اور پورا یقین نصیب نہیں ہے اس وجہ سے اس کی جیسی طلب وآرزو ہونی چاہئے ویسی نہیں ہے۔ بالکل یہی معاملہ جہنم کا ہے اگر اُس کا صحیح تصور اور یقین جیسا کہ ہونا چاہئے حاصل ہو تو ہمارا حال ہرگز یہ نہ ہو جو اب ہے، ہم کبھی اُس کی طرف سے غافل نہ ہوں، اس کے تصور سے دل لرز جایا کرے۔

منافقوں اور مشرکوں کا یہ اُخروی انجام بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے ''وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزاً حَكِيْماً'' بظاہر یہاں آیت کے ان آخری کلمات کا رُخ اُن منافقین اور مشرکین کی طرف ہے جن کے مبتلائے عذاب اور موردِ

لعنت وغضبِ الٰہی ہونے کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اُن کو خبردار کیا جارہا ہے کہ آسمان وزمین کے سارے لشکر اور اس عالمِ کون کی ساری طاقتیں اللہ کے قبضہ میں ہیں وہ مجرموں کو جیسی سزا دینا چاہے اور جو عذاب ان پر نازل کرنا چاہے کرسکتا ہے، کوئی مجرم اس کی گرفت اور پکڑ سے نکل نہیں سکتا، وہ عزیز ہے یعنی زبردست اور ہر طرح کی قدرت رکھتا ہے اور ہر چیز پر اُس کا اقتدار ہے۔ اور ساتھ ہی وہ صاحب حکمت ہے، اس کی صفت حکمت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ اس دنیا کو اُس نے دارالامتحان اور دارالعمل قرار دیا ہے اور ثواب وعذاب کے لئے عالمِ آخرت رکھا ہے۔ منافقین ومشرکین جیسے مجرمین کو یہاں جو آزادی حاصل ہے اور اُن کے جرموں کی سزا نہیں مل رہی ہے یہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور اس کی حکمت کا یہی تقاضا ہے۔ لیکن اسی حکمت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ عالمِ آخرت میں اُن کو وہ سزا ضرور دی جائے جس کے وہ مستحق ہیں اور ان پر خدا کے اُس غضب اور لعنت کا ظہور ہو جس کو انہوں نے اپنے لئے واجب کرلیا ہے، ان مجرموں کو یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے۔ (وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا)



(درس - ۳۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ومرتبہ

اور آپ کی بعثت کی غایت وغرض

آپ سے بیعت کرنے والے خدا سے بیعت کرتے ہیں

بیعت کے بعد عہد شکنی اپنے ہی پر ظلم ہے، اربابِ وفا کیلئے اجر عظیم ہے

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاہِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا o لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ
وَتُعَزِّرُوْہُ وَتُوَقِّرُوْہُ ط وَتُسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا o اِنَّ الَّذِیْنَ
یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ط یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ ج فَمَنْ
نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ ج وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰہَدَ عَلَیْہُ
اللّٰہَ فَسَیُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا o (سورۃ الفتح آیات ۔ ۸ تا ۱۰)

(ترجمہ) (اے پیغمبر) ہم نے آپ کو بھیجا ہے شہادت دینے والا اور خوش خبری سنانے والا اور آگاہی دینے والا بنا کرتا کہ (اے لوگو) تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر، اور اس کی مدد کرو اور اس کی توقیر وتعظیم کرو اور صبح وشام اسی کی تسبیح کرو۔ (اے ہمارے پیغمبر) جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے ان کے ہاتھ پر، پس جو کوئی عہد شکنی کرے گا تو اس کی عہد شکنی کا وبال خود اسی پر پڑے گا اور جو اس عہد کو پورا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ اس کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

تفسیر وتشریح

اوپر کی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے اُن عظیم انعامات کا ذکر کیا گیا تھا جو واقعہ حدیبیہ کے سلسلہ میں اور اس کے نتیجہ میں رسول اللہ ﷺ پر اور آپ کے رفقاء پر ہوئے تھے۔ اس کے بعد اسی واقعہ حدیبیہ کے سلسلہ میں منافقین اور مشرکین پر نازل ہونے والے خدا کے غضب اور عذاب کا ذکر کیا گیا تھا اور ان کو سخت انتباہ دیا گیا تھا۔ اب اِن آیتوں میں یہ بتلایا جارہا ہے کہ ہمارے اِن رسول کا مقام ومرتبہ کیا ہے اور اہل ایمان کا معاملہ اور رویہ آپ کے ساتھ کیا ہونا چاہئے۔

بظاہر اِن آیتوں میں روئے سخن خصوصیت سے مدینہ منورہ کے قرب وجوار کے ان اعراب (بدویوں) کی طرف ہے جو اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شامل تو ہوگئے تھے لیکن اُن کے دلوں کو ایمان ویقین کی حقیقت ابھی نصیب نہیں ہوئی تھی، اپنے اسی حال کی وجہ سے یہ حدیبیہ والے سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جانے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے، اوپر والی آیت "لِیُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ..... الآیۃ" میں ان کو منافقین کہا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ اپنے اس منافقانہ کردار اور رویہ کی وجہ سے وہ خدا کے عذاب اور غضب ولعنت کے مستحق ہوچکے ہیں۔ آگے کی آیتوں میں اِن اعراب (بدویوں) کا ذکر صراحت کے ساتھ آرہا ہے۔

مقامِ رسالت

بہر حال ان آیتوں "اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاهِداً وَّمُبَشِّراً وَّنَذِیْراً...... اَجْراً عَظِیْماً" میں سب سے پہلے یہ بتلایا گیا ہے کہ ہمارے رسول کی حیثیت کسی قبیلہ کے سردار، کسی جماعت، کسی جتھے کے امیر وسربراہ اور سیاسی لیڈر کی نہیں ہے بلکہ اُن کا مقام ومرتبہ اور ان کی شان یہ ہے کہ وہ ہمارے بھیجے ہوئے رسول اور پیغمبر ہیں، ہم نے ان کو شاہد اور مبشّر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

یہاں آپ کا پہلا وصف "شاہد" (شہادت دینے والا) ذکر کیا گیا ہے، یہ لفظ قرآن

مجید میں (اور ہماری زبان میں بھی) اُس گواہی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو اپنے علم ومشاہدہ کی بنا پر کسی متنازعہ معاملہ اور مقدمہ میں عدالت کے سامنے دی جاتی ہے۔ اور کسی اہم غیبی حقیقت پر اپنے کامل یقین اور اذعان وایمان کے اظہار کے لئے اور دوسروں کو اُس سے باخبر کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، جس طرح کہا جاتا ہے کہ ''ہم شہادت دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے اور حضرت محمد ﷺ اُس کے رسول برحق ہیں''۔

اللہ کے پیغمبروں کا سب سے اہم امتیازی وصف یہی ہوتا ہے کہ وحی الٰہی کے ذریعہ ان کو جن غیبی حقائق کا علم وانکشاف ہوتا ہے (جو ہمارے مشاہدہ والے علم سے بھی زیادہ یقینی اور بدیہی ہوتا ہے) وہ دوسرے بندگان خدا کے سامنے اُن کو بیان فرماتے اور ان کی شہات دیتے ہیں، اور ان پر ایمان لانے کی ان کو بھی دعوت دیتے ہیں۔ یہ ''شہادت'' تمام انبیاء علیہم السلام کا امتیازی وصف ومنصب اور ان کی اہم ذمہ داری ہوتی ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ اس حیثیت سے بھی ''شاہد'' ہیں اور اس بارہ میں آپ ﷺ کو یہ اختصاص وامتیاز حاصل ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس منصب پر فائز کیا اور توحید اور آخرت اور جنت، دوزخ وغیرہ غیبی حقائق اور خداوندی احکام کا وحی کے ذریعہ علم ویقین عطا فرما کر اس فریضۂ ''شہادت'' کے لئے مامور کیا اور آپ نے زندگی کے آخری دن اور آخری وقت تک یہ فریضۂ شہادت ادا کیا۔ پھر آپ کی نیابت میں اور گویا آپ ہی کی طرف سے امت کو ''شہادت'' کا یہ فریضہ ہمیشہ ہمیشہ ادا کرنا ہے، اس طرح آپ کی ''شہادت'' قیامت تک کے لئے ہے۔ بہرحال رسول اللہ ﷺ اس حیثیت سے بھی ''شاہد'' ہیں اور ایسے شاہد ہیں کہ کوئی دوسرا اس طرح کا شاہد نہیں۔ اور دوسری حیثیت آپ کے شاہد ہونے کی یہ ہے کہ قیامت میں آپ بارگاہ خداوندی میں اپنی امت کے رویہ کے بارہ میں اور انبیاء سابقین کے فریضۂ تبلیغ ادا کرنے کے بارے میں شہادت اور گواہی دیں گے، جیسا کہ حدیثوں میں وارد ہوا ہے۔

بہرحال اس آیت ''إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا'' میں رسول اللہ ﷺ کا مقام ومرتبہ بیان کرتے ہوئے آپ کا پہلا وصف وامتیاز یہی ذکر فرمایا گیا ہے کہ ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا ہے۔ اور بلاشبہ یہ بہت بلند مقام ہے۔ اس کے آگے دو وصف اور بیان کئے گئے ہیں ''مبشر'' اور ''نذیر'' یعنی آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے وفادار اور نیکوکار بندوں کو

اُس کی رحمت ورضا اور جنت وغیرہ کی خوش خبری سنانے والے اور مجرموں، نافرمانوں کو اس کے غضب وعذاب کی آ گاہی دینے والے بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ جو بشارت سناتے اور جو آ گاہی دیتے ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے رسول اور نمائندے ہونے کی حیثیت سے دیتے ہیں اس لئے ان کی دی ہوئی خوش خبری اور اُن کی آ گاہی دراصل اللہ تعالیٰ کی خوش خبری اور اسی کی آ گاہی ہے۔

مقصدِ رسالت

آ گے فرمایا گیا ہے " لِتُؤمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلاً" اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ آپ ﷺ کو رسول اور شاہد اور بشیر ونذیر بنا کر بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کی تعلیم وہدایت کو قبول کر کے تم سچے پکے مؤمن بن جاؤ اور شہادتِ حق اور دعوت الی اللہ کا جو مشن آپ لے کر آئے ہیں اور جس کے لئے آپ جدوجہد کر رہے ہیں، اس میں آپ کے مددگار اور دست وباز و بن جاؤ اور آپ کی وہ تعظیم وتوقیر کرو جو اللہ کے اس رسول کی کرنی چاہئے جو اُس کی طرف سے شاہد اور بشیر ونذیر بنا کر بھیجا گیا ہو۔ اور اس کی تعلیم وہدایت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے صبح وشام اللہ کی تسبیح وعبادت کرو۔ بظاہر یہاں تسبیح کا مطلب صرف "سبحان اللہ" کا ذکر نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا عنوان ہے جس میں اس کی تسبیح وتقدیس بھی ہوتی ہے، نماز اُس کی کامل ترین صورت ہے۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ صبح وشام کے اوقات میں خاص طور سے اللہ کا ذکر، اُس کی تسبیح وتقدیس اور عبادت کرو۔ اللہ کے ذکر وعبادت اور حمد وتسبیح کے لحاظ سے اِن دو وقتوں کو بلاشبہ خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک رات کا آخری اور دن کا ابتدائی حصہ اور دوسرا دن کا آخری اور رات کا ابتدائی حصہ۔ انہی دو وقتوں کو "بُكْرَةً وَّاَصِيْلاً" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس آیت نے بتلایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو شاہد اور بشیر ونذیر بنا کر بھیجے جانے کی غایت اور خاص مقصد یہ ہے کہ جن کو آپ کی دعوت پہنچے ان کو ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کی حقیقت نصیب ہو وہ سچے پکے مؤمن ہو جائیں اور آپ کی دینی دعوت اور جدوجہد میں دل وجان سے آپ کے ساتھ اور آپ کے مددگار ہوں اور اُن کے دلوں میں آپ

کی کما حقہٗ عظمت ہو، جس کے نتیجہ میں وہ آپ کے پورے فرمانبردار اور تابعدار ہوں اور صبح وشام اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس اور اس کی عبادت اُن کا معمول ہو۔

اس آیت کی روشنی میں ہم سب کو اپنے کو دیکھنا اور جانچنا چاہیئے کہ اِن باتوں کے لحاظ سے ہمارا کیا حال ہے۔ یقیناً بہت کمی کسر ہے، ہمیں اس کمی کسر کو پورا کرنے کی اور اپنی اصلاح کی فکر اور کوشش کرنی چاہیئے۔

رسول اللہؐ سے کی جانے والی بیعت

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ''إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيْهِمْ...... فَسَيُؤْتِيْهِ أَجْراً عَظِيْماً''.

اس آیت میں بھی ایمان لانے والوں اور اسلام قبول کرنے والوں کو رسول اللہ ﷺ کی کامل فرمانبرداری اور وفاداری اور ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ اور اس کے لئے نہایت بلیغ اور بہت ہی مؤثر اور دل آویز عنوان اختیار کیا گیا ہے اس کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات ذہن میں رکھ لیجئے کہ عہد نبوی میں عام دستور یہ تھا کہ جو لوگ ایمان لاتے اور اسلام قبول کرتے وہ اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں اس طرح دے کر کہ اُن کا ہاتھ نیچے اور حضور ﷺ کا دست مبارک اُس کے اوپر ہوتا بیعت کرتے تھے۔ یہ بیعت اس بات کا عہد اور اقرار ہوتا تھا کہ ہم نے آپ کو اللہ کا رسول مان لیا اور آپ کا لایا ہوا دین قبول کرلیا، اب ہم ایک امتی کی حیثیت سے آپ کی فرمانبرداری اور پیروی کریں گے اور دین کی دعوت اور جد وجہد میں آپ کا ساتھ دیں گے یہ بیعت۔ ''بیعت اسلام'' کہلاتی تھی۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ اُن لوگوں سے بھی جو اسلام لاچکے ہوتے تھے، جہاد یا جہاد میں ثابت قدمی پر یا دوسرے اعمال خیر پر بھی بیعت لیتے تھے۔ چنانچہ اسی حدیبیہ کے واقعہ میں جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں ایک مرحلہ پر آپ ﷺ نے جہاد اور اس میں استقامت پر اپنے تمام رفقا سے بیعت لی تھی جو اسلام کی تاریخ میں ''بیعت رضوان'' کے نام سے معروف ہے اور اس کا ذکر اِسی سورت میں آگے آرہا ہے۔ اور مشہور صحابی حضرت جریر بن عبد اللہؓ نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے بیعت لی تھی اہتمام سے نماز اور زکوۃ ادا کرنے پر اور اس بات پر کہ میں ہمیشہ امت

مسلمہ کے ہر فرد کے ساتھ خیر خواہی کروں گا۔

بہر حال رسول اللہ ﷺ سے یہ تین طرح کی بیعتیں ثابت ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا بیعت کا طریقہ یہی ہوتا تھا کہ بیعت کرنے والا شخص رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں اس طرح اپنا ہاتھ دے کر بیعت اور عہد و اقرار کرتا تھا کہ اس کا ہاتھ نیچے اور رسول اللہ ﷺ کا دست مبارک اس کے اوپر ہوتا تھا۔ انہی بیعت کرنے والوں کے بارے میں اس آیت میں فرمایا گیا ہے "إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ...... الآية"۔ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت اور معاہدہ کرتے ہیں انہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ فی الحقیقت اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت اور عہد معاہدہ کر رہے ہیں، اس بیعت کے وقت اُن کے ہاتھ پر جو آپ کا ہاتھ ہوتا ہے وہ اللہ کے ہاتھ کے قائم مقام ہوتا ہے اور اس لحاظ سے گویا وہ اللہ ہی کا ہاتھ ہوتا ہے، کیونکہ آپ یہ بیعت اپنی ذاتی حیثیت سے نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور سفیر کی حیثیت سے اور اللہ ہی کے احکام کی تعمیل اور اس کے دین کی راہ میں جد و جہد ہی کے لئے لیتے ہیں اس لئے یہ بیعت درحقیقت براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے جو علیم و خبیر اور سمیع و بصیر ہے، ہر بندے کے ظاہری اعمال واحوال کی طرح اُس کا باطن اور دل کے راز بھی جانتا ہے اور ہر ایک کو مرنے کے بعد اس کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ پھر ہر ایک اپنے عمل و کردار کی جزا یا سزا پائے گا۔ آگے فرمایا گیا ہے "فَمَنْ نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلىٰ نَفْسِهٖ وَمَنْ أَوْفىٰ بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ أَجْراً عَظِيْماً" مطلب یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت فی الحقیقت اللہ جل جلالہٗ سے بیعت اور معاہدہ ہے تو اس کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ جو شخص اپنی بدبختی سے بیعت کی خلاف ورزی اور عہد شکنی کرے گا وہ اپنے کو خدا کے غضب و عذاب کا مستحق بنا لے گا اور جو بندے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کریں گے وہ خداوندی انعام کے مستحق ہوں گے اور وہ رب کریم اس وفاداری پر ان کو اجر عظیم سے نوازے گا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا بظاہر ان آیتوں کا روئے سخن خصوصیت سے مدینہ منورہ کے قرب و جوار کے اُن اعراب (بدویوں) کی طرف ہے جو اسلام تو قبول کر چکے تھے لیکن ابھی اُن کے ایمان میں کمزوری تھی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اس کا

تقاضا یہ تھا کہ جب حضور ﷺ نے عمرہ کے لئے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی تو دوسرے مخلص اہل ایمان کی طرح یہ بھی لبیک کہہ کے ساتھ ہو لیتے۔ لیکن انہوں حیلے بہانے کئے اور حضور ﷺ کے ساتھ نہیں نکلے، یہ ان کی طرف سے بیعت کی خلاف ورزی تھی۔ تو بظاہر اس آیت میں خصوصیت سے ان لوگوں کو اور بالعموم تمام بیعت کرنے والوں کو آگاہی دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول کے ہاتھ پر بیعت اور عہد معاہدہ کرنے کے بعد اس کی خلاف ورزی اور عہد شکنی اپنے ہی نفس پر بڑا ظلم اور بدترین قسم کی خودکشی ہے۔ لیکن اگر وہ سچے دل سے تائب ہو کر آئندہ کے لئے صدق و وفا کا طریقہ اپنالیں تو اللہ تعالیٰ رحم و کرم فرمانے والا ہے اور وہ اس کی کریمی سے "اجر عظیم" کی توقع کر سکتے ہیں۔

ہم سب نے بھی بیعت کی ہے

اس آیت کے حقیقی مصداق تو بلاشبہ وہی صحابہ کرام ہیں جن کو حضور ﷺ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کرنا نصیب ہوا لیکن اتنا شرف ہم کو اور آپ کو بھی حاصل ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا رسول مان کر اور کلمہ پڑھ کر حضور ﷺ سے غائبانہ بیعت کی ہے اور آپ کی فرماں برداری اور پیروی کا عہد کیا ہے تو آیت کے آخری حصہ میں ہمارے آپ کے لئے بھی آگاہی اور بشارت ہے کہ "فَمَنْ نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ أَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ أَجْرًا عَظِيْمًا"



(درس-۳۹)

سفر حدیبیہ کے سلسلہ میں ایک گروہ کے

منافقانہ کردار کی پردہ دری

اِن منافقوں کو خیبر کی مہم میں شریک ہونے کی اجازت نہیں

عنقریب ان کے ایمان واخلاص کے امتحان کا ایک موقع آئے گا

خطبہ مسنونہ کے بعد

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ - بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا
فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ج يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ط قُلْ
فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ
نَفْعًا ط بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ٥ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ
يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ
قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ج وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا ٥ وَمَنْ لَّمْ
يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ٥ وَلِلّٰهِ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ط
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ٥ سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ
اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ج يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا
كَلٰمَ اللّٰهِ ط قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ج
فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ط بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ٥

قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ ۖ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا ۖ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (سورہ فتح آیات ۔ ۱۱ تا ۱۶)

(ترجمہ) جو بدولوگ پیچھے ڈال دیئے گئے تھے وہ عنقریب (جب آپ مدینہ پہنچیں گے معذرت کے طور پر) آپ سے کہیں گے کہ ہمارے اموال اور اہل وعیال نے ہمیں (گھر سے نکلنے کی) فرصت نہیں دی تو آپ ہمارے لئے (اللہ تعالیٰ سے) مغفرت اور معافی کی دعا کیجئے۔ یہ اپنی زبانوں سے وہ بات کہیں گے جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ آپ اُن سے کہیے کہ وہ کون ہے جو تمہارے لئے اللہ سے کچھ اختیار رکھتا ہو اگر وہ تم کو کوئی نقصان یا نفع پہنچانا چاہے، یقین رکھو اللہ تمہارے عملوں (اور کرتوتوں) سے پوری طرح باخبر ہے۔ بلکہ (اصل واقعہ یہ ہے کہ) تم نے یہ سمجھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اور (اُن کے ساتھ جانے والے) مؤمنین اب کبھی اپنے گھر والوں کے پاس واپس نہ لوٹ سکیں گے، اور یہ بات تمہارے دلوں کو بہت خوشنما معلوم ہوئی اور تم نے بُرے بُرے گمان قائم کر لئے اور بالآخر تم ہو گئے تباہ و برباد...... اور جو ایمان نہ لاویں اللہ اور اس کے رسول پر تو (ہم نے ایسے) کافروں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے سزا اور عذاب دے اور اللہ بہت بخشنے والا اور بہت مہربانی فرمانے والا ہے۔

عنقریب (جب تم غنیمتیں لینے کے لئے چلو گے تو) ''مخلفین'' (پیچھے ڈالے ہوئے بدولوگ) کہیں گے کہ ہم کو بھی اجازت دی جائے، آپ لوگوں کے ساتھ ہم بھی چلیں، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل ڈالیں، آپ (صاف) کہدیں کہ تم لوگ ہرگز (اس موقع پر) ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے۔ ایسے ہی فرما دیا ہے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی، تو وہ کہیں گے آپ لوگ ہم سے حسد رکھتے ہو۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) یہی لوگ بہت کم سمجھتے ہیں (اس لئے ایسی احمقانہ باتیں کرتے ہیں)۔ آپ اہل ''بدو'' میں کے ان مخلفین سے (یہ بھی کہہ دیں) کہ عنقریب ہی تم لوگوں کو ایک سخت جنگ آزما قوم (سے جہاد و قتال) کے

لئے دعوت دی جائے گی، اُن سے یا تو تم قتال کرتے رہو گے یا وہ اسلام لے آئیں، پس اگر تم نے (اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے) اطاعت و فرماں برداری کا رویہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ تم کو (اس فرمانبرداری اور جہاد و قربانی کا) بہتر اجر عطا فرمائے گا، اور اگر تم نے روگردانی اور نافرمانی کی جیسے کہ پہلے کی تھی تو وہی اللہ تم کو سخت ترین عذاب دے گا۔

تفسیر و تشریح

یہ بات تفصیل سے ذکر کی جا چکی ہے کہ یہ سورۂ فتح ۶ھ میں صلح حدیبیہ والے سفر سے واپسی میں نازل ہوئی ہے۔ اور یہ بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چاہا تھا کہ اس سفر میں (جو عمرے کے لئے تھا) مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد آپ کے ساتھ ہو تاکہ کفار مکہ مرعوب ہو جائیں اور مزاحمت کا ارادہ نہ کریں۔ اس وجہ سے آپ نے عام مسلمانوں کو ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔ قریباً ڈیڑھ ہزار اہل ایمان نے آپ کے ساتھ یہ سفر کیا اور وہ واقعات پیش آئے جو تفصیل سے ذکر کئے جا چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ مدینہ منورہ کے قرب و جوار میں کچھ اعراب یعنی بدوی لوگ تھے، ان کا حال یہ تھا کہ بظاہر یہ اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو گئے تھے لیکن ان کے دلوں کو حقیقی ایمان نصیب نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک طرح کے منافق تھے، لیکن مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہونے کی وجہ سے ان کو بھی عمرے کے لئے ساتھ چلنے کی دعوت دی گئی تھی، لیکن حقیقی ایمان نصیب نہ ہونے کی وجہ سے ان کا خیال تھا کہ یہ سفر بہت خطرناک ہے۔ اہل مکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو عمرے کے لئے مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے، مزاحمت ضرور کریں گے اور لامحالہ جنگ کی نوبت آئے گی اور اہل مکہ کو اس جنگ میں یہ سہولت حاصل ہوگی کہ وہ اپنے شہر اور اپنے گھروں میں ہوں گے اُن کی ضرورت کی ساری چیزیں اُن کے پاس ہوں گی اور مسلمان اپنے مرکز مدینہ سے ڈھائی سو میل دور ہوں گے اس لئے جنگ میں ان کی پوزیشن بہت کمزور ہوگی، نتیجہ یہ ہوگا کہ مکہ والے ان سب کا صفایا کر دیں گے اور ان کو گھروں کو واپس لوٹنا بھی نصیب نہ ہوگا۔ الغرض مدینہ کے قرب و جوار کے یہ اعراب یہی سب سوچ کر

عمرے کے اس سفر میں حضور ﷺ کے ساتھ نہیں گئے۔ لیکن اس سفر کا انجام حدیبیہ کے معاہدہ صلح پر ہوا۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ''فتح مبین'' فرمایا اور بعد کے واقعات سے سب کو معلوم ہو گیا کہ واقعی وہ صلح مسلمانوں کے حق میں ''فتح مبین'' تھی۔ تو اس سفر سے واپسی ہی میں یہ سورۂ فتح نازل ہوئی جس میں اُن مضامین کے بعد جو اوپر کی آیتوں میں بیان ہوئے ہیں ان آیتوں میں (جن کا سلسلہ ''سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ'' سے شروع ہوا ہے) ان منافق اعراب کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کو پیشگی ہی بتلایا گیا ہے کہ جب آپ مدینہ پہنچیں گے تو یہ آپ کے پاس آئیں گے اور اس طرح کے جھوٹے حیلے بہانے کریں گے، آپ اِن کے بارے میں یہ رویہ اختیار کریں۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ''سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ...... بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا''

اس آیت میں اِن اعراب کو ''مُخَلَّفُوْنَ'' کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں پیچھے ڈالے ہوئے۔ بظاہر واقعہ تو یہ تھا کہ یہ لوگ حدیبیہ والے اس سفر میں حضور ﷺ کے ساتھ نہیں گئے تھے بلکہ خود ہی سوچ سمجھ کے خطرہ محسوس کر کے پیچھے رہ گئے تھے۔ اس لئے ''مُتَخَلِّفِيْنَ'' (پیچھے رہ جانے والے) تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے ''مُخَلَّفُوْنَ'' کا لفظ استعمال فرما کر ارشاد فرمایا کہ ان کے نفاق اور بد باطنی کی وجہ سے اللہ نے ان کو اس مبارک سفر کی توفیق نہیں دی اور یہ پیچھے ڈھکیل دئے گئے اور اس سفر کی عظیم برکات سے محروم رکھے گئے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے رسول جب آپ مدینہ پہنچیں گے تو یہ اعراب ''مُخَلَّفِيْنَ'' سفر میں ساتھ نہ جانے کی معذرت کرتے ہوئے آپ سے کہیں گے ''شَغَلَتْنَا اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا'' یعنی ہمارے مال مویشی اور ہمارے اہل وعیال سے متعلق کچھ ضروری کام تھے ہم اُن میں پھنسے رہے اور سفر میں آپ کے ساتھ جانے کی فرصت نہیں پا سکے۔ آپ ہمارے اس قصور کی معافی اور مغفرت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مطلع فرمایا کہ وہ اس عذر معذرت میں جھوٹے ہیں، اُن کے دلوں میں وہ بات نہیں ہے جو وہ کہہ رہے ہیں ''يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ.''

آگے ارشاد فرمایا ''قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا'' یعنی آپ ان سے کہیں کہ بتلاؤ اگر اللہ تم کو کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا کوئی

نفع پہنچانا چاہے تو کون ہے جو اُس میں کسی ردو بدل کا کچھ اختیار رکھتا ہو؟ یعنی کسی کی مجال نہیں ہے کہ ارادۂ الٰہیہ کے خلاف کچھ کر سکے۔ جو نقصان یا نفع اللہ تعالیٰ تم کو پہنچانا چاہے گا وہ پہنچ کے رہے گا۔ اگر یہ ایمان ویقین ہو تو اللہ ورسول کے حکم کی تعمیل کے سلسلہ میں آدمی کسی خطرے کی بھی پروانہ کرے۔ آگے ارشاد فرمایا "بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْراً" مطلب یہ ہے کہ جھوٹے بہانے نہ بناؤ۔ تم نے جو کچھ کیا اور جس خیال سے کیا اللہ تعالیٰ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ تم کیسے امید کر سکتے ہو کہ وہ اللہ تم کو اس منافقانہ عذر معذرت میں سچا سمجھ کر معاف کر دے گا اور بخش دے گا۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ " بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ...... وَكُنْتُمْ قَوْماً بُوْراً". اس آیت میں ان منافق اعراب کے باطن کو بالکل کھول دیا گیا ہے، فرمایا گیا ہے کہ اے منافقو! اصل حقیقت یہ ہے کہ تم نے یہ سمجھا تھا اور خیال قائم کر لیا تھا کہ اللہ کے رسول اور اِس حدیبیہ والے سفر میں اُن کے ساتھ جانے والے مؤمنین مخلصین زندہ سلامت واپس نہیں لوٹ سکیں گے۔ کفار مکہ ان سب کا صفایا کر دیں گے۔ اور تمہارے قلبی مرض نفاق کی وجہ سے یہ بات تمہارے دلوں کو بہت خوشنما لگی تھی، اور یہ تم نے بہت بُرا خیال قائم کیا تھا، ورتم اپنے اس منافقانہ کردار کی وجہ سے دینی وایمانی نقطۂ نظر اور آخرت کے انجام کے لحاظ سے بالکل ہی تباہ وبرباد ہو گئے۔

آگے ارشاد ہوا ہے۔ "وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْراً".

اس موقع پر اس آیت کا مقصد ومدّعا بظاہر ان اعراب منافقین کو جن کا ذکر ہو رہا ہے یہ جتلانا ہے کہ اگر چہ تم لوگ بظاہر اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو گئے ہو لیکن اللہ تمہارے اس حال سے واقف ہے کہ تم ابھی دل سے ایمان نہیں لائے ہو، تمہارے دل کافر ہیں۔ اور ایسے لوگوں کے لئے اللہ نے دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ اگر تم اسی حال میں رہے تو دوزخ کی وہ آگ تمہارا ٹھکانا ہوگا۔

آگے ارشاد ہے۔ "وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْراً رَحِيْماً". مطلب یہ ہے کہ زمین وآسمان میں اللہ ہی کی بادشاہی اور فرماں روائی ہے وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کے بارے میں چاہے

عذاب کا فیصلہ فرمائے اس کے فیصلے میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا...... آخر میں فرمایا گیا ہے "وکان اللہ غفوراً رحیماً"، یعنی وہ اللہ جو زمین وآسمان کا بادشاہ وفرمانروا ہے اور جس کے اختیار میں بندوں کی مغفرت یا عذاب کا فیصلہ ہے اُس کی خاص اور غالب صفت یہ ہے کہ بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے، اس لئے کسی بڑے سے بڑے مجرم کافر یا منافق کو بھی یہ خیال کر کے اس کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہئے کہ میرا جرم اور گناہ ناقابل معافی ہے، میری بخشش تو ہو ہی نہیں سکتی...... آیت کے اس آخری جز میں بظاہر اُن اعراب منافقین کو اشارہ دیا گیا ہے کہ اگر اب بھی تم دل سے ایمان لے آؤ، اور اب تک جو منافقانہ رویہ رہا تھا اُس سے سچے دل سے توبہ کرلو، اپنے اندر صدق واخلاص پیدا کرلو تو اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے وہ تم کو بخش دے گا اور رحم وکرم کا معاملہ فرمائے گا۔

باز آ باز آ از انچہ ہستی باز آ
گر کافر وگبر و بت پرستی باز آ

کیں درگہ مادرگہ نومیدی نیست
گر ہزار بار توبہ شکستی باز آ

اس کے آگے کی آیتوں کی تشریح سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھ لینی چاہئے کہ حدیبیہ کے اس سفر سے واپسی ہی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو یہ اطلاع بھی دی گئی تھی کہ آپ اور آپ کے وہ اصحاب جو اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے عنقریب ہی اللہ تعالیٰ اُن کے ہاتھوں خیبر فتح کرادے گا اور اس مہم میں آپ کے ساتھ صرف اصحاب حدیبیہ ہی ہوں گے...... اور اس کی فتح میں مال غنیمت بھی بڑی مقدار میں حاصل ہوگا۔ (یہ گویا حدیبیہ کے سفر میں آپ کے ساتھ جانے والے مخلصین کی مخلصانہ قربانی اور سرفروشی کا نقد انعام ہوگا) ساتھ ہی آپ کو یہ بھی اطلاع دی گئی کہ جب آپ حکم الٰہی کے مطابق اپنے ان مخلص رفقاء کے ساتھ خیبر فتح کرنے کے لئے چلیں گے تو مدینہ کے قرب وجوار کے یہ اعراب منافقین جن کا اوپر ذکر ہوا اور جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے "مُخَلَّفِیْنَ" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ یہ بھی آپ کے ساتھ چلنا چاہیں گے۔ آپ ان کو ہرگز ساتھ چلنے کی اجازت نہ دیں، ان سے صاف کہہ دیا جائے کہ اللہ کا حکم نہیں ہے کہ تم اس مہم میں ہمارے ساتھ چلو۔

اس صورت حال کو ذہن میں رکھ کر اب آگے کی آیتیں پڑھیے۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ...... بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ إِلَّا قَلِيْلًا"۔ مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رسول، جب تم اور تمہارے رفقاء اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور حکم کے مطابق خیبر فتح کرنے اور وہاں کی غنیمتوں پر قبضہ کرنے کے لئے چلیں گے تو یہ اعراب مخلفین کہیں گے کہ ہم کو بھی اجازت دی جائے کہ آپ لوگوں کے ساتھ چلیں۔ یہ منافقین اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو بدل دینا چاہتے ہیں کہ ان کو سفر میں ہرگز ساتھ نہیں لیا جائے گا "كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ" یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ہی یہ فرمان آ گیا ہے۔ تو یہ جواب سن کر یہ جاہل اعراب کہیں گے "بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا" کہ آپ لوگ حسد اور ہماری بدخواہی کرتے ہیں اس لئے ہم کو ساتھ چلنے کی اجازت نہیں دیتے (غالبًا ان کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کے حکم کی بات صرف بہانہ ہے، ہم کو ساتھ نہ لے چلنے کی اصل وجہ حسد اور بدخواہی ہے) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ إِلَّا قَلِيْلًا" یعنی واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ بہت کم فہم ہیں، یہ اس بات کو نہیں سمجھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خیبر کی غنیمتوں کی شکل میں اپنے اُن وفادار بندوں کو نقد انعام سے نوازنا چاہتا ہے جو حدیبیہ کے انتہائی خطرے والے سفر میں ساتھ جا کر اپنی کامل وفاداری اور راہِ خدا میں جانوں کی بھی قربانی پر آمادگی کا ثبوت دے چکے ہیں۔

آیت کا ایک اہم فائدہ

اس آیت سے ضمنی طور پر ایک بہت اہم اور اصولی بات معلوم ہوئی۔ اعراب منافقین کو فتح خیبر کے سفر میں ساتھ چلنے کی اجازت نہ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ "لَنْ تَتَّبِعُوْنَا" (یعنی تم لوگوں کو ہرگز ساتھ چلنے کی اجازت نہ دی جائے گی) اس کے آگے فرمایا گیا "كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ" (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ہی ایسا فرمان آ گیا ہے) حالانکہ قرآن پاک میں کہیں بھی اس فرمان کا ذکر نہیں ہے۔ ہاں حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت تھی کہ جب آپ خیبر فتح کرنے کے لئے چلیں تو آپ کے ساتھ وہی وفادار مخلصین ہوں جو حدیبیہ کے سفر میں آپ کے ساتھ تھے دوسرے لوگ

نہ ہوں۔ قرآن مجید کے ان الفاظ "كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ" میں اللہ تعالیٰ کی اسی ہدایت اور اسی فرمان کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس لئے یہ آیت اس بات کا نہایت واضح اور روشن ثبوت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ ایسی ہدایتیں اور ایسے احکام بھی ملتے تھے جو قرآن پاک میں نہیں ہیں صرف حدیثوں میں مذکور ہیں۔ آج کل کے بہت سے گمراہ لوگ اس سے انکار کرتے ہیں۔ بہر حال قرآن مجید کی یہ آیت اس کی واضح اور روشن دلیل ہے، جو شخص قرآن کو مانتا ہے اُس کو یہ بات بھی ماننی پڑے گی کہ قرآن کے علاوہ بھی حضور پر وحی ہوتی تھی اور احکام آتے تھے۔

آگے کی آیت میں اِن "مُخَلَّفِيْنَ" سے جن کو غزوۂ خیبر میں ساتھ چلنے کی اجازت نہیں دی گئی ایک آخری بات فرمائی گئی ہے۔

ارشاد ہے۔ "قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ...... يُعَذِّبْكُمْ عَذَاباً أَلِيْماً"
مطلب یہ ہے کہ اے رسول آپ اِن "مُخَلَّفِيْنَ" سے (جن کو غزوۂ خیبر میں ساتھ چلنے کی اجازت نہیں دی جارہی ہے) کہہ دیں کہ عنقریب وقت آئے گا کہ اہل ایمان اللہ کے حکم سے ایک بڑی طاقتور اور جنگ آزما قوم سے جہاد کے لئے اٹھیں گے۔ اس قوم کے لوگوں سے اس وقت تک جنگ جاری رہے گی کہ وہ اسلام لے آئیں (سر تسلیم خم کر دیں) اس فیصلہ کن جنگ میں شرکت کی تم لوگوں کو بھی دعوت دی جائے گی، اُس وقت تمہارے ایمان و اخلاص کا امتحان ہو جائے گا، اگر تم نے اس وقت اللہ و رسول کی وفاداری، فرمانبرداری کا رویہ اختیار کیا اور مؤمنین مخلصین کی طرح تم بھی سر بکف اُس طاقتور اور جنگ آزما قوم سے جنگ کے لئے ہمارے ساتھ نکلے تو اللہ تم کو اپنی شان کریمی کے مطابق اجر عطا فرمائے گا (اور تمہارے پچھلے قصور معاف ہو جائیں گے) اور اگر اُس وقت بھی تم نے حیلوں بہانوں کا وہی پہلا والا منافقانہ رویہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ تم کو سخت ترین عذاب دے گا۔

مفسرین کی رائیں اس بارے میں مختلف ہیں کہ اس آیت میں ایک طاقتور اور سخت جنگ آزما قوم سے عنقریب ہونے والی جس جنگ کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد کون سی جنگ ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد وہ جنگیں ہیں جو حضور ﷺ کے بعد عہد صدیقی و فاروقی میں روم و فارس کی منظم اور طاقتور حکومتوں کے خلاف لڑی گئیں جن کو فوجی طاقت کے

لحاظ سے مسلمانوں کے مقابلہ میں بے حساب برتری حاصل تھی۔ ایک دوسری رائے یہ ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ کی مہم ہے اور ''طاقتور اور جنگ آزما قوم'' سے مراد مکہ کے کفار قریش ہیں۔ میرے نزدیک یہی دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ فتح مکہ والا غزوہ، حدیبیہ اور غزوۂ خیبر کے صرف دو سال بعد ہوا ہے اور اس کے لئے بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اہل ایمان کو عام دعوت دی گئی تھی اور اس سفر میں قریباً دس ہزار مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔ اور اس موقع پر کفار مکہ کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ایک جنگ یا اسلام یعنی سر تسلیم خم کر دینا۔ ''تُقَاتِلُوْنَهُمْ أَوْ يُسْلِمُوْنَ'' کا یہی مطلب تھا۔ واللہ اعلم۔ (ان مشرکین کے لئے دوسرے کفار و مشرکین کی طرح اس بات کی اجازت نہ تھی کہ چاہیں تو اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کر کے اپنے دین پر رہ جائیں۔ مرتب)



(درس-۴۰)

اصحاب حدیبیہ کیلئے رضائے الٰہی کا تمغہ

نقد انعام کے طور پر فتح خیبر اور کثیر مقدار میں اموالِ غنیمت کا عطیہ اس کے بعد عنقریب ہی مکہ فتح کرادینے کی بشارت عظمیٰ

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ لَقَدْ رَضِىَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِىْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِىَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرًا ۝

(سورۂ فتح آیات ۔ ۱۷ تا ۲۱)

(ترجمہ) نابینا پر کوئی گناہ نہیں اور لنگڑے پر بھی کوئی گناہ نہیں اور بیمار پر بھی گناہ نہیں ۔ اور جو کوئی اللہ و رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا رہے گا اس کو اللہ ایسے بہشتی

باغات میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اور جو کوئی روگردانی کرے گا تو اللہ اس کو دردناک عذاب دے گا۔ حق ہے کہ اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جب وہ تم سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے، تو جان لیا اللہ نے اُن کے دلوں کا حال، اور نازل فرمائی اُن پر سکینت وطمانیت، اور بطور انعام عطا فرمائی ان کو ایک قریبی فتح، اور بہت سی غنیمتیں جن کو وہ حاصل کریں گے، اور اللہ عزیز وحکیم ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے تم سے بہت سی غنیمتوں کا جن کو تم حاصل کرو گے تو یہ غنیمت تو اُس نے تم کو ابھی دے دی، اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے اور تاکہ یہ اہل ایمان کے لئے ایک نشانی ہو۔ اور تم کو صراط مستقیم کی ہدایت بخشے۔ اور ایک اور فتح بھی (تم کو عطا ہونے والی ہے) جس پر تم ابھی قابو نہیں پا سکے ہو اللہ نے اس کو گھیرے میں لے لیا ہے اور اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے۔

تفسیر وتشریح

سچے عذر والوں پر گناہ نہیں

اوپر کی آیت میں اُن منافق ''اعراب مخلّفین'' کے بارے میں جن کا اوپر کی آیتوں میں ذکر تھا، فرمایا گیا تھا کہ عنقریب تم کو ایک سخت جنگ آزما قوم سے جہاد وقتال کی دعوت دی جائے گی، اگر تم نے اُس دعوت پر لبیک کہہ کے اُس قوم سے جہاد وقتال میں حصہ لیا اور اخلاص ووفاداری کا ثبوت دیا تو اللہ تم کو اچھا اجر عطا فرمائے گا اور اگر تم نے پہلے کی طرح روگردانی ونافرمانی کا منافقانہ رویہ اختیار کیا تو اللہ تم کو دردناک عذاب دے گا۔ اگرچہ یہ بات اُن اعراب مخلّفین سے کہی گئی تھی جو اپنے باطنی نفاق کی وجہ سے حدیبیہ کے سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ لیکن کہا گیا ہے۔ ''قربیا نرا بیش بود حیرانی''۔ اور ''عشق است وہزار بدگمانی'' مخلص مسلمانوں میں جو بیچارے ایسے معذور تھے جو اپنی نابینائی، یا لنگڑے پن یا بیماری کی وجہ سے جنگ وقتال میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، شاید اُن کے دلوں میں خطرہ پیدا ہوا (اور آئندہ بھی ایسے معذور بندوں کو خطرہ پیدا ہو سکتا تھا) کہ ہم بھی جہاد وقتال میں حصہ نہ لینے والوں میں ہیں، تو کیا اس جرم وگناہ کی پاداش میں ہم بھی جہنم کے ''عذاب الیم'' میں جھونکے جائیں گے۔

اس آیت "لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ" میں وضاحت فرمادی گئی کہ جو بندے اس طرح کی کسی معذوری اور مجبوری سے جنگ وقتال میں حصہ نہ لے سکیں، اُن سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا، وہ جہاد وقتال کے مکلف ہی نہیں ہیں، ان کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ اللہ ورسول کے جن احکام کے وہ مکلف اور مخاطب ہیں اپنی استطاعت کے بقدر اُن کی تعمیل کریں، کامیابی اور جنت کے استحقاق کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔

اطاعت گزاروں کو مُژدہ

آگے فرمایا گیا ہے۔ "وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَاباً اَلِيْماً"۔ اوپر کی آیت کا تعلق "اعراب مخلّفین" سے تھا، درمیان میں معذورین کے بارے میں گویا استدراک کیا گیا تھا۔ اب اس آیت میں نجات وعذاب کا یہ عام ضابطہ اور قانون بیان فرمایا گیا ہے کہ جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت وفرمانبرداری کرے گا اُس کا آخرت میں جنت میں مقام ہوگا اور جو کوئی روگردانی کا رویہ اختیار کرے گا اس کو دوزخ میں عذاب الیم دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ پہلے گروہ میں شامل ہوں۔ اور اس کا راستہ یہی ہے کہ اللہ ورسول کے احکام کی تعمیل کریں اور ان کی نافرمانی سے بچیں۔

بیعتِ رِضوان

آگے کی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن مخلص اور وفادار رفقاء کے بارہ میں جو حدیبیہ کے سفر میں آپ کے ساتھ تھے اور جنہوں نے اس سفر میں سخت خطرہ کی حالت میں آپ کے ہاتھ پر مرتے دم تک جہاد میں ثابت قدم رہنے کی بیعت کی تھی اپنی خاص رضامندی کے اظہار واعلان، اور دنیا وآخرت میں اُن پر ہونے والے انعامات کا بیان فرمایا ہے ارشاد ہے۔ "لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ" مطلب یہ ہے کہ اے رسول، اللہ تعالیٰ آپ کے مؤمن ومخلص رفقائے سفر اصحاب حدیبیہ کے اس عمل بیعت سے بہت ہی راضی اور خوش ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا یہ جو اعلان ہے اسی کی وجہ سے اس بیعت کو "بیعت رضوان" کہا جاتا ہے۔ میں اس بیعت کا واقعہ

پوری تفصیل سے بیان کر چکا ہوں، غالباً یہ بھی ذکر کر چکا ہوں کہ یہ بیعت جس درخت کے نیچے ہوئی تھی وہ کیکر کا درخت تھا۔ یہ بیعت اللہ و رسول کی وفاداری اور اُن کے راستہ میں جان تک کی قربانی کا عہد تھا جو حضور ﷺ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں سب سے پہلے اِن بیعت کرنے والے اہل ایمان سے اپنی خاص الخاص رضا مندی کا اعلان فرمایا ''لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤمِنِیْنَ'' اس کے بعد آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ان کو گوناگوں انعامات سے نوازنے کی بشارت سنائی ہے۔ ارشاد ہے ''فَعَلِمَ مَافِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ...... وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزاً حَکِیْماً'' مطلب یہ ہے کہ بیعت کے وقت ان اہل ایمان کے قلوب کی جو کیفیت تھی وہ اللہ کے علم میں تھی تو اس نے اُن پر سکینت اور طمانیت نازل فرمادی۔ اس کا مطلب سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن میں رکھئے کہ جس وقت یہ بیعت ہوئی ہے اندازہ یہی تھا کہ کفار مکہ سے جنگ ہوگی، اور جنگی نقطۂ نظر سے اُس وقت مسلمانوں کی پوزیشن بہت کمزور تھی اور وہ سخت خطرے میں اور گویا موت کے منہ میں تھے، چونکہ وہ عمرے ہی کی نیت سے آئے تھے اس لئے جنگ کا ضروری سامان بھی ساتھ نہیں لیا تھا، اور وہ اپنے مرکز مدینہ منورہ سے ۱۰۔۱۲ دن کی مسافت کے فاصلہ پر تھے اس لئے فطری طور پر اس وقت مسلمانوں کے دل پورے اضطرار اور الحاح کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں گے۔ غالباً مسلمانوں کے دل کی یہی وہ کیفیت ہے جس کو فرمایا گیا ہے ''فَعَلِمَ مَافِیْ قُلُوْبِھِمْ الخ'' کہ اُن کے دلوں کے حال سے اللہ واقف تھا، اُس نے اُن کے دلوں پر سکینت اور اطمینان کی کیفیت نازل فرمادی یعنی اُن کے قلوب میں یہ اعتماد و یقین پیدا ہوگیا کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے اور اس کو سب کچھ قدرت ہے اور اگر یہاں موت اور شہادت ہی مقدر ہے تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی حیات جاودانی اور جنت ملے گی اور یہ بڑا نفع مند سودا ہے۔ تو حُدَیبیہ میں بیعت کرنے والے اہل ایمان کے قلوب پر جو یہ سکینت نازل فرمائی گئی یہ رضامندی کے اعلان کے بعد پہلا روحانی انعام تھا۔ ''فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ''۔

مادّی انعام

آگے فرمایا گیا ہے۔ ''وَاَثَابَھُمْ فَتْحاً قَرِیْباً، وَمَغَانِمَ کَثِیْرَۃً یَاخُذُوْنَھَا وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزاً حَکِیْماً'' مطلب یہ کہ اس روحانی نعمت ''سکینت'' کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ان

بیعت کرنے والے اہل ایمان کے لئے بطور انعام ایک عنقریب ہونے والی فتح اور اس کے ساتھ بہت سے اموال غنیمت عطا فرمانے کا بھی فیصلہ فرمادیا۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جاچکا ہے یہ خیبر کا علاقہ فتح ہونے کی اور اس کے ساتھ بڑی مقدار میں اموال غنیمت حاصل ہونے کی بشارت تھی جو حدیبیہ کے سفر سے واپسی ہی میں ان آیتوں کے ذریعہ آپ کے رفقاءِ سفر اصحاب حدیبیہ کو دی گئی تھی۔ آگے فرمایا گیا "وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزاً حَكِيماً" یعنی اللہ تعالیٰ زبردست اور غالب ہے، خیبر کا علاقہ فتح کرادینا اور وہاں کے اموال غنیمت پر تم کو قبضہ دلادینا اس کے لئے مشکل نہیں، اس کے سامنے ساری طاقتیں کمزور اور مغلوب ہیں اور وہ "حکیم" ہے، اس کی صفتِ حکمت کا تقاضا ہے کہ اپنے وفادار اور صالح بندوں کو اس انعام سے نوازے اور ان کو معاشی حیثیت سے بھی مطمئن اور مادّی لحاظ سے بھی طاقتور بنائے۔ تا کہ ان کے ایمان ویقین میں اور جہاد وقربانی کے جذبہ میں اور اضافہ ہو۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا...... وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطاً مُّسْتَقِيماً"

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ تم کو بہت سی فتوحات دے گا اور ان فتوحات میں بڑی مقدار میں اموال غنیمت تم کو حاصل ہوں گے۔ سو ان موعودہ فتوحات اور غنیمتوں میں سے یہ خیبر کی فتح تو تم کو ابھی ہاتھ کے ہاتھ گویا دے دی گئی (۱) اور اس فتح خیبر ہی کے سلسلہ میں تم پر یہ بھی اللہ تعالیٰ کا انعام وکرم ہوا کہ اُس نے فریق مخالف کے یعنی اہل خیبر کے ہاتھ روک دیئے وہ تم پر دست درازی نہیں کر سکے۔ "وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ"

(۱) اس سورہ کے درس میں بار بار یہ بات دُہرائی گئی ہے کہ حدیبیہ سے مدینہ کو واپسی کے سفر میں اس کا نزول ہوا، لیکن جس آیت کی یہاں تشریح کی جارہی ہے اس کے بارے میں کسی ذہن میں یہ اشکال ضرور پیدا ہوا ہوگا کہ بظاہر تو یہ آیت فتح خیبر کے بعد ہونی چاہئے، اس لئے کہ اس میں اس فتح کو ایک ایسے واقعے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے جو ہو چکا ہے، اسی بنا پر بعض مفسرین سلف سے یہ بھی روایت ہے کہ یہاں نقد دی جانے والی فتح (فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ) سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔ لیکن جمہور مفسرین نے اس کو فتح خیبر ہی قرار دیا ہے، اور اس کی توجیہ یوں کی جاسکتی ہے کہ یہاں "هٰذِهٖ" (یہ فتح) کا اشارہ واقعہ فتح کی طرف نہیں ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے اس فتح کے لئے ہو جانے والے اس فیصلے کی طرف ہے جس کا بیان ماقبل کی آیت میں "فَأَثَابَكُمْ فَتْحاً قَرِيباً" کے الفاظ سے کیا گیا ہے، لیکن "فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ" کے بعد والے الفاظ "وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ" پر اگر نظر کی جائے تو "هٰذِهٖ" کا اشارہ صلح حدیبیہ ہی کی طرف زیادہ قرین قیاس ہوتا ہے، اس لئے کہ "وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ" کا پورے معنی میں ظہور صلح حدیبیہ ہی کے موقع پر ہوا کہ مشرکین جنگ پر مائل نہ ہو سکے۔ واللہ اعلم (مرتب)

اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں رُعب ڈال کے گویا ان کے ہاتھ باندھ دیئے۔آگے فرمایا گیا ہے۔ ''وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا'' مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وفادار بندوں کو خیبر کی یہ فتح اور اس میں بڑی مقدار میں اموالِ غنیمت عطا فرمانے کا اور دشمنوں کے ہاتھ روک دینے کا فیصلہ اس لئے فرمایا ہے کہ ان مومنین باوفا کو اطمینان اور فراغت حاصل ہو اور وہ اللہ کی مدد کی ایک نشانی اور معجزہ دیکھیں جس سے ان کے ایمان ویقین میں اضافہ اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد وتوکل میں ترقی ہو اور اس طرح صراط مستقیم کی کامل ہدایت ان کو نصیب ہو جو اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن بہت سی فتوحات اور غنیمتوں کے وعدہ کا ذکر فرمایا گیا ہے اُن میں عرب وعجم کی وہ ساری غنیمتیں اور فتوحات شامل ہیں جو صلح حدیبیہ اور فتح خیبر کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو عطا ہوئیں خاص طور سے قرن اوّل کی فتوحات۔اس آیت میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس غزوۂ خیبر میں اللہ تعالیٰ نے فریق مخالف کے ہاتھ روک دیئے، وہ تم پر کوئی دست درازی نہیں کر سکے۔یہ غالباً اس طرف اشارہ ہے کہ خیبر کے یہودی جن کے پاس ہر طرح کے وسائل تھے، اگر حوصلہ سے اور جم کر مقابلہ کا فیصلہ کرتے تو ان کو شکست دینا اور خیبر کا فتح ہونا آسان نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا کہ وہ جم کر جنگ کی ہمت نہیں کر سکے اور تھوڑے سے مقابلہ کے بعد انہوں نے گویا شکست قبول کر لی۔اس کے علاوہ روایات میں یہ بھی ہے کہ قبیلہ غطفان جو ایک لڑنے مرنے والا بہادر قبیلہ تھا وہ خیبر کے یہودیوں کا حلیف تھا جب اس کو خیبر پر مسلمانوں کے حملہ کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کی مدد کے لئے لشکر مرتب کیا، لیکن پھر اُن کے دلوں میں منجانب اللہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم خیبر والوں کی مدد کو جائیں اور مسلمان پیچھے سے ہمارے گھروں پر حملہ کر دیں، یہ سوچ کر انہوں نے خیبر نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔یہ بھی منجانب اللہ ہوا۔یہ سب ''وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ'' کا ظہور تھا۔

فتح مکہ کی بشارت

آخر میں فرمایا گیا ہے۔ ''وَاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا''

وَکَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْراً"۔ اس آیت میں فتح مکہ کی خوشخبری دی گئی ہے جو یقیناً رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی اس وقت سب سے بڑی تمنا اور آرزو تھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا فتح کرا دینا اور اس پر مسلمانوں کا اقتدار قائم کر کے اس کو دارالاسلام بنادینا گویا نعمت کا اتمام تھا۔

اوپر کی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا تم سے وعدہ تھا اور ہے کہ وہ تم کو بہت سے فتوحات اور ان میں بہت سی غنیمتیں عطا فرمائے گا، تو اِن موعودہ فتوحات میں سے خیبر کی فتح تو تم کو گویا ابھی فوری طور پر دے دی گئی۔ اب اس آیت "وَاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا۔" میں فرمایا جا رہا ہے کہ ایک اور اہم فتح بھی تم کو عنقریب ہی عطا ہوگی تم سردست اس پر قابو نہیں پا سکے ہو۔ فی الحال وہ تمہارے قابو سے باہر ہے لیکن اللہ کی طرف سے فیصلہ ہو گیا ہے اور اس نے اس کو اپنے احاطہ میں لے لیا ہے ("قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا") اور وہ قادر مطلق ہے، کوئی چیز اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں۔ ("وَکَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْراً") اس لئے اس فتح میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں، وہ بھی جلد ہی تم کو عطا ہوگی۔

سفر حدیبیہ سے واپسی میں جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں اُس وقت کفار مکہ کے مقابلہ میں مسلمان ظاہری اسباب و وسائل کے لحاظ سے بہت کمزور تھے اور یہ بات بظاہر بہت بعید از قیاس تھی کہ مسلمان مکہ کو فتح کر سکیں گے اور اس پر اُن کا اقتدار قائم ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ "لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا" سے اسی صورت حال کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے (واللہ اعلم) اس کے آگے فرمایا گیا ہے۔ "قَدْ أَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَکَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْراً" یعنی اللہ تعالیٰ نے اس فتح مکہ کو تمہاری فتوحات میں شامل کرنے کا فیصلہ فرما لیا ہے اور اپنے احاطہ میں لے لیا ہے اور وہ قادر مطلق ہے یہ بات اس کی قدرت میں ہے کہ وہ تمہارے ہاتھوں اس کو فتح کرا دے لہٰذا کسی کو اس میں شک شبہ نہ ہونا چاہئے، یہ دوسری فتح بھی تم کو جلدی ہی عطا ہوگی، تم اللہ کی قدرت کاملہ کا یہ کرشمہ بھی عنقریب ہی دیکھو گے۔

بیعت رضوان اور اس کی یادگار۔ درخت

اِن آیتوں کی ضروری تشریح تو کر دی گئی۔ اب انہی کے مضمون سے متعلق دو باتیں

اور عرض کرنی ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں حدیبیہ میں ایک درخت کے نیچے ہونے والی بیعت کا ذکر فرمایا ہے اور جن خوش نصیبوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی ان کے بارہ میں اپنی خاص الخاص رضا کا اظہار و اعلان فرمایا ہے "لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ" رضائے الٰہی کا یہ اعلان امتیوں کے لئے سب سے بڑا سرٹیفکٹ اور تمغہ ہے بندۂ مومن کی اعلیٰ سے اعلیٰ تمنا اور آرزو یہی ہو سکتی ہے کہ اللہ اس سے راضی ہو جائے۔

دوسری قابل ذکر بات اس آیت سے متعلق یہ ہے کہ حدیبیہ کے میدان کا یہ درخت جس کے نیچے بیٹھ کے آپ نے بیعت لی تھی جیسا کہ میں نے ذکر کیا تھا روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ببول کا درخت تھا۔ بلاشبہ یہ بڑا مبارک درخت تھا کہ قرآن پاک میں اس کا ذکر فرمایا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نیچے بیٹھ کے وہ بیعت لی جس پر اللہ تعالیٰ نے سب بیعت کرنے والوں کے لئے اپنی رضا کا اعلان فرمایا۔ لیکن اسلامی تاریخ کا یہ مشہور واقعہ ہے اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے دور خلافت میں معلوم ہوا کہ کچھ لوگ حدیبیہ جا جا کر اُس درخت کے نیچے نمازیں پڑھتے ہیں اور غالباً آپ نے خطرہ محسوس کیا کہ لوگ آئندہ اس درخت کی تعظیم میں غلو کرنے لگیں اور یہ امت کے لئے فتنہ بن جائے تو آپ نے حکم دے کر اُس درخت کو جڑ سے کٹوا دیا۔ (۱)

حالانکہ حضرت عمرؓ خود ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اسی درخت کے نیچے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کی تھی۔ لیکن وہ دین کی روح کو سمجھتے تھے فتنہ سے اور شرک سے امت کی حفاظت کے لئے انہوں نے اس مبارک اور متبرک درخت کو کٹوا دینا ضروری سمجھا۔ حضرت عمرؓ کے اس اقدام میں امت کے لئے بڑی روشنی اور بڑا سبق ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ بزرگوں کی قبروں کو معبود بنا لیا گیا ہے۔ اُن پر سجدے کئے جاتے ہیں، نذریں چڑھائی جاتی ہیں، وہ سب کچھ ہوتا ہے جو مشرکین اپنے دیوتاؤں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اگر حضرت عمرؓ ہوتے تو ان عالیشان مزاروں اور ان پر بنے ہوئے گنبدوں کو اکھاڑ کے برابر کر دینے کا حکم دیتے۔

---

(۱) فتح الباری کتاب المغازی، باب غزوۂ حدیبیہ۔ بحوالہ طبقات ابن سعدؒ۔

(درس - ۴۱)

واقعہ حدیبیہ میں اگر جنگ کی نوبت آجاتی

تو دشمنانِ اسلام کو شکست فاش ہوتی لیکن اللہ نے جنگ کی نوبت
نہ آنے دی اِس میں اسلام اور مسلمانوں کی بڑی مصلحتیں تھیں
دشمن کی اشتعال انگیزی کے وقت جذبات پر قابو رکھنا اور عقل
اور دین کی رہنمائی میں چلنا کامیابی کی کلید ہے

خطبہ مسنونہ کے بعد

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا
نَصِيْرًا ○ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ج وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ
اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ○ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ
عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ○ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ط وَلَوْلَا
رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ
فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ج لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ
مَنْ يَّشَآءُ ج لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا
اَلِيْمًا ○ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ
الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَاؕ وَكَانَ
اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا۠ (سورۃ الفتح۔ آیات ۲۲ تا ۲۶)

(ترجمہ) اور اگر یہ کافر لوگ تم سے جنگ کرتے تو یقیناً پیٹھ پھیر کے بھاگتے، پھر یہ نہ کوئی کارساز پاتے نہ مددگار یہی اللہ کی سنت (اور اس کا دستور ہے) جو پہلے سے جاری ہے، اور تم کبھی نہ پاؤ گے اللہ کی سنت (اور دستور) میں کوئی تبدیلی۔ وہی ہے جس نے روک دیئے اُن کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ اُن سے وادی مکہ میں، بعد اس کے کہ تم کو اُن پر قابو دے دیا تھا، اور اللہ خوب دیکھ رہا تھا جو کچھ تم کر رہے تھے۔

وہی یہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر و انکار کا رویہ اختیار کیا تھا اور تم کو روکا مسجد حرام (میں داخل ہونے) سے۔ اور قربانی کے جانوروں کو اپنی قربانی کی جگہ پہنچنے سے اور اگر مکہ میں بہت سے ایسے مومن مرد اور مومنہ عورتیں نہ ہوتیں جن کے بارے میں خطرہ تھا کہ (جنگ کی صورت میں) تم ان کو بے خبری میں روند ڈالو گے، پھر علم نہ ہونے کے باوجود تمہارے سر اُن کا الزام آ جائے گا (تو اللہ جنگ کا حکم دے دیتا لیکن اللہ نے یہ حکم اس لئے نہیں دیا) تاکہ وہ جن کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے اور اگر وہ لوگ الگ ہو گئے ہوتے تو ہم اُن میں سے اُن لوگوں کو دردناک عذاب دیتے جنہوں نے کفر و انکار کا راستہ اپنایا تھا۔

اور اُس وقت کا خیال کرو جب کافروں نے اپنے دلوں میں بیجا ضد، جاہلیت کی بے جا ضد، کرنے کی ٹھان لی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی سکینت و طمانیت نازل فرما دی اپنے رسول پر اور مومنین پر اور پابند کر دیا ان کو تقوے کی بات کا اور یہ اس کے بہت حقدار و سزاوار تھے۔ اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

تفسیر و تشریح

سورت کے شروع میں صلح حدیبیہ کا ذکر تھا اور اس کو ''فتح مبین'' بتلایا گیا تھا، اور اس کے ثمرات و برکات اور اصحاب حدیبیہ پر ہونے والے خداوندی انعامات کا بیان فرمایا گیا تھا...... پھر اُن لوگوں کی سرزنش کی گئی تھی جو ضعف ایمان کی وجہ سے حدیبیہ والے سفر میں حضور ﷺ کے ساتھ نہیں نکلے تھے...... اس کے بعد اصحابِ حدیبیہ کو فتح خیبر کی اور اُس کے

ساتھ فتح مکہ اور دوسری فتوحات کی بھی خوشخبری سنائی گئی تھی۔

اب ان آیتوں میں پھر حدیبیہ کے سلسلہ کے بعض واقعات کا اور اس اہم موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ ظہور میں آیا اس کے مصالح اور اسرار کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

حرم میں قتل وقتال کی روک تھام کیلئے تدابیر الٰہیہ کا ظہور

آپ حضرات کو یاد ہوگا حدیبیہ کے اس سفر میں ایک وقت ایسا آ گیا تھا کہ پوری جنگی فضا قائم ہوگئی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے تمام رفقاء سے جن کی تعداد ۱۴۔۱۵ سو کے قریب تھی زندگی کے آخری سانس تک راہ خدا میں جہاد کی بیعت لی تھی اور اس وقت ہر شخص جہاد اور قربانی کے جذبہ سے سرشار تھا، لیکن پھر جنگ کی نوبت نہیں آئی بلکہ بات صلح پر ختم ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ منجانب اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوا۔ لیکن بظاہر اسباب اس میں دو باتوں کا خاص دخل تھا۔ ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ سفر عمرہ کی نیت سے کیا تھا اور آپ کعبۃ اللہ اور حرم کے احترام میں تا امکان جنگ اور خونریزی سے بچنا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ قریش مکہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ آپ کے رفقاء نے زندگی کے آخری سانس اور خون کے آخری قطرہ تک آپ کے ہاتھ پر اللہ کے راستہ میں جہاد وقتال کی بیعت کی ہے اور ایسے جوش وخروش سے یہ بیعت ہوئی ہے تو ان کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور انہوں نے مصالحت کی بات کے لئے اپنے نمائندے بھیجے اور دس سال تک کے لئے ناجنگ معاہدہ کی تجویز خود اپنی طرف سے رکھی اور یہ بھی پیش کش کی کہ آئندہ سال آپ اسی طرح اپنے رفقاء کے ساتھ عمرہ کے لئے آئیں۔ ہم تین دن کے لئے شہر مکہ کو خالی کردیں گے تاکہ کسی تصادم کا اندیشہ ہی نہ رہے۔ بہرحال بظاہر اسباب ان دو باتوں کی وجہ سے جنگ کے بادل چھٹ گئے اور بالآخر صلح ہوگئی۔ لیکن فی الحقیقت یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ سے ہوا۔ اُسی نے رسول اللہ ﷺ کو اس پر جما دیا کہ تا امکان جنگ سے بچنا ہے اور اُسی نے کفار مکہ کے دلوں میں رعب ڈال کے اُن کا رخ صلح کی طرف موڑ دیا۔ "اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِمَا یَشَاءُ"۔

ان آیتوں میں اسی صورت حال کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا...... وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا"، مطلب یہ ہے کہ اگر یہ

کفار مکہ آمادہ صلح نہ ہوتے اور جنگ ہی کرتے جیسے کہ شروع میں اُن کے تیور تھے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری بھرپور مدد ہوتی اور یہ مشرکین بری طرح شکست کھاتے اور میدان چھوڑ کے بھاگتے کہیں سے اُن کو مدد نہ ملتی۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ یہ اللہ کی سُنّت اور اس کا دستور ہے وہ ایسے مواقع پر اپنے مخلص اور فادار مومن بندوں کی مدد فرماتا ہے اور اُن کے دشمنوں پر ان کو غلبہ دیتا ہے اور یہ وہ سنۃ اللہ اور خداوندی قانون و دستور ہے جو کبھی نہیں بدلتا۔

قرآن پاک میں جابجا اس سنۃ اللہ اور قانون خداوندی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ کہیں فرمایا گیا "وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ" ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "إِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔ "إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ"۔ ان سب آیتوں میں اسی سنۃ اللہ کا بیان ہے۔

آگے کی آیت میں غالباً حدیبیہ ہی کے سلسلہ کے ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ جب حضرت عثمان رسول اللہ ﷺ کے حکم سے مکہ والوں کو یہ بتلانے اور سمجھانے کے لئے گئے ہوئے تھے کہ ہم صرف عمرہ کے لئے آئے ہیں اور عمرہ کر کے ہم خاموشی سے واپس چلے جائیں گے۔ اور پھر حضرت عثمانؓ کی واپسی میں دیر ہوئی اور کسی غلط فہمی سے حضور ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ عثمانؓ مکہ میں شہید کر دیئے گئے، تو قدرتی طور پر آپ کے تمام رفقاء میں سخت اشتعال پیدا ہو گیا تھا۔ اسی اثناء میں ایسا ہوا کہ مشرکین مکہ کا ۵۰۔۶۰ آدمیوں کا ایک دستہ جو اس ناپاک غرض سے بھیجا گیا تھا کہ اگر موقع ملے تو وہ حضور ﷺ کو معاذ اللہ شہید کر دے۔ صحابہ کرامؓ نے اُس کے سب آدمیوں کو گرفتار کر لیا اور اُس اشتعال کی فضا میں بعض لوگوں کے دل میں آیا اِن سب کو قتل کر ڈالا جائے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے روک دیا، اور ظاہر ہے کہ اگر یہ لوگ قتل کر دیئے جاتے تو یقیناً حضرت عثمانؓ اور اُن کے رفقاء مکہ معظّمہ میں شہید کر دیئے جاتے، اور پھر فریقین میں سخت خونریز جنگ ہوتی۔ تو اگلی آیت میں غالباً اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا ہے۔

"وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا"۔

مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی حکمت و مشیت تھی جس نے اس موقع پر دونوں

فریقوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے قتل سے روک دیئے، مکہ سے حضرت عثمانؓ اور اُن کے ساتھی صحیح سلامت واپس آ گئے اور مشرکین کے جو ۵۰۔۶۰ آدمی گرفتار کر لئے گئے تھے ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا لیا اور اس طرح جنگ کی نوبت نہ آنے دی...... آخر میں فرمایا گیا ہے۔ "وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْراً" یعنی اُس وقت کے تمہارے اعمال واحوال پر اللہ تعالیٰ کی برابر نظر تھی، یہ جو کچھ ہوا اسی کی توفیق سے ہوا، اس کی حکمت کا یہی تقاضا تھا۔

آگے کی آیت میں بتلایا گیا ہے کہ یہ کفار مکہ اپنی کافرانہ سرکشی اور ظالمانہ ومجرمانہ حرکتوں کی وجہ سے مستحق تو اسی کے تھے کہ اُن کے خلاف جنگ کرنے کا مسلمانوں کو حکم دیا جاتا اور ان کا قلع قمع کر دیا جاتا۔ لیکن دو باتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے اس وقت جنگ حکمت ومصلحت کے خلاف تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے جنگ کی نوبت نہ آنے دی اور صلح پر بات ختم کرائی۔

فرمایا گیا ہے۔ "هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْىَ مَعْكُوْفاً اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ...... لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَاباً اَلِيْماً"

مطلب یہ ہے کہ یہ مشرکین مکہ وہ مجرمین ہیں جنہوں نے ہمارے رسول کی دعوتِ ایمان وتوحید کا انکار کر کے کفر اور مخالفت کا رویہ اختیار کیا اور اب انہوں نے آپ کے رفقاء کو عمرہ سے اور مسجد حرام میں داخل ہونے سے بھی روکا اور قربانی کے جانوروں کو قربان گاہ تک نہیں جانے دیا۔ اس لئے یہ بدکردار مستحق تو اس کے تھے کہ ان کے خلاف جنگ کرنے اور طاقت استعمال کرنے کا حکم دیا جاتا لیکن دو وجہوں سے اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ حکم نہیں دیا اور جنگ کی نوبت نہ آنے دی۔ ایک یہ کہ مکہ میں ایسے بہت سے مسلمان تھے جو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے ہجرت نہیں کر سکے تھے اور وہ اِن کافروں کے ساتھ ہی رہ بس رہے تھے، الگ ان کی کوئی بستی نہیں تھی، تو اگر جنگ ہوتی تو اس کا بڑا خطرہ تھا کہ وہ بھی بے خبری میں اور بلا ارادہ تمہارے نیزوں اور تلواروں کا نشانہ بن جائیں اور تمہارے ہی ہاتھوں شہید ہو جائیں۔ اور پھر تمہارے سر ان کی شہادت کا الزام آئے اور تمہیں ندامت اور افسوس ہو "فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ

مَعَرَّۃٌ بِغَیرِ عِلْمٍ" کا یہی مطلب ہے۔

اور اسی طرح کی بلکہ اس سے بھی بڑی دوسری وجہ اور مصلحت جنگ کا حکم نہ دینے میں تھی کہ اس وقت کے کفارِ مکہ میں بہت سے وہ لوگ تھے جن کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت یہ فیصلہ کرچکی تھی کہ وہ ایمان لاکر اور رسول اللہ ﷺ کے دست و بازو، دین کے داعی اور اللہ کے سپاہی بن کر حضور ﷺ کے ساتھ جنت میں جائیں گے۔(۱) تو اگر اُس وقت جنگ کی نوبت آجاتی تو وہ سب بھی رسول اللہ ﷺ کے خلاف اس جنگ میں شریک ہوتے اور مسلمانوں کی تلواروں کا نشانہ بن کر جہنم رسید ہوتے۔تو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت کا تقاضا ہوا کہ اس وقت جنگ نہ ہو اور اِن لوگوں کو مہلت مل جائے اور یہ ایمان لاکر اللہ کی رحمت کے دائرہ میں آجائیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک اچھی خاصی تعداد نے تو جلدی ہی صلح حدیبیہ کے اس واقعہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے ہی رسول اللہ ﷺ کی دعوت ایمان کو قبول کرلیا، ان میں حضرت خالد بن الولیدؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ جیسے اکابر صحابہ بھی ہیں۔اور جو بچے تھے قریباً ان سب ہی نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرلیا اور یہ سب اسلام کے علمبردار اور لشکر اسلام کے جانباز سپاہی بن گئے۔تو حدیبیہ کے موقع پر جنگ نہ ہونے کی بلاشبہ یہ عظیم ترین مصلحت تھی۔یہ سب اللہ ہی کے علم میں تھا اور اسی کی حکمت و مشیت نے رسول اللہ ﷺ کا دل اس پر جما دیا کہ جنگ

---

(۱) یہ دوسری وجہ آیت کے الفاظ میں اس طرح مذکور نہیں ہے جس طرح پہلی وجہ صاف طور سے مذکور ہوئی ہے۔ چنانچہ ترجمے سے بھی اس وجہ کا اظہار نہیں ہوتا ہے۔لیکن بعض مفسرین کی رائے کے مطابق اس کا اشارہ آیت کے اِن الفاظ میں پایا جاتا ہے جن کے ترجمے میں لکھا گیا ہے کہ "اللہ نے یہ (جنگ کا) حکم اس لئے نہیں دیا تاکہ وہ جن کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے" صاحب درس علیہ الرحمۃ نے اپنی تشریح میں اسی رائے کو اختیار فرمایا۔ آیت کے الفاظ میں چونکہ اس اشارہ کی کوئی واضح علامت نہیں ہے۔اسی لئے اِن الفاظ (جن کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے) کی تشریح میں اہل تفسیر کی رائیں مختلف ہوئی ہیں۔کسی نے "جن کو چاہے" کا اشارہ صرف مشرکین کی طرف سمجھا ہے۔کسی نے صرف ان مؤمنین کی طرف جو مکہ میں مجبورانہ رہ رہے تھے۔اور کسی نے اس میں اِن دونوں گروہوں کو شامل کیا ہے۔ بلکہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ایک چوتھی راہ اختیار فرمائی ہے۔ وہ اس آیت پر اپنے تفسیری حواشی میں فرماتے ہیں "اور تم پر اپنے بے مثال صبر و تحمل کی بدولت خدا اپنی رحمت نازل فرمائے نیز کافروں میں سے جن لوگوں کا اسلام لانا مقدر ہے ان کو بھی لڑائی کی خطرناک گڑبڑ سے بچا کر اپنی رحمت میں داخل کرے" اس تشریح میں مؤمنین مکہ کے بجائے وہ اہل ایمان مراد لئے گئے ہیں جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ حدیبیہ میں تھے۔اور واقعہ یہ ہے کہ بظاہر اس سبھی کی گنجائش ہے۔زیادہ بہتر کا علم اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہے۔(مرتب)

نہ ہو اور ہر قیمت پر صلح ہو جائے ۔ آخر میں فرمایا گیا ہے۔ "لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَاباً أَلِيْماً". مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے بچاؤ کے لئے اللہ تعالیٰ نے جنگ کی نوبت نہ آنے دی اگر وہ کہیں الگ ہو گئے ہوتے تو اللہ تعالیٰ جنگ کا حکم دیتا اور یہ کافر اپنے کیفر کردار کو پہنچتے اور اُن پر اللہ کی سخت مار پڑتی۔

اصحابِ حدیبیہ کے ضبط وتحمل کی تحسین

آگے اسی سلسلہ میں فرمایا گیا ہے۔ "إِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ، حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهُ عَلٰى رَسُوْلِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْآ أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا، وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْئٍ عَلِيْماً"

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس خاص عنایت وکرم کو بھی یاد کرو کہ جب حدیبیہ کے اس واقعہ میں کفار مکہ نے حمیۃ جاہلیہ یعنی سخت متکبرانہ اور جاہلانہ ضد کا رویہ اپنا لیا تھا جس کے جواب میں فطری طور پر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رفقاء کے دلوں میں بھی اشتعال پیدا ہو سکتا تھا، اگر ایسا ہوتا تو جنگ ہو ہی جاتی اور سخت خونریز جنگ ہوتی اور وہ سب مصلحتیں اور منفعتیں خاک میں مل جاتیں جو صلح کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی تھیں (جن کا میں بار بار ذکر کر چکا ہوں) تو اللہ تعالیٰ نے اس نازک وقت میں اور انتہائی اشتعال کی اس فضا میں یہ کرم فرمایا کہ اپنے رسول پاک اور آپ کے رفقاء کے دلوں میں سکینت وطمانیت نازل فرما دی اور ان کو اپنے بھڑکے ہوئے جذبات پر قابو پانے کی توفیق دی اور کلمۂ تقویٰ کا ان کو پابند کر دیا۔ ''کلمۂ تقویٰ'' یہ عہد تھا کہ ہم اپنی نفسانی خواہشات اور جذبات کی پیروی نہیں کریں گے بلکہ ہر حال میں اللہ ورسول کی ہدایت کے پابند رہیں گے۔ "رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبّاً وَّبِمُحَمَّدٍ نَّبِيّاً وَّبِالْإِسْلَامِ دِيْناً"۔

آگے فرمایا گیا ہے۔ "وَكَانُوْا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا" یعنی یہ اہل ایمان جو اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اس کے بہت حقدار اور سزاوار تھے کہ ان کو کلمۂ تقویٰ کا پابند کر دیا جائے۔ بلاشبہ یہ اصحاب حدیبیہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی سند ہے کہ ان کو ''کلمۂ تقویٰ'' کا پابند کر دیا گیا ہے اور وہ اس کے بہت حقدار اور سزاوار تھے۔ آگے ارشاد ہوا

ہے "وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْئٍ عَلِيْماً" مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو سب باتوں کا علم تھا اور ہے، اُس نے اپنے رسول پاک اور مسلمانوں کو حدیبیہ کے اس غیر معمولی واقعہ میں اس رویہ کی توفیق دی جو اس کے علم محیط اور علم ازلی میں اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بہتر اور شاندار نتائج پیدا کرنے والا تھا۔

حدیبیہ کے پورے واقعہ کا اور خاص کر اس آخری آیت کا یہ بہت اہم سبق ہے کہ دشمن کی اشتعال انگیزی کے موقع پر صبر وسکون سے کام لینا اور جذبات کے بجائے عقل وشریعت سے رہنمائی حاصل کرنا اور اس کی پابندی کرنا کامیابی کی کلید ہے۔ افسوس ہے کہ آج امت نے قرآن اور اسوۂ نبوی کے اس اہم سبق کو بالکل بھلا دیا ہے۔



(درس-۴۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب منجانب اللہ تھا، یقیناً اُس کا ظہور ہو گا

اللہ نے آپ کو اس لئے بھیجا ہے کہ دین حق غالب ہو

آپ کے اصحاب ورفقاء میں وہی اوصاف ہیں جو تورات وانجیل میں بیان ہوئے ہیں۔

اُن کیلئے بخشش اور اجر عظیم کا الٰہی وعدہ ہے

خطبہ مسنونہ کے بعد

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ج لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ
الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ لا مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لا
لَا تَخَافُوْنَ ط فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا
قَرِيْبًا ە هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ
لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ە مُحَمَّدٌ
رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ
تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز
سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي
التَّوْرٰىةِ ج وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ج كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ
فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ
الْكُفَّارَ ط وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ
مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ە (سورۃ الفتح۔ آیات ۲۷۔۲۸۔۲۹)

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے سچا خواب دکھایا اپنے رسول کو جو برحق (اور واقع کے مطابق) ہے، یقیناً تم داخل ہوگے مسجد حرام میں انشاء اللہ امن وامان کے ساتھ سر منڈائے ہوئے اور سر کے بال کتروائے ہوئے، اور اُس وقت تم کو کوئی خوف وخطر نہ ہوگا۔ پس اللہ کے علم میں تھا وہ جو تمہارے علم میں نہیں تھا، تو اُس نے نے اُس سے پہلے ایک قریبی فتح مقرر فرمادی۔

وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق لے کر تاکہ وہ غالب کردے اس کو سارے دینوں پر، اور اللہ کافی گواہ ہے۔ محمد اللہ کے رسول ہیں، اور وہ جو اُن کے ساتھ ہیں وہ اہل کفر کے مقابلہ میں سخت ومضبوط ہیں، اور آپس میں رحم دل ہیں، تم ان کو دیکھو گے اللہ کے فضل اور اس کی رضا کی طلب میں رکوع وسجود کی حالت میں۔

ان کی خاص نشانی اُن کے چہروں میں ہے سجدوں کے اثر سے، یہ اُن کا وصف (بیان ہوا) ہے تورات میں، اور اُن کا وصف انجیل میں (بیان ہوا) ہے کہ جیسے کھیتی ہو جس نے نکالی اپنی سوئی، پھر اس کو قوی اور مضبوط کیا پھر وہ موٹی ہوئی، پھر وہ اپنے تنہ پر سیدھی کھڑی ہوگئی دل خوش کر رہی ہے کسانوں کا، تاکہ جلائے اُن سے کافروں کا دل، وعدہ فرمایا ہے اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کئے ان میں سے مغفرت کا اور ایک اجر عظیم کا۔

تفسیر وتشریح

یہ سورۃ الفتح کی آخری آیتیں ہیں، آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سورت حدیبیہ والے سفر سے واپسی میں نازل ہوئی تھی۔ جب یہ سورت شروع ہوئی تھی تو میں نے پوری تفصیل سے حدیبیہ کا واقعہ بیان کیا تھا اور بتلایا تھا کہ ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ معظّمہ گئے ہیں۔ اور آپ کے ساتھ آپ کے رفقاء صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت ہے۔ اور پورے امن وامان کے ساتھ سب نے عمرے کے ارکان ادا کئے بیت اللہ کا طواف کیا، صفا مروہ کی سعی کی، اور پھر عمرے کے اختتامی عمل کے طور پر سر کے بال منڈوائے یا کتروائے...... جب آپ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے اپنا یہ خواب بیان کیا تو سب کو بڑی خوشی ہوئی اور یقین ہوگیا کہ جو کچھ آپ نے خواب میں دیکھا ہے وہ عالمِ واقعہ میں ہوگا کیونکہ آپ کا خواب ایک قسم کی وحی ہے۔

اگر چہ خواب میں اس کا کوئی اشارہ نہیں تھا کہ یہ کب ہوگا۔ لیکن غلبہ شوق سے صحابہ کرامؓ نے یہی خیال کرلیا کہ ابھی ہوگا اور تیاری شروع کردی اور رسول اللہ ﷺ سے تقاضا شروع کردیا۔ حضور ﷺ نے بھی ارادہ فرمالیا۔ پھر وہ واقعات پیش آئے جن کا اس سورت کے درس میں بار بار ذکر کیا جاچکا ہے۔ کفارِ مکہ نے مزاحمت کی اور جنگ کا راستہ اختیار کیا، رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں جنگ نہ کرنے کا اور صلح ومصالحت کا رویہ اختیار فرمایا، بالآخر وہ صلح ہوئی جس میں دوسری چند باتوں کے علاوہ یہ بھی طے ہوا کہ اس وقت تو آپ اور آپ کے رفقاء عمرہ کئے بغیر واپس جائیں گے لیکن آئندہ سال آکر عمرہ کریں گے اور کوئی مزاحمت نہیں کی جائے گی۔ بلکہ تین دن کے لئے شہر مکہ خالی کردیا جائے گا چنانچہ آپ بغیر عمرہ کئے واپس آ گئے۔ قدرتی طور پر آپ کے اکثر رفقاء اس طرح بغیر عمرہ کئے واپسی سے بہت رنجیدہ اور متاثر تھے، شیطان اُن کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہوگا کہ آپ ﷺ کا خواب تو سچا ثابت نہیں ہوا اور یہ بھی خیال آتا ہوگا کہ منافقین ہمارا مذاق بنائیں گے۔

ان آخری آیتوں کا تعلق اسی صورت حال سے ہے فرمایا گیا ہے۔ " لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْشَاءَ اللّٰهُ آمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَاتَخَافُوْنَ"۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمرے کے بارے میں جو خواب دیکھا تھا، وہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دکھایا تھا اور بالکل سچا خواب تھا جس کا عالمِ واقعہ میں ظہور یقینی ہے، آپ اور آپ کے اصحاب عمرہ کریں گے، بلا روک ٹوک کے امن وامان کے ساتھ مسجد حرام داخل ہوں گے، (بیت اللہ کا طواف اور صفا ومروہ کے درمیان سعی کریں گے، جو کہ عمرے کے ارکان ہیں) اور اس عمرے کے اختتامی عمل کے طور پر کچھ لوگ حلق کرائیں گے (یعنی سر منڈوائیں گے) اور کچھ لوگ قصر کرائیں گے (یعنی سر کے بال کتروائیں گے) اور یہ سب ایسی فضا میں ہوگا کہ کوئی خوف وخطر نہ ہوگا (لَاتَخَافُوْنَ)۔

آگے فرمایا گیا ہے۔ "فَعَلِمَ مَالَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحاً قَرِيْباً"۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوا (کہ خواب کی بنا پر عمرے کے لئے گئے اور بغیر عمرہ کئے واپس آنا پڑا جس کا تم کو رنج وملال ہے) اس میں جو راز تھا اور جو مصلحتیں تھیں وہ تمہارے علم میں نہیں تھیں، اللہ کے علم میں تھیں، وہ جانتا تھا کہ تمہارے حق میں یہ بہتر ہے کہ اُس عمرے سے پہلے

جو خواب میں دکھایا گیا تھا تم کو ایک بڑی فتح نصیب فرمائے۔ چنانچہ اُس نے اِس سفر میں صلح حدیبیہ کی شکل میں تم کو "فتح مبین" نصیب فرمائی اور پھر جلدی ہی خیبر کی فتح بھی مقرر فرمائی۔

میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ حدیبیہ کی صلح جو ظاہری نظر میں مغلوبانہ صلح معلوم ہوتی تھی فی الحقیقت "فتح مبین" تھی، اُس کی وجہ سے اسلام کی دعوت کے راستہ کی بہت سی رکاوٹیں دور ہوگئیں، اور راستہ صاف ہوگیا، اور وہی خیبر کی فتح اور اس کے بعد فتح مکہ اور بعد کی فتوحات کی تمہید اور بنیاد بنی۔ الغرض یہ جو کچھ ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا اور اس کی حکمت کا یہی تقاضا تھا اور اسی میں تمہاری اور دین کی بھلائی تھی لہٰذا اس کو خداوندی انعام سمجھو اور شکر ادا کرو۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے " هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْداً"۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنا رسول ہدایت اور دین حق لے کر اس مقصد سے بھیجا ہے کہ وہ دین حق اسلام کو دوسرے تمام ادیان باطلہ پر غالب کردے (اور یہ ہو کے رہے گا) اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی شہادت کافی ہے، وہ خبیر و بصیر ہے۔

"محمد رسول اللہ" کی معنویت

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰه" مطلب یہ ہے کہ یہ محمد اللہ کے رسول ہیں، یہی وہ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت اور دین حق لے کر بھیجا ہے اور جن کے ذریعہ ادیان باطلہ پر دین حق کا غلبہ مقدر ہو چکا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ حدیبیہ میں جب صلح نامہ لکھا جا رہا تھا تو کفار مکہ کے نمائندے سُہَیل نے اِس پر اصرار کیا تھا کہ "محمد رسول اللہ" نہ لکھا جائے، بلکہ لکھا ہوا کٹوا دیا تھا اور اس کی جگہ "محمد بن عبداللہ" لکھوایا تھا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کا تعارف اس کلمہ "محمد رسول اللہ" سے کرایا ہے اور جہاں تک خیال ہے یہ کلمہ قرآن مجید میں اسی جگہ ہے۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ بدنصیب کفار مکہ مانیں یا نہ مانیں اللہ تعالیٰ شہادت دیتا ہے اور اعلان فرماتا ہے کہ "مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰه" (یہ محمد اللہ کے رسول ہیں)۔

صحابہ کے کمالِ ایمان کی گواہی

آگے فرمایا گیا ہے۔ "وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا" مطلب یہ ہے کہ ہمارے جو بندے ایمان لاکر دین کی دعوت اور جد و جہد میں ہمارے ان رسول کے ساتھ ہیں (یعنی آپ کے رفقاء صحابہ کرامؓ) ان کا یہ حال ہے کہ منکرین حق کفار و مشرکین کے مقابلہ میں پتھر کی چٹان کی طرح سخت اور مضبوط ہیں اور باہم یعنی اللہ و رسول کے وفادار بندوں کے لئے رحمدل اور نرم خو ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ ان کی محبت اور عداوت، اور سختی اور نرمی اب اپنے نفس کے لئے اور اس کے تقاضے کے تابع نہیں ہے بلکہ اللہ کی رضا کے تابع ہے، وہ اللہ کے اور اس کے دین کے دشمنوں کے مقابلہ میں لوہے کی دیوار کی طرح مضبوط اور سخت ہیں اور اس کے صاحبِ ایمان اور فرمانبردار بندوں کے لئے موم کی طرح نرم ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تزکیہ نفس کا کمال ہے کہ محبت وعداوت جیسے جذبات صرف رضائے الٰہی کے تابع ہو جائیں۔ قرآن مجید کا یہ بیان صحابہ کرامؓ کے حق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت ہے کہ ان کے نفوس کا کامل تزکیہ ہو چکا ہے۔ حدیث شریف میں ہے "من أحب لِلّٰه و أبغض لِلّٰه فقد استكمل الايمان" (جس کی محبت اور بغض وعداوت صرف اللہ کے لئے ہو اس کو ایمان کا کمال نصیب ہو گیا)۔ (۱)

آگے فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا محبت و عبدیت کا ایسا تعلق ہے کہ تم اُن کو دیکھو گے تو ایسی حالت میں دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب و جستجو میں وہ رکوع و سجود کی حالت میں یعنی نماز میں مشغول ہوں گے۔

آگے فرمایا گیا ہے "سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ" یعنی سجدوں کے اثر سے اُن کے چہروں میں ایک امتیازی علامت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صحابہ کرامؓ کے اوصاف و احوال بیان کئے جا رہے ہیں جو "وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ" کا مصداق ہیں، بلاشبہ اُن کے چہروں میں سجدوں کے اثر سے ایک خاص نورانیت تھی جو اُس دور میں اُن کا امتیاز تھا۔ اور اپنے اپنے حال کے مطابق اللہ کے مقبول اور عبادت گزار بندوں کے چہروں میں اُس طرح کے انوار اب بھی محسوس ہوتے ہیں۔

---

(۱) مشکوٰۃ کتاب الایمان بروایت ابوداؤد و ترمذی۔ (مرتب)

آگے فرمایا گیا ہے۔ "ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرَاۃِ" مطلب یہ ہے کہ اصحاب رسول کے یہ اوصاف جو یہاں بیان ہوئے پہلے تورات میں بھی بیان کئے جا چکے ہیں۔ آگے ارشاد ہوا ہے "وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ...... لِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّارَ" مطلب یہ ہے کہ انجیل میں ان اصحاب محمد کا حال اور ان کی مثال یہ بیان کی گئی ہے کہ جیسے کسان جب کھیت میں دانہ ڈالتا ہے تو ابتداء میں سوئی کی طرح باریک نرم و نازک ریشہ زمین سے نکلتا ہے جو بہت ہی کمزور اور بے جان ہوتا ہے، اس کے بعد تدریجاً اُس میں کچھ جان اور قوت آتی ہے اور وہ موٹا ہوتا ہے پھر ایک وقت آتا ہے کہ یہ پودا پورا نشو و نما پا کر اپنے تنہ پر قائم ہو جاتا ہے، اس حالت میں اُس کو دیکھ کر کسان کا دل باغ باغ ہوتا ہے۔ تو انجیل میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کی اور آپ کی جماعت کی یہی مثال بیان کی گئی ہے کہ کسان کی کھیتی کی طرح وہ شروع میں بظاہر کمزور سی جماعت ہوگی، پھر وہ برابر بڑھتی اور طاقتور ہوتی چلی جائے گی، پھر ایک وقت اپنے کمال کو پہنچ جائے گی۔ اور اس وقت دین حق کے منکرین و مخالفین ان کی ترقی اور ان کی طاقت دیکھ کر جلیں گے۔ "لِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّارَ"۔

حوالہ اصلی تورات و انجیل کا ہے

یہاں یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ علمی اور تاریخی طور پر اب یہودی اور عیسائی بھی یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ وہ تورات دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی اور وہ انجیل دنیا میں کہیں نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ کے ذریعہ آئی تھی۔ آج تورات و انجیل کے نام کی جو کتابیں ہیں ان کو قابل اعتماد ''ترجمہ'' بھی نہیں کہا جا سکتا۔ خود ان ہی کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک کی اس آیت میں جس مضمون کا حوالہ دیا گیا ہے وہ یقیناً اصل تورات و انجیل میں اسی طرح تھا۔ اگر دنیا میں کہیں اُس تورات و انجیل کے نسخے مل جائیں تو اس میں یہ مضمون دیکھا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں مختلف زبانوں میں تورات و انجیل کے نام سے جو کتابیں چل رہی ہیں اگرچہ علمی اور تاریخی حیثیت سے وہ قطعاً ناقابل اعتماد ہیں لیکن ان میں بھی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کے متعلق پیشینگوئی کی شکل میں ایسے مضامین موجود ہیں جو قرآن پاک کے اس بیان سے بہت قریب ہیں۔ حضرت مولانا رحمت اللہ

کیرانوی جنہوں نے تورات وانجیل وغیرہ کتب قدیمہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور عیسائیت کی رد میں انہوں متعدد لاجواب اور یادگار کتابیں لکھی ہیں (جن کے ترجمے بھی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں) انہوں نے تورات وانجیل کے موجودہ نسخوں سے بھی ایسی عبارتیں نقل کی ہیں جن سے قرآن پاک کے اس بیان کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے۔ ان کی نہایت اہم کتاب ''اظہار الحق'' کا اردو ترجمہ حال ہی میں تین جلدوں میں پاکستان میں شائع ہوا ہے۔ اُس میں یہ بحث بڑی تفصیل سے کی گئی ہے۔ تفسیر حقانی کے مصنف مولانا عبدالحق حقانی دہلوی نے بھی تورات وانجیل کی وہ عبارتیں اپنی تفسیر میں نقل کی ہیں اور بہت اچھی بحث کی ہے۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے اور یہی سورت کی آخری آیت ہے "وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّأَجْراً عَظِيْماً'' مفسرین نے عام طور سے اس آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب (جن کا "وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ'' کے الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے اور جن کی صفت "أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ'' بیان کی گئی ہے) ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کی بنا پر اُن کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ ہے۔(۱)

اس وعدے اور بشارت کے لئے ''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' کا یہ عنوان غالباً اس لئے اختیار فرمایا گیا ہے کہ صحابہ کرامؓ ایمان اور عمل صالح کے بارے میں برابر سرگرم رہیں، مغفرت اور اجر عظیم کے اس وعدے کی وجہ سے اور اس سورت کی دوسری بشارتوں پر بھروسہ کر کے غافل نہ ہو جائیں اور سست نہ پڑ جائیں۔ ایک فائدہ اس کا یہ بھی ہے کہ دوسروں کو بھی معلوم ہو جائے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کو اپنا کر وہ بھی ''مغفرت'' اور ''اجر عظیم'' حاصل

(۱) ہم طالب علموں کی زبان میں کہا جائے گا کہ ان مفسرین نے "منھم" کے لفظ "من" کو بیانیہ مانا ہے اور قرآن مجید میں ایسا بکثرت آیا ہے۔ (نعمانی) راقم مرتب کا گمان ہے کہ اس موقع پر حضرت والد ماجدؒ کے سامنے شاید حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا تفسیری حاشیہ نہ تھا اور نہ وہ اسی کو پسند فرماتے جو اُن کے ترجمے کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا تھا جس میں مِنْ کو "بیانیہ" نہیں مانا گیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں "یہ وعدہ دیا ان کو جو ایمان والے ہیں اور بھلے کام کرتے ہیں۔ حضرت کے سب اصحاب ایسے ہی تھے۔ مگر خاتمہ کا اندیشہ رکھا۔ حق تعالیٰ بندوں کو ایسی صاف خوشخبری نہیں دیتا کہ نڈر ہو جائیں، اُس مالک سے اتنی شاباشی بھی غنیمت ہے۔'' حضرت شاہ صاحبؒ نے "منھم" کو اس کے ظاہری مفہوم ہی پر رکھ کر ایسی خدا لگتی بات فرما دی کہ دشمنانِ صحابہ کیلئے اِس ظاہری مفہوم سے بھی فائدہ اٹھانے کی گنجائش نہیں رہ گئی۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون سب کے لئے اور ہر زمانے کے مومنین صالحین کے لئے ہے۔ اگر ہم آپ ایمان اور اعمال صالحہ کو اپنا لیں جیسا کہ اس کا حق ہے تو ہم بھی ''مغفرت'' اور ''اجر عظیم'' کے انعام کے انشاء اللہ مستحق ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔



سورۃ البیّنۃ

درس ـ ۴۳

سورۃ البینہ

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعُوذُ باللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم۔ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ط

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ
مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا
مُّطَهَّرَةً ۝ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا
مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ
مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لا حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ
وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط اُولٰٓئِكَ هُمْ
شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لا اُولٰٓئِكَ هُمْ
خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ط رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا
عَنْهُ ط ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝ (سورۃ البینہ)

(ترجمہ) اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے کفر وانکار کی راہ اختیار کی وہ باز آنے والے نہیں تھے جب تک کہ ان کے پاس "بَیِّنَۃ" (ایک روشن دلیل) نہ آ جائے۔ (یعنی) ایک رسول جو تلاوت کرتا ہو (پڑھ کر سناتا ہو) مقدس صحیفے۔ ان میں لکھی ہوئی سچی اور پکی باتیں۔ اور نہیں اختلاف کیا اہل کتاب نے مگر بعد اس کے کہ آ گئی ان کے سامنے وہ روشن دلیل۔ اور ان کو کوئی حکم نہیں دیا گیا سوا اس کے کہ اللہ ہی کی عبادت و بندگی کریں

اخلاص کے ساتھ اسی کی بندگی، بالکل اُسی کے ہو کر۔ اور اہتمام سے نماز ادا کیا کریں اور زکوٰۃ دیا کریں۔ اور یہی طریقہ ہے ملتِ قیِّمہ کا۔

بیشک اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے کفر وانکار کی راہ اختیار کی وہ دوزخ کی آگ میں پڑیں گے، ہمیشہ اُسی میں رہیں گے، یہ سب لوگ بدترین خلائق ہیں۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے، وہ سب بہترین خلائق ہیں۔ اُن (کے ایمان اور نیک عمل) کی جزا اُن کے رب کے پاس غیر فانی (سدا بہار) بہشتی باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔ یہ (جنت اور رضائے الٰہی کا انعام) اُن کے لئے ہے جن (کے دل) میں اپنے رب کی خشیت ہے۔

تفسیر وتشریح

پچھلے ہفتے ''سورۃ القدر'' کا درس تھا، (۱) اس میں 'لیلۃ القدر'' کی عظمت بیان فرما کر قرآن مجید کی عظمت بیان فرمائی گئی تھی کہ یہ مقدس کتاب ایسی مبارک اور عظیم الشان رات میں نازل فرمائی گئی ہے۔ اب اِس سورت سورۂ بینہ میں ایک دوسرے پہلو سے قرآن پاک اور اس کے لانے والے جلیل القدر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت بیان فرما کے اُن پر ایمان لانے والوں اور انکار وتکذیب کرنے والوں کا انجام بیان فرمایا گیا ہے۔

سورہ کا خاص پس منظر

اس سورت کا خاص کر اس کی ابتدائی آیات کا مطلب سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ واقعی حقیقت آپ کے پیش نظر ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی آمد اور بعثت سے پہلے اہل کتاب یہود ونصاریٰ تورات وانجیل وغیرہ اگلے آسمانی صحیفوں اور اپنی مذہبی روایات کی بنا پر ایک ایسے جلیل القدر پیغمبر کی آمد کا یقین رکھتے تھے اور اُس کے منتظر تھے جو اللہ کا کلام لے کر آئے گا اور باطل کی اندھیریوں کو ختم کر کے حق کی روشنی پھیلائے گا، اور حق کے مقابلہ میں سرکشی کرنے والوں کو اللہ کی مدد سے مغلوب کر کے دین حق کا بول بالا کرے گا۔ اُن کو اِس کا ایسا یقین تھا کہ

(۱) افسوس ہے کہ وہ درس دستیاب نہیں ہو سکا۔ (مرتب)

اہل کفر وشرک کے مقابلہ میں جب کبھی یہ اہل کتاب مغلوب ہوتے تو دعا کرتے تھے کہ اللہ اُس پیغمبر کو دنیا میں جلدی بھیج دے تاکہ اس کے ساتھ ہو کر ہم اِن کافروں مشرکوں پر فتح حاصل کریں۔ اُن کی اس حالت کا ذکر قرآن پاک سورۂ بقرہ میں ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے

"وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" (البقرہ آیت۔۸۹)

واقعہ یہ ہے کہ توراۃ وانجیل کے نام سے آج جو کتابیں ہماری اس دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ اُن کے متعلق کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یہ وہی کتابیں ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھیں یا یہ اُن کے صحیح ترجمے ہی ہیں۔ خود یہود اور عیسائی محققین کو اس کا اقرار ہے کہ اصل توراۃ وانجیل تو دنیا میں کہیں بھی نہیں ہے اور ان موجودہ مطبوعہ نسخوں کو اُن کا صحیح اور مستند ترجمہ بھی نہیں کہا جاسکتا (۱) اور خود اِن کتابوں کو دیکھ کر پڑھ کر ہر منصف مزاج یہی فیصلہ کرے گا کہ یہ ہرگز اللہ کی نازل کی ہوئی کتابیں نہیں ہوسکتیں۔ خاص کر انجیل کا حال تو یہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح حیات بھی نہیں، بس مختصر میلادنامہ اور وفات نامہ ہے جس میں اُن کی پیدائش کا اور عیسائی عقیدہ کے مطابق صلیب کے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اُس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کچھ نصیحتیں بھی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ الہامی ہوں۔ توراۃ وانجیل اور دوسرے صحفِ انبیاء اگر اصل شکل میں موجود ہوتے تو ہم آپ دیکھ سکتے تھے کہ اُن میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر کتنی تفصیل سے کیا گیا ہے اور کیسی واضح علامتیں بیان کی گئی ہیں...... قرآن پاک سورۂ اعراف میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے "اَلنَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ" (یعنی توراۃ وانجیل کے ماننے والے یہود ونصاریٰ نبی اُمی ﷺ کو لکھا ہوا پاتے ہیں توراۃ وانجیل میں) (۲) اس سے معلوم ہوا کہ توراۃ وانجیل میں حضور ﷺ کا ایسا مفصل ذکر تھا گویا خود آپ اس کے صفحات پر لکھے ہوئے تھے، قرآن پاک ہی میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے "يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ" یعنی یہ اہل کتاب رسول اللہ ﷺ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اس سے

---

(۱) اس سلسلے میں یہودی اور عیسائی اہل علم وتحقیق کے اقوال مولانا دریا آبادی مرحوم کی تفسیر ماجدی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ (نعمانی)

(۲) اس آیت پر درس گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔ (مرتب)

بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگلی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کا سراپا بھی ذکر کیا گیا تھا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کو اگلے انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں اور اپنی مذہبی روایات سے رسول اللہ کا حلیۂ مبارک بھی اتنی تفصیل سے معلوم تھا کہ اس کی روشنی میں انہوں نے آپ کی تصویریں بنالی تھیں۔ حدیث کی بعض کتابوں میں حضرت جُبیر بن مُطعم صحابیؓ سے یہ عجیب وغریب واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ میں نے اسلام لانے سے پہلے تجارتی سلسلہ میں شام کا ایک سفر کیا تھا۔ مجھے وہاں اہل کتاب میں سے ایک شخص ملا (جو غالباً اُن کا کوئی بڑا عالم رہا ہوگا) اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں مکہ کا رہنے والا ہوں تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے ہاں کسی شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ میں نے کہا ہاں ایک شخص ہے جو کہتا ہے کہ مجھے اللہ نے اپنا پیغمبر بنایا ہے۔ اُس نے کہا کہ تم اگر ان کی تصویر دیکھو تو پہچان لوگے؟ میں نے کہا کیوں نہیں وہ ہمارے ہی قبیلہ قریش کا ایک آدمی ہے۔ پھر وہ مجھے ایک عمارت میں لے گیا وہاں اس نے مجھے ایک تصویر دکھلائی جو رسول اللہ ﷺ کی تصویر تھی۔ میں نے کہا ہاں یہ اسی شخص کی تصویر ہے۔ اور یہ تصویر اس طرح بنائی گئی تھی کہ پیچھے ایک دوسرا شخص بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ آپ کی ایڑیوں پر تھے۔ یہ دوسری تصویر ابوبکر ابن ابی قحافہ کی تھی (جو سب سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان لائے اور آپ ﷺ کے رفیق خاص تھے) جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ جس شخص نے مجھے یہ تصویر دکھلائی میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے اور اس کا کیا مطلب ہے؟ اُس نے کہا کہ پہلے جو انبیاء آتے تھے تو اُن کے بعد بھی نبی آتے تھے۔ لیکن اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، یہ اللہ کے آخری نبی ہیں، ہاں ان کے بعد اِن کے خلفا ہوں گے۔ اور یہ شخص جو تصویر میں پیچھے بیٹھا دکھلائی دے رہا ہے یہی ان کے بعد ان کا خلیفہ ہوگا۔(۱)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اگلی کتابوں اور اہل کتاب کی مذہبی روایت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کے خلفاء اور خاص رفقا کا بھی ایسا تذکرہ تھا کہ اس کی روشنی میں ان کی بھی تصویر بنائی جاسکتی تھی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ''ازالۃ الخفا'' میں حضرت عمرؓ سے متعلق ایسی متعدد روایتیں

---

(۱) جبیر بن مطعم کی یہ روایت ''جمع الفوائد'' میں طبرانی کی ''معجم کبیر'' اور ''معجم اوسط'' کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے، درس میں جو بیان کیا گیا ہے وہ روایت کا مختصر حال ہے۔ (جمع الفوائد۔ص ۴۵۲، ج ۲)(محمد منظور نعمانی)

نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلی کتابوں اور اہل کتاب کی مذہبی روایات میں حضرت فاروق اعظمؓ کی بھی ایسی جسمانی علامتیں مذکور تھیں کہ علمائے اہل کتاب ان کو دیکھ کر پہچان لیتے تھے۔ ایسے واقعات بھی نقل کئے گئے ہیں کہ شام کے علاقہ کے بعض راہبوں نے ان کو زمانۂ جاہلیت میں دیکھ کر یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ نبی آخرالزماں کے خلیفہ ہوں گے اور ہمارا علاقہ اُن کے زیر اقتدار آئے گا۔ اس سلسلہ کا ایک عجیب وغریب واقعہ نقل کیا گیا ہے۔

ایک ایمان افروز واقعہ

یہ بات تو آپ سب ہی حضرات کے علم میں ہوگی کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں فلسطین فتح ہوا جس میں بیت المقدس ہے تو وہاں کے ذمہ داروں نے اصرار کیا کہ خود امیر المؤمنین یہاں تشریف لائیں۔ یہ بات آپ تک پہنچائی گئی تو صحابہ کرامؓ کے مشورہ کے بعد آپ نے ارادہ فرمالیا، یہ بھی آپ حضرات نے سنا ہوگا کہ یہ سفر آپ نے اس طرح کیا کہ آپ کے ساتھ آپ کا غلام تھا اور ایک ہی اونٹ تھا، ایک منزل آپ خود سوار ہوتے اور غلام پیدل چلتا، دوسری منزل غلام کو اونٹ پر سوار کردیتے اور خود پیدل چلتے۔ شام ہی کے علاقہ میں کوئی مقام جابیہ تھا۔ اس سفر میں آپ نے جاتے ہوئے یا واپسی میں وہاں قیام فرمایا اور علاقہ کے لوگوں کو جمع کر کے اُن سے خطاب فرمایا۔ (۱) اس سلسلہ میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ جب خطبہ دے کر فارغ ہوئے تو ایک بہت بوڑھا راہب اٹھا جس کی بھویں بھی سفید ہوگئی تھیں، اور اُس نے ایک کاغذ حضرت کے ہاتھ میں دیا۔ آپ نے بہت غور سے بار بار اس کاغذ کو دیکھا اس کے بعد اس راہب سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"لیس لعمر ولا لابنہ انما انا واموال المسلمین کولی الیتیم واموالہ"	یہ نہ میری ملکیت ہے نہ میرے بیٹے کی، یہ عام مسلمانوں کی ملکیت ہے اور میں اس کا ایسا ہی متولی ہوں جیسا کہ یتیم کے مال وجائداد کا متولی ہوتا ہے۔

اس راہب نے تو یہ سمجھ لیا ہوگا کہ آپ کس چیز کے بارہ میں یہ فرمارہے ہیں، لیکن اور

(۱) "کنزالعمال" کے مختلف ابواب کی روایات میں حضرت فاروق اعظمؓ کے اس خطبہ جابیہ کا ذکر اور اس کے کچھ اجزاء ملتے ہیں۔ (محمد منظور نعمانی)

حاضرین نے کچھ نہیں سمجھا تو آپ سے دریافت کیا گیا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ تو آپ نے یہ عجیب وغریب واقعہ بیان فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت میں اپنی جوانی کے دور میں ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ میں اس ملک میں یعنی شام میں آیا تھا جب ہمارا قافلہ واپس ہوا اور کچھ دور نکل آیا تو مجھے یاد آیا کہ بھول کے میں فلاں چیز چھوڑ آیا، میں نے ساتھ والوں کو بتلایا اور کہا کہ آپ لوگ اسی طرح چلتے رہیں راستہ کھوٹا نہ کریں، میں دوڑ کے جاتا ہوں اور آ کر آپ سے مل جاؤں گا۔ چنانچہ میں واپس لوٹا اور اپنا بھولا ہوا سامان لے کر تیزی سے آیا، لیکن غلط راستہ پر پڑ گیا، اس وجہ سے قافلہ سے بچھڑ گیا۔ رات کا اندھیرا ہو گیا تھا اور میں تھک بہت گیا تھا، کہیں پڑ جانا چاہتا تھا۔ ایک روشنی نظر آ رہی تھی میں اس کے رخ پر چلا گیا یہ عیسائیوں کا ایک کلیسا تھا، دروازہ بند تھا، میں وہیں پڑ گیا، صبح ہوئی تو کلیسا کے راہب نے دروازہ کھولا اس نے مجھے دیکھا اور بہت غور سے دیکھتا رہا، پھر اس نے پوچھا تم کہاں کے رہنے والے ہو اور کیسے یہاں آئے ہو؟ میں نے بتلایا کہ میں مکہ کا رہنے والا ہوں اور اپنا پورا قصہ بتایا، اس نے میرا نام پوچھا میں بتلا دیا۔ پھر میرے باپ کا نام اور قبیلہ کے بارے میں پوچھا میں نے وہ بھی بتلا دیا اور بھی کچھ باتیں پوچھیں جن کا میں نے جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے بڑی عنایت اور شفقت کا اظہار کیا اور مجھے کلیسا کے اندر لے گیا۔ اس نے کہاں میرا اندازہ ہے تم نے کچھ کھایا بھی نہیں ہے، پھر اس نے میرے کھانے کا انتظام کیا اور مجھے کھلایا۔ اس کے بعد میں نے اس سے اجازت چاہی تو اس نے کہا آپ سے میری ایک درخواست ہے۔ اس نے مجھے کاغذ دیا اور کہا کہ اس پر بس اتنا لکھ دیجئے کہ اس کلیسا سے متعلق جو جاگیر ہے وہ میں نے بحال رکھی۔ میں نے کہا کہ میں پردیسی ہوں میرا اس سے کیا تعلق؟ اس نے کہا کہ میری یہی درخواست ہے آپ بس اتنا اپنے قلم سے لکھ دیجئے۔ میں نے سمجھا کہ وہ مجھ سے تمسخر کر رہا ہے اور میرا مذاق بنا رہا ہے۔ میں نے کہا:

ایھا الشیخ صنعت الیّ معروفاً فلا تُضَیِّعْهُ.	اے بزرگ آپ نے میرے ساتھ بڑے احسان کا معاملہ کیا ہے۔ اس تمسخر سے آپ اس کو مکدر نہ کیجئے۔

اس راہب نہ اس کے بعد بھی مجھ سے اصرار کے ساتھ وہی کہا، تو جو کچھ اس نے مجھ سے لکھنے کو کہا وہ میں نے لکھ دیا۔

یہ کاغذ جو اِس وقت اس بوڑھے راہب نے مجھے دیا ہے یہ وہی کاغذ ہے اور میں نے پہچانا یہ بزرگ وہی راہب ہے۔ میری اس تحریر کی بنا پر اس کا مطالبہ ہے کہ اس علاقہ میں اس کلیسا کی جو جاگیر ہے وہ اسی طرح بحال رہے۔ اور میں اس بزرگ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ میں خود یا میرا بیٹا اس کا مالک نہیں ہے اس لئے مجھے کوئی اختیار نہیں ہے، میری حیثیت تو بس وہ ہے جو یتیم کے مال کے متولی کی ہوتی ہے، متولی اپنی مرضی سے یتیم کا مال کسی دوسرے کو نہیں دے سکتا۔

اب اس بوڑھے بزرگ راہب سے لوگوں نے دریافت کیا تو اس نے بتلایا کہ میں نے جب ان کو دیکھا تھا تو مجھے وہ علامتیں محسوس ہوئی تھیں جو ہماری کتابوں اور ہماری روایات میں نبی آخر الزماں کے اس خلیفہ کی بتلائی گئی ہیں جن کا اقتدار بیت المقدس پر قائم ہوگا۔ پھر جب میں نے ان کا نام پوچھا تو مجھے اس کا پورا یقین ہوگیا۔ آگے غالباً یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس بزرگ راہب نے اس موقعہ پر اسلام بھی قبول کرلیا۔(۱)

بہرحال یہ واقعہ بھی اس بات کی شہادت ہے کہ اگلے انبیاء کے صحیفوں اور اہل کتاب کی مذہبی روایات میں رسول اللہ ﷺ کا بلکہ آپ کے خلفاء کا بھی اور ان کے ذریعہ برپا ہونے والے دینی انقلاب کا بھی ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا تھا۔

الغرض اہل کتاب اپنے کتابی علم اور اپنی مذہبی روایات کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کے ظہور کے منتظر تھے اور ان میں جو گمراہیاں اور غلط کاریاں آگئی تھیں، ان کے بارہ میں وہ کہا کرتے تھے کہ ہم ان گندگیوں سے جب ہی نکلیں گے جب اللہ کے اُس جلیل القدر پیغمبر کا ظہور ہوگا۔ جو اللہ کا کلام لے کر آئے گا اور تاریکیوں کو شکست دے کر دنیا میں روشنی پھیلائے گا۔

مشرکین مکہ بھی بالکل بے خبر نہ تھے

مشرکین مکہ کے بارہ میں اس طرح کی کوئی واضح بات تو میرے علم میں نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید میں بیان فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام جب خانہ کعبہ کی تعمیر کررہے تھے تو انہوں نے خاص طور سے یہ دعا کی تھی کہ اے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار

---

(۱) اس عاجز نے درس قرآن میں یہ واقعہ یادداشت ہی کی بنا پر ذکر کیا تھا، خیال یہی ہے کہ یہ ''ازالۃ الخفاء'' میں ذکر کیا گیا ہے اس وقت وہ کتاب سامنے نہیں ہے ممکن ہے بیان میں کچھ فرق پڑ گیا ہو۔ (محمد منظور نعمانی)

بندہ بنادے اور ہماری نسل میں ایک فرمانبردار امت ہو اور اُن میں ایک رسول بھی انہی میں سے مبعوث فرما جوان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے، اور کتاب وحکمت کی ان کو تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، ان کو پاک باطن بنائے۔ حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کی یہ دعا قرآن مجید میں ذکر فرمائی گئی ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ مکہ کے قریش حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کی نسل سے تھے اور اپنے کو ملت ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے اور حج وقربانی جیسے ملت ابراہیمی کے بعض اعمال بھی اُن میں رائج تھے۔ تو قیاس کہتا ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں یہ بات بھی ان کی روایات میں رہی ہوگی کہ حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام نے ایسی دعا کی تھی اور اس بنا پر وہ بھی اپنی قوم میں کسی نبی کے ظہور کے منتظر ہوں گے۔ (خواہ وہ نبوت کے صحیح تصور سے نا آشنا رہے ہوں) اور ان میں بھی اس طرح کے لوگ ہوں گے جو کہا کرتے ہوں گے کہ جب ہماری قوم میں اُس نبی کا ظہور ہوگا تو ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اسی کا اتباع کریں گے...... سورۂ ''فاطر'' مکی سورت ہے اُس میں مشرکین ہی کے بارہ میں یہ آیت ہے۔ ''وَأَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَ هُمْ نَذِيْرٌ لَيَكُوْنُنَّ أَهْدَىٰ مِنْ إِحْدَى الْأُمَمِ، فَلَمَّا جَاءَ هُمْ نَذِيْرٌ مَا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُوْرًا''...... یعنی یہ مشرکین بڑی قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے کہ اگر (اللہ کی طرف سے) کوئی آگاہی دینے والا اور ہدایت کرنے والا آئے گا تو ہم اس کی پیروی اختیار کر کے ہر ایک امت سے زیادہ ہدایت یاب ہوں گے۔ لیکن جب اللہ کی طرف سے وہ آگاہی دینے والا آیا (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنا کر کھڑا کیا، اور آپ نے کفر وشرک کے انجام اور آخرت کے بارہ میں آگاہی دی) تو بجائے قبول کرنے اور پیروی اختیار کرنے کے وہ اور دور بھاگے۔

بہر حال اس آیت سے اشارہ ملتا ہے کہ اہل کتاب کے علاوہ مشرکین بھی کسی نبی اور ہادی کی آمد کے منتظر تھے۔ واللہ اعلم

آیاتِ سورہ کی تشریح

الغرض اس سورۂ ''بَيِّنَة'' کو سمجھنے کے لئے یہ پس منظر ذہن میں رکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اہل کتاب اپنے کتابی علم اور اگلے پیغمبروں کی پیشین گوئیوں کی روشنی میں اور

مشرکین بھی غالباً اپنی روایات کی بنا پر ایک جلیل القدر اور صاحب برہان پیغمبر کے ظہور کے منتظر تھے جو اللہ کا کلام لے کر آئے اور اُس کے ذریعہ دنیا میں روشنی پھیلے، اور اِس بنا پر وہ کہا کرتے تھے کہ جب تک وہ پیغمبر نہیں آتا اُس وقت تک تو ہم اپنے حال میں رہیں گے، اور جب وہ ظاہر ہوگا اور اللہ کا پیغام لے کر آئے گا اور دعوت و تعلیم دے گا تو ہم اس کی دعوت پر لبیک کہہ کے اس کا اتباع کریں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب وہ رسول، اللہ کا کلام لے کر آیا تو یہ اہل کتاب و مشرکین (چند باتوفیق بندوں کے سوا) اُس کے مخالف اور دشمن بن کے کھڑے ہو گئے...... اس سورت (سورۂ بیّنہ) کی ابتدائی آیتوں میں اسی صورت حال کا بڑے لطیف انداز میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ...... فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ".

مطلب یہ ہے کہ یہ اہل کتاب اور مشرکین جنہوں نے اللہ کے نبی اور اس کی کتاب کے انکار اور کفر کی راہ اختیار کی ہے یہ تو (بقول خود) باز آنے والے نہیں تھے اپنے طور طریقوں سے یہاں تک کہ آئے اُن کے پاس ایک روشن برہان یعنی ایسا رسول جو تلاوت کرتا اور پڑھ کر سناتا ہو مقدس صحیفے جن میں لکھی ہوں سچی پکی باتیں۔ یعنی اِن سے توقع کی جاسکتی تھی کہ جب اللہ کی طرف سے ایسا رسول آئے گا تو وہ سب سے پہلے اس کی دعوت پر لبیک کہیں گے۔

لیکن جب وہ وقت آیا

لیکن ہوا یہ کہ "وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ"، خاص کر وہ اہل کتاب جو انبیاء سابقین کے صحیفوں اور اپنی مذہبی روایات کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے بارہ میں زیادہ علم رکھتے تھے اور اُن کے لئے شک شبہ کی بھی گنجائش نہیں تھی لیکن انہوں نے بھی قبول کرنے کے بجائے اختلاف کیا اور دعوت پر لبیک کہنے کے بجائے دور بھاگے۔

یہاں صرف اہل کتاب کا ذکر فرمایا گیا کیونکہ یہ بات اِن کے حال سے بہت بعید تھی پس جب یہ دور بھاگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ مشرکین بھی دور بھاگے۔ علاوہ ازیں اس بارہ میں

اہل کتاب اور مشرکین میں ایک فرق یہ بھی رہا کہ شروع میں اگر چہ مشرکین نے سخت اختلاف کیا اور انتہائی شقاوت و بدبختی کا مظاہرہ کیا لیکن بعد میں آہستہ آہستہ وہ قبول کرتے رہے یہاں تک کہ آخر میں عرب کے قریباً سارے ہی مشرکین نے قبول کرلیا، لیکن اہل کتاب میں سے بہت کم افراد کو توفیق ملی۔ ان کا جرم اس لحاظ سے بھی بڑا ہے کہ انہوں نے اچھی طرح جاننے پہچاننے کے بعد بھی کفر و انکار کی راہ اختیار کی۔ اِن کا حال تو یہ تھا کہ رسول اللہ کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے "یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَ ھُمۡ. اور...... فَلَمَّا جَآءَ ھُمۡ مَّا عَرَفُوۡا کَفَرُوۡا بِہٖ"

نئے پیغمبر کی دعوت میں کوئی نئی بات نہ تھی

آگے فرمایا گیا ہے "وَمَآ اُمِرُوۡٓا اِلَّا لِیَعۡبُدُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ حُنَفَآءَ وَیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ"...... مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کے اختلاف کرنے اور دور بھاگنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہمارے اس رسول نے کوئی ایسا حکم دیا ہو جو قابل قبول نہیں تھا یا جو اگلے پیغمبروں نے نہیں دیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا، صرف تین باتوں کا حکم دیا تھا۔ اوّل توحید خالص، یعنی یہ کہ صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں، اس کے سوا کسی سے عبودیت اور بندگی کا رشتہ نہ ہو، اپنے جدِ اعلیٰ امام الانبیاء ابراہیم علیہ السلام کی طرح بس اُسی کی طرف رخ کرلیں اور اسی کے ہوجائیں۔ "حُنَفَآءَ" کا یہی مطلب ہے۔ دوسرا حکم یہ دیا گیا تھا کہ اہتمام سے نماز ادا کیا کریں اور تیسرا حکم یہ کہ زکوٰۃ ادا کیا کریں (یعنی اپنی کمائی ہوئی دولت میں سے اللہ کے حکم کے مطابق اس کی راہ میں خرچ کیا کریں) ظاہر ہے کہ اِن میں کوئی حکم بھی ایسا نہیں ہے جو نا قابل قبول ہو اور جو اگلے پیغمبروں کی شریعت میں نہ دیا گیا ہو، ہر آسمانی شریعت کے بنیادی حکم یہی رہے ہیں۔ اور یہ تینوں باتیں انسانی عقل و فطرت کے بھی مطابق بلکہ اس کا تقاضا ہیں۔

تکذیب کا انجام

آگے اہل کتاب اور مشرکین کے اس کفر و انکار کے انجام اور اس کی اخروی سزا کا

بیان فرمایا گیا ہے اور اسی کے ساتھ ایمان لانے والوں اور احکام خداوندی کے مطابق عمل کرنے والوں کو اخروی جزا اور انعامات الٰہی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَالْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اُوْلٰئِکَ ھُمْ شَرُّ الْبَرِیَّۃِ"۔ مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین میں جن لوگوں نے اللہ کی طرف سے اُس جلیل القدر رسول کے آجانے کے بعد جو اُس کا کلام اور اس کے احکام لے کر آیا، ایمان لانے کے بجائے کفروانکار کا رویہ اختیار کیا، اُن کے متعلق اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ آخرت میں دوزخ کی آگ میں ڈالے جائیں گے اور اُسی میں پڑے رہیں گے۔ ان کو عذاب سے کبھی نجات اور رہائی نہیں ملے گی۔

سوچنے کی بات

سوچنے کی بات ہے کہ اِس دنیا کی آگ میں بھی اگر کوئی آدمی ایک سکنڈ کے لئے ڈال دیا جائے تو اس کو ایسی تکلیف ہوگی کہ اُس سے زیادہ تکلیف کا اس دنیا میں تصور نہیں کیا جاسکتا۔ پھر کیا حال ہوگا اُس آدمی کا جو آخرت کی اور دوزخ کی اُس آگ میں جو ہماری آگ سے بدرجہا زیادہ جلانے والی ہے، لاکھوں کروڑوں برس پڑا رہے گا اور کبھی اُس سے نجات نہ پاسکے گا، اور اس کو موت بھی نہیں آئے گی، قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے "لَا یُقْضٰی عَلَیْھِمْ فَیَمُوْتُوْا" دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ وہ جہنمی چلائیں گے اور داروغۂ جہنم سے درخواست کریں گے "لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّکَ" کہ تمہارا خدا ہم کو موت دے دے، جواب ملے گا "اِنَّکُمْ مّٰکِثُوْنَ" یعنی تمہارے لئے فیصلہ ہے کہ تم کو موت بھی نہیں آئے گی اور رہائی بھی نہیں ملے گی اس طرح ہمیشہ ہمیشہ اس آگ میں جلتے بھنتے رہو گے۔ "اَللّٰھم احفظنا اللّٰھم احفظنا، اللّٰھم إنا نعوذبک من عذاب النار. اللّٰھم إنا نعوذبک من عذاب النار. اللّٰھم إنا نعوذبک من عذاب النار.

آخر میں فرمایا گیا ہے "اُوْلٰئِکَ ھُمْ شَرُّ الْبَرِیَّۃِ" یہ کفروانکار کا رویہ اختیار کرنے والے اہل کتاب اور مشرکین اللہ کی نظر میں بدترین خلائق ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو کوئی ہمیشہ کے لئے دوزخ کا ایندھن بنے وہ بدترین خلائق ہے، اُس سے زیادہ بدنصیب کوئی مخلوق نہیں۔

آگے ایمان لانے والوں اور ایمان والوں کی سی عملی زندگی گزارنے والوں کا حسنِ انجام بیان فرمایا گیا ہے اور ان کو بشارت سنائی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

''اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ، جَزَآءُ ھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ، خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا، رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ، ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ''

مطلب یہ ہے کہ جو بندے اللہ کے اُس رسول پر اور اس کی لائی ہوئی کتاب پر ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیے، یعنی اس رسول کی تعلیم وہدایت کے مطابق عملی زندگی گزاری وہ اللہ کی نظر میں بہترین خلائق ہیں، اُن کا صلہ اُن کے پروردگار کے ہاں وہ بہشتی باغات ہیں جو کبھی فنا نہ ہوں گے اور کبھی ان پر خزاں نہ آئے گی وہ ہمیشہ سدا بہار رہیں گے۔ ''جَنّٰتُ عَدْنٍ'' کا یہی مطلب ہے، ان باغات کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ انسان کی فطرت ایسے سرسبز وشاداب باغیچوں کو چاہتی ہے اور اُن کے نظارے سے خاص لذت ومسرت حاصل کرتی ہے جن میں نہریں جاری ہوں۔

جنت سے مراد ''جنت مع لوازمات'' ہے

یہاں اور اس کے علاوہ بھی بہت سے مقامات پر مومنین صالحین کے لئے صرف جنت کا ذکر کیا گیا ہے لیکن مراد ہے ''جنت ومافیہا'' یعنی جنت اور وہ سب کچھ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لطف وعیش کے لئے وہاں رکھا ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے ''وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ، نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ'' یعنی جنت میں تمہارے لئے وہ سب کچھ ہوگا جس کو تمہارا جی چاہے گا اور جو تم طلب کرو گے، یہ میزبانی ہوگی ربِّ غفور ورحیم کی طرف سے۔ دنیا میں کسی کے لئے اس کا امکان نہیں ہے کہ اس کی سب خواہشیں پوری ہوں لیکن جنت میں ایسا ہی ہوگا کہ بندے کی جو خواہش اور چاہت ہوگی وہ پوری ہوگی وہ وہاں اپنے غفور ورحیم پروردگار کا مہمان ہوگا اور وہ رب کریم اُس کا میزبان۔ ذرا تصور تو کیجئے اِس خوش نصیبی کا۔ اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر جنت کی امید نہ ہوتو اس دنیا کی زندگی بالکل فضول [illegible] جنت کو حاصل کرنے کے لئے نہ

دولت کی ضرورت ہے نہ عالم فاضل ہونے کی۔ بس ایمان اور عمل صالح، یہی جنت کا ٹکٹ ہے، اِس کو ہر غریب ہر امیر، ہر بوڑھا، ہر جوان، مرد، عورت، پڑھے لکھے اور بے پڑھے لکھے سب حاصل کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اِن حقیقتوں کا یقین نصیب فرمائے اور توفیق دے۔

آگے فرمایا گیا ہے "خٰلِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا" یہ خوش نصیب بندے جنت میں پہنچنے کے بعد ہمیشہ اسی میں رہیں گے، یہ بھی بڑی عظیم بشارت ہے۔ اس دنیا میں کسی کو عیش کے وہ سارے سامان نصیب ہوں جو یہاں ممکن ہیں۔ لیکن یقین ہے کہ ایک دن موت آئے گی، اور مجھے کوٹھی، موٹر، باغ، بیوی، اولاد وغیرہ عیش وراحت کے سارے سامانوں کو چھوڑ کے اکیلے خالی ہاتھ جانا ہوگا۔ بس اس کا خیال ہی سارے عیش کو مکدر اور گدلا کر دیتا ہے۔

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم
جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

اِس کے آگے مومنین صالحین کو جنت اور اس کی نعمتوں سے بھی بڑی اور بہت بڑی ایک نعمت کی بشارت سنائی گئی ہے فرمایا گیا ہے۔ "رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ" (اللہ جل شانہ اپنے اِن بندوں سے راضی خوش ہوگا اور یہ بندے اس سے راضی خوش ہوں گے۔

حدیث شریف میں ہے کہ اہل جنت جب جنت میں پہنچ جائیں گے اور وہاں کی نعمتوں، راحتوں، لذتوں سے لطف اندوز ہوں گے تو اللہ اُن سے فرمائے گا "هَلْ رَضِیْتُمْ" میرے بندو تم راضی ہو، خوش ہو؟ وہ عرض کریں گے کہ اے ہمارے کریم پروردگار ہم راضی خوش کیوں نہ ہوں گے۔ آپ نے ہم کو وہ نعمتیں نصیب فرمائی ہیں جو کسی مخلوق کو عطا نہیں ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اب میں تم کو اس سے بھی افضل اور برتر ایک نعمت دیتا ہوں، وہ یہ کہ۔ "میں تم سے ہمیشہ کے لئے راضی ہوں اور کبھی ناراض نہ ہوں گا" (۱) فی الحقیقت یہ نعمت جنت کی ساری نعمتوں سے برتر اور بالاتر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے "ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ" یعنی جنت اور رضائے الٰہی کی نعمت اُس کو نصیب ہوگی جس کے دل میں خشیت الٰہی ہو۔ خشیت کے معنی خوف کے ہیں، لیکن وہ خوف نہیں جو کسی زبردست دشمن سے یا درندے وغیرہ سے ہوتا ہے۔ بلکہ خوف اور فکر کی اس

---

(۱) بخاری ومسلم، مشکوٰۃ "صفۃ الجنۃ واھلھا"

کیفیت کا نام خشیت ہے جو اللہ تعالیٰ کی انتہائی عظمت وجلالت کے دھیان اور خیال سے اُس بندے کے دل میں ہوتی ہے جس کو اپنی گنہگاری کا احساس ہو۔ یہ کیفیت بندے کو غافل نہیں ہونے دیتی۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک دعا ہے "اللّٰھم اقسم لنا من خشیتک ماتحول به بیننا وبین معاصیک" (اے اللہ ہم کو اپنی وہ خشیت نصیب فرما جو ہمارے اور گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے، یعنی جو ہم کو گناہوں سے روکتی رہے، گناہوں کے اٹھتے ہوئے قدم کو روک لے۔

ایک دوسری دعا ہے "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ اَخْشَاکَ کَاَنِّیْ اَرَاکَ اَبَداً حَتّٰی اَلْقَاکَ وَاَسْعِدْنِیْ بِتَقْوَاکَ وَلَاتُشْقِنِیْ بِمَعْصِیَتِکَ" (اے اللہ مجھے ایسا کر دے کہ اس وقت تک کہ جب تک میں تیرے حضور میں حاضر ہوں تجھ سے ایسا ڈرتا رہوں کہ گویا ہر دم تجھے دیکھ رہا ہوں۔ اور مجھے تقویٰ کی یعنی پرہیز گاری اور فرمانبرداری کی سعادت عطا فرما اور ایسا نہ ہو کہ تیری نافرمانی کر کے میں بدبختی میں مبتلا ہو جاؤں۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اپنی خشیت نصیب فرمائے۔ سورۃ کی اس آخری آیت سے معلوم ہوا کہ جنت اور رضائے الٰہی کی نعمت سب کا حصول اسی پر موقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محروم نہ رکھے۔

سُبْحَانَکَ اَللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْھَدُ اَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ



سورۃ الزلزال

درس ۔ ۴۴

سورۃ الزلزال

خطبہ مسنونہ کے بعد

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ٥ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ٥
وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ٥ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ٥ بِاَنَّ رَبَّكَ
اَوْحٰى لَهَا ٥ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ٥
فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ ٥ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ
شَرًّا يَّرَهُ ٥ (سورۂ زلزال)

(ترجمہ) جب ہلا ڈالی جائے گی زمین اُس کے والے بھونچال سے۔ اور باہر نکال پھینکے گی وہ زمین اپنے بوجھ، اور آدمی کہے گا کہ اس کو کیا ہوا۔ اُس دن وہ زمین بیان کرے گی اپنی خبریں بہ سبب اس کے کہ تمہارے رب کا اُس کو یہی حکم ہوگا۔ اُس دن لوگ متفرق طور پر لوٹیں گے تاکہ اُن کو دکھا دیئے جائیں ان کے اعمال۔ پس جو شخص ذرّہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور جو کوئی ذرّہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

تفسیر و تشریح

قیامت کا بھونچال

قرآن مجید کی بہت سی سورتوں اور آیتوں میں قیامت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ کسی درجہ میں اس کا کچھ منظر سامنے آجاتا ہے، بلکہ میں کہتا ہوں کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی قیامت کا ذکر کیا گیا وہاں صرف ایک اہم ایمانی عقیدہ کے طور پر اُس طرح اس کا

ذکرنہیں کیا گیا جس طرح ہماری عقائد کی کتابوں میں کیا جاتا ہے، بلکہ اُس کا ذکر اسی طرح فرمایا گیا ہے کہ کسی حد تک اُس کا لرزہ خیز منظر تصور کی آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ اِس سورۃ الزلزال میں بھی قیامت کا ذکر اسی طرح فرمایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے "اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا" مطلب یہ ہے کہ ذرا سوچو اُس وقت کیا حال ہوگا جب ساری زمین مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک اور نیچے سے اوپر تک ایک غیر معمولی قسم کے زلزلہ اور بھونچال سے ہلا ڈالی جائے گی، یعنی ایک ایسا بھونچال آئے گا جو ساری زمین کو زیر و زبر کردے گا۔ زلزلے مقامی بھی ہوتے ہیں اور علاقائی بھی، لیکن قیامت کا زلزلہ اور بھونچال پورے کرۂ ارض کا زلزلہ ہوگا اور ہماری اس پوری دنیا کو تہ و بالا کردے گا۔ قرآن مجید ہی میں دوسری جگہ (سورۂ حج کے شروع میں) فرمایا گیا ہے "اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْئٌ عَظِيْمٌ" یعنی قیامت کا زلزلہ بہت ہی عظیم چیز ہے، آگے فرمایا گیا ہے کہ جب وہ برپا ہوگا تو ہیبت ناکی کا یہ عالم ہوگا کہ بچوں کو دودھ پلانے والی مائیں اپنے پیارے چہیتے بچوں کو بھول جائیں گی، اور حمل والیوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے اور لوگ ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے۔

اِس سورۂ زلزال کی اس پہلی آیت "اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا" میں لفظ "زِلْزَالَهَا" اُس زلزلہ کی شدت اور غیر معمولی پن کو ظاہر کر رہا ہے۔

یہ زلزلۂ قیامت اِس وجہ سے بھی انتہائی ہوش ربا ہوگا کہ بالکل اچانک آئے گا۔ پہلے سے کسی کو کوئی اطلاع نہ ہوگی کوئی اندازہ نہ ہوگا۔ سورۂ اعراف میں فرمایا گیا ہے "لَا تَأْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً" (قیامت جب آئے گی تو بالکل اچانک اور بے خبری میں آئے گی)۔

آگے فرمایا گیا ہے "وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا" مطلب یہ کہ اس زلزلۂ قیامت کا یہ بھی نتیجہ ہوگا کہ جو مُردے وغیرہ اس زمین میں دفن ہیں اُن سب کو زمین باہر نکال پھینکے گی۔ ذرا ہم تصور کریں اس ہیبت ناک منظر کا کہ قیامت کے بھونچال نے پورے کرۂ ارض کو زیر و زبر کردیا ہے اور مُردے اور اُن کے علاوہ بھی جو کچھ زمین میں دفن تھا وہ سب باہر آ گیا ہے۔ کیسا لرزہ خیز اور دہشت ناک ہوگا وہ منظر "وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا" (یعنی اس صورتِ حال کو دیکھ کر آدمی ہکا بکا رہ جائے گا اور کہے گا کہ اس زمین کو یہ کیا ہوا؟

جب زمین بولے گی

آگے فرمایا گیا ہے "یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا، بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا" مطلب یہ ہے کہ اُس دن یعنی قیامت کے دن زمین اپنی ساری خبریں بیان کرے گی اور اس وجہ سے بیان کرے گی کہ تمہارے خداوند ذوالجلال کا اُس کو یہی حکم ہوگا۔ یعنی قیامت کے دن زمین کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا کہ جو بھی اچھا یا برا عمل کسی نے تیری پشت پر کیا ہے وہ آج تو بیان کر اور اس کی شہادت دے! زمین اس حکم خداوندی کی تعمیل کرے گی اور بتلائے گی کہ مجھ پر فلاں بندے نے یہ اچھا یا بُرا عمل کیا تھا۔ فلاں بندے نے تیری حضور میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی تھی، تیراذکر کیا تھا۔ تیری کتاب پاک کی تلاوت کی تھی۔ گناہوں سے توبہ کی تھی، گناہوں کی معافی مانگی تھی، دعا کی تھی، تیرے فلاں بندے کے ساتھ احسان کیا تھا، کسی بھوکے کو کھانا کھلایا تھا، مسکینوں محتاجوں کی مدد کی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح زمین بتلائے گی کہ فلاں بندے نے مجھ پر زنا کیا تھا، ناحق خون کیا تھا، جھوٹی گواہی دی تھی، ماں باپ کو ستایا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ الغرض قیامت کے دن اللہ کے حکم سے زمین اپنی ساری سرگزشت سنائے گی۔ زمین کا بولنا بیان کرنا اور شہادت دینا پہلے سمجھ میں آنا مشکل تھا لیکن اب مشین پر ریکارڈ بولتا ہے اور ہم سب سنتے ہیں یہ بندوں کی ایجاد اور کاریگری ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسی طرح زمین بولے گی اور اپنی ساری سرگزشت اور کہانی سنائے گی۔ سورہ یٰسین میں فرمایا گیا "أَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ" اس کا حاصل یہ کہ قیامت کے دن، ہم بندوں کے منہ اور زبان پر مہر لگادی جائے گی، ان کا بولنا بند کردیا جائے گا اور ہمارے ہاتھ پاؤں ہمارے اعمال کی گواہی دیں گے۔ اور ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے "شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ" یعنی ہم بندوں کے کان، ہماری آنکھیں اور۔ ہمارے پوری جسم کی کھال، گویا ہمارا بال بال اور رواں رواں شہادت دے گا اور بتائے گا کہ ہم نے دنیا کی زندگی میں کیا کیا عمل کئے تھے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اس وقت ہمارا کیا حال ہوگا جب خود ہمارے ہاتھ پاؤں ہمارے سارے اعضاء اور ہمارے جسم کی کھال اور اس کا بال بال ہماری بداعمالیوں کی گواہی دے گا اور یہ زمین جس پر

ہم نے یہ اعمال کئے ہیں وہ بھی گواہی دے گی۔ ہاں امید ہے کہ جن گناہوں سے توبہ کرلی گئی ہوگی اور صدق دل سے اللہ سے معافی مانگ لی گئی ہوگی، ان کو نہ ہمارے اعضاء اس وقت بیان کریں گے اور نہ زمین بتلائے گی کیونکہ سچی توبہ واستغفار کی وجہ سے وہ کالعدم ہو چکے ہوں گے۔ حدیث شریف میں ہے "التائب من الذنب کمن لا ذنب له" (گناہ سے توبہ کرنے والا بالکل اس بندہ کی طرح ہوتا ہے جس نے گناہ کیا ہی نہ ہو) اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب بھائیوں کو سچی توبہ اور حقیقی استغفار نصیب فرمائے۔ اور قیامت کے دن کی رسوائی اور عذاب سے بچائے۔ (اللّٰھم لاتخزنا فإنک بنا عالمٌ ولاتعذبنا فإنک علینا قادرٌ).

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتاً، لِّیُرَوْا اَعْمَالَھُمْ، فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْراً یَّرَهٗ، وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً یَّرَهٗ"۔

بظاہر اِن آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن حساب کتاب سے فارغ ہوکر سب لوگ متفرق طور پر لوٹیں گے، تاکہ وہ اپنے اعمال دیکھ لیں (بظاہر مطلب یہ ہے کہ اپنے اعمال کے نتائج وثمرات کو دیکھ لیں) پھر یہ ہوگا کہ جس نے ذرّہ برابر نیکی اور بھلائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

اس سورت کی پہلی آیت میں قیامت کے آغاز کا بیان تھا کہ وہ ایک انتہائی ہیبت ناک زلزلہ اور بھونچال ہوگا جو ساری زمین کو اور اس پوری دنیا کو زیروزبر کردے گا۔ اس کے بعد کی آیتوں میں درمیان کے دو مرحلوں کا ذکر کیا گیا تھا ایک یہ کہ زمین میں جو مردے وغیرہ دفن ہیں وہ سب باہر آجائیں گے۔ اور دوسرا یہ کہ زمین اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی سرگزشت بیان کرے گی اور شہادت دے گی۔ اب اِن آخری آیتوں میں قیامت کے اس آخری مرحلہ اور انجام کا بیان فرمایا گیا ہے کہ میدان حشر کے حساب کتاب سے فارغ ہوکر سب بندے مومن اور کافر، صالح اور فاجر، مخلص اور منافق وہاں آئیں گے جہاں اُن کے اعمال (یعنی اعمال کے نتائج) اُن کو دکھائے جائیں گے، پھر ایسا ہوگا کہ جس نے ذرّہ برابر بھی کوئی نیک عمل کیا ہوگا، وہ وہاں اس کو دیکھ لے گا (یعنی اُس کا نتیجہ اجر وثواب اور جنت کی نعمتوں کی شکل میں اُس کے سامنے آجائے گا) اور جس نے ذرّہ برابر بھی کوئی برائی اور کوئی گناہ کا کام کیا ہوگا وہ اس کو دیکھ لے گا (یعنی اس کا نتیجہ عذاب کی شکل میں اس کے سامنے آجائے گا)۔

اس سورہ کے بارے میں چند قابل ذکر واقعات

اگر ہم قرآن پاک کی صرف اسی ایک سورت اور اُس کے پیغام کو صحیح طور پر سمجھ لیں یا اس کی صرف اس آخری آیت ہی کو اس طرح سمجھ لیں جس طرح سمجھنے کا حق ہے اور اللہ تعالیٰ یقین نصیب فرمائے اور توفیق دے تو یہی ہماری پوری زندگی اور ہمارے ظاہر و باطن کی اصلاح کے لئے کافی ہے۔

حدیث کی کتابوں میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ کوئی صاحب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت مجھے قرآن پڑھا دیجئے اور اِس بارہ میں ہدایت فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن پاک کی جو سورتیں الٓمّرٓا سے شروع ہوتی ہیں اُن میں سے بس تین سورتیں پڑھ لو! (یہ سورتیں گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں پارے میں ہیں اور خاصی بڑی ہیں) اُن نو وارد نے عرض کیا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور مجھے زیادہ پڑھنا مشکل ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر حٰمٓ والی سورتوں میں سے تین سورتیں پڑھ لو، انہوں پھر وہی عرض کیا جو پہلے کہا تھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اچھا "مُسبّحات" میں سے (یعنی ان سورتوں میں سے جو سَبَّحَ یا یُسَبِّحُ کے لفظ سے شروع ہوتی ہیں) تین سورتیں پڑھ لو، انہوں نے پھر اپنی بات دہرائی کہ یہ میری لئے مشکل ہے مجھے تو بس کوئی چھوٹی سی جامع سورت پڑھا دیجئے تو رسول اللہ ﷺ نے اُن کو یہ سورۃ "إذا زلزلت" پڑھائی وہ صاحب بہت خوش ہوئے اور کہا

والذی بعثک بالحق نبیاً لا ازید علیھا ابداً۔	قسم اُس خدائے پاک کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے میں اب اس پر کوئی اضافہ نہیں کروں گا۔ (بس یہی میرے لئے کافی ہے)

اور وہ صاحب یہ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ جب وہ چلے گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "افلح الرویجل، افلح الرویجل" (یعنی یہ مردوا کامیاب ہوگیا کامیاب ہوگیا، مطلب یہ کہ اس نے نجات کی اور کامیابی کی کنجی حاصل کر لی۔(۱)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک صاحب (مشہور عربی شاعر فرزدق کے چچا صعصعہ ابن معاویہ) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ ﷺ نے ان کو اِس سورت کی صرف آخری آیت سنائی۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ.

جو کوئی ذرہ برابر کوئی نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو کوئی ذرہ برابر کوئی برائی کرے گا وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔

حضور ﷺ کی زبان مبارک سے صرف یہ آیت سن کر یہ صاحب بولے "حسبی لا ابالی ان لا اسمع غیر هذا" (بس یہی میرے لئے کافی ہے، اگر اس کے سوا کچھ نہ سنوں تو کوئی پروانہیں)(۲) واقعہ تو یہی ہے کہ اگر دل مردہ نہ ہوتو بس یہی آیت کافی ہے۔

اسی آیت سے متعلق ایک اور سبق آموز حدیث کا مضمون اپنے بعض صاحبِ علم بزرگوں سے سنا ہوا یاد ہے، کسی کتاب میں یہ حدیث دیکھنا یادنہیں۔ اُن بزرگ نے کسی کتاب ہی میں یہ دیکھی ہوگی۔ حدیث کا مضمون یہ ہے کہ مدینہ منورہ سے باہر کے کوئی صاحب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ یہ غریب آدمی تھے حضور ﷺ کا دستور تھا کہ ایسے لوگوں کو جو اسلام قبول کرتے قرآن کی تعلیم اور دین کی ضروری باتیں سیکھنے کے لئے کسی خاص صحابی سے متعلق کر دیتے تھے کہ تم ان سے تعلیم حاصل کرلیا کرو۔ چنانچہ ان نو

---

(۱) تفسیر ابن کثیر میں یہ حدیث ترمذی سے نقل کی گئی ہے۔(نعمانی)

(۲) یہ حدیث ابن کثیر نے مسند احمد کے حوالہ سے نقل کی ہے (نعمانی) (مرتب عرض کرتا ہے کہ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں اس حدیث کے راوی صعصعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کو عم فرزدق کہے جانے میں مغالطہ ہوا ہے، یہ احنف بن قیس کے چچا ہیں، فرزدق کے چچا کا تو نہیں البتہ دادا کا نام یہی صعصعہ تھا، اور ان سے بھی احادیث کی روایت ہے۔ع)

وارد کو آپ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔ وہ چند روز تک آ کر تعلیم حاصل کرتے رہے۔ پھر اُن کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب کئی دن ان کو مسجد میں بھی نہیں دیکھا تو حضرت علیؓ سے دریافت کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چند روز تک میرے پاس آتے رہے، اب کئی روز سے نہیں آئے ہیں۔ حضور ﷺ کو فکر ہوئی کہ بیچارے پردیسی ہیں، نہ معلوم کس حال میں ہیں۔ آپ نے حاضرِ مجلس صحابہ سے فرمایا کہ خیال رکھو اگر کہیں کسی کو مل جائیں یا ان کا پتہ معلوم ہو جائے تو ان کو یہ بات پہونچا دی جائے کہ ہمیں اُن کے بارے میں فکر ہے، ہم سے آ کر ملیں۔

کسی صاحب کو وہ مل گئے انہوں نے حضور ﷺ کا پیام ان کو پہونچا دیا وہ فوراً حاضر خدمت ہوئے، آپ نے اُن سے حال پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ تم نے تعلیم کا سلسلہ کیوں منقطع کر دیا؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! میں نے اتنا پڑھ لیا جو میرے لئے کافی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم نے کیا پڑھ لیا؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے یہ آیت بھی پڑھ لی "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَراً يَّرَهٗ" اب میرا حال یہ ہے کہ جب کسی کام یا کسی بات کا ارادہ کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ قیامت میں اس کا کیا نتیجہ سامنے آئے گا۔ اگر اطمینان ہو جاتا ہے کہ اچھا نتیجہ سامنے آئے گا تو وہ کام اور بات کرتا ہوں ورنہ رک جاتا ہوں۔

آہ یہ مُردہ قلوب!

افسوس ہے، ہمارے قلوب مردہ ہیں ہم اِن قرآنی آیات سے اور اِن واقعات سے کوئی سبق نہیں لیتے۔ کسی کو کیا کہوں خود میرا اپنا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہت کچھ پڑھا ہے۔ قرآن مجید پڑھا ہے، اُس کا کچھ سمجھنا بھی نصیب ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے کچھ حفظ بھی ہے، حدیث شریف کے ہزاروں صفحات پڑھے ہیں اور پڑھائے ہیں اور ان کی شرح بھی لکھی ہے اور لکھتا ہوں۔ لیکن اللہ کے اس گھر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان بے پڑھے لکھے صحابیوں کو صرف ایک آیت سے فکر آخرت اور خشیت الٰہی

کی جو دولت مل گئی تھی اُس کا سوواں حصہ بھی نصیب نہیں۔ اصل چیز ان کی یہی آخرت کی فکر اور خشیت الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ بس اس کا کوئی ذرہ نصیب فرمادے تو خیریت اور کامیابی ہے۔ اللّٰھم اعطنا ولا تحرمنا.



سورۃ العادیات

درس — ۴۵

(درس-۴۵)

سُوْرَةُ الْعٰدِیٰت

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ہ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ہ فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ہ
فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا ہ فَوَسَطْنَ بِہٖ جَمْعًا ہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوْدٌ ہ
وَاِنَّہٗ عَلٰی ذَالِکَ لَشَہِیْدٌ ہ وَاِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ہ
اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ ہ وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ہ اِنَّ
رَبَّھُمْ بِھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّخَبِیْرٌ ہ (سورۂ عادیات)

ترجمہ: قسم ہے اُن گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ پھر ٹاپ مار کر چنگاریاں جھاڑتے ہیں۔ پھر صبح نمودار ہوتے ہی تاخت وتاراج کرتے ہیں۔ پھر اس میں غبار اڑاتے ہیں۔ پھر اُس کے ساتھ (دشمن کے) جتھے میں گھس جاتے ہیں۔ بے شک انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا (اور اس کی نعمتوں کا بڑا ہی ناقدر شناس) ہے۔ اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔ اور وہ مال و دولت کی محبت و چاہت میں بڑا پکا ہے۔ کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب (زندہ کر کے) باہر نکال دیئے جائیں گے وہ سب مردے جو قبروں میں (دفن) ہیں۔ اور نکلوا لئے جائیں گے وہ سب بھید جو سینوں میں ہیں۔ بے شک اُس دن اُن کا پروردگار اُن سے پوری طرح باخبر ہوگا۔

تفسیر وتشریح

سابق سورہ سے ربط

اس سے پہلی سورت ''الزلزال'' میں قیامت کا بیان اس طرح کیا گیا تھا کہ کسی درجہ میں اُس کا دہشت ناک منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا، اور آخر میں فرمایا گیا تھا ''فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ'' (جو بندہ بھی ذرّہ برابر کوئی نیکی یا بدی، عمل صالح یا معصیت کرے گا وہ وہاں اُس کے سامنے آجائے گا یعنی وہ اس کا صلہ، یا اس کی سزا ضرور پائے گا) اس سورۂ ''والعٰدیٰت'' میں پہلے تو ہم انسانوں کو دو ایسی روحانی اور اخلاقی بیماریوں کی نشان دہی کی گئی ہے جو قریباً ساری معصیتوں کی جڑ بنیاد ہیں اور آخر میں اُس کی آگاہی دی گئی ہے جو قیامت میں سامنے آنے والا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اپنے خالق اور کریم پروردگار کی حق ناشناسی اور مال و دولت کی ہوس تمام معصیتوں کی بلکہ کفر و شرک کی بھی بنیاد ہیں، اس سورت میں بہت ہی مؤثر اور حکیمانہ انداز میں ان مہلک بیماریوں کے بارے میں ہم انسانوں کو متنبہ کیا گیا ہے۔

سورہ کی قسمیں

اس کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ عربوں میں زمانۂ جاہلیت میں جنگ اور لوٹ مار عام بات تھی۔ ایک طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ پر دھاوا بول کے اس کو لوٹ لیتا تھا ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' یہاں کا قانون تھا۔ یہ دوسرا قبیلہ بھی جس پر حملہ ہوتا اپنی پوری طاقت سے مدافعت میں جنگ کرتا تھا، اور پھر گھمسان کی لڑائی ہوتی تھی۔ اس تاخت و تاراج اور ان حملوں میں گھوڑے استعمال ہوتے تھے، یہ گھوڑے اِن جنگوں میں بڑی وفاداری اور جاں نثاری کی ثبوت دیتے تھے، ان کے سوار ان کو دوڑاتے تو یہ پوری طاقت اور تیزی سے دوڑتے یہاں تک کہ دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگتے اور پھر بھی دوڑتے رہتے اور ایسے دوڑتے کہ پتھریلی زمین پر ان کی ٹاپوں کے پڑنے سے چنگاریاں اُڑتیں...... پھر یہ لوگ جس قبیلہ پر حملہ کرتے تو قدرتی

طور پر وہ لوگ بھی مسلح ہو کر ایک فوج کی طرح مدافعتی جنگ کرتے۔ یہ گھوڑے اپنے سواروں کے اشاروں پر تلواروں اور نیزوں سے مسلح اس مدافعتی فوج میں بھی گھس جاتے اگر چہ زخم پہ زخم کھاتے لیکن اپنے سواروں کی وفاداری میں ڈٹے رہتے، منہ نہ موڑتے۔ ان گھوڑوں کی اپنے سواروں اور مجازی مالکوں سے یہ وفاداری بلاشبہ ہم بندوں کے لئے بڑی سبق آموز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سورۂ "والعٰدیٰت" میں اِن گھوڑوں کی اپنے مالکوں کے ساتھ اس وفاداری کو بطور شہادت کے پیش فرما کر ارشاد فرمایا ہے کہ انسان اپنے مالک و پروردگار کا بڑا ناشکرا اور اس کی نعمتوں کا بڑا ناقدر شناس ہے۔

غیر اللہ کی قسم

آپ کو یاد ہوگا کہ اسی درس میں بار بار عرض کیا گیا ہے کہ ہم بندوں کو اللہ کے سوا اُس کی کسی مخلوق کی قسم کھانا جائز نہیں۔ یہاں تک کہ کعبۃ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کی قسم کھانا بھی جائز نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جابجا اپنی مخلوقات کی قسم کھا کر بعض حقیقتیں بیان فرمائی ہیں۔ آسمان اور زمین کی اور سورج اور چاند اور ستاروں کی بھی قسمیں کھائی گئی ہیں، دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے کی بھی قسم کھائی گئی ہے اور اسی طرح اور بھی بعض مخلوقات کی قسم کھا کر بعض اہم مضامین بیان فرمائے گئے ہیں۔ ان قسموں کا مطلب عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی جارہی ہے وہ اُس بات اور اس حقیقت کی شہادت دے رہی ہے جو قسم کے ساتھ بیان کی جارہی ہے، نیز قسم سے اس بات کا بھی اظہار مقصود ہوتا ہے کہ جو کچھ بیان کیا جارہا ہے وہ نہایت محکم اور محقق ہے، اُس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ (الغرض اللہ کی ذات عالی اور بندوں میں جو فرق ہے اس کی بنا پر ایک کو دوسرے پر نہیں قیاس کیا جاسکتا کہ ہم بھی اپنے لئے غیر اللہ کی قسم جائز سمجھ لیں)۔(۱)

---

(۱) یہ بریکٹ کی عبارت مرتب کا اضافہ ہے تاکہ اوپر کی سطروں میں جو بات بتائی جانی مقصود نظر آتی ہے وہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔ غالب گمان ہے کہ درس کے سلسلے میں جہاں کہیں ابتداءً اور اس کے بعد بھی یہ قرآنی قسموں کا مسئلہ آیا ہوگا وہاں حضرت مخدوم نے حسب عادت ضرور بھرپور وضاحت فرمائی ہوگی اور اس لئے یہاں مختصر بات کافی سمجھ لی۔ مگر افسوس ہے کہ درس کے جو متفرق حصے اس کتاب میں جمع کئے جاسکے ہیں ان میں کہیں یہ قسم کی بحث نہیں آئی ہے۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ توضیحی اشارہ کر دیا جائے۔ (مرتب)

انسان بڑا ناشکرا اور انجام سے غافل

اس سورت "والعٰدیٰت" میں ہم انسانوں کی اِس نہایت مہلک بیماری کی نشان دہی کی گئی ہے کہ انسان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بڑا ناقدر شناس اور ناشکرا ہے۔ اور اس کی شہادت کے طور پر جنگوں میں استعمال ہونے والے گھوڑوں کے اس رویہ اور کردار کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ ان گھوڑوں کا سوار اور مجازی مالک ان کا خالق اور پروردگار نہیں ہے بس کچھ گھاس دانہ کھلا دیتا ہے جو اس کا پیدا کیا ہوا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے، لیکن اتنے ہی احسان کے نتیجہ میں گھوڑے کا رویہ ایسی وفاداری اور تابعداری کا ہے کہ اس کے دوڑانے پر بے تحاشا دوڑتا ہے، ہانپنے لگتا ہے اور پھر بھی دوڑتا ہے اور اس زور سے دوڑتا ہے کہ پتھریلی زمین پر ٹاپ پڑنے سے چنگاریاں اڑتی ہیں، پھر وہ اس کے اشارہ پر کسی بھی بستی یا قبیلہ پر حملہ کرتا اور ٹوٹ پڑتا ہے اور اپنی جان خطرہ میں ڈال کر تلواروں اور نیزوں وغیرہ سے مسلح دشمن کی فوج میں گھس جاتا ہے۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں ان گھوڑوں کی اس وفاداری اور احسان شناسی کو قسم کے عنوان سے بطور شہادت ذکر فرما کر ارشاد فرمایا ہے کہ انسان کا عام حال یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بڑا ناقدر شناس اور ناشکر گزار ہے۔ اس سورت کی ابتدائی چھ آیتوں کا یہی حاصل اور مدعا ہے۔

اب مختصر طور سے آیتوں کا الگ الگ مطلب بھی سمجھ لیجئے! واؤ قسم کے لئے ہے اور "عٰدیٰت" کے معنی دوڑنے والوں کے ہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا یہاں اس سے تاخت وتاراج اور جنگ کی مہموں میں دوڑنے والے اور دوڑائے جانے والے گھوڑے مراد ہیں "ضبح" اس آواز کو کہتے ہیں جو گھوڑوں کے دوڑتے وقت اُن کے نتھنوں سے نکلتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ قسم ہے اُن گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے تیز دوڑتے ہیں۔ یعنی ان گھوڑوں کی جاں نثاری اور جانبازی اس بات کی شاہد ہے جو آگے کہی جارہی ہے۔ آگے ہے "فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحاً" یہ ان گھوڑوں کی دوسری صفت ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ ایسے زور سے دوڑتے ہیں کہ پتھریلی زمین پر اُن کی ٹاپ پڑنے سے چنگاریاں اڑتی ہیں۔ آگے ہے "فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحاً" مطلب یہ ہے کہ پھر وہ گھوڑے صبح کے وقت کسی دشمن قبیلہ یا بستی پر تاخت وتاراج اور غارت گری کرنے کے لئے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ عربوں کا دستور تھا کہ وہ کسی قبیلہ یا بستی پر حملہ رات کے ختم ہونے پر صبح کے وقت کرتے تھے۔ آگے ہے "فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعاً" مطلب یہ کہ پھر یہ گھوڑے اِس طرح دوڑتے ہیں کہ اُس صبح کے وقت میں جبکہ رات کی شبنم یا خنکی کی وجہ سے گرد

وغبار اُڑنے کا وقت نہیں ہوتا، ان گھوڑوں کے تیز دوڑنے کی وجہ سے فضا میں غبار ہی غبار ہو جاتا ہے۔ آگے ہے "فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا" پھر وہ اس صبح کے وقت میں اور گرد وغبار کے اس طوفان میں دشمن کی جماعت میں یعنی مقابل فوج میں گھس جاتے ہیں جہاں تلواروں اور تیروں کا سامنا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے مالکوں اور سواروں کے وفادار اور تابعدار اِن گھوڑوں کی قسم کھا کر یعنی ان کی وفاداری اور جاں نثاری کو بطور شہادت کے پیش فرما کر۔ ارشاد فرماتا ہے "اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ" (انسان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بڑا ناقدر شناس، اور ناشکرا ہے۔)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا، اُس کو اپنی ساری مخلوق پر فضیلت اور برتری دی، اس کو عقل اور نطق یعنی گویائی کی نعمت دی جو کسی دوسری مخلوق کو عطا نہیں فرمائی گئی۔ اس کو انواع واقسام کی بے حساب نعمتوں سے نوازا۔ اس کے باوجود وہ اُس کی نافرمانی کرتا ہے۔ اس کو اور اس کے احسانات کو فراموش کر کے زندگی گزارتا ہے اس کے حقوق وفرائض ادا کرنے کی بالکل فکر نہیں کرتا (عام انسانوں کا یہی حال ہے) اسی کو فرمایا ہے "اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ" آگے فرمایا گیا ہے "وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ" مطلب یہ ہے کہ انسان خود ہی اپنی اس ناشکر گزاری اور نابکاری کا شاہد اور گواہ ہے۔ یعنی اگر وہ خود اپنے بارہ میں سوچے تو خود اُس کا ضمیر گواہی دے گا کہ وہ اپنے محسن پروردگار کا بڑا ناشکر گزار ہے۔ اس کے لئے کسی خارجی شہادت اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ" مطلب یہ ہے کہ وہی انسان جو اپنے خالق و پروردگار کی شکر گزاری اور وفاداری کے معاملے میں بہت بے پروا اور بےفکرا ہے، وہی مال و دولت کی محبت و چاہت اور اس کو سمیٹنے میں بہت تیز اور چاق ہے، اس معاملہ میں بالکل غافل اور بے پروا نہیں ہوتا "خَیْر" کے معنی یہاں مال و دولت کے ہیں، یہ لفظ اس معنی میں قرآن پاک میں بعض دوسرے مقامات پر بھی استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں بھی انسان کی ناشکر گزاری کی ایک دلیل اور نشانی بیان فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک جانور گھوڑے کا حال تو یہ ہے کہ اس کو اپنے مجازی مالک سے جو اس کو صرف گھاس دانہ کھلا دیتا ہے ایسی محبت ہے کہ اس کی وفاداری میں اپنی ساری طاقت اور توانائی صرف کر دیتا ہے اور جان کی بھی پروا نہیں کرتا۔ لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ اس کو اپنے خالق اور پروردگار سے بھی زیادہ محبت مال و دولت کی ہے۔ یہ خدا ناآشنا اور خدا فراموش انسانوں کا عام حال ہے۔ لیکن جن انسانوں کو ایمان کی حقیقت نصیب ہے ان کا حال دوسری جگہ یہ بیان فرمایا گیا ہے "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" (اور جن بندوں کو ایمان کی دولت نصیب ہے ان کو ہر چیز سے زیادہ محبت اور چاہت

اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے) اللہ تعالیٰ ہم کو بھی انہی بندوں میں شامل فرمادے۔

آگے انسان کی ناشکری خدا فراموشی اور دولت پرستی کے اُخروی انجام کے بارے میں آگاہی دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے "أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ، وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ" مطلب یہ ہے کہ یہ غافل انسان اُس وقت اور اس دن کو نہیں جانتا جب قبروں میں دفن شدہ سارے مردے زندہ کر کے قبروں سے باہر نکالے جائیں گے اور زندگی بھر کے اُن کے اعمال کا پورا احتساب ہوگا۔ اور سینوں کے بھید اور راز بھی جن کو وہ سمجھتا تھا کہ یہ ہمیشہ راز ہی رہیں گے کبھی کسی کو ان کی اطلاع نہ ہوگی، وہ اُس دن (یعنی بروز قیامت) باہر نکال لئے جائیں گے۔ مثلاً نفاق ہے، ریاکاری ہے، یا ایسی ہی چھپی ہوئی گندگیاں ہیں تو وہ ظاہر کر دی جائیں گی اور ان کا بھی محاسبہ ہوگا، دوسری جگہ فرمایا گیا ہے "يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ" یعنی اُس دن مخفی اور پوشیدہ باتیں بھی جانچی اور پرکھی جائیں گی اُن کا بھی پورا احتساب ہوگا۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے "إِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ" یہ اوپر والی آیتوں کے مضمون کی مزید تاکید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر بندے کے ظاہر و باطن کے ہر فعل سے اگرچہ باخبر تو آج بھی ہے لیکن قیامت کا دن جو احتساب اور جزاوسزا کے فیصلہ کا دن ہوگا اُس دن اللہ تعالیٰ کی اس صفت خبیری (خبر داری) کی خاص شان ہوگی، سب بندوں کا، خاص کر اُن غافل بندوں کا جنہوں نے اُس کو اور اس کے احسانات و انعامات کو بھلا رکھا تھا پورا ظاہر و باطن اس کے سامنے ہوگا اور اسی کی بنیاد پر اُس دن سب کا احتساب اور فیصلہ ہوگا۔ اس سے پہلی سورت "إِذَا زُلْزِلَت" میں قریباً یہی مضمون اِن الفاظ میں بیان فرمایا گیا تھا "فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ، وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ" اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ قیامت کے بارہ میں یہ آگاہی ہر وقت ہمارے سامنے رہے، یقیناً اُس دن ہم بھی اپنی قبر سے اٹھائے جائیں گے، ہمارے بھی سینوں کے سب راز، ہمارا نفاق، ہماری ریاکاری، اور اس طرح کے ہمارے سارے مخفی رزائل اور معاصی کھولے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ علیم و خبیر کا احتساب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو مخلصانہ توبہ کی اور اپنی اصلاح کی توفیق عطا فرمائے اور ظاہر و باطن کو پاک فرما کے اٹھائے۔ شیخ عطارؒ کی مشہور مناجات کا ایک شعر ہے۔

چشم دارم از گنہ پاکم کنی
پیش ازاں کاندر لحد خاکم کنی

سورۃ القارعہ

درس — ۴۶

(درس-۴۶)

سورۃ القارعۃ

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعُوذُ باللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

اَلْقَارِعَةُ o مَاالْقَارِعَةُ o وَمَآ اَدْرٰكَ مَاالْقَارِعَةُ o يَوْمَ يَكُوْنُ
النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ o وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ
الْمَنْفُوْشِ o فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ o فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ
رَّاضِيَةٍ o وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ o فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ o وَمَا
اَدْرٰكَ مَاهِيَهْ o نَارٌ حَامِيَةٌ o (سورۃ القارعۃ)

ترجمہ: وہ کھڑکھڑانے والی۔ کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی۔ اور تمہیں کیا معلوم کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی۔ جس دن لوگ منتشر پتنگوں کی طرح ہو جائیں گے۔ اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کی طرح۔ تو جس کی میزانیں بھاری ہوں گی وہ پسندیدہ عیش میں ہوگا۔ اور جس کی میزانیں ہلکی ہوں گی اس کا ٹھکانا ہاویہ ہوگا۔ اور تمہیں کیا معلوم کیا ہے وہ ہاویہ۔ ایک دہکتی ہوئی آگ۔

تفسیر وتشریح

قیامت کی ایک اور یاد دہانی

اِس سے پہلی سورۂ عادیات کی آخری آیتوں میں قیامت کے بارے میں ان الفاظ میں آگاہی دی گئی تھی "اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَافِی الْقُبُوْرِ، وَحُصِّلَ مَافِی الصُّدُوْرِ، اِنَّ

رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْر" (مطلب یہ کہ کیا وہ انسان جانتا نہیں کہ اُس وقت کیا حال ہوگا جب قبروں کے مردے اکھاڑ کے اور زندہ کر کے باہر کر دیئے جائیں گے اور سینوں کے راز نکال کے ظاہر کر دیئے جائیں گے اُس دن ان کا پروردگار خداوند تعالیٰ اُن کی زندگی اور اُن کے ظاہر و باطن سے پوری طرح باخبر ہوگا اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا جنت یا دوزخ کا فیصلہ ہوگا)

اور اُس سے پہلی سورت ''الزلزال'' میں اوّل سے آخر تک قیامت ہی کے بارہ میں آگاہی دی گئی تھی اور اس طرح اُس کا بیان کیا گیا تھا کہ ایک درجہ میں اُس کا ہیبت ناک اور لرزہ خیز منظر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ اس کے آخر میں فرمایا گیا تھا۔ "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَّرَهٗ" جس کا مطلب یہ تھا کہ جو کوئی اِس زندگی اور اس دنیا میں ذرّہ برابر نیکی یا بدی کرے گا وہ اس کو وہاں آخرت میں دیکھ لے گا۔ یعنی اُس نیکی یا بدی کی جزا یا سزا ضرور پائے گا۔

اب اس سورت "القارعہ" میں بھی قیامت ہی کا بیان ہے اور اُس کا انداز بھی ایسا ہی ہے کہ مخاطبین جو قیامت اور آخرت سے غافل ہیں وہ بھی اس کی دہشت ناکی محسوس کریں اور ان کے دلوں میں بھی فکر پیدا ہو جائے۔ فرمایا گیا ہے۔ ''القارعۃ'' یہ قیامت کے ناموں سے ایک نام ہے۔

میں ذکر کر چکا ہوں کہ قرآن پاک میں قیامت کا ذکر مختلف ناموں سے کیا گیا ہے ''الساعۃ، القیامۃ، الواقعۃ، الأزفہ، الحاقّہ، الطّامہ، الصاخّہ'' تو "القارعہ" بھی اسی کا ایک نام اور عنوان ہے، جو شخص اس کا مطلب سمجھتا ہو اُس کے لئے اس عنوان ہی میں دہشت بھری ہوئی ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں کھڑکھڑا ڈالنے والی۔ یعنی جب وہ واقع ہوگی تو سارے عالم کو کھڑکھڑا ڈالے گی، زیروزبر کر دے گی۔ اور ساری کائنات میں ہلچل مچا دے گی۔ پھر اس کی ہولناکی اور دہشت ناکی کو اور زیادہ نمایاں کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے "ماالقارعہ" اس کا لفظی ترجمہ تو صرف اتنا ہی ہے کہ "کیا ہوگی اور کیسی ہوگی وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی'' لیکن عربی محاورہ کے لحاظ سے اس نے اس دہشت ناکی کو بدرجہا بڑھا دیا جو ''القارعہ'' کے لفظ سے مفہوم ہوئی تھی۔ اس کے بعد اور ترقی کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ''وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ'' جس کا حاصل ترجمہ یہ ہوگا کہ کیا تم جان سکتے ہو اور کیا سمجھ سکتے

ہو کہ وہ کھڑ کھڑا ڈالنے والی کیا ہوگی، یعنی وہ جو کچھ اور جیسی کچھ ہوگی وہ تمہارے ادراک کے حدود سے باہر ہے۔ یہ وہی انداز بیان ہے جو قیامت کے بارہ میں سورۂ "الحاقہ" میں اختیار فرمایا گیا تھا۔ وہاں فرمایا گیا تھا "اَلْحَاقَّہ، مَاالْحَاقَّہ، وَمَآاَدْرَاکَ مَاالْحَاقَّہ"

یہ سورہ "القارعہ" مکّی ہے، اس کے اولین مخاطب اہل مکہ تھے جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا، وہ اس انداز بیان کی غیر معمولی دہشت ناکی کو محسوس کر سکتے تھے۔ اگر وہ سنجیدگی سے اس کو سنتے تو اُن کے دل لرز جاتے اور قیامت و آخرت سے غفلت و بے فکری ختم ہو جاتی۔

ہولناک منظر

آگے مختصر الفاظ میں قیامت کے ہولناک منظر کی بس ایک جھلک دکھلائی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے "یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ، وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ".

"فراش" پتنگوں اور پروانوں کو کہتے ہیں جو خاص طور سے برسات میں روشنی پر آتے ہیں۔ مبثوث کے معنی ہیں منتشر، بکھرے ہوئے۔ "عھن" کے معنی اون اور "منفوش" کے معنی دھنکی ہوئی۔ روشنی پر جو پتنگے آتے ہیں وہ کثرت کے لحاظ سے لاتعداد ہوتے ہیں، ساتھ ہی منتشر ہوتے ہیں ایک کو دوسرے سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہوتا۔ "یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ" کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن وہ دن ہوگا جب اللہ کے حکم سے سب آدمی اولین و آخرین دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور محشر میں اُن کا وہ منظر ہوگا جو پتنگوں کا ہوتا ہے یعنی وہ منتشر ہوں گے۔ نفسی نفسی کا عالم ہوگا، کوئی کسی کا حامی اور مددگار نہ ہوگا، ہر ایک کو بس اپنی پڑی ہوگی۔

آگے فرمایا گیا ہے "وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ" مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن وہ پہاڑ جو اس دنیا میں سب سے سخت چیز ہے، لوہا آگ میں ڈال دینے سے پگھل جاتا ہے لیکن پتھر نہیں پگھلتا۔ ان پہاڑوں کا اس دن یہ حال ہوگا کہ وہ دھنکی ہوئی اون کی طرح ہوں گے جس کا ریشہ ریشہ الگ ہو جاتا ہے اور ہوائیں اس کو اِدھر سے اُدھر اڑا لے جاتی

ہیں۔ مکہ معظمہ اور اس کا قرب و جوار زراعتی علاقہ نہیں تھا، وہاں کپاس اور روئی نہیں ہوتی تھی۔ اونٹ اور بھیڑ کے اُون کو دُھنک کر کا تا جاتا تھا اور اس سے کپڑا بنا جاتا تھا۔ ہمارے زبان میں کہا جائے گا کہ پہاڑ اُس دن دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے جو ہواؤں کے ساتھ اُڑتے اور تیرتے ہوں گے۔

روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ کے کفار و مشرکین کے سامنے قیامت کا ذکر فرماتے اور ان کو قرآن کی وہ آیات سناتے جن میں بتلایا گیا ہے کہ قیامت جب آئے گی تو سارے عالم کو زیر وزبر اور ساری کائنات کو کالعدم کردے گی تو وہ کہتے کیا وہ ان پہاڑوں کو بھی اکھاڑ سکے گی، اُن کے نزدیک پہاڑ ایسی چیز تھی کہ اس کو کوئی حادثہ اور کوئی طاقت اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ اس آیت میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے "وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ" یعنی یہ پہاڑ جن کو تم ناقابل شکست سمجھتے ہو، قیامت کے دن ان کا یہ حال ہوگا جس طرح دھنکی ہوئی اون کا ریشہ ریشہ الگ ہوجاتا ہے اسی طرح یہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں گے...... سورہ مزمّل میں فرمایا گیا ہے "وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْباً مَّهِيْلاً" کہ قیامت کے دن پہاڑ ریزہ ریزہ ہوکر اِدھر سے اُدھر جانے والے ریگ کے ڈھیر کی طرح ہوجائیں گے۔

آگے قیامت میں ہر انسان کے سامنے آنے والے انجام کا بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے "فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ، وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَأُمُّهٗ هَاوِيَةٌ، وَمَا أَدْرَاكَ مَاهِيَةٌ، نَارٌ حَامِيَةٌ" مطلب یہ ہے کہ پھر وہاں ہر آدمی کے ایمان اور عمل کی جانچ اور تول ہوگی، تو ایمان وعمل کے وزن سے جس کی میزانیں بھاری ہوں گی وہ پسندیدہ عیش میں ہوگا یعنی جنت میں عیش اور چین کرے گا اور ہر طرح سے راضی اور خوش ہوگا۔ اور جس کی میزانیں ایمان وعمل کا وزن نہ ہونے کی وجہ سے ہلکی ہوں گی اُس کا ٹھکانا "ھاویہ" ہوگا یعنی دوزخ کا کھڈ اور گڑھا۔ پھر عذاب کے لحاظ سے اس "ھاویہ" کے غیر معمولی پن کو ظاہر کرنے کے لئے فرمایا گیا "وَمَا أَدْرَاكَ مَاهِيَه" یعنی تم کیا جان سکتے ہو اور کیا سمجھ سکتے ہو کہ وہ "ھاویہ" کیا ہے اور کیسی ہے، مطلب یہ ہے کہ تم اس کو مقرر بھی نہیں کرسکتے، آگے فرمایا وہ ایک غیر معمولی قسم کی آگ ہے دہکتی ہوئی اور بھڑکتی ہوئی (نَارٌ حَامِيَةٌ)

اِن آیتوں میں بتلایا گیا ہے کہ جب قیامت برپا ہوگی اور انسانوں کا اور پہاڑوں کا

وہ حال ہوگا جو اوپر بیان ہوا تو محشر میں ہر آدمی کے ایمان و عمل کی جانچ ہوگی اور وزن کیا جائے گا۔ قرآن پاک میں جابجا اس وزن اور جانچ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ سورۂ اعراف میں فرمایا گیا ہے "وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ" یعنی قیامت کے دن آدمیوں کے ایمان و اعمال کا وزن کیا جانا، تولا جانا حق ہے، اس میں شک شبہ کی گنجائش نہیں۔

آگے اِس وزن اور جانچ کا نتیجہ یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ جس کی میزانیں بھاری ہوں گی یعنی جس کے ایمان و اعمال میں وہ وزن ثابت ہوگا جو اس کو نجات اور جنت کا مستحق ٹھہرائے تو اس کے لئے جنت کا فیصلہ ہو جائے گا اور وہاں اس کو اس کی پسندیدہ زندگی نصیب ہوگی جس سے وہ ہر طرح راضی اور خوش ہوگا اور جس کی میزانیں ہلکی رہیں گی، یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کے وزن سے خالی ثابت ہوں گی تو اس کا ٹھکانا "ھاویہ" ہوگا یعنی دوزخ کا گڑھا جو دہکتی اور بھڑکتی ہوئی آگ ہوگی۔

قیامت میں وزنِ اعمال کا یقین بھی شرطِ ایمان ہے

جیسا کہ میں نے ابھی کہا قرآن پاک میں یہ مضمون بہت سے مقامات پر بیان فرمایا گیا ہے کہ قیامت میں آدمی کے اعمال کا وزن کیا جائے گا، ایمان بھی انسان کے اعمال میں سے ایک عمل ہے وہ ہاتھ پاؤں کا عمل نہیں ہے بلکہ دل کا عمل اور فعل ہے اس کا بھی وزن کیا جائے گا، اور اس وزن کے بعد ہی جنت یا دوزخ کا فیصلہ ہوگا۔ حدیث کے ذخیرہ میں اس مضمون کی حدیثیں بہت ہیں اور بعض حدیثوں میں اس وزن اور تول کی کچھ تفصیل بھی ہے۔

جس طرح قیامت پر اور جنت و دوزخ پر ایمان لانا ضروری اور شرط ایمان ہے اسی طرح آخرت کی میزان اور وزن اعمال پر ایمان لانا اور یقین کرنا بھی ایمان کی شرط ہے۔ ہاں ان چیزوں کی حقیقت اور کیفیت وہاں جا کر ہی معلوم ہوگی۔ اس زندگی میں یہ سب ہمارے لئے عالم غیب کی چیزیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایمان تو غیب ہی کی چیزوں پر لایا جاتا ہے۔ زمین آسمان، سورج چاند جیسی چیزوں کے ماننے کو ایمان نہیں کہا جاتا، یہ چیزیں تو آنکھوں سے نظر آتی ہیں۔ ہاں اللہ، اس کے فرشتے، اور وحی و رسالت، اور قیامت اور جنت اور دوزخ جیسے غیبی حقائق کے ماننے اور ان پر یقین لانے کو ایمان کہا جاتا ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے "يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ"

بہر حال قیامت میں ایمان و عمل کا وزن برحق ہے اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

وزن اعمال کی حقیقت

کسی کو یہ وسوسہ ہوسکتا ہے کہ وزن تو کسی مادّی چیز ہی کا کیا جاسکتا ہے، اور ہمارے ایمان اور اسی طرح اعمال تو کوئی مادّی چیز نہیں ہیں تو پھر ان کا وزن کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات کہ وزن صرف مادّی چیز ہی کا ہوسکتا ہے یہ ہماری اس دنیا اور اس عالم کا قانون ہے اور ہم انسانوں کی قدرت اور صلاحیت کے لحاظ سے ہے، آخرت کے عالم میں ہزاروں لاکھوں وہ چیزیں سامنے آئیں گی جن کو یہاں ہماری عقل ناممکن سمجھتی ہے، وہاں اللہ تعالیٰ کی اُس قدرت کا ظہور ہوگا جس کا ظہور ہماری اِس دنیا میں نہیں ہورہا ہے، اسی میں سے ایک یہ بات بھی ہوگی کہ وہاں ایمان اور اعمال اور ہمارے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بھی تو لے جائیں گے۔ بخاری شریف کی آخری حدیث جس پر امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری کو ختم کیا ہے یہ مبارک حدیث ہے۔

كلمتان حبيبتانِ إلى الرحمٰن خفيفتان على اللسان ثقيلتان في الميزان سبحان اللّٰه وبحمدہٖ، سبحان اللّٰه العظيم.	دو کلمے ہیں جو اللہ کو بہت پیارے، زبان پر بہت ہلکے پھلکے اور آخرت کی میزان میں بہت بھاری ہوں گے۔ سبحان اللّٰه وبحمدہٖ، سبحان اللّٰه العظيم۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ یہ دو کلمے، قیامت میں ان کا وزن کیا جائے گا اور یہ بہت بھاری اور وزنی ثابت ہوں گے۔ ہماری عقل کا حال یہ ہے کہ اگر دو سو برس پہلے کوئی کہتا کہ انسان کے جسم کی حرارت ناپی تولی جاتی ہے تو ہم اس کو ناممکن سمجھتے لیکن تھرمامیٹر ایجاد ہوگیا اس کا یہی کام ہے کہ اس سے جسم کی حرارت ناپی اور تولی جاتی ہے کہ وہ کس درجہ پر ہے۔ فضا میں جو گرمی یا ٹھنڈک ہوتی ہے اس کا بھی ناپنے کا آلہ ہے، ہوا کے بھی ناپنے اور تولنے کا آلہ ہے۔ یہ تو یہاں اس دنیا کی ایجادوں کا حال ہے۔ ان چیزوں کو سامنے رکھا جائے تو اس وسوسہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ قیامت میں ایمان اور عمل کا وزن کس طرح ہوگا۔ ہاں اس وزن اور تول کی اور وزن کے آلہ "میزان" کی حقیقت اور کیفیت وہیں جاکر معلوم ہوگی، اور عالم آخرت

کی سب ہی چیزوں کا حال یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس کا مکلف نہیں کیا کہ ہم اُس کی حقیقت اور کیفیت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں، اس طرح کی چیزیں قرآن وحدیث میں اس لئے بیان کی گئیں ہیں کہ ہم اُن پر دل سے یقین کر کے اپنی زندگی کو ایمان اور عمل صالح والی زندگی بنانے کی کوشش کریں تاکہ قیامت میں جب ہمارے ایمان اور اعمال کا وزن ہو تو ہم اُن خوش نصیب بندوں میں ہوں جن کے لئے نجات اور جنت کا فیصلہ سنایا جائے۔ ان بدنصیبوں میں نہ ہوں جن کے پلّے میں ایمان اور اعمال صالحہ کا وزن نہ ہو اِس کے برخلاف انہوں نے کفر ونفاق اور بدعملی کی زندگی گزاری ہو اور ان کے لئے "ھاویہ" یعنی دوزخ کا فیصلہ ہو۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

بے عمل مسلمانوں کا انجام اور قرآن

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ میں نے درس میں پہلے بھی بار بار کہا ہے کہ قرآن پاک میں اکثر وبیشتر دو متقابل طبقوں ہی کا اور اُن کے انجام کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک وہ مومنین جو ایمان لائے اور انہوں نے زندگی بھی ایمان والی گزاری، اُن کا انجام یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ اُن سے راضی ہوگا اور دار آخرت میں وہ اللہ تعالیٰ کے جوار رحمت اور جنت میں جگہ پائیں گے جہاں دائمی عیش اور چین میں رہیں گے۔ اور ہر طرح کی لذتیں اور مسرتیں ان کو حاصل ہوں گی۔ (فِيهَا مَاتَشْتَهِيهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ) اور دوسرے وہ غیر مومنین جو ایمان نہیں لائے، اللہ کے رسول کو اور اس کی ہدایت کو نہیں مانا اور اس کے اتباع اور پیروی کا فیصلہ نہیں کیا، ان کا انجام یہ بتلایا گیا ہے کہ اُن پر اللہ کا غضب ہوگا اور وہ دار آخرت میں دوزخ میں ڈالے جائیں گے جو دائمی عذاب گھر ہے۔ (فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًا) اس سورۃ "القارعہ" کی ان آخری آیتوں میں بھی انہی دو طبقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ "فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ" کا مصداق وہ مومنین صادقین ہیں جن کے پلّے میں ایمان کا بھی وزن ہوگا اور ایمان والی زندگی کا بھی۔ ان کے لئے فرمایا گیا ہے "فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ" اور "وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ" سے مراد وہ بدنصیب لوگ ہیں جن کے پلّے میں نہ ایمان کا وزن ہوگا نہ ایمان والی زندگی کا، یہ اہل کفر ونفاق ہوں گے، ان کے بارہ میں فرمایا گیا ہے "فَأُمُّهٗ

هَاوِیَۃٌ" یعنی ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ اللہ کی پناہ۔

الغرض اس سورت میں بھی اور قرآن پاک میں عام طور سے انہی دو طبقوں کا اور ان کے انجام کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک مومنین صادقین، دوسرے کافرین ومنافقین۔ اُس تیسرے طبقہ کا ذکر قرآن پاک میں بہت ہی کم کیا گیا ہے جس کا حال یہ ہے کہ اُس نے اللہ کے پیغمبر کو مان تو لیا اور کلمہ بھی پڑھ لیا اور زبان کے ساتھ دل سے بھی پڑھ لیا لیکن ایمان لانے اور کلمہ پڑھنے کے بعد پیغمبر کی ہدایت کی جس طرح پیروی کرنی چاہئے تھی وہ نہیں کی، یہاں تک کہ فرائض ادا کرنے اور محرمات سے بچنے کی بھی فکر نہیں کی یعنی زندگی ایمان والی نہیں رہی اور توبہ کی بھی توفیق نہیں پائی جیسا کہ آج مسلمانوں کی بڑی تعداد کا حال ہے اور میرا خیال ہے کہ خیر القرون کے بعد تقریباً ہر دور ہی میں ایسے مسلمانوں کی بڑی تعداد رہی ہے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا قرآن مجید میں ان کا اور ان کے انجام کا ذکر بہت ہی کم کیا گیا ہے۔ تلاش کرنے سے بھی مشکل ہی سے ملتا ہے۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس طبقہ کا وجود غیر معقول اور غیر منطقی ہے، عقل و منطق کا تقاضا یہی ہے کہ جب اللہ کے رسول پر ایمان لے آئے اور دل سے مان لیا تو پھر ان کی ہدایت کی پیروی اور احکام کی فرمانبرداری کی جائے۔ اب رہا یہ سوال کہ ان کا انجام کیا ہوگا تو عقل بھی یہ کہتی ہے کہ ان کو منکروں، کافروں والا دائمی عذاب بھی نہ ہو اور مومنین صادقین کی طرح سیدھے جنت میں بھی نہ بھیجے جائیں بلکہ نافرمانی اور بداعمالی کی سزا بھی پائیں اور ایمان کی بنیاد پر پھر رہائی بھی ہو جائے۔ قرآن وحدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، ہاں اگر کسی کی شفاعت یا دعا کے طفیل یا ارحم الراحمین اپنی رحمت ہی سے ان کو معاف فرمادے تو اس کا رحم وکرم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب گناہگاروں کو اسی طرح معاف فرمادے۔ "ربّ اغفر ورحم وانت خیرا الراحمین"



سورۃ التکاثر

درس — ۴۷

(درس-۴۷)

سورة التکاثر

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعُوذُ باللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ٥ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ٥ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ٥
ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ٥ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ٥
لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ۔ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ٥ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ
عَنِ النَّعِيْمِ٥ (سورۃ تکاثر)

ترجمہ: تمہیں غفلت میں ڈالے رکھا مال ودولت کی بہتات کی ہوس نے۔ یہاں تک کہ تم پہنچ گئے قبروں میں۔ ہرگز نہیں! تم جلدی جان لوگے۔ پھر (سنو) ہرگز نہیں! تم جلدی جان لوگے۔ ہرگز نہیں! اگر تم یقین کے ساتھ جان لیتے۔ تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے۔ پھر تم اس کو ضرور بالضرور یقین کی آنکھ سے دیکھو گے۔ پھر تم سے اُس دن نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

تفسیر وتشریح

یہ سورۃ تکاثر ہے۔ اس سے پہلی سورت "القارعہ" میں قیامت کا بیان فرمایا گیا تھا اور اُس کی آخری آیتوں میں بتلایا گیا تھا کہ وہاں وہی لوگ کامیاب اور بامراد ہوں گے اور جنت کی دائمی لذتیں اور مسرتیں حاصل کرسکیں گے جو ایمان اور ایمانی اعمال کا وہ ذخیرہ ساتھ لے جائیں گے جس کی وجہ سے جانچ تول میں ان کی میزانیں بھاری رہیں گی۔ اور وہ لوگ ناکام ونامراد رہیں گے اور دوزخ کا ایندھن بنیں گے جو وہ ذخیرہ ساتھ نہیں لے جائیں گے اور اس کی وجہ سے اُن کی میزانیں بے وزن اور ہلکی رہیں گی۔

سورہ کا سبق

اب اس سورۂ تکاثر میں اُس خاص سبب اور اُس مہلک روحانی مرض کی نشاندہی کی گئی ہے جو آدمی کو اُن اعمال خیر کا ذخیرہ فراہم کرنے سے غافل رکھتا ہے، جو قیامت اور آخرت میں نجات اور حصول جنت کا وسیلہ بننے والے ہیں اور جن کے وزن سے آخرت کی میزانیں بھاری ہوتی ہیں۔ اور وہ ہے مال و دولت اور دوسرے دنیوی سامانوں کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ جمع کرنے اور اس میں دوسروں سے آگے بڑھ جانے کی حرص و ہوس (تکاثر کا یہی مفہوم ہے) اور اس کا علاج ہے آخرت کے انجام کو اور خاص کر دوزخ کے عذاب کو نگاہ کے سامنے رکھنا۔ اس سورۂ تکاثر کا یہی خاص سبق ہے اور پیغام ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے "اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ، حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" مطلب یہ ہے کہ غافل انسانو! تم کو "تکاثر" نے (یعنی مال و دولت اور دنیوی عیش و راحت کے دوسرے سامانوں کی بہتات اور اس میں دوسروں سے بڑھ جانے کی حرص و ہوس نے) آخرت کی فکر اور اور تیاری سے اور وہاں کے لئے اعمال خیر کا ذخیرہ فراہم کرنے سے غفلت میں ڈال رکھا ہے اِسی میں تمہاری زندگیاں ختم ہو رہی ہیں یہاں تک کہ تم اسی حال میں مر کے قبروں میں پہنچ جاتے ہو۔ آگے فرمایا گیا ہے "كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ، ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ" "کلا" کے معنی ہیں ہرگز نہیں۔ یہ اِن غافلوں کی ان خام خیالیوں اور نفس کے فریبوں کی شدت کے ساتھ نفی اور تردید فرمائی گئی ہے جن میں یہ مبتلا تھے۔ مثلاً قیامت کا انکار اور اس پر یقین نہ رکھنا۔ یا یہ خیال کہ ہمارے دیوتا یا ہمارے پیر یا ہمارے آباواجداد وہاں ہمیں بچا لیں گے۔ "کلا" فرما کر اس طرح کی ساری خام خیالیوں اور غلط آرزوؤں کی شدت کے ساتھ نفی کی گئی ہے کہ ہرگز ایسا نہیں ہے، یقیناً قیامت آنے والی ہے اور کوئی بھی مجرموں کو وہاں اللہ کی پکڑ اور عذاب سے نہیں بچا سکے گا۔ آگے فرمایا گیا ہے "سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ" یعنی جلد ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ مزید تاکید و تنبیہ کے لئے مکرر ارشاد فرمایا گیا ہے "ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ" قرآن و حدیث کا اور عام وعظ و نصیحت کا بھی طریقہ ہے کہ زیادہ اہم بات کو مکرر سہ کرر کہا جاتا ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے "كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ" "کلا" کا مطلب یہاں بھی

وہی ہے جو ابھی میں نے بیان کیا ہے۔ یعنی غافل انسانوں کی اُن خام خیالیوں اور غلط آرزوؤں کی پھر شدت سے نفی اور تردید، جن میں مبتلا ہو کر وہ قیامت اور آخرت کی فکر اور تیاری سے بالکل غافل ہو کر زندگی گزار رہے تھے۔ آج بھی دنیا ایسے غافلوں سے بھری ہوئی ہے۔ خود مسلمانوں میں بھی آج بڑی تعداد اسی حال میں ہے۔ اس آیت کے مخاطب ایسے سب ہی لوگ ہیں جو قیامت کے بارے میں بے یقینی اور طرح طرح کی خام خیالیوں اور غلط آرزوؤں میں مبتلا ہو کر آخرت کی طرف سے بالکل بے فکر ہیں اور دنیا کمانے ہی پر جان کھپا رہے ہیں۔ اس آیت (اور اس سے آگے کی دو آیتوں میں بھی) ان سب سے خطاب ہے۔ فرمایا گیا ہے۔ ہرگز ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم سوچ رہے ہو، اگر تمہیں قیامت کے آنے اور جزا سزا کا یقینی علم ہوتا (اور تم ان حقیقوں پر ایمان لائے ہوتے) تو آخرت کی طرف سے تمہاری اندر یہ غفلت نہ ہوتی اور تم دنیا ہی کو مقصود و مطلوب بنا کر اُس پر اور صرف اسی پر اس طرح جان نہ کھپاتے۔

مرنے کے ساتھ ہی دوزخ کا مشاہدہ

آگے فرمایا گیا ہے "لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ" مطلب یہ ہے کہ اے غافلو! یہ بات قطعی اور یقینی ہے، اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ دوزخ کا وجود حق ہے اور تم اس کو دیکھ لو گے۔ غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ مرنے کے بعد عالم برزخ ہی میں تم اس کو دیکھو گے۔ قرآن مجید کی بعض آیات سے بھی معلوم ہوتا ہے اور حدیثوں میں بھی وارد ہوا ہے کہ دوزخیوں کو مرنے کے بعد عالم برزخ ہی میں دوزخ دکھلا دی جاتی ہے اور اسی طرح جنتیوں کو جنت کا نظارہ کرایا جاتا ہے (عالم برزخ میں جنت اور دوزخ کا یہ دیکھنا غالباً کچھ اس طرح کا ہوگا جس طرح ہم زمین پر رہنے بسنے والے آسمان کے ستاروں کو دیکھتے ہیں) بظاہر "لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ" میں رؤیت سے عالم برزخ کی یہی رؤیت مراد ہے۔ واللہ اعلم۔

آگے فرمایا گیا ہے "ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ" مطلب یہ ہے کہ اے غافلو! پھر اس کے بعد تم اس دوزخ کو یقین کی آنکھ سے بھی دیکھ لو گے۔ یعنی وہاں (عین دوزخ ہی پر) پہنچ کر اس کا مشاہدہ کر لو گے۔ پھر تم کو دوزخ کے بارہ میں عین الیقین حاصل ہو جائے گا۔

''عین الیقین'' یقین کا وہ درجہ ہے، جو ذاتی مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔

جنت اور دوزخ پر الحمدللہ ہمارا ایمان ہے اور ہم کو ان کے وجود کا پورا یقین ہے۔ لیکن اس یقین کی بنیاد رسول اللہ ﷺ اور اللہ کی کتاب پاک قرآن مجید کی اطلاع پر ہے۔ ہم نے اس کو حق مانا اور اس پر یقین کیا۔ یہ درجہ ''علم الیقین'' کا ہے۔

اس کے بعد دوسرا درجہ یقین کا وہ ہے جو عالم برزخ میں جنت یا دوزخ کو دور سے دیکھ کر حاصل ہوگا۔ اس کے آگے یقین کا تیسرا درجہ وہ ہے جو جنتیوں کو جنت کے بارے میں اور دوزخیوں کو دوزخ کے بارے میں وہاں پہنچ کر ذاتی مشاہدہ سے حاصل ہوگا۔ یہی ''عین الیقین'' کا درجہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ یقین کا اعلیٰ درجہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے ''لیس الخبر کالمعاینة'' یعنی خبر اور اطلاع کے ذریعہ جو علم یقین حاصل ہوتا ہے اُس یقین کے برابر نہیں ہوتا جو مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔

الغرض آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے غافلو! پھر وہ وقت بھی آئے گا جب تم اُس دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے اور تم کو اس کے بارے میں ''عین الیقین'' حاصل ہو جائے گا۔

نعمتوں کا حساب دینا ہوگا

آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے ''ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ'' جس کا مطلب ہے کہ پھر تم سے باز پرس کی جائے گی نعمتوں کے بارے میں۔ اوپر کی آیتوں میں خطاب خاص کر اُن لوگوں سے تھا جن کو مال و دولت وغیرہ متاعِ دنیا کی حرص و ہوس نے آخرت کی فکر و تیاری سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنے اُخروی انجام سے بے پروا ہو کر دنیا کمانے میں منہمک ہیں۔ اس آخری آیت میں وہ لوگ بھی مخاطب ہیں اور اُن کے علاوہ بھی تمام بنی آدم۔ اس دنیا اور اس زندگی میں جس بندے کو جو نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہوئی ہے اُس کے بارے میں قیامت میں اُس سے سوال ہوگا کہ اس نعمت کا تم نے کیا حق ادا کیا؟ اُس کے استعمال اور اس سے استفادے میں اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود کی کہاں تک پابندی کی؟ اللہ تعالیٰ نے ہم کو دیکھنے والی آنکھ، سننے والے کان اور سوچنے والی عقل عطا فرمائی۔ قیامت

میں ہم سے سوال ہوگا کہ اِن خداداد نعمتوں کو کس طرح استعمال کیا گیا؟ قرآن پاک کی آیت "إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا" کا یہی مطلب ہے۔

بہر حال اس سورت کی اس آخری آیت کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو جو بھی نعمتیں جسمانی، روحانی، دینی، دنیوی، اس زندگی میں عطا ہوئی ہیں، اُن کے بارے میں ہم سے سوال ہوگا اور ہم کو جوابدہی کرنی ہوگی۔ مال و دولت، اچھی کھانے پینے کی چیزیں، اچھا لباس، اچھا مکان، اچھی اولاد اور اچھی بیوی اِن جیسی چیزوں کو تو ہم نعمتیں سمجھتے ہیں لیکن اِدھر بہت کم لوگوں کا ذہن جاتا ہوگا کہ ان سب سے بدرجہا بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید ہے جو ہم کو عطا ہوئی ہے، رسول اللہ ﷺ اور آپ کی لائی ہوئی شریعت ہے۔ ان نعمتوں کے بارے میں بھی ہم سے سوال ہوگا کہ ان عظیم ترین نعمتوں کا تم نے کیا حق ادا کیا؟ تمہارا ان کے ساتھ کیا معاملہ رہا؟ بلاشبہ "لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ" میں یہ نعمتیں بھی شامل ہیں۔

پرچۂ امتحان

اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث خاص طور سے یاد رکھنے کے لائق ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ:

''کوئی بندہ قیامت میں مقام حساب سے اس وقت تک قدم ہلا نہیں سکے گا جب تک کہ اس سے پانچ باتوں کا سوال نہ کر لیا جائے گا۔ اوّل یہ کہ اُس نے اپنی عمر کن کاموں میں ختم کی۔ دوسرے یہ کہ خاص کر شباب کی قوتوں کو کن کاموں میں صرف کیا۔ تیسرے یہ کہ جو مال کمایا کس طریقہ سے کمایا، جائز طریقہ سے یا ناجائز طریقوں سے۔ چوتھے یہ کہ اُس کمائے ہوئے مال کو کن راہوں میں اور کن مصارف میں خرچ کیا۔ پانچویں یہ کہ جو علم اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا تھا اس پر کتنا عمل کیا۔ (۱)

یوں سمجھنا چاہیے کہ آخرت میں جو امتحان ہونے والا ہے یہ (حدیث) اُس کے سوال کا پرچہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ہم بندوں کو اس دنیا ہی میں بتلا دیا گیا ہے۔

---

(۱) مشکوٰۃ۔ کتاب الرقاق۔ بروایت ترمذی (مرتب)

اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ زندگی اس طرح گزاریں کہ اس کا وہ جواب دے سکیں جس پر ہم نجات اور جنت کے مستحق قرار پائیں۔



سورۃ العصر

درس — ۴۸

(درس-۴۸)

سُوْرَةُ الْعَصْرِ

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

وَالْعَصْرِ ہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ہ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ لا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ہ (سورة العصر)

ترجمہ: قسم ہے زمانے کی، انسان بڑے خسارے میں ہے۔ بجز ان بندوں کے جو ایمان لائے، اور انہوں نے نیک اعمال کئے، اور ایک دوسرے کو حق کی تاکید اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

تفسیر وتشریح

جیسا کہ اس درس قرآن کے سلسلہ میں بارہا ذکر کیا جا چکا ہے۔ "و" عربی میں قسم کے معنی میں آتا ہے۔ ہم آپ بھی بولتے ہیں "واللہ" اس کا مطلب ہوتا ہے اللہ کی قسم، تو یہاں "والعصر" میں بھی "و" قسم کے لئے ہے اور "العصر" کے معنی زمانے کے ہیں، تو "والعصر" کا مطلب ہوا، "قسم ہے زمانے کی"۔

یہ بات بھی آپ حضرات کے سامنے بار بار ذکر کی جا چکی ہے کہ قرآن پاک کی بہت سی سورتوں کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کی جو قسمیں ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر ایک طرح کی شہادت اور دلیل ہیں۔ یعنی جس چیز کی قسم کے ساتھ مضمون و مدعا بیان کیا جاتا ہے وہ چیز اُس مضمون اور مدعا کے لئے شاہد اور دلیل ہوتی ہے۔ (چند ہی ہفتے پہلے سورۂ "والعادیات" کے درس میں یہ بات کسی قدر تفصیل سے بیان کی گئی تھی) اس سورة العصر کا بنیادی مضمون یہ ہے

کہ سارے انسان خسارے میں ہیں اور اس خسارے سے محفوظ صرف وہ بندے ہیں جو اپنی زندگی میں چار باتوں کا اہتمام کریں۔ ایمان۔ عمل صالح۔ دوسروں کو حق کی نصیحت ووصیت۔ اور اسی طرح دوسروں کو صبر کی بھی تاکید ووصیت۔ یہی چار کام ہیں جن کے ذریعہ بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور دنیا وآخرت کی فلاح حاصل کرسکتا ہے۔ تو سورت کا حاصل یہ ہوا کہ جن بندوں نے اپنی زندگی کا سرمایہ ان چار کاموں میں لگایا وہی کامیاب وبامراد ہیں۔ اور جنہوں نے ایسا نہیں کیا انہوں نے اپنی زندگی کا سرمایہ برباد کیا اور وہ سراسر خسارے اور ٹوٹے میں رہے۔

اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان کا سرمایہ بس وہ زمانہ اور زندگی کی وہ مہلت اور وہ لیل ونہار ہیں جو اللہ نے اُس کو دیئے ہیں۔ اس سرمائے کو اگر وہ نفع والے کاموں میں لگائے گا تو نفع حاصل کرے گا اور اس کی تجارت کامیاب ہوگی۔ اور اگر غلط اور مضر کاموں میں لگائے گا یا غفلت اور خواہش پرستی میں ضائع کرے گا تو خسارے اور ٹوٹے میں رہے گا۔ زمانہ جس طرح گزر رہا ہے کہ اس میں ذرا ٹھہراؤ نہیں ہے وہ اس حقیقت کی شہادت دے رہا ہے اور گویا زبانِ حال سے پکار کے اعلان کررہا ہے۔ کسی بزرگ کا قول ہے کہ "میں نے برف کی دوکان پر برف کو پگھلتا دیکھا تو سورۃ العصر کی تفسیر سمجھ میں آ گئی کہ اگر دوکاندار محنت کرکے برف جلد بیچ لے گا تو اس کی پونجی محفوظ رہے گی اور کچھ نفع بھی کمالیگا، لیکن اگر اُس نے غفلت کی تو اس کا برف پانی ہوکر بہہ جائے گا، اور نفع سے محرومی کے علاوہ اپنی اصل پونجی بھی کھودے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانے کی رفتار برف کے گھلنے اور پانی بن کر بہنے سے زیادہ تیز ہے۔

اس سورۂ والعصر کے بنیادی مضمون پر زمانے کی شہادت کی ایک دوسری تشریح جو زیادہ واضح اور سہل الفہم ہے یہ ہے کہ گزرا ہوا زمانہ یعنی اُس کی تاریخ شاہد ہے کہ صرف وہی انسان فلاح یاب ہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالحہ کئے اور دوسروں کو بھی حق وصبر کی نصیحت ووصیت کرتے رہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین تھے۔ اور دوسرے لوگ جنہوں نے اس کے خلاف راستہ اختیار کیا وہ ناکام ونامراد رہے۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے جو واقعات بیان فرمائے گئے ہیں وہ سب اس کے شاہد اور اس کی دلیل ہیں۔ دنیا میں بھی اس کا ظہور ہوا اور پورا ظہور آخرت میں ہوگا۔ بہر حال زمانہ اس کی ت اور یہ سبق دے رہا ہے کہ وہی انسان فلاحیاب اور بامراد ہیں جن کی زندگی ایمان اور

عمل صالح والی زندگی ہو اور جو دوسروں کو بھی حق وصبر کی تاکید ووصیت کرتے ہوں، اور جن لوگوں کی زندگی ان چار چیزوں سے خالی ہو وہ ناکام ونامراد ہیں۔

ایمان کیا ہے؟

اب اِن چار چیزوں کی حقیقت اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، انہی کے ہونے نہ ہونے پر انسان کی فلاح وکامیابی اور خسران ونامرادی کا دارومدار ہے۔

ایمان ایک خاص دینی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے اللہ کے رسول پر اعتماد کرکے اور اُن کو خدا کا سچا رسول جان کر اُن کی اُن سب باتوں پر یقین کرنا اور قبول کرنا جو وہ اللہ کے رسول ہونے کی حیثیت سے بتلائیں اور فرمائیں۔ ہماری عقائد کی کتابوں میں ''ایمان'' کی تعریف اور تشریح ان مختصر الفاظ میں کی گئی ہے "تصدیق ما جاء به النبی صلی اللہ علیہ وسلم من عند اللّٰہ" اس کا یہی مطلب ہے کہ اللہ کے پیغمبر جو بات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتلائیں اور پہنچائیں اس کو حق جاننا اور ماننا۔ مثلاً اللہ کی ذات، اس کی وحدانیت، اس کی صفات اور عالم کی تخلیق وغیرہ جیسے اس کے افعال کے بارے میں، اِسی طرح قیامت، آخرت، جنت، دوزخ اور جزا سزا کے بارے میں، علیٰ ہٰذا، فرشتوں کے بارے میں، اگلے نبیوں اور اگلی کتابوں کے بارے میں، اللہ کی وحی اور اس کے احکام کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتلایا اور فرمایا، اگر وہ یقینی اور قطعی ذریعہ سے ہم تک پہنچا ہے تو اس کو حق جاننا اور اُس پر یقین کرنا اور اس کو قبول کرنا مومن ہونے کی شرط ہے۔ اگر تفصیل معلوم نہ ہو تو اجمالی طور پر یہ یقین کرنا اور قبول کرنا کافی ہے کہ اللہ کے پیغمبر ہونے کی حیثیت سے جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا اور فرمایا ہے اور جو تعلیم دی ہے وہ سب حق ہے اور میں نے اس کو قبول کیا۔

ایمان اور کفر کی سرحد

اور آپ کی بتلائی اور فرمائی ہوئی ایسی ایک بات کا انکار بھی کفر ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب باتوں کو تو میں مانتا ہوں، لیکن ''قیامت کا آنا میری سمجھ میں نہیں آتا اس لئے اس کو میں نہیں مانتا'' یا ''قرآن کا کلام اللہ ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا'' یا ''آپ پر

سلسلۂ نبوت کا ختم ہو جانا میری سمجھ میں نہیں آتا'' ایسا شخص کافر ہوگا۔ اسی لئے ہم لوگ قادیانیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو جانا نہیں مانتے، آپ ﷺ کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی مانتے ہیں۔ اگرچہ دوسرے ایمانیات سے ان کو انکار نہیں ہے۔ بہرحال بندہ مومن جب ہوگا جب رسول اللہ ﷺ کی بتلائی اور فرمائی ہوئی سب باتوں کو مانے اور قبول کرے (چاہے یہ ماننا اجمالی ہی طور پر ہو) اور آپ ﷺ کی بتلائی ہوئی اور فرمائی ہوئی ایک بات کے انکار سے بھی کافر ہو جائے گا۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

عمل صالح

اس سورۂ والعصر میں جن چار چیزوں کے ہونے نہ ہونے پر انسان کی فلاح اور اس کے خسران کا یعنی کامیابی اور ناکامی ونامرادی کا دارومدار بتایا گیا ہے ان میں دوسری چیز عمل صالح ہے۔ اس سے مراد وہ سب اعمال ہیں جن کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا، یا اپنے قول یا عمل سے ان کی ترغیب دی۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقہ، ذکر اللہ اور قربانی جیسی عبادات بھی داخل ہیں اور اچھے اخلاق اور اچھے معاشرتی اعمال بھی، جیسے سچائی، دیانت داری، رحم دلی، صبر، شکر، حسن سلوک، سخاوت، ایثار، غریبوں اور کمزوروں کی خدمت واعانت، مریضوں کی عیادت، بڑوں کی تعظیم، چھوٹوں پر شفقت اہل حقوق کے حقوق کی ادائیگی، اپنے سارے دنیوی معاملات، تجارت، ملازمت، شادی بیاہ، سب اللہ ورسول کے حکم یعنی شریعت کے مطابق کرنا، دین سیکھنا، دین سکھانا، اللہ ورسول کے حکم کے مطابق ہجرت اور جہاد۔ یہ سب چیزیں اپنے اپنے درجہ میں ''عمل صالح'' کے وسیع دائرہ میں شامل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سب چیزوں کا حکم دیا ہے اور ان کے فضائل بیان فرمائے ہیں اور ترغیب دی ہے۔ اور سب سے پہلے ان پر خود عمل کیا ہے۔

بدعت کتنی بھی اچھی نظر آئے عمل صالح نہیں ہے

''عمل صالح'' کے بارے میں اس وضاحت سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ مختلف

زمانوں میں جو ایسی باتیں دین میں ایجاد کی گئیں جن کا رسول اللہ ﷺ نے اشارۃً بھی حکم نہیں دیا اور اُن کو لوگوں نے ''عمل صالح'' قرار دے لیا ہے، وہ ''عمل صالح'' نہیں ہیں۔ جیسے بڑے پیر صاحب کی گیارہویں، بارہویں۔ بزرگوں کی قبروں پر عرس، اور خاص دنوں میں ''فاتحہ'' دسواں، چالیسواں وغیرہ۔ یہ ''اعمال صالحہ'' نہیں ہیں، بلکہ دین کی اصطلاح میں یہ ''بدعات'' ہیں۔ اور یہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین اور شریعت میں اضافہ ہے، جو نامقبول اور مردود ہے۔ دین اور شریعت بس وہی ہے جس کی تعلیم رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عمل صالح دراصل ایمان کا لازمی ثمرہ ہے۔ ایمان دل میں ہوتا ہے۔ زبان سے اس کا اظہار اور اقرار ہوتا ہے اور عمل صالح اس کا لازمی نتیجہ اور عملی ثبوت ہوتا ہے، بندے کے اندر جس درجہ کا ایمان ہوگا اسی درجہ کے اعمال صالحہ ہوں گے۔ اگر کسی بندے کی زندگی اعمال صالحہ سے خالی ہے تو سمجھنا چاہئے کہ اس کے دل میں ایمان نہیں ہے، یا ایمان بالکل بے جان ہے، جس طرح اُس مرے ہوئے دانے سے جس میں جان نہ ہو پودا نہیں اُگتا، اسی طرح بے جان ایمان سے عمل صالح پیدا نہیں ہوتا۔ بہر حال عمل صالح ایمان کا ثمرہ و نتیجہ اور اس کی علامت بھی ہے۔

تواصی بالحق اور تواصی بالصبر

جن چار چیزوں پر انسان کی فلاح اور کامیابی کا دارومدار ہے ان میں تیسری اور چوتھی چیز تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ہے۔ یعنی حق کی وصیت و تاکید کرنا اور صبر کی وصیت و تاکید کرنا ''حق'' سے مراد ہر اچھی بات اور اچھا کام ہے، جس میں ایمان اور عمل صالح کے سارے شعبے شامل ہیں۔ اور صبر کا مطلب ہے نفس پر قابو رکھنا اور ناموافق حالات میں بھی حق پر قائم رہنا۔ تو تواصی بالحق کا مطلب ہوا دوسروں کو ایمان و عمل صالح اور ہر اچھی بات اور اچھے کام کی نصیحت و وصیت کرنا۔ اسی کا دوسرا عنوان ''امر بالمعروف'' ہے۔ اور تواصی بالصبر کا مطلب ہوا نفس کو قابو میں رکھنے کی اور معصیتوں سے اس کو روکے رکھنے کی دوسروں کو تاکید و وصیت کرنا۔ اِس کا دوسرا عنوان ''نھی عن المنکر'' ہے۔

تو معلوم ہوا کہ خسارے سے اور ناکامی و نامرادی سے محفوظ رہنے کے لئے اور فلاح

وکامیابی حاصل کرنے کے لئے جس طرح ایمان لانا اور اعمال صالحہ کرنا شرط ہے اسی طرح دوسروں کو ایمان وعمل صالح کی اور اچھی باتوں اور اچھے کاموں کی دعوت دینا اور اس کی وصیت وتاکید کرنا اور ہر طرح کی معصیتوں اور برائیوں سے نفس کو روکنے کی نصیحت ووصیت کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ بھی ہمارے فرائض میں ہے اور اپنے اپنے حالات کے مطابق ہم اس کے مکلف ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عمل صالح کے وسیع دائرہ میں ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' بھی شامل ہیں لیکن چونکہ ہم بندوں کو یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے نفس کے ذمہ دار ہیں دوسروں کے ذمہ دار نہیں، اس لئے ''تواصی بالحق'' اور ''تواصی بالصبر'' کا صراحت کے ساتھ مستقل ذکر کیا گیا ہے۔

ایک سطر میں دین کی پوری دعوت

الغرض اس سورۂ والعصر کا پیغام یہی ہے کہ جو بندہ اللہ کی رضا اور دنیا وآخرت کی فلاح چاہے وہ ایمان لائے، اپنے اندر یقین کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اعمال صالحہ والی زندگی اختیار کرے، اور اس کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بھی اپنا وظیفہ بنائے۔ جب ہی وہ فلاحیاب ہوگا اور جس کی زندگی دین کے اِن عناصر اربعہ سے خالی ہوگی وہ خائب وخاسر اور نامراد رہے گا اور بالخصوص آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ خون کے آنسو روئے گا۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قریباً ایک سطر کی اس چھوٹی سی سورت میں دین کی پوری دعوت آگئی ہے اور فلاح دارین کا پورا پروگرام بتلا دیا گیا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر لوگ قرآن پاک کی صرف اس چھوٹی سی سورت میں تدبر کر لیتے یعنی اس کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو یہی ان کے لئے کافی تھی۔

اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق دے کہ اس سورت کا پیغام ہمارے سامنے رہے اور اس کی روشنی میں ہم اپنا محاسبہ اور اپنی اصلاح کی فکر وکوشش کرتے رہیں۔



سورۃ الھمزۃ

درس — ۴۹

(درس-۴۹)

سورۃ الھُمزہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعُوذُ باللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْم- بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ط

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ۝ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ- يَحْسَبُ
اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ۝ وَمَا اَدْرٰكَ
مَاالْحُطَمَةُ ۝ نَارُاللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝
اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝ فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝ (سورۂ ہمزہ)

ترجمہ: بڑی خرابی اور بربادی ہے ہر ایسے شخص کے لئے جو ہنسی اڑاتا اور تمسخر کرتا ہے اور عیب جوئی اور بدگوئی کرتا ہے، جو مال جوڑتا اور اس کو گنتا رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا یہ مال اس کو ہمیشہ باقی رکھے گا۔ ایسا ہرگز نہیں! وہ یقیناً پھینکا جائے گا حُطمہ میں۔ اور تم کیا جانو وہ حُطمہ کیا ہے۔ آگ ہے اللہ کی بھڑکائی ہوئی۔ وہ چڑھ دوڑے گی دلوں پر۔ وہ اُن پر بند کردی جائے گی۔ لمبے لمبے ستونوں میں۔

تفسیر وتشریح

سابق سورہ سے ربط

اس سے پہلی سورت ''والعصر'' میں بتلایا گیا تھا کہ انسانوں میں صرف وہ بندے کامیاب اور فلاح یاب ہوں گے اور اُنہی کا انجام بخیر ہوگا جو یہ چار صفتیں اپنے اندر پیدا کرلیں گے۔ ایمان۔ عمل صالح۔ ایک دوسرے کو حق کی تاکید ووصیت۔ اور اسی طرح صبر واستقامت

کی تاکید ووصیت۔ (جس کا حاصل دعوتِ خیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے) جن لوگوں میں جس درجہ میں یہ چار صفات ہوں گی وہ اُسی درجہ میں رسول اللہ کے متبع اور آپ کے لائے ہوئے دین اور آپ کی دعوت کے نمائندے ہوں گے۔ اور کامیاب و بامراد ہوں گے۔

اب اس سورہ ''الھمزہ'' میں بتلایا جارہا ہے کہ اِس کے برعکس اُن لوگوں کا انجام بہت برا ہوگا اور بالآخر وہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے جن کے اندر ایمان وعمل صالح اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر جیسی ایمانی وملکوتی صفات کے بجائے ھَمز ولَمز اور دولت پرستی جیسی شیطانی صفات ہوں گی۔

ھَمز اور لمز کا مطلب

ھمز اور لَمز یہ دونوں قریب المعنی لفظ ہیں، ہماری اردو زبان کے کسی ایک لفظ میں ان کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہَمز کے معنی ہیں کسی کی ہنسی اڑانا، تمسخر واستہزاء کرنا، پھبتیاں کسنا، غیبت کرنا، نقل اتارنا، تحقیر آمیز اشارے اور حرکتیں کرنا، یہ سب خواہ زبان سے ہو، یا ہاتھوں یا آنکھوں کے اشاروں سے، ہَمز کے مفہوم میں یہ سب صورتیں شامل ہیں۔ (آج کل اخبارات ورسائل میں جو کارٹون بنائے جاتے ہیں وہ بھی ہَمز ہی کی ایک ''ترقی یافتہ'' صورت ہے) اور لَمز کے معنی ہیں کسی کی عیب جوئی اور بدگوئی کر کے اس کی تحقیر وتذلیل کرنا۔

''ھُمزہ'' اور ''لُمزہ'' دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔ ان کا مطلب ہوا بہت زیادہ ہَمز ولَمز کرنے والے۔ ان دو کے بعد ایک تیسری بُری خصلت دولت اندوزی سے دلچسپی اور اس میں غیر معمولی انہاک کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے ''الَّذِیْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَہٗ، یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗ اَخْلَدَہٗ'' یعنی وہ آدمی جو مال جمع کرتا اور اس کو گن گن کے رکھتا ہے۔ اور وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا یہ مال اس کو ہمیشہ باقی رکھے گا۔ یہ مال کے ساتھ اس کی انتہائی محبت اور دلچسپی کی تعبیر ہے۔ یہ حال ان دولت پرستوں کا ہوتا ہے جو آخرت سے بالکل غافل اور بے فکر ہوتے ہیں اور دنیا ہی کو اور اس کی دولت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ بلا شبہ ہَمز اور لَمز کی طرح یہ دولت پرستی بھی کافرانہ اور منافقانہ خصلت ہے۔ جس بندے کو حقیقی ایمان نصیب ہو، دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر ہو اُس کا کبھی یہ حال اور یہ رویہ نہیں ہوسکتا۔

جس زمانے میں مکہ معظمہ میں یہ سورت نازل ہوئی اُس وقت اس کا خاص مصداق وہاں کے وہ کفار و مشرکین تھے جو کافر ہونے کے ساتھ کمینے اور موذی بھی تھے، وہ اہل ایمان کو تمسخر و استہزاء کا نشانہ بناتے، پھبتیاں کستے، اشارے بازی کرتے اور عیب جوئی و بدگوئی کر کے ان کو ایذا پہونچاتے اور اُن کا دل دکھاتے تھے۔ یہی اُن ظالموں بدبختوں کا تفریحی مشغلہ تھا، اسی کے ساتھ اُن کا حال یہ تھا کہ آخرت کی طرف سے غافل اور بےفکر ہو کر بس دنیا کمانے اور مال جوڑنے میں لگے رہتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ یہ مال ہر بلا سے ہم کو محفوظ رکھے گا اور ہم کو ہمیشہ باقی رکھے گا۔ اُن کے اس زعم باطل کی تردید میں پہلے تو فرمایا گیا "کلا" ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ نہ یہ مال ہمیشہ باقی رہے گا نہ تمہیں باقی رکھے گا۔ آگے ان کا انجام یہ بیان فرمایا گیا ہے "لَيُنۢبَذَنَّ فِى الۡحُطَمَةِ" وہ حطمہ میں یعنی دوزخ میں پھینک دئے جائیں گے، جھونک دئے جائیں گے۔

"اَلۡحُطَمَة" کا مفہوم

"الحطمة" کے اصل لغوی معنی ہیں چور چور اور ریزہ ریزہ کر دینے والی۔ اور یہاں اس سے مراد آتش دوزخ ہے۔ آگے اس "الحطمة" کے غیر معمولی پن کو بیان کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے "وَمَا أَدۡرَاكَ مَاالۡحُطَمَةِ" (اور تم کیا جانو کہ وہ "الحطمة" کیا ہے اور کیسی ہے) یہ اسی طرح فرمایا گیا جس طرح سورۃ الحاقۃ میں فرمایا گیا تھا "اَلۡحَاقَّةُ مَاالۡحَاقَّةُ، وَمَاأَدۡرَاكَ مَاالۡحَاقَّةُ" اور القارعہ میں فرمایا گیا تھا "اَلۡقَارِعَةُ مَاالۡقَارِعَةُ، وَمَاأَدۡرَاكَ مَاالۡقَارِعَةُ" جب کسی چیز کی انتہائی شدت اور ہولناکی بیان کرنا مقصود ہوتا ہے تو اسی استفہامیہ اور سوالیہ انداز میں خطاب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ "الحطمة" کی انتہائی ہولناکی اور شدت بیان کرنے کے لئے اس آیت میں فرمایا گیا ہے "وَمَا أَدۡرَاكَ مَاالۡحُطَمَةُ" اور تم کیا جانو کہ وہ "الحطمة" کیا ہے اور کیسی ہے۔ آگے خود ہی اُس کی غیر معمولی ہولناکی ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی "نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ الَّتِىۡ تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـئِدَةِ" مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی پیدا کی ہوئی اور بنائی ہوئی ایک خاص قسم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد دوزخ

کی آگ ہے جو اللہ تعالیٰ کے قہر وجلال کا خاص مظہر ہوگی۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کو "نار اللہ" (اللہ کی آگ) کہا گیا ہے۔ آگے اس آگ کی ایک غیر معمولی خصوصیت یہ بیان فرمائی گئی ہے "اَلَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ" جس کا مطلب یہ ہے کہ چڑھ دوڑے گی اور زَد لگائے گی مجرمین کے دلوں پر، اس کا خاص نشانہ اُن کے دل ہوں گے۔

یہ بات عقل بھی بتلاتی ہے اور تجربہ بھی ہے کہ انسان کے اعضاء میں جو عضو زیادہ نازک اور زیادہ اہم ہے وہ تکلیف زیادہ محسوس کرتا ہے۔ ہمارے ظاہری اعضاء میں آنکھ سب سے زیادہ نازک اور اہم ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اگر اس میں ذرّہ بھی چلا جائے تو انسان بے چین ہو جاتا ہے۔ اور انسان کا دل آنکھ سے اور تمام ظاہری و باطنی اعضاء سے زیادہ نازک اور اہم ہے۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ جہنم کی آگ دلوں پر چڑھے گی اور دلوں کو جلائے گی اور بھونے گی۔ اس دنیا میں اگر کوئی آدمی آگ میں ڈال دیا جائے تو پہلے اس کی کھال اور جسم جلے گا اور اسی سے آدمی کا زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دل تک آگ پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ لیکن جہنم کی آگ کی یہاں یہ خصوصیت بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ دلوں پر چڑھے گی اور دل اس کا خاص نشانہ ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کفر وشرک اور تمام بداخلاقیوں اور بداعمالیوں کی جڑ دل ہی میں ہوتی ہے اس لئے دوزخ کی آگ کا خاص حملہ ان دلوں پر ہوگا۔ واللہ اعلم

جب آگ بند کردی جائے

آگے فرمایا گیا ہے "اِنَّھَا عَلَیْھِمْ مُّؤْصَدَۃٌ، فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ" مطلب یہ ہے کہ پھر وہ آگ اُن ظالموں پر بند کردی جائے گی۔ ہماری اس دنیا میں بھی یہ ہوتا ہے کہ آگ جب کھلی رہتی ہے تو اس تپش اور گرمی ہر طرف کو جاتی ہے اور تقسیم ہو جاتی ہے، لیکن اگر کسی طریقہ سے اس کو بند کر دیا جائے تو اُس بند دائرہ میں اس کی تپش اور گرمی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ آوے میں آگ کو بند کر کے جس طرح اینٹیں پکائی جاتی ہیں اور ہمارے گھروں میں جو کوکر میں کھانا پکایا جاتا ہے اُس کا فلسفہ یہی ہے۔ تو دوزخ کی آگ جب دوزخیوں پر بند کردی

جائے گی تو اس کی جلانے کی ساری صلاحیت صرف انہی پر صرف ہو گی۔ **اللّٰھمّ احفظنا! اللّٰھمّ احفظنا!!**

"فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ" کے کئی مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ میرے نزدیک راجح اور سہل الفہم یہ ہے کہ جہنمی جکڑے ہوئے ہوں گے لمبے لمبے ستونوں سے۔

میں نے پہلے بھی بار بار کہا ہے کہ آخرت اور جنت دوزخ کے بارے میں قرآن پاک میں اسی اسی طرح حدیثوں میں جو کچھ بیان فرمایا گیا ہے ایک حد تک تو اُس کو یہاں بھی سمجھا جا سکتا ہے اور دعوت وتذکیر کے لئے اتنا سمجھنا کافی ہے لیکن اس کی واقعی نوعیت وہاں جا کر ہی معلوم ہو گی۔

بدترین کبیرہ گناہ

میں یہ ذکر کر چکا ہوں کہ اس سورت اور اس کی شدید وعید کا اصل مصداق وہ کفار ومشرکین اور منافقین تھے جو اہل ایمان کو اپنے ہمز ولمز استہزاء وتمسخر اور عیب جوئی وبدگوئی کا نشانہ بناتے تھے اور آخرت سے غافل وبے پروا ہو کر دولت سمیٹنے میں لگے رہتے تھے۔ انہی کا یہ انجام اس سورت میں بیان فرمایا گیا کہ وہ حُطَمَه میں اللہ کی بھڑکائی ہوئی اور دہکائی ہوئی آگ میں پھینکے اور جھونکے جائیں گے اور پھر وہ اوپر سے اُن پر بند کر دی جائے گی۔

لیکن جس انداز اور جن الفاظ میں یہ وعید سنائی گئی ہے اُس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمز ولمز، تمسخر واستہزاء، ہنسی اڑانا، پھبتیاں کسنا، منہ چڑانا، عیب جوئی وبدگوئی کر کے کسی کی تحقیر کرنا اور دل دکھانا، بدترین اور شدید ترین کبیرہ گناہوں میں سے ہیں۔ سورۂ حجرات میں صراحت کے ساتھ اِن حرکتوں کو حرام قرار دیا گیا ہے اور تاکید کے ساتھ منع فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح مال کی ایسی محبت کہ اس کو سمیٹتا اور جوڑتا رہے، گن گن کے رکھتا رہے اور اللہ کا اور اس کے بندوں کا حق بھی نہ نکالے یہ بھی ان کبیرہ گناہوں میں سے ہے جن پر قرآن پاک میں شدید وعید ہے۔

سورۂ توبہ میں فرمایا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ.

جو لوگ سونا چاندی سینت سینت کے رکھتے ہیں اور اس کو راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے اُن کو خوشخبری سنا دو دردناک عذاب کی۔

اللہ تعالیٰ اِن گناہوں سے اور ہر طرح کے گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔



سورۃ الفیل

درس — ۵۰

(درس-۵۰)

سُوْرَۃُ الْفِیْل

خطبہ مسنونہ کے بعد

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ○ اَلَمْ يَجْعَلْ
كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ○ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ○
تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ○ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ○
(سورہ فیل)

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کیسا معاملہ کیا تمہارے پروردگار نے اصحاب فیل کے ساتھ، کیا اُس نے ان کے داؤں کو یکسر ناکام نہیں کر دیا۔ اور اُس نے بھیجے اُن پر پرندے جھنڈ کے جھنڈ۔ جو اُن کو مارتے تھے کنکر کی پتھریاں۔ پھر کر ڈالا ان کو جیسے کھایا ہوا بھوسہ۔

تفسیر و تشریح

سورت کا خاص سبق

اس سورت کے اوّلین اور خاص مخاطب قریش مکہ اور تمام اہل مکہ ہیں، اس میں اصحاب فیل کے واقعہ کا ذکر فرمایا گیا ہے جو قریش پر اور عام مکہ والوں پر اللہ تعالیٰ کا انتہائی غیر معمولی انعام واحسان تھا اور اس میں اس کی قدرت کا خارق عادت طریقہ پر ظہور ہوا تھا...... اس واقعہ کا خاص سبق اور پیغام یہ تھا اور یہ ہے کہ اِس دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کچھ نہیں، اصل کارفرما طاقت اور قدرت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا بندوں کو چاہئے کہ اسی کو معبود و مقصود بنائیں۔ اسی کی عبادت کریں اور اس کی عبادت و بندگی میں کسی کو شریک نہ کریں۔

اصحاب فیل کا قصہ

اصحاب فیل کے اس واقعہ کی جو تفصیل تاریخ اور تفسیر کی کتابوں میں بیان کی گئی ہے وہ مختصراً یہ ہے کہ۔ رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت سے کچھ پہلے یمن پر عیسائیوں کی حکومت تھی، جو شخص حاکم اور فرمانروا تھا اس کا نام ابرہہ تھا۔ یہ سخت متعصب قسم کا عیسائی تھا، علاقہ میں جو لوگ عیسائی نہیں تھے، وہ اگر چہ مکہ والوں کی طرح مشرک تھے لیکن اپنا دینی اور مذہبی سلسلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جوڑتے تھے اور کعبۂ مکرمہ کو اپنا قبلہ مانتے اور اس کی زیارت اور حج کے لئے مکہ جایا کرتے تھے۔ ابرہہ نے چاہا کہ کسی طرح مکہ مکرمہ کے کعبہ سے ان کی عقیدت کا رشتہ ختم ہو اور ان سب کو عیسائی بنالیا جائے، اِس غرض سے اُس نے یمن کے دارالحکومت صنعاء میں ایک بڑا عظیم الشان اور بہت ہی شاندار کنیسہ یعنی گرجا تعمیر کرایا۔ اور چاہا کہ لوگ بجائے کعبہ کے اُس کو اپنا قبلہ اور دینی مرکز بنالیں۔ لیکن اس کی یہ اسکیم کامیاب نہیں ہوئی۔ اور عقیدہ اور عقیدت ایسی چیز نہیں ہے جس کو اس طرح کی تدبیروں سے بدلا جاسکے۔ خانہ کعبہ کی عمارت بالکل سیدھی سادی چوکور عمارت ہے۔ نہ گنبد ہے، نہ برج ہے، نہ نقش ونگار، کچھ بھی نہیں، لیکن کوئی مسلمان جو اُس کو قبلہ اور بیت اللہ سمجھتا ہے اس پر تیار نہیں ہوسکتا کہ اس کی جگہ ہماری دلی کی خوبصورت جامع مسجد یا آگرہ کے تاج محل کو یا امریکہ یا لندن کی کسی بڑی سے بڑی حسین وجمیل عمارت کو قبلہ اور بیت اللہ ماننے لگے...... بہرحال خانہ کعبہ سے وابستگی رکھنے والے غالباً کسی ایک آدمی نے بھی ابرہہ کے بنائے ہوئے کنیسہ کو قبلہ نہیں مانا، بلکہ اُن لوگوں میں اس کے خلاف غم وغصہ پیدا ہوگیا۔ اور ابرہہ کی اسکیم ناکام ہو کے رہ گئی۔ اب شیطان نے اس کو سمجھایا کہ کعبہ سے ان لوگوں کا تعلق جب ختم ہوگا جب کعبہ ہی کو ختم اور نیست ونابود کردیا جائے۔ اُسی زمانہ میں یہ واقعہ ہوا یا غلط طور پر اس کا پروپیگنڈا کیا گیا کہ قریش کے کسی آدمی نے رات میں کنیسہ میں گھس کر اُس میں غلاظت کردی اور اس کو ناپاک کردیا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کعبۃ اللہ کو ڈھانے کی غرض سے مکہ پر چڑھائی کرنے کا بہانہ کھڑا کرنے کیلئے یہ جھوٹا پروپیگنڈا کرایا گیا ہو، ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ فساد کرانے کے لئے اس طرح کے پروپیگنڈے سے خوب آگ لگائی جاتی ہے۔ بہرحال واقعہ ہو یا خالی پروپیگنڈہ، اسی کو بہانا بنا

کر ابرہہ نے مکہ پر فوج کشی کا منصوبہ بنایا۔ ابرہہ اگرچہ یمن کا بااختیار حکمراں تھا، لیکن ایک طرح سے حبشہ کی عیسائی شہنشاہی کے ماتحت تھا، اس نے اپنی اس فوجی مہم کے سلسلے میں حبشہ کی حکومت سے بھی مدد لی اور خاص طور سے ہاتھیوں کا ایک دستہ منگوایا، اور بیان کیا گیا ہے کہ ساٹھ ہزار کا لشکر جرار لے کر اس ناپاک ارادے سے مکہ کی طرف کوچ کیا، اس لشکر میں آگے ہاتھیوں والا دستہ رہتا تھا۔ یہ تدبیر غالباً عربوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے کی گئی تھی، کیونکہ عرب عوام کے لئے ہاتھی جیسی کوہ پیکر مخلوق بالکل نئی چیز تھی۔ بہرحال یہ لشکر منزلیں طے کرتا ہوا مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ گیا اور اس نے کچھ فاصلہ پر ایک وادی میں پڑاؤ کیا اُس کے قریب مکہ والوں کے اونٹوں کی چراگاہ تھی جہاں اُن کے اونٹ چر رہے تھے۔ ان میں دوسو اونٹ رسول اللہ ﷺ کے جد امجد خواجہ عبدالمطلب کے بھی تھے۔ لشکر والوں نے ان سارے اونٹوں کو مال غنیمت بنالیا۔ ابرہہ کے لشکر کی اور اُس کی اس حرکت کی اطلاع بھی اہل مکہ کو ہوگئی۔

ابرہہ نے جہاں پڑاؤ کیا تھا وہاں سے اُس نے اپنے ایک سفیر کے ذریعہ اہل مکہ کے پاس یہ پیام بھیجا کہ ہم صرف اس کعبہ کو ڈھانے اور ختم کرنے کے لئے آئے ہیں، تم سے جنگ کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے اس لئے تم لوگوں کے حق میں بہتر یہ ہے کہ تم کوئی مزاحمت نہ کرو دور دور رہو، اگر مزاحمت کرو گے تو ہمارا راستہ تو تم روک نہیں سکو گے البتہ سب کچل کے رہ جاؤ گے۔ اس لئے تمہارے لئے سلامتی اور عافیت کا راستہ یہی ہے کہ تم الگ رہو۔ ابرہہ کا سفیر یہ پیام لے کر مکہ آیا، اُس کو معلوم ہوا کہ یہاں کے سب سے بڑے سردار اور بزرگ قوم، خواجہ عبدالمطلب ہیں۔ جو بات کرنی ہو اُن سے کی جائے۔ چنانچہ ابرہہ کا سفیر اُن سے ملا اور بات پہنچائی۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ کعبہ میرا یا ہم میں سے کسی کا گھر نہیں ہے۔ یہ ''بیت اللہ'' ہے، جس کو اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم نے اللہ کے حکم سے بنایا تھا، اس کے ڈھانے کی کوشش کرنا اس اللہ سے لڑائی مول لینا ہے اس لئے تمہارے بادشاہ کو ہمارا نیک مشورہ یہ ہے کہ ایسا ارادہ نہ کریں واپس چلے جائیں۔ (بعض تاریخی روایتوں میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اہل مکہ میں سے کچھ لوگوں نے یہ پیش کش بھی کی کہ ہم اپنے فلاں پیداواری علاقہ کی پیداوار کا اتنا حصہ یمن کی حکومت کو بطور خراج ادا کریں گے۔ (اگر وہ واپس ہو جائے)

سفیر خواجہ عبدالمطلب کی باتوں سے اور ان کی شخصیت سے کچھ متاثر ہوا، اُس نے کہا

بہتر یہ ہوگا کہ آپ میرے ساتھ چلیں اور خود ہی ہمارے بادشاہ (ابرہہ) سے بات کرلیں۔ خواجہ عبدالمطلب اس کے ساتھ روانہ ہوگئے (اللہ تعالیٰ نے ظاہری وجاہت بھی دی تھی، ابرہہ نے دیکھا تو وہ بھی اُن کی وجاہت سے متاثر ہوا، اُن کا اکرام کیا، برابر میں بٹھایا اور کہا کہ آپ کو ہمارے سفیر کے ذریعہ ہمارا مقصد معلوم ہو چکا ہے۔ اب آپ جو کچھ کہنا چاہیں کہیں۔ انہوں کہا کہ میرا ذاتی مسئلہ تو بس اتنا ہے کہ آپ کے لشکر والوں نے ہمارے اونٹ پکڑ لئے ہیں وہ ہم کو واپس دے دئے جائیں۔ ابرہہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو میں نے آپ کو بڑا اور بلند خیال آدمی سمجھا تھا، لیکن آپ نے جو بات کی وہ تو بڑے آدمیوں والی بات نہیں ہے۔ آپ کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہم آپ کے کعبہ کو ڈھانے اور ختم کردینے کے لئے آئے ہیں آپ نے اُس سلسلہ میں مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا، صرف اپنے اونٹوں کی واپس کی بات کی۔ خواجہ عبدالمطلب نے بڑی سنجیدگی سے کہا "إنی انا رب الابل وإن للبیت ربا سیَمْنَعُه" (یعنی میری ملکیت کی چیز تو بس میرے یہ اونٹ ہیں، اس لئے میں نے اُن ہی کے بارے میں آپ سے کہا، رہا کعبہ تو اس کو جو مالک ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا) تاریخی روایات میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس گفتگو کے بعد ابرہہ نے وہ اونٹ واپس کرادئے جو لشکر والوں نے پکڑ لیے تھے۔

اہل مکہ نے عقل سے کام لیا

میرا خیال ہے کہ خواجہ عبدالمطلب اور مکہ کے دوسرے ذمہ داروں نے یہ رویہ سوچ سمجھ کے اس لئے اختیار کیا تھا کہ ابرہہ کے لشکر کی مزاحمت کا اِن کے لئے کوئی امکان نہیں تھا۔ اگر مزاحمت کرتے تو صرف کچلے جاتے اور جو ہونا تھا وہ ہو جاتا۔ ایسی حالت میں ابرہہ سے جنگ کرنے کا نہ خدا کا حکم تھا نہ عقل کا فتویٰ تھا۔ اُن کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ معاملہ خدا کے سپرد کرتے اور اس کے سامنے روتے گڑگڑاتے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ روایتوں میں ہے کہ انہوں نے خانہ کعبہ کا حلقہ پکڑ کر بہت ہی الحاح اور اضطراری کے ساتھ دعا کی اور لوگوں نے بھی دعائیں کیں۔(۱)

---

(۱) سیرت ابن ہشام ج اول (مرتب)

کعبے کی حفاظت چڑیوں کے لشکر سے

اُدھر یہ ہوا کہ ابرہہ نے منصوبے اور پروگرام کے مطابق خانہ کعبہ کو ڈھانے کے لئے لشکر کو اُس طرف بڑھنے کا حکم دیا، سب سے آگے ہاتھیوں والا دستہ تھا اور اُس میں ایک ہاتھی جو سب سے بڑا تھا اور گویا سب ہاتھیوں کا سردار تھا اس کو آگے بڑھنا تھا، وہ جم کر کھڑا ہو گیا اور کسی طرح قدم بڑھانے پر تیار نہیں ہوا، کعبۃ اللہ کے رخ کے علاوہ جس رخ پر چلایا جاتا چلتا لیکن جب کعبہ کی طرف بڑھایا جاتا تو جم کے کھڑا ہو جاتا اور قدم نہ اٹھاتا۔ بالآخر وہ بیٹھ گیا، اور فیل بان کی ہر طرح کی کوششوں کے باجود کھڑا نہیں ہوا۔ اسی اثناء میں چڑیوں کے غول کے غول کسی طرف سے آئے اور ابرہہ کے لشکر پر ان چڑیوں نے پتھریاں برسائیں، گویا اللہ تعالیٰ نے ابرہہ اور اس کے لشکر کو سنگسار کرنے کے لئے چڑیوں کا لشکر بھیجا۔ روایات میں ہے کہ یہ چڑیاں سمندر کی جانب سے آئی تھیں، یہ عجیب قسم کی چڑیاں تھیں جو اس دنیا میں کبھی نہیں دیکھی گئیں اِن کا رنگ زرد سا تھا اور یہ کبوتر سے کچھ چھوٹی تھیں، ان میں سے ہر چڑیا کی چونچ میں اور دونوں پنجوں میں کنکر کی ایک ایک پتھریا تھی۔ یہ پتھریاں وہ لشکر والوں پر گراتی تھیں اور وہ گولی کا کام کرتی تھیں۔ قرآن مجید میں ان چڑیوں کے غول کو "طیراً ابابیل" فرمایا گیا ہے۔ طَیر کے معنی ہیں پرندے، چڑیاں، اور ابابیؔل کے معنی ہیں غول در غول، جھنڈ کے جھنڈ، پرے کے پرے۔ ہماری اردو زبان میں ایک چھوٹے سے پرند کو "ابابیل" کہتے ہیں، پرانے گھروں میں اس کے گھونسلے ہوتے ہیں اور عجیب قسم کے ہوتے ہیں وہ اکثر شام کو غروب آفتاب کے قریب نکلتا ہے۔ یہاں وہ "ابابیل" مراد نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ میں نے کہا "ابابیل" کے معنی ہیں پرندوں کے غول کے غول اور چڑیوں کے پرے کے پرے۔ یہ گویا چڑیوں کی فوج تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے ہاتھیوں والی لشکر کے مقابلہ کے لئے بلکہ اس کو فنا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اِن چڑیوں کی اِس سنگباری اور سنگساری سے ابرہہ کے لشکر کا یہ حال ہوا کہ وہ گویا بھوسہ بلکہ کھائے ہوئے بھوسے کی طرح ہو گیا "کعصف ماکول" ہماری اردو زبان کا بھی محاورہ ہے کہ مار مار کے بھوسہ بنا دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک خاص ظہور تھا۔ ابرہہ بڑے غرور کے ساتھ ہاتھیوں والا لشکر لے کر آیا تھا اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ اس کو اور اس کے لشکر کو ننھی منی

چڑیوں سے فنا کرا کے قدرت کا معجزہ دکھایا جائے۔

قدرت کا یہ معجزہ ولادت نبوی کی تمہید تھا

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت سے کچھ ہی دنوں پہلے ظہور میں آیا تھا۔ اس طرح کے معجزانہ واقعات اگر اللہ کے کسی پیغمبر کی تائید وتصدیق کے لئے ظاہر ہوں تو اُن کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ جیسے نوح علیہ السلام کی دعا سے طوفان آجانا، یا موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل کا تعاقب کرتے ہوئے فرعون اور اس کے لشکر کا غرقاب ہوجانا، یا غزوۂ احزاب کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی آندھی کا آجانا جس نے دشمن کے ایسے بڑے طاقت ور لشکر کو جس کا عالم اسباب میں مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا بھاگنے پر مجبور کردیا۔ بہرحال اس طرح کے خارق عادت واقعات جب کسی پیغمبر کی تائید ومدد کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوں تو ان کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ اور اگر کسی پیغمبر کی بعثت یا اس کی دنیا میں آمد سے کچھ پہلے ظاہر ہوں تو ان کو ''اِرہاص'' کہا جاتا ہے۔ یہ معجزانہ واقعات پیغمبر کی آمد یا بعثت کی تمہید ہوتے ہیں تو ''اصحاب فیل'' کا یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی آمد کی تمہید تھا۔ اس سورۃ الفیل میں اسی واقعہ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

یقینی بات گویا آنکھوں دیکھی ہوتی ہے

''اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ'' مطلب یہ ہے کہ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے اصحاب الفیل کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ جب یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی پیدائش سے بھی پہلے کا ہے تو پھر یہ کیسے فرمایا گیا کہ کیا تم نے نہیں دیکھا؟ آپ کے تو دیکھنے کا امکان ہی نہیں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ ایسا مشہور ومتواتر ہو کہ اُس کی بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہ ہو تو نہ دیکھنے والوں لئے بھی وہ گویا دیکھا بھالا واقعہ ہوتا ہے اور اُن کے سامنے اسی طرح ذکر کیا جاتا جیسے وہ اُن کو دیکھا ہوا ہے۔ اس وقت افغانستان میں بڑی تعداد میں روسی فوج ہے اور افغان مجاہدین ان کا مقابلہ کررہے ہیں ظاہر ہے کہ ہم میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا ہے لیکن چونکہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے

جس میں کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ افغانستان میں کتنی بڑی تعداد میں روس کی فوج ہے اور افغان مجاہدین کیسی بہادری سے ان کا مقابلہ کرر ہے ہیں اور کیسی قربانی دے رہے ہیں۔ الغرض چونکہ ''اصحاب الفیل'' کے اس واقعہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور اُس علاقے کے اس زمانے کے سب ہی لوگوں کو ایسا ہی یقینی علم تھا جیسا کہ بچشم خود دیکھی ہوئی چیزوں کا ہوتا ہے اس لئے فرمایا گیا "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحَابِ الْفِيْلِ" علاوہ ازیں اس سورت کے نزول کے وقت یقیناً ایسے بہت لوگ زندہ تھے جنہوں نے یہ واقعہ بچشم خود دیکھا تھا۔ آگے واقعہ بیان فرمایا گیا ہے۔

"اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ" "کید" کے معنی ہیں خفیہ تدبیر، ہماری اردو زبان میں اس کا ترجمہ ''داؤں'' اور ''چال'' سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ تو آیت کا مطلب یہ ہوا کہ کیا تمہارے اُس پروردگار نے ان ''اصحاب فیل'' (ابرہہ اور اس کے لشکر) کی خفیہ تدبیر اور اس کی چال کو یکسر ناکام نہیں کر دیا اور خاک میں نہیں ملا دیا۔

ابرہہ کی چال کیا تھی

بظاہر ''کید'' سے اشارہ اس طرف ہے کہ ابرہہ نے ساٹھ ہزار کا جرار لشکر اور اس میں ہاتھیوں کا دستہ ساتھ لے کر یہ چال چلی تھی کہ مکہ والے دہشت زدہ ہوکر مقابلہ ہی نہ کریں گے اور ہم کسی مزاحمت کے بغیر کعبہ کو ڈھادینے اور نیست و نابود کر دینے میں کامیاب ہو جائیں گے اور پھر لوگ ہمارے بنائے ہوئے کنیسہ ہی کو قبلہ بنالیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُس کے اس منصوبے اور اس تدبیر اور چال کو خاک میں ملا دیا۔ آگے اس کی وضاحت اور تفصیل سے فرمایا گیا ہے "وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ، تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ، فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ".

"طیراً ابابیل" کی تشریح میں کرچکا ہوں "سجیل" کے متعلق اہل لغت نے لکھا ہے کہ فارسی کے لفظ ''سنگِ گل'' کو عربی بنالیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ ہوگا مٹی سے بنا ہوا پتھر۔ یہ وہ ہوا جس کو ہم اپنی زبان میں کنکر کہتے ہیں "عصف" کے معنی بھوسہ اور "ماکول" کھایا ہوا۔ تو ان تینوں آخری آیتوں کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے رب اور پروردگار نے ''اصحاب فیل'' یعنی

ابرہہ اوراس کے ہاتھیوں والے لشکر کو نیست و نابود کرنے کے لئے چڑیوں کے غول کے غول اور جھنڈ کے جھنڈ بھیج دے۔ جو ان کو کنکر کی پتھریوں سے مارتے تھے۔ پھر اِن چڑیوں کی اس سنگباری کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اِن ''اصحاب فیل'' کو بالکل بھوسہ کردیا اور وہ بھی کھایا ہوا اور چبایا ہوا بھوسہ۔

یہ چڑیاں خدا کے غیبی لشکروں میں سے ایک لشکر تھا، جس طرح قوم نوح پر طوفان بھیجا گیا، قوم عاد پر تباہ کن آندھیاں بھیجی گئیں جنہوں نے بستیوں کو نیست و نابود کردیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے غیبی لشکر تھے۔ قرآن مجید میں ہے "وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ" (اللہ تعالیٰ کے لشکر لاتعداد ہیں اُن کو اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا) اللہ تعالیٰ ہی اپنے حکمت سے فیصلہ فرماتا ہے کہ کس موقع پر کس لشکر سے کام لیا جائے ''اصحاب فیل'' کے بارہ میں حکمت الٰہی کا تقاضا یہی تھا کہ ہاتھیوں والے لشکر کو چڑیوں سے نیست و نابود کرایا جائے۔ العظمة لِلّٰه و الحمد لِلّٰه



سورۃ القریش

درس — ۵۱

(درس-۵۱)

سورۃ القریش

خطبہ مسنونہ کے بعد

أعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ۔

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ۔ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ (سورۂ قریش)

ترجمہ: قریش کی دلچسپی اور وابستگی کی وجہ سے۔ (یعنی) اُنکی دلچسپی اور وابستگی کی وجہ سے جاڑے اور گرمی کے سفر سے۔ پس انکو چاہیے کہ وہ عبادت کریں س بیت (کعبہ) کے مالک کی، جس نے ان کو کھلایا بھوک میں اور امن دیا خوف سے۔

تفسیر وتشریح

سورۂ فیل کا تتمہ

یہ سورۂ قریش، اس سے پہلی سورۃ الفیل کا گویا ضمیمہ یا تتمہ ہے۔ اُس میں اہل مکہ خاص کر قریش پر ہونے والے اللہ تعالی کے اس عظیم انعام واحسان کا ذکر فرمایا گیا تھا کہ جب ابرہہ نے اُن کے مقدس معبد کعبۃ اللہ کو تباہ وبرباد کرنے کے لیے ہاتھیوں والے لشکر کے ساتھ چڑھائی کی تھی، تو اللہ تعالی نے اس کی حفاظت فرمائی اور چڑیوں کی شکل میں اپنا غیبی لشکر بھیج کر ابرہہ کے لشکر کو صرف شکست ہی نہیں دی بلکہ اُن کو تہس نہس کر دیا اور ان کا بھوسہ بنا دیا۔ اب اِس سورۂ قریش میں اُنہی پر ہونے والے ایک دوسرے خاص انعام کا ذکر فرما کر اُن کو فرضِ شکر

ادا کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ وہ اُس ربّ کعبہ کی عبادت کریں جس نے ان کو کھانا عطا فرما کر بھوک کے عذاب سے نجات دی اور خوف سے امن عطا فرمایا۔

اس سورۂ ''قریش'' کے مضمون اور پیغام کو سمجھنے کے لئے ایک بات تو یہ پیش نظر رہنی چاہئے کہ مکہ میں اگرچہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلے بھی آباد تھے لیکن سرداری اور قیادت کا مقام قریش ہی کو حاصل تھا، اور اس کی وجہ سے صورت حال یہ تھی کہ کسی چیز کے قبول کر لینے یا رد کر دینے کے بارے میں قریش جو رویہ اختیار کرتے، امید کی جاتی کہ دوسرے لوگ بھی وہی رویہ اختیار کریں گے۔ دوسری بات یہ سامنے رہنی چاہئے کہ مکہ والوں کی معاش کا زیادہ تر دارومدار تجارت پر تھا۔ اور یہ تجارت بھی قریش ہی کے ہاتھ میں تھی۔ خود مکہ معظمہ اور اُس کے آس پاس کے علاقہ کا حال یہ تھا کہ نہ وہاں زراعت تھی نہ کوئی اور ایسی چیز جس سے لوگوں کی معاشی ضرورتیں پوری ہوتیں، تجارت واحد ذریعۂ معاش تھا۔ قریش میں جو سرمایہ دار تھے وہ تو تجارت کرتے ہی تھے لیکن جن کے پاس اپنا سرمایہ نہیں تھا وہ بھی سرمایہ والوں کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتے تھے، پھر اُن میں جو فیاض اور اہل سخاوت تھے وہ تجارتی منافع ہی کے بل پر غریبوں مفلسوں کی بھی مدد کرتے تھے۔ اس طرح قریش کی تجارت سے سب کو سہارا ملتا تھا۔

اس تجارت کا نظام یہ تھا کہ حجاز جس کا مرکزی شہر مکہ معظمہ تھا اور ہے اس کے ایک طرف شام تھا جو سرد ملک ہے اور دوسری طرف یمن، جو گرم علاقہ ہے۔ قریش کے تجارتی قافلے گرمی کے موسم میں شام کی طرف اور سردی کے زمانہ میں یمن کی طرف جاتے اور ایک ملک کی پیداوار اور مصنوعات دوسرے ملک تک پہنچاتے اور خود حجاز کے علاقہ میں بھی فروخت کرتے۔ اُس زمانے میں یہ راستے مامون نہیں تھے، تجارتی قافلے لُٹ بھی جاتے تھے، لیکن چونکہ اُن علاقوں میں عام طور سے وہ لوگ آباد تھے جو مکہ کے کعبہ کی عظمت اور تقدس کا عقیدہ رکھتے اور اس کو ''بیت اللہ'' مانتے تھے، اور قریش کے بارے میں جانتے تھے کہ یہ اس کعبہ کے خادم اور پڑوسی ہیں اور حج کے زمانہ میں دور دراز سے آنے والے حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں اس لئے اُن کے تجارتی قافلوں سے وہ تعرض نہیں کرتے تھے، بلکہ اُن کی خاطر مدارات ہوتی تھی۔ پھر اِن تجارتی سفروں کی وجہ سے قریش گرمی کے موسم میں مکہ معظمہ کی سخت گرمی سے اور سردی کے موسم میں وہاں کی سخت سردی سے بھی محفوظ رہتے تھے اس وجہ سے یہ دونوں سفر قریش بڑے

ذوق وشوق سے کرتے تھے اور یہ ان کی معاشی ضرورت ہونے کے علاوہ ان کی مرغوب ومحبوب تفریح بھی تھی۔اور ظاہر ہے کہ یہ ساری نعمتیں اور سہولتیں ان کو خانہ کعبہ ہی کے طفیل، فی الحقیقت رب کعبہ کی طرف سے حاصل ہو رہی تھیں۔تو اس سورہ میں بھی ان سب باتوں کی طرف اجمالی اشارہ کرتے ہوئے قریش سے فرمایا گیا ہے کہ اِس کعبہ کے طفیل ربّ کعبہ کی طرف سے جو نوازشیں تم پر ہو رہی ہیں کہ اِن تجارتی سفروں کے ذریعہ تمہارا معاشی اور غذائی مسئلہ حل ہو رہا ہے اور بھوک کے عذاب سے تم کو نجات ملی ہوئی ہے اور تمہارے قافلے امن واطمینان کے ساتھ چلتے ہیں اُن کو وہ خوف وخطر نہیں ہوتا جو دوسروں کو ہوتا ہے اور یہ سفر تم کو مرغوب بھی ہیں تو اس سب کا حق ہے کہ تم رب کعبہ ہی کی عبادت اور بندگی کرو جس کے فضل وکرم سے تم کو یہ سب کچھ حاصل ہو رہا ہے۔بس یہی اس سورت کا پیغام اور حاصل ہے۔

الفاظ کی تشریح

اب ذرا الفاظ کی روشنی میں بھی اس مطلب اور پیغام کو سمجھ لیا جائے۔فرمایا گیا ہے "لِاِیلٰفِ قُرَیشٍ اِلٰفِهِم رِحلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیفِ" مطلب یہ کہ قریش مکہ کو سردی اور گرمی کے اپنے تجارتی سفروں سے جو دلچسپی اور وابستگی ہے،اور اس سے جو منافع اُنکو حاصل ہوتے ہیں اُن کا حق ہے کہ "فَلیَعبُدُوا رَبَّ هٰذَا البَیتِ الَّذِی اَطعَمَهُم مِن جُوعٍ وَّاٰمَنَهُم مِنْ خَوفٍ" وہ "رَبَّ هٰذَا البَیتِ" یعنی کعبہ کے وحدہٗ لاشریک لہٗ، خداوند ہی کی عبادت اور بندگی کریں، ان کو جو کچھ مل رہا ہے اُس کے کرم سے مل رہا ہے۔

سورہ کا پیغام عام ہے

اِس سورت کا خاص تعلق اگرچہ قریش مکہ سے ہے لیکن اِسکا ہر اُس بندہ کو جو اس دنیا میں اللہ کی نعمتوں سے فیضیاب ہو رہا ہے، کھاپی رہا ہے، امن وامان کی فضا میں زندگی بسر کر رہا ہے، یہ سبق اور پیغام ہے کہ وہ عیشِ دنیا میں مست ہو کر اُس خداوند کریم کو نہ بھولے جس کے کرم سے اس کو یہ سب کچھ نصیب ہے، اس کا شکر ادا کرے، اس کی عبادت اور بندگی کرے۔ خود شکر بھی عبادت ہے۔فرمایا گیا ہے "کُلُوا مِن طَیِّبٰتِ مَارَزَقنٰکُم وَاشکُرُو اللّٰهِ اِن

كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْن" اس آیت سے معلوم ہوا کہ شکر بھی عبادت ہے۔

اس کے ساتھ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر ایسے بندوں نے جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھانے پینے اور امن واطمینان جیسی نعمتیں مل رہی ہیں اِن نعمتوں کا حق ادا نہیں کیا، اللہ اور اس کے حق کو بھلا دیا تو ہوسکتا ہے کہ ان کو ان نعمتوں سے محروم کردیا جائے۔ قرآن پاک میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے "ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَداً مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ" یعنی اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتا ہے ایک بستی تھی جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن واطمینان کی نعمت نصیب تھی اور اُس کے لیے رزق ہر جگہ سے وافر آجاتا تھا، پھر اُس بستی والوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اُن کے اس کرتوت کی بنا پر اُن کو بھوک اور خوف کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا اور رزق کی فراوانی اور امن واطمینان کی نعمت اُن سے چھین لی گئی۔

اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق دے کہ کبھی اس حقیقت کو نہ بھولیں کہ ہم کو جو نعمتیں نصیب ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے کرم سے مل رہی ہیں اور ان کا حق ہے کہ ہم رب کریم کا شکر ادا کریں اور اُسی کی عبادت اور بندگی کریں، اس صورت میں ہم دنیا اور آخرت میں اس کی نوازشوں کے مستحق ہوں گے۔ والحمد للہ رب العٰلمین۔



سورۃ الماعون

اور

سورۃ الکوثر

درس — ۵۲

(درس-۵۲)

سورۃ الماعون اور سورۃ الکوثر

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

أَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ٥ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ٥
وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ٥ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ٥ الَّذِيْنَ
هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ٥ وَيَمْنَعُوْنَ
الْمَاعُوْنَ ٥ (سورۂ ماعون)

(ترجمہ) کیا تم نے اسکو دیکھا جو روز جزا کی تکذیب کرتا (جھٹلاتا) ہے۔تو یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔اور مسکین (محتاج) کو کھانا دینے کی ترغیب (بھی) نہیں دیتا۔تو بڑا خراب انجام ہے ان نمازیوں کا جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔جو ریا کاری کرتے ہیں اور ماعون (زکوٰۃ) تک نہیں دیتے ہیں۔

تفسیر وتشریح

سابق سورہ سے ربط

اس سے پہلی دو سورتوں (الفیل اور القریش) میں قریش مکہ پر ہونے والے اللہ تعالیٰ کے بعض غیر معمولی انعامات واحسانات کا ذکر فرما کر اُن سے کہا گیا تھا کہ وہ ان انعامات کے شکر میں اُس کعبہ کے رب کی عبادت کرتے رہیں جس کے طفیل میں اُن پر رب کعبہ کے یہ انعامات واحسانات ہوئے اور ہو رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اللہ کی عبادت میں سب سے پہلا

درجہ نماز کا اور راہ خدا میں یتیموں اور مسکینوں وغیرہ اہل حاجت پر خرچ کرنے کا ہے جس کا اصطلاحی عنوان زکوٰۃ ہے۔ تو قریش مکہ کے لیے خصوصیت سے لازم تھا کہ وہ ان خداوندی انعامات کے شکر میں اہتمام سے نماز ادا کرتے اور اس کی دی ہوئی دولت اس کے غریب محتاج بندوں پر خرچ کرتے اور اُن کے ساتھ ترحّم کا برتاؤ کرتے۔ سورۃ الفیل اور سورۃ القریش کے مضمون کا یہ تقاضا تھا اور اُنکے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم و اسماعیل کی اپنی ذریت اور نسل کو یہ وصیت بھی تھی۔

سورہ کا مضمون

اب اس سورۂ ماعون میں بظاہر قریش ہی میں کے ایسے بدبختوں کا کردار بیان کیا جارہا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیوی نعمتیں عطا فرمائی تھیں، لیکن چونکہ وہ آخرت کی جزا سزا اور نیک و بد اعمال کے ثواب و عذاب پر ایمان نہیں رکھتے تھے بلکہ انکار و تکذیب کرتے تھے اس وجہ سے وہ بجائے اللہ تعالیٰ کے شکر اور اس کی عبادت اور اسکے محتاج بندوں کی خدمت و اعانت کے، اس کے بالکل برعکس شیطنت اور قساوت کا انتہائی بدبختانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ یہ بدبخت کافر و منکر ہونے کے علاوہ ننگ انسانیت بھی تھے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سورۂ ماعون میں فرمایا گیا ہے۔

اَرَءَیتَ الَّذِی یُکَذِّبُ بِا لدِّینْ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الیَتِیْمَ وَ لَایَحُضُّ عَلیٰ طَعَامِ المِسْکِیْن. مطلب یہ ہے کہ کیا تم نے اُس بدبخت کو یا ایسے بدبختوں کو دیکھا ہے۔ یعنی یقیناً دیکھا ہے۔ جن کا حال یہ ہے کہ وہ آخرت کی جزا سزا کے منکر اور اسکی تکذیب کرتے ہیں، یہی وہ ہیں جو لاوارث یتیموں کو بھی (جن کے ساتھ حسن سلوک اور ان کو کھلانا پلانا علاوہ حکم خداوندی اور نیکی ہونے کے انسانیت کا بھی تقاضا ہے، یہ بدبخت سنگدل اُن کو بھی) دھکے دیتے ہیں۔ اور مسکینوں محتاجوں کو خود تو کیا کھلاتے پلاتے، دوسروں کو بھی اس کی ترغیب نہیں دیتے، ان کے لئے کلمہ خیر کہنے میں بھی بخل کرتے ہیں، تم نے دیکھا یہ کیسے شقی اور قسی القلب ہیں۔ اس میں ان لوگوں کے لیے جو اللہ پر، آخرت کی جزا سزا پر، اور قرآن پر ایمان رکھتے ہیں سبق ہے کہ وہ اِس کافرانہ اور خلاف انسانیت کردار سے اپنی حفاظت کرتے رہیں۔ وہ یتیموں مسکینوں کی دستگیری اور اعانت کریں اور ان کے ساتھ اکرام کا برتاؤ کریں۔

سورۂ فجر میں فرمایا گیا ہے "كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيْمَ وَ لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ" (تم وہ مجرم ہو جو یتیموں کے ساتھ حسن سلوک نہیں کرتے اور محتاجوں مسکینوں کو کھلانے کی ترغیب بھی نہیں دیتے۔

آگے اُن مسلمانوں کو بُرے انجام کی آگاہی دی گئی ہے جن کا رویہ اس کے خلاف ہو جو نماز کی ادائیگی میں بھی غفلت کریں یا ریا کارانہ عبادت کریں، اور زکوٰۃ ادا نہ کریں یعنی محتاجوں مسکینوں کی امداد واعانت میں بخل کریں۔ فرمایا گیا ہے۔ "فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ" مطلب یہ ہے کہ ایسے نمازیوں کے لیے بڑی خرابی ہے اور انکا بہت برا انجام ہونے والا ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے ہیں، نہیں پڑھتے یا کبھی پڑھتے اور کبھی نہیں پڑھتے ہیں۔ اور اگر نماز یا کوئی بھی نیک کام کرتے ہیں تو اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کی رضا جوئی کے مخلصانہ جذبے سے نہیں کرتے بلکہ ریاکارانہ طور پر لوگوں کے دکھاوے کے لیے کرتے ہیں، اور ماعون نہیں دیتے۔ بعض اکابر صحابہ اور تابعین نے ماعون کی تفسیر زکوٰۃ سے کی ہے اس بنا پر یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے مال ودولت میں غریبوں محتاجوں کا جو حق مقرر کیا ہے وہ ادا نہیں کرتے۔ یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ یہ سورت مکّی ہے یعنی ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اور ہجرت سے پہلے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام مکہ معظمہ ہی میں تھا نماز کی طرح زکوٰۃ کا حکم تو تھا، لیکن اسکی مقدار کا تعین کہ مال کا چالیسواں حصہ ادا کیا جائے اور اس سلسلہ کے تفصیلی احکام ہجرت کے بعد آئے، ہجرت سے پہلے زکوٰۃ کا مطلب بس یہ تھا کہ اپنی کمائی سے غریبوں محتاجوں ضرورت مندوں کی خدمت اور مدد کی جائے تو "ماعون" سے یہی مراد ہوگا۔

سورت کی ابتدائی تین آیتوں میں اُن بدبختوں کے گھناؤنے کردار کا حقارت ونفرت کے انداز میں ذکر کیا گیا تھا جو آخرت میں اعمال کی جزا سزا اور ثواب وعذاب کے منکر ومکذب ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایسے سنگدل ہیں کہ لاوارث یتیموں کو دھکے دیتے ہیں اور مسکینوں محتاجوں کے ساتھ ان کو ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے، وہ دوسروں کو بھی ان کی مدد اور خبر گیری کی طرف توجہ نہیں دلاتے۔ اور اس کے بعد کی آیتوں میں اسلام کے دائرہ میں آجانے والوں کو "حدیث دیگراں" کے انداز میں آگاہی دی گئی ہی کہ وہ اپنا رویہ درست رکھیں نماز کے بارے میں غفلت نہ برتیں۔ پورے اہتمام سے نماز ادا کریں اور ان کی نماز اور ہر نیک عمل خالص اللہ ہی کے لیے اُس کے حکم

کی تعمیل اور اس کی رضا جوئی کی نیت سے ہو ریا کاری کا شائبہ بھی نہ ہو، اور ماعون یعنی غریبوں محتاجوں کا حق دینے میں کوتاہی نہ کریں بخل سے کام نہ لیں۔ اگر وہ اِن جرائم کا ارتکاب کریں گے تو اُنکا انجام بہت برا ہوگا، اُن کے لیے بڑی تباہی اور ہلاکت ہوگی یعنی آخرت میں ان کو سخت عذاب بھگتنا ہوگا۔ "وَیل" کا مطلب یہاں بُرا انجام اور آخرت کا عذاب ہے۔

آیت کی ایک دوسری تفسیر

بعض حضرات نے اس سورت کی ان آخری آیتوں "فَوَیلٌ لِلْمُصَلِّیْنَ سے یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ" تک کا مصداق بھی قریش اور مکہ کے اُن ہی مکذّبین مشرکین کو قرار دیا ہے جن کی بدکرداری اور قساوت قلبی کا ذکر اوپر کی آیتوں میں کیا گیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہاں "فَوَیلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ" میں صلٰوۃ سے مراد مسلمانوں کی نماز نہیں ہے بلکہ مکّہ کے مشرکین بھی جس طرح حج اور عمرہ کرتے تھے، بیت اللہ کا طواف کرتے تھے، قربانی کرتے تھے اور ان سب کو ملّت ابراہیمی کی عبادات سمجھتے تھے، اسی طرح وہ اپنے طریقہ پر نماز بھی پڑھتے تھے۔ لیکن ان سب اعمال کو انھوں نے مسخ کر کے لہو ولعب بنا رکھا تھا اور شرک سے ملوث کر رکھا تھا، قرآن مجید میں بھی اُن کی اس نماز کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے "وَمَا كَانَ صَلٰوتُهُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِیَةً" (سورہ الانفال) مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ کے پاس ان مشرکوں کی نماز بس یہ تھی کہ منھ سے سیٹی اور ہاتھوں سے تالیاں بجاتے تھے۔ تو اس دوسری تفسیر کی بنا پر سورت کی ان آخری آیتوں کا مطلب یہ ہوگا کہ بہت بُرا انجام ہونے والا ہے ان لوگوں کا اور بڑی تباہی اور ہلاکت آنے والی ہے اُن پر جو اپنی نمازوں کی اصل حقیقت سے غافل ہیں، اور نماز کے نام سے سیٹیاں اور تالیاں بجاتے اور کھیل تماشا کرتے ہیں، اور یہ بھی اللہ کے لیے نہیں بلکہ عوام کو یہ دکھانے کے لئے کرتے ہیں کہ ابراہیمی ملت کے عبادت گزار ہیں اور ان کا دوسرا مجرمانہ کردار یہ ہے کہ وہ انتہائی درجہ کے بخیل ہیں۔ "ماعون" دینے میں بھی بخل کرتے ہیں۔ لغت میں "ماعون" کے معنی ہیں روزمرّہ کی ضروریات میں استعمال کی معمولی چیزیں، جو ہر شریف آدمی ضرورت کے وقت استعمال کے لیے اہل ضرورت کو عاریۃً دے دیتا ہے، یہ بخالت اور کنجوسی کا انتہائی درجہ ہے کہ صرف استعمال کے لیے ان چیزوں کے دینے میں بھی بخل کیا جائے۔

بہر حال ان آیتوں کی جو بھی تفسیر کی جائے، اس سورت میں اس کردار کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ اور اسکو قابلِ نفرت اور موجبِ ہلاکت بتلایا گیا ہے کہ یتیموں مسکینوں محتاجوں کے ساتھ بے دردی اور بے رحمی کا برتاؤ کیا جائے۔ نماز کے بارے میں غفلت اور بے پروائی برتی جائے، اور اگر ادا کی جائے تو ریاکارانہ طور پر ادا کی جائے اور اہل ضرورت کو استعمال کے لیے معمولی چیزیں منگنیٔ کے طور پر دینے میں بھی بخل کیا جائے۔ مشرکین مکہ میں سے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوتِ اسلام کے سخت ترین دشمن تھے جیسے ابولہب ان کا یہی کردار تھا۔ اس سورت میں آگاہی دیدی گئی ہے کہ ان کا انجام بہت برا ہونے والا ہے اور بڑی ہلاکت اور تباہی اُن کا مقدر بن چکی ہے، ان کو سخت ترین عذاب بھگتنا ہوگا۔

اس سورۂ ماعون کے بعد چھوٹی سی سورت ''الکوثر'' ہے۔ مضمون کے لحاظ سے اُس کا اِس سورۂ ماعون سے بہت گہرا تعلق ہے۔

سورۃ الکوثر

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ
هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ (سورہ کوثر)

(ترجمہ) ہم نے تم کو عطا کیا کوثر۔ تو اپنے رب ہی کی نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ تمہارا دشمن ہی بے نام ونشان ہونے والا ہے۔

تفسیر وتشریح

جیسا کہ ابھی ذکر کیا جا چکا ہے سورۃ الفیل اور سورۃ القریش میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قریش مکہ پر ہونے والے عظیم انعامات کا ذکر فرمایا گیا تھا اور آخر میں فرمایا گیا تھا کہ ان کو چاہیے کہ وہ رب کعبہ کے انعامات واحسانات کے شکر میں اسکی عبادت کریں۔ (فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ. الاٰية) اس کے بعد سورۃ الماعون میں بتلایا گیا کہ ان ظالموں نے بجائے شکر وعبادت کے انتہائی ذلیل درجہ کے کفران کا رویہ اختیار کیا۔ آخرت کی جزا سزا کی تکذیب کی، جس

کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت عدل اور شانِ حاکمیت کا انکار کیا اور اس کے کمزور بندوں یتیموں مسکینوں کے ساتھ قساوت، بے دردی اور بے رحمی کا درندوں والا برتاؤ کیا۔ آگے فرمایا گیا کہ اُن لوگوں کے لیے بڑی خرابی اور ہلاکت وتباہی ہے جو نماز کے بارے میں غفلت اور کوتاہی کرتے ہیں اور نماز یا کوئی بھی نیک کام کرتے ہیں تو اللہ کے لیے اور آخرت کے ثواب کی امید میں نہیں، بلکہ ریاکارانہ طور پر کرتے ہیں۔ اور جو ماعون کے دینے میں بھی بخل کرتے ہیں۔

الکوثر کا مفہوم

اب اس سورۂ کوثر میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے ایک عظیم انعام واحسان کا ذکر فرما کر آپ کو حکم دیا ہے کہ اس کے شکر میں آپ اپنے محسن رب کے حضور میں نماز ادا کریں اور اسی کے لیے قربانی کریں۔ فرمایا گیا ہے۔"اِنَّا اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ" ہم نے آپ کو کوثر بخش دیا۔ امام بخاری نے اس کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کوثر سے مراد وہ خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا اور آخرت کی جو بھی نعمت اور خیر اور بھلائی رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوئی ہے کوثر کا لفظ اس سب کو حاوی ہے، اس میں آخرت اور جنت کا وہ حوض کوثر اور نہر کوثر بھی شامل ہے، جنکا ذکر حدیثوں میں آیا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حوض کوثر محشر میں ہوگا اور نہر کوثر جنت میں ہے، علماء نے یہ سمجھا ہے کہ کوثر کا اصل چشمہ اور نہر جنت میں ہے اور اسی کا پانی محشر کے حوض کوثر میں آتا رہے گا۔ بہر حال حضرت ابن عباس کی اس تفسیر کی بنا پر حوض کوثر اور نہر کوثر بھی کوثر کے وسیع مفہوم میں شامل ہیں۔ اُن کے علاوہ نبوّت، رسالت، ہدایت، قرآن پاک اور حکمت اور اعلاء کلمۃ اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کی توفیق، اور اُنکے نتیجہ میں اللہ کی مرضی کے مطابق نظام حکومت کا قیام، اور خاص کر بلد اللہ الحرام مکہ مکرمہ پر اقتدار اور بیت اللہ کی تولیت اور بتوں کی نجاست سے اُسکی تطہیر، اور وہ امت جس میں لاتعداد صدیقین اور شہداء اور صالحین اولیاء اللہ ہوئے ہیں اور قیامت تک ہوں گے، اور پھر آخرت میں مقام محمود اور شفاعتِ کبریٰ یہ سب ہی چیزیں حضرت عبداللہ بن عباس کی تفسیر کے مطابق کوثر کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اور یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ یہ سورت مکّی ہے، ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے، اس میں "اِنَّا اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ" فرما کر رسول اللہ ﷺ کو مکہ مکرمہ کی

مظلومانہ زندگی ہی میں اُن سب نعمتوں کی بشارت دی گئی ہے جو اللہ تعالی کی طرف سے آپ کیلئے دنیا یا آخرت میں مقدر ہو چکی ہیں۔اس طرح یہ فتح مکہ اور اسلام کے غلبہ کی پیشینگوئی بھی ہے۔

نحر (قربانی) کے ذکر کی خصوصیت

بہر حال سورت کی اس پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ کو خیر کثیر بخش دیا، آگے فرمایا گیا ہے "فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ" مطلب یہ ہے کہ آپ اس انعام واحسان کا شکر اس طرح ادا کریں کہ کامل اخلاص کے ساتھ اپنے خداوند کے حضور نماز ادا کیا کریں اور اُسی کے لیے قربانی کیا کریں۔ "نحر" عربی زبان میں زیادہ تر اونٹ کی قربانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن دوسرے جانوروں کی قربانی کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ یہاں نماز کے ساتھ عبادات میں سے قربانی کا ذکر کیا گیا ہے، شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ مشرکین اپنے بتوں اور معبودانِ باطل کیلئے قربانی وان عبادت زیادہ کرتے تھے، اس لیے صرف اللہ کے لیے قربانی اُنکے اِس شرک کے خلاف عملی جہاد بھی تھا۔ اور ہجرت سے پہلے جب تک زکوٰۃ کے تفصیلی احکام نہیں آئے تھے اور اسکا نصاب بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا، تو اس وقت زکوٰۃ کا مطلب صرف یہی تھا کہ اپنی کمائی سے غریبوں پر بھی خرچ کیا جائے، انکو کھلایا پلایا جائے۔ اس طرح مکی دور میں قربانی بھی زکوٰۃ کے وسیع مفہوم کے تحت آجاتی تھی (کیونکہ یہ بھی غریبوں کی مدد کا ذریعہ تھی) الغرض اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ اللہ تعالی کے اس عظیم انعام کے شکر میں کہ اُس نے آپ کو کوثر بخش دیا ہے، آپ کامل اخلاص کے ساتھ اُس رب کریم کے حضور میں نماز ادا کیجئے۔اور اسی کے لیے قربانی کیجئے۔

قرآن ہی کی بات سچ ٹھہری

آگے فرمایا گیا ہے "اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الاَبْتَر" شَانِئَ کا مطلب ہے دشمن، بدخواہ اور ابتر وہ ہے جس کا نسلی سلسلہ منقطع ہو جائے اور پھر کوئی اس کا نام لیوا نہ رہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین مکہ میں سے رسول اللہ ﷺ کے بعض بدطینت دشمن آپ کی مذکر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے کہا کرتے تھے کہ ان کا نسلی سلسلہ منقطع ہے، کوئی لڑکا بیٹا نہیں ہے جس سے آگے ان کا سلسلہ چلے، اس لیے (معاذ اللہ) اِن کے بعد کوئی ان کا نام لیوا بھی نہیں رہے گا۔

اس سورت میں اللہ کی طرف سے فرمایا گیا۔ کہ ہم نے تو آپ کو کوثر یعنی دنیا اور آخرت کی ساری خیر اور بھلائی بخش دی ہے (جس میں آپ کی دختری اولاد اور روحانی اولاد ساری امت بھی شامل ہے) آپ کو تو ہم نے وہ بخشا ہے جو کسی کو بھی نہیں ملا۔ پھر آپ کا سلسلہ کیسے منقطع ہو سکتا ہے، بلکہ ہماری طرف سے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ آپ کے اِن دشمنوں بدخواہوں کا سلسلہ بالکل منقطع ہوگا، ان کا کوئی نام لیوا نہ ہوگا۔

ہجرت سے پہلے مکی دور میں جب اللہ تعالی کی طرف سے یہ سورت نازل ہوئی اور اُس میں واشگاف طور پر یہ اعلان فرمایا گیا کہ "اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَر" (کہ آپ کے ان دشمنوں بدخواہوں کا سلسلہ منقطع ہوگا اور انکا کوئی نام لیوا نہ رہیگا) تو یہ بات بظاہر بالکل قرین قیاس نہیں تھی، آپ کے یہ بدطینت دشمن سب صاحبِ اولاد تھے۔ اس وقت دنیا میں پھل پھول رہے تھے، لیکن وہی ہوا جسکا اعلان اس آیت میں فرمایا گیا تھا۔ آج ہی نہیں بلکہ صدیوں سے ان کی اولاد اور نسل کا کہیں نام ونشان نہیں، ہم کو ان کا نام بھی تفسیری روایتوں ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ قرآن مجید کی ان پیشینگوئیوں میں سے ہے جو قرآن کے کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے بھی برحق ہونے کی روشن دلیلیں ہیں۔

سورت کا خطاب ہم سے بھی ہے

اس سورت میں اگر چہ خطاب رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا ہے لیکن آپ کے ساتھ یقیناً آپ کی امت کو بھی یہ ہدایت ہے کہ وہ اللہ کی روحانی وجسمانی اور دنیوی ودینی ہر قسم کی نعمتوں کا شکر ادا کرتی رہے۔ خاص طور سے اخلاص کے ساتھ نماز کا اور قربانی کا اہتمام کرے۔ اس کے ساتھ یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر امت اس پر عامل رہے گی تو اللہ تعالی کی مدد ونصرت اس کو دنیا میں بھی حاصل رہے گی، "اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَر" کا ظہور ہوگا، اسکے دشمن اور بدخواہ ناکام رہیں گے۔ اللہ تعالی اس پر یقین اور عمل کی توفیق دے۔

اس سورۂ کوثر میں جس طرزِ عمل کی ہدایت فرمائی گئی ہے وہ اُس کافرانہ کردار کے بالکل برعکس ہے جس کا ذکر اس سے پہلی سورت ماعون میں کیا گیا تھا۔ اس کے آگے سورۂ "الکفرون" اور اس کے بعد "سورۃ النصر" ہے ان دونوں سورتوں کا بھی اس مضمون سے خاص تعلق ہے۔ جیسا کہ انشاء اللہ معلوم ہو جائے گا۔

سورۃ الکافرون

درس — ۵۳

(درس-۵۴)

سورة الکافرون

خطبہ مسنونہ کے بعد

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ (سورہ کافرون)

ترجمہ: کہہ دیجئے، (صاف اور واشگاف اعلان کردیجئے) کہ اے منکرو! میں عبادت (پرستش اور پوجا) نہیں کرتا اُن (معبودانِ باطل) کی جنکی تم عبادت کرتے ہو۔ اور تم عبادت کرنے والے نہیں ہو اُس (معبودِ برحق) کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور میں (کبھی اور قطعاً) عبادت کرنے والا نہیں تمہارے معبودوں کی۔ اور تم (بھی کبھی) عبادت کرنے والے نہیں میرے (وحدہٗ لاشریک) معبود کی۔ تمہارے لیے تمہارا دین، اور میرے لیے میرا دین۔

تفسیر و تشریح

اتنی بات تو ہم آپ سب کو معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے، جب عمر کے چالیس سال پورے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا، پھر آپ کو حکم ہوا کہ دوسرے لوگوں کو دین حق کی دعوت دیں۔ آپ کی بنیادی دعوت اور تعلیم یہ تھی کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت اور پرستش کے لائق نہیں، صرف اسی کی عبادت اور پرستش کی جائے۔ اور قیامت اور آخرت اور وہاں اعمال کی جزا سزا، اور عذاب و ثواب برحق ہے، اس کا یقین کیا جائے۔ اور یہ کہ مجھے اللہ نے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے تاکہ میں اس کی عبادت کا طریقہ اور آخرت میں نجات کا راستہ بتلاؤں۔

اس سورہ کا خاص پس منظر

آپ کی اس دعوت کے اوّلین مخاطب اہل مکہ اور خاص طور سے قریش تھے۔ شروع میں دو چار ازلی سعادت مندوں کے سوا سب ہی نے اس کے ماننے اور قبول کرنے سے انکار کیا، اور مخالفت اور تکذیب پر کمر بستہ ہو گئے، کسی نے کہا کہ (معاذ اللہ) یہ خبط ہے، جنون اور دیوانگی ہے، کسی نے کہا کہ جن بھوت یا جادو کا اثر ہے، کوئی بولا کہ بڑائی اور سرداری حاصل کرنے کیلئے یہ روپ بھرا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی طرح طرح کے بہتان لگائے گئے۔ لیکن آپ اللہ کے حکم کے مطابق صبر واستقامت اور حکمت وموعظت کے ساتھ دعوت دیتے رہے۔ اور اس سلسلہ میں ہر طرح کی تکلیفیں اُٹھاتے اور مصائب جھیلتے رہے۔ شروع میں دعوت کو قبول کرنے اور ایمان لانے کی رفتار ایسی صبر آزما ہی کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ سال تک قریباً چالیس ہی حضرات ایمان لائے۔ اس کے بعد اس تعداد میں ایسا اضافہ ہونے لگا کہ منکرین اور مخالفین نے غالباً سمجھ لیا کہ ہم اپنی موجودہ مخالفانہ منفی کوششوں سے دین کی اس دعوت کو ختم کر دینے یا روک دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے اس لیے ایک مرحلہ پر انھوں نے ”کچھ لو اور کچھ دو“ کی بنیاد پر مصالحت اور مفاہمت کی بات سوچی۔ قرآن مجید۔ سورۂ ”ن“ میں فرمایا گیا ہے ”وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ“ (یعنی یہ منکرین مشرکین چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے پڑیں اور اپنے موجودہ موقف سے کچھ نیچے اتریں تو وہ بھی ڈھیلے پڑیں اور نیچے اتریں) روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طرف سے اس طرح کی تجویز رکھی گئی کہ آپ ہمارے معبودوں کا احترام کریں اور ان کی کچھ تعظیم وعبادت کر لیا کریں کم از کم ان کو ہاتھ ہی لگا دیا کریں اور آپ جس معبود کی عبادت کرتے اور دعوت دیتے ہیں، ہم اس کا احترام کریں اور اسکی بھی عبادت کر لیا کریں۔ اس طرح ہمارا آپ کا یہ اختلاف اور جھگڑا ختم ہو سکتا ہے (کیونکہ اختلاف کی بڑی بنیاد اور ان منکرین مشرکین کیلئے نا قابل قبول بلکہ نا قابل برداشت، آپ کی دعوتِ توحید ہی تھی، اس کے علاوہ وہ سب کچھ ماننے اور قبول کرنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے)۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر یہ سورۂ ”کافرون“ نازل ہوئی۔

غیر معمولی انداز خطاب

اس کے تیور اور اس کا انداز خطاب غیر معمولی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے قرآن پاک میں کسی دوسری جگہ دعوت حق کے منکرین و مکذبین کو "یَا اَیُّھَا الْکٰفِرُوْن" (اے منکرو، کافرو!) کہہ کر مخاطب نہیں کیا گیا ہے، اور جس طرح واشگاف اور دوٹوک انداز میں بات یہاں کہی گئی ہے، مجھے معلوم نہیں کہیں دوسری جگہ بھی کہی گئی ہو۔ فرمایا گیا ہے "قُلْ یَا اَیُّھَا الکافرُون" یعنی اے ہمارے پیغمبر آپ کہہ دیجئے اور صاف صاف اعلان کر دیجئے کہ اے کافر ومنکرو! "لَا اَعْبُدُ مَاتَعْبُدُوْنَ وَلَا اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ" مطلب یہ ہے کہ تم اپنے جن خودساختہ معبودوں کی عبادت کرتے ہو، میں اُن کی عبادت اور پرستش نہیں کرتا اور نہیں کروں گا اسکی کوئی امید نہ رکھی جائے، یہ معاملہ کم پرومائز (Compromise) اور لین دین کا نہیں ہے یہ دین کا سب سے اہم بنیادی مسئلہ ہے۔ اور میں جس وحدہٗ لاشریک معبود حق کی عبادت اور پرستش کرتا ہوں، تم اس کی عبادت اور پرستش کرنے والے نہیں (کیونکہ اس کی عبادت وہی معتبر ہے جو اُس کے سوا ہر ایک کی معبودیت کا انکار اور ہر قسم کے شرک سے بیزاری کا اظہار کر کے کی جائے، اور تم اس کے لئے تیار نہیں ہو، لہٰذا اس صورت میں اس کا کوئی امکان نہیں کہ تم میرے اس معبود حق کی عبادت کرو جس کی میں عبادت اور پرستش کرتا ہوں) آگے اسی مضمون کو معمولی لفظی فرق کے ساتھ مکرر ارشاد فرمایا گیا ہے "وَلَا اَنَا عَابِدٌمَا عَبَدْ تُّمْ وَلَا اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ" یعنی پھر سن لو اور لوح دل پر نقش کر لو کہ میں کبھی عبادت کرنے والا نہیں ہو سکتا تمہارے خودساختہ معبودوں کی، اس کا کوئی امکان نہیں، اور اسی طرح تم میرے معبود حق کی عبادت کرنے والے نہیں ہو سکتے، (کیونکہ اسکی عبادت کے لیے شرک اور دوسرے معبودوں سے بیزاری شرط ہے اور تم اس کے لئے تیار نہیں ہو)۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَ لِیَ دِیْن" یعنی ہمارا اور تمہارا راستہ بالکل جدا ہے، تمہارے لیے تمہارا دین ہے (جس کی بنیاد خودساختہ معبودوں کی عبادت اور شرک پر ہے) اور میرے لیے میرا دین ہے (جس کی بنیاد ہر طرح کے شرک سے بیزاری، توحید خالص اور وحدہٗ لاشریک معبود حق کی عبادت پر ہے) اب دیکھو اور انتظار کرو، ہم میں سے ہر ایک کے سامنے اس کا انجام اور نتیجہ

آجائے گا، میں نے تم کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور اپنے امکان بھر سمجھانے کی اور تمہارے دلوں میں اتارنے کی کوشش کی، اب میں بری الذمہ ہوں۔ یہ ہے اس سورت کا حاصل اور پیغام۔

عبادت کیا ہے؟

اس سلسلۂ درس میں یہ بات بار بار بیان کی جاچکی ہے کہ کسی واقعی یا فرضی ہستی کو نفع وضرر اور بناؤ بگاڑ کا مالک ومختار سمجھ کر عجز و نیاز کے اظہار کے ساتھ ظاہر و باطن سے اسکی آخری درجہ کی تعظیم کرنا، اُس سے اپنی حاجتیں طلب کرنا، اس کے لئے چڑھاوے چڑھانا، نذریں ماننا یہ سب صورتیں عبادت کی ہیں اور مشرکین عرب اپنے خود ساختہ معبودوں کے ساتھ یہ سب معاملات کرتے تھے، یہی اُن کا شرک فی العبادت تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت وتعلیم کا پہلا سبق اَن کو یہ تھا کہ یہ شرک سب سے بڑا اور ناقابل معافی گناہ ہے، اس سے باز آجاؤ "لَاتَعْبُدُوْا اِلاَّ اللّٰہ" عبادت صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی کرو، اسکے سوا کسی کی نہیں، اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ سب پیغمبروں کا پہلا سبق یہی رہا ہے۔ (اَنِ عْبُدُ وْاللّٰہَ مَالَکُم مِن اِلٰہٍ غَیْرُہٗ) یہی کلمہ "لَا اِ ٰلہَ اِلاَّ اللّٰہ" کا مطلب اور پیغام ہے لیکن اہل شرک کے لیے ہمیشہ یہی بات سب سے زیادہ ناگوار رہی ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین مکہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت وتعلیم کے سلسلہ کی دوسری بہت سی باتیں ماننے کو تیار تھے لیکن شرک کے خلاف سننا بھی نہیں چاہتے تے آج بھی یہی حال ہے، دوسروں کا کیا ذکر خود مسلمان کہلانے والوں میں جو تعزیہ پرست اور قبر پرست جیسے گرفتاران شرک ہیں، جو تعزیوں پر اور مزارات پر چڑھاوے چڑھاتے، سجدے کرتے اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں، ان کا بھی یہی حال ہے، ان سے نماز روزے کی بات کہی جائے یا دوسرے نیک کاموں کے لیے اور گناہوں سے بچنے کے لیے کہا جائے تو وہ چاہے عمل نہ کریں مگر بُرا نہیں مانیں گے، لیکن اگر تعزیہ پرستی اور قبر پرستی کی قباحت ان کو بتلائی جائے اور اس انتہائی درجہ کی گمراہی اور گندگی سے نکالنے کی کوشش کی جائے تو بسا اوقات وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ اور خود آپ کو بددین سمجھیں گے۔ وہ اسی کو دین وایمان سمجھتے ہیں۔

ہجرت اور اعلان جنگ کی تمہید

اس سورۂ "کافرون" کے بارے میں ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے، کہ کسی روایت سے تو مجھے متعین طور سے اسکا زمانۂ نزول معلوم نہیں ہوسکا لیکن اسکے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حضور کے مکہ معظمہ کے قیام کے آخری دور میں نازل ہوئی ہے جبکہ اہل مکہ پر قطعی طور پر حجت تمام ہوگئی اور اُن کے دعوت حق قبول کرنے کی طرف سے قطعی مایوسی ہوگئی اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے ذریعہ آپ سے شرک اور اہل شرک اور انکے معبودان باطل سے برأت اور بیزاری اور قطعی بے تعلقی کا اعلان کرایا، جس طرح آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت فرمانے سے پہلے اپنے قبیلہ اور عام اہل وطن کے شرک اور اُن کے باطل معبودوں سے برأت اور بیزاری کا اعلان فرمایا تھا جسکا ذکر سورۂ ممتحنہ کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ الآية

ترجمہ: تمہارے لیے اچھا قابل تقلید نمونہ ہے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں، جب انھوں نے اپنی قوم والوں سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمھارے معبودانِ باطل سے بری اور بیزار ہیں۔

اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اس سورت میں مشرکین کے پیش کئے ہوئے مصالحت کے فارمولے کو قطعی طور سے مسترد کر کے اور ہر قسم کے شرک اور اہل شرک سے برأت کا اظہار کر کے اُس ہجرت کی طرف اشارہ فرمایا گیا جو آپ کی فتح اور دین حق کے غلبہ کا مقدمہ اور پیش خیمہ بننے والی تھی۔ ہمارے بزرگوں میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس سورۂ "کافرون" میں اعلان جنگ مضمر ہے۔

ماقبل اور مابعد سے اس سورت کا ربط

اس سے پہلے قرآن پاک میں سورہ کوثر ہے، اُسکے درس میں میں نے کہا تھا کہ اس سورۂ کوثر میں فتح مکہ اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے لائے ہوئے دین حق کی تمام فتوحات کی

بشارت دیدی گئی ہے۔ گویا پہلے آپ کو فتوحات اور غلبہ دین کی بشارت دیدی گئی اسکے بعد ہجرت کا حکم آیا۔ اور اس سورۂ کافرون کے بعد متصلاً سورۂ ''نصر'' ہے جس میں فتح مکہ اور غلبۂ حق کا واضح بیان ہے، یہ بھی اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہ سورۂ ''کافرون'' مکہ معظمہ کے آخری زمانہ قیام میں ہجرت سے کچھ ہی پہلے نازل ہوئی اور اسمیں ہجرت کا اشارہ فرمایا گیا۔

واللہ اعلم

اس سورہ کی عظمت وفضیلت

اس سلسلۂ درس میں یہ بات بھی بار بار بیان کی جا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کی حیثیت سے قرآن مجید کی ہر آیت اور ہر سورت کی عظمت وفضیلت یکساں ہے۔ اس کے باوجود مضمون کے لحاظ سے بعض آیات اور بعض سورتوں کو خاص فضیلت حاصل ہے، یہ سورۃ کافرون اور سورۂ اخلاص (قل هو الله احد) بھی انہی سورتوں میں سے ہیں جن کی رسول اللہ ﷺ نے خاص فضیلت بیان فرمائی ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ فجر کی اور مغرب بعد کی سنتوں میں اکثر پہلی رکعت میں سورۂ کافرون اور دوسری میں سورۂ اخلاص پڑھتے تھے۔ ایک صحابی نوفل بن معاویہؓ نے آپ سے دریافت کیا کہ میں سوتے وقت کیا پڑھا کروں؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ سورۂ کافرون پڑھ لیا کرو۔ اس میں شرک سے قطعی برأت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اخلاصِ توحید اور شرک کی نفی سے زیادہ کوئی عمل محبوب نہیں اسی لیے ''لا الہ الا اللہ'' افضل الذکر ہے اور اِس سورۂ کافرون میں اسی کی وضاحت اور تشریح ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص توحید، شرک سے بیزاری اور اُس پر استقامت نصیب فرمائے۔



سورۃ النصر

درس — ۵۴

(درس-۵۴)

سُوْرَۃُ النَّصْرِ

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

اِذَا جَآءَ نَصْرُاللّٰہِ وَالْفَتْحُo وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ
اللّٰہِ اَفْوَاجًاo فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ ط اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًاo
(سورہ نصر)

ترجمہ: جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے۔ اور تم دیکھو لوگوں کو کہ وہ اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں جوق در جوق۔ تو اپنے پروردگار کی تسبیح وحمد (خاص اہتمام سے) کرو، اور (کوتاہیوں کی) اُس سے مغفرت طلب کرو، وہ بڑا ہی معاف کرنے والا (بہت مہربانی فرمانے والا) ہے۔

تفسیر وتشریح

سورہ کے نزول کا پس منظر

یہ سورۃ النصر ہے۔ اس سے پہلے سورۃ الکٰفرون تھی، میں نے اُس کے درس میں بتلایا تھا کہ اس میں خاص طور سے مشرکین مکہ پر حجت تمام کی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا ہے کہ اُن سے اور اُن کے شرک وکفر سے صاف اور واشگاف طور پر براٗت اور بیزاری کا اعلان کر دیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس میں ہجرت کا بھی اشارہ ہے۔ اور ہجرت کے بعد ہی سے اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت کے ظہور اور اس کے نتیجہ میں دعوتِ دین کے فروغ اور فتوحات کا دور شروع ہونے والا تھا۔ جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ تھا۔ چنانچہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم

سے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی، اپنا گھر، اپنے عزیز وا قارب اور وطن چھوڑ کے مدینہ منورہ کو اپنا مستقر بنایا۔ پھر ایک وقت آیا کہ اللہ تعالی کی طرف سے آپ کو اور آپ پر ایمان لانے والوں کو کفار ومشرکین کے ظلم وستم اور چیرہ دستیوں کا طاقت سے مقابلہ کرنے اور جنگ کرنے کی اجازت ملی اور اللہ تعالی کی نصرت کا ظہور شروع ہوا جس کا وعدہ تھا اور جو سنتہ اللہ ہے اس (نصرت) کا پہلا محسوس ظہور ہجرت کے دوسرے سال غزوۂ بدر میں ہوا۔ جب آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو جن کی تعداد کل تین سو تیرہ تھی اور جن کے پاس ضروری سامان جنگ بھی نہیں تھا۔ مشرکین مکہ کے ایک ہزار کے اس لشکر کے مقابلہ میں فتح حاصل ہوئی جو پوری طرح مسلح اور لیس ہو کر آیا تھا۔ پھر اُس رفتار کے ساتھ جو اللہ تعالی کے نزدیک مناسب تھی نصرت الٰہی اور فتوحات کا سلسلہ چلتا رہا۔

اللہ تعالی کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو یہ بشارت بھی دیدی گئی تھی کہ ہماری نصرت اور فتوحات کے اس سلسلہ میں عنقریب ہی وہ مرحلہ بھی آئے گا جب مکہ معظمہ سے مشرکین کا اقتدار ختم ہو کے دین حق کا اور اسکے حاملین کا، یعنی آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا اقتدار قائم ہو جائے گا اور آپ ہی کے ذریعہ وہ پھر توحید اور اسکی دعوت کا مرکز بن جائے گا۔ صحابہ کرام کو بھی رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس خداوندی بشارت کا علم ہو گیا تھا اور قدرتی طور پر ان کو اس مبارک وقت کا غیر معمولی اشتیاق کے ساتھ انتظار تھا۔ سورۂ صف میں اُن اہل ایمان کو جو جہاد فی سبیل اللہ کا فریضہ کماحقہٗ ادا کریں، آخرت میں مغفرت اور جنت کی بشارت کے ساتھ یہ بشارت بھی دیدی گئی تھی کہ "وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِیْبٌ" یہ اُس فتح مکہ ہی کی بشارت تھی جس کا رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرام کو بڑے اشتیاق کے ساتھ انتظار تھا اسی فضا میں یہ سورۂ نصر نازل ہوئی، اِس میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اے ہمارے پیغمبر جب اللہ کی مدد اور وہ فتح موعود آ جائے (یعنی مکہ مکرمہ سے مشرکین کا اقتدار ختم ہو کر دین حق کا اقتدار قائم ہو جائے) اور تم دیکھ لو کہ لوگ اپنے باطل ادیان سے نکل کر اللہ کے دین میں جوق در جوق اور گروہ گروہ داخل ہو رہے ہیں تو تم یکسوئی اور مزید اہتمام کے ساتھ اللہ کی تسبیح وحمد میں مشغول ہو جاؤ اور اس سے کوتاہیوں کی مغفرت اور معافی طلب کرو، وہ بڑا ہی معاف کرنے والا بڑی عنایت ومہربانی فرمانے والا ہے۔

فتح مکہ کے بعد یا پہلے

اس بارے میں روایات اور مفسرین کی رائیں مختلف ہیں کہ یہ سورت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی یا اُس سے پہلے، میرے نزدیک یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ فتح مکہ سے کچھ پہلے بشارت کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ اسی بنیاد پر میں نے اس کا مطلب بیان کیا ہے۔ اگر یہ مانا جائے کہ یہ فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے ہمارے پیغمبر جب اللہ کی وہ مدد اور وہ فتح آگئی جس کا وعدہ کیا گیا تھا اور آپ نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ لیا کہ اب لوگ گروہ گروہ کی سورت میں اللہ کے دین اسلام میں داخل ہورہے ہیں، (تو دنیا میں آپ کی بعثت کا بڑا مقصد پورا ہوگیا) اب آپ آخرت کی منزل کی طرف زیادہ توجہ کریں، اپنے رب کی حمد و تسبیح اور اس سے استغفار کا زیادہ اہتمام کریں، اسکی شان یہ ہے کہ وہ توّاب ہے، یعنی بڑا معاف فرمانے والا او ر بہت زیادہ مہربان اور عنایت فرمانے والا ہے۔

بہر حال اس سورہ کا نزول فتح مکہ سے پہلے مانا جائے یا اس کے بعد، اس کا خاص تعلق فتح مکہ کے واقعہ سے ہے، اور اس سورہ میں جس طرح اس کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس کی غیر معمولی عظمت کا اندازہ کرنے کیلئے کافی ہے۔ اور فی الحقیقت فتح مکہ کا واقعہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ اور اسلامی تاریخ کا عظیم ترین واقعہ ہے۔ اس کے بعد ہی سے اسلام کی ایک نئی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر فتح مکہ کے واقعہ کا مختصر طور سے ذکر کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

فتح مکہ کا واقعہ

صلح حدیبیہ کے واقعہ کا ذکر اس درس میں بار بار کیا گیا ہے یہ صلح رسول اللہ ﷺ اور مشرکین مکہ کے درمیان ہجرت کے چھٹے سال ہوئی تھی، انہی دو فریقوں میں اس سے پہلے بدر، احد، غزوۂ خندق وغیرہ کئی جنگیں ہو چکی تھیں۔ صلح حدیبیہ آج کل کی اصطلاح میں دس سال کیلئے گویا ناجنگ معاہدہ تھا۔ جس میں بہت سی دفعات تھیں۔ اس معاہدہ سے رسول اللہ ﷺ کا

خاص مقصد یہ تھا کہ جنگ وخونریزی کا سلسلہ ختم ہوکر علاقہ میں امن کی فضا قائم ہوتا کہ دین کی دعوت کے لیے راستہ صاف ہو۔ اسی غرض سے رسول اللہ ﷺ نے اس معاہدہ میں مشرکین مکہ کی ایسی کئی شرطیں بھی مان لی تھیں جو عام نقطہ نظر سے کسی طرح بھی ماننے کے لائق نہیں تھیں، اور بظاہر وہ عزت ووقار کے خلاف تھیں لیکن رسول اللہ ﷺ کے سامنے دین حق کی دعوت اور بندوں کی ہدایت کا جو اعلیٰ مقصد تھا، اسکی خاطر آپ نے قیام امن کی امید پر وہ شرطیں بھی قبول فرمالیں اور اسکے نتیجہ میں امن کی وہ فضا قائم بھی ہوگئی جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے یہ معاہدہ کیا تھا اور اس سے وہ فائدہ بھی حاصل ہوا جو اصل مقصود تھا۔ لیکن اس معاہدہ پر ابھی دو سال بھی نہیں گذرے تھے کہ دوسرے فریق مشرکین مکہ کی طرف سے عہد شکنی اور معاہدہ کی خلاف ورزی کی گئی۔ (جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں) اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ اب جبکہ فریق ثانی نے معاہدہ توڑ دیا ہے، ایک دفعہ طاقت استعمال کر کے مکہ مکرمہ پر قبضہ کرلیا جائے اور اِن مشرکین کی طاقت اس طرح توڑ دی جائے کہ اسکے بعد وہ کوئی شرارت نہ کرسکیں، اسکے بعد ہی پورے علاقہ میں امن کی وہ فضا قائم ہوسکے گی جس کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مشہور روایت کے مطابق دس ہزار صحابہؓ کی جمعیت کے ساتھ آپ نے مکہ معظمہ کی طرف کوچ کیا۔ ہجرت کا آٹھواں سال اور رمضان مبارک کا مہینہ تھا۔ آپ کا اندازہ تھا اور صحیح اندازہ تھا کہ مشرکین مکہ اس عظیم لشکر کی مزاحمت کا ارادہ ہی نہیں کریں گے اور اس طرح بغیر قتل وقتال اور خونریزی کے مکہ معظمہ پر قبضہ ہوجائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اہل مکہ نے لشکر کو دیکھنے کے بعد مزاحمت کا اردہ ہی نہیں کیا، اس لئے باقاعدہ صف آرائی اور جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی، آپ نے اپنے رفقاء کو ہدایت فرمادی تھی کہ جب تک تم پر تلوار نہ اٹھائی جائے تم تلوار نہ اٹھاؤ اس لئے قتل وقتال کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بس اتنا ہوا کہ اسلامی لشکر کا ایک دستہ جو حضرت خالد بن الولیدؓ کی قیادت میں ایک سمت سے مکہ میں داخل ہورہا تھا اُس کے تین آدمی دستہ سے الگ ہوگئے، قریش کے شریروں کے ایک گروہ نے اُن پر حملہ کرکے اُن کو شہید کردیا اور حضرت خالد کے دوسرے ساتھیوں پر تیر برسانے شروع کردیے۔ اس کے جواب میں حضرت خالدؓ کے دستے کے لوگوں نے اِن اشرار پر حملہ کیا جس کے نتیجہ میں ان میں سے ۱۳ یا ۱۴ قتل ہوئے باقی بھاگ گئے۔ اس ایک واقعہ کے علاوہ فتح مکہ کی

عظیم مہم میں کوئی اس طرح کی واردات نہیں ہوئی۔ بلاشبہ یہ اللہ کی خاص مدد ہی تھی کہ قریش ایسے مرعوب ہوئے کہ انھوں نے مزاحمت کا ارادہ ہی نہیں کیا اور جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی۔

نبی ﷺ کا فاتحانہ داخلہ

رسول اللہ ﷺ اپنی اونٹنی پر سوار اس حال میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے کہ ازراہ انکسار اور اللہ کے شکر میں سر مبارک اتنا جھکا ہوا تھا کہ اونٹنی کے کجاوے سے لگ رہا تھا، گویا حضور اونٹنی پر سواری کی حالت ہی میں بارگاہ خداوندی میں سربسجود تھے۔ یہاں تک کہ آپ اپنے رفقا مہاجرین وانصار کے ساتھ اسی حالت میں حرم میں داخل ہوئے۔ مکہ والوں نے ہجرت سے پہلے آپ پر اور آپ پر ایمان لانے والوں پر جو ظلم وستم کے پہاڑ توڑے تھے اور پھر ہجرت کے بعد بھی جو بار بار مدینہ پر انھوں نے چڑھائی کی تھی اور صرف دو سال پہلے آپ کو عمرہ کرنے سے جس طرح روکا تھا اور بغیر عمرہ کیے مدینہ واپسی پر مجبور کیا تھا وہ سب ان کو یاد تھا اور وہ بجا طور پر ڈر رہے تھے کہ آج اس سب کا بدلہ چکایا جائے گا اور ہم میں سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کے سر قلم ہوں گے۔ لیکن آپ نے اعلان کرایا کہ جو اپنا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے اس کو امن اور معافی ہے، جو فلاں یا فلاں کے گھر میں داخل ہو جائے اس کو امن اور معافی ہے۔ اس کے بعد آپ نے دو چار بدترین قسم کے اُن مجرموں کے علاوہ جن کو سزا دینا ہی مصلحت اور قانون خداوندی کا تقاضا تھا سب کے لیے عام معافی کا اعلان فرما دیا۔ ارشاد فرمایا "لَاتَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ أَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ" (اب تم پر زبانی ملامت بھی نہیں تم سب آزاد ہو) آپ کے اس سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ کے جو لوگ اس وقت تک اسلام کے بدترین دشمن تھے ان کی اکثریت نے اسی دن اسلام قبول کر لیا اور جو باقی بچے انھوں نے بھی اطاعت قبول کر لی اور اس دن سے مکہ معظمہ بھی مدینہ منورہ کی طرح ''دارالاسلام'' ہو گیا اور کچھ ہی دن بعد ان سب نے بھی اسلام قبول کر لیا جنھوں نے فتح کے دن صرف اطاعت قبول کی تھی۔

بتوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں

مکہ معظمہ کے لوگ خاص طور سے قریش حضرت ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ کی نسل سے تھے،

اللہ کے ان دونوں پیغمبروں نے مکہ میں بیت اللہ (خانۂ کعبہ) اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کے لئے بنایا تھا اور وہ دعوتِ توحید کا مرکز تھا۔ لیکن جب ان کی نسل میں بت پرستی آ گئی تو اس خانہ کعبہ کو ایک بت خانہ بنادیا گیا، فتح مکہ کے اس دن تک وہاں بتوں کی پوجا ہوتی تھی، سیکڑوں بت اس کے اردگرد رکھے ہوئے تھے، ان کی تعداد تین سو ساٹھ تک بتلائی گئی ہے اور کعبۃ اللہ کی دیواروں پر بھی دیوتاؤں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی تصویریں بھی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان بتوں کو تڑوایا اور پھکوایا اور دیواروں کی تصویریں مٹائی گئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خاص مؤذن بلال کو (جو حبشی تھے اور کفار قریش کی نظروں میں انتہائی ذلیل وحقیر تھے اور ایک مشرک کے غلام بھی رہے تھے ان ہی بلال کو) حکم دیا کہ وہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دیں، انھوں نے اذان دی۔ یہ اللہ کے حرم اور کعبۃ اللہ میں پہلی اذان تھی۔ آپ نے خانہ کعبہ کا دروازہ کھلوایا اور اندر جا کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں نمازِ شکر ادا کی۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنی صدیوں کے بعد اللہ کے اس گھر میں اس کے حضور میں اس طرح نماز ادا کی گئی۔

یہ ہے فتح مکہ کا واقعہ جو میں نے مختصر طور سے آپ حضرات کے سامنے اس وقت بیان کیا ہے اس کی پوری تفصیل حدیث اور سیرت کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

فتح مکہ کے بعد "یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجاً" کا منظر

مکہ معظمہ کے اس طرح معجزانہ طور پر فتح ہو جانے اور اہل مکہ کے اسلام یا اطاعت قبول کر لینے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے قبیلے اور علاقوں کے لوگ جو قریش مکہ کی مخالفت کو خطرناک سمجھنے کی وجہ سے یا کسی بھی وجہ سے دعوتِ اسلام قبول کرنے میں ابھی تک متردد تھے وہ ایک دم اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اس سے پہلے لوگ انفرادی طور پر اِکا دُکا آ کر اسلام قبول کرتے تھے، اب فتح مکہ کے واقعہ کے بعد اجتماعی طور پر قبیلے کے قبیلے اور علاقے کے علاقے آنے لگے۔ اسی صورتحال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سورت میں فرمایا گیا ہے "وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجاً" (یعنی اے ہمارے پیغمبر جب تم دیکھ لو کہ لوگ اللہ کے دین اسلام میں داخل ہو رہے ہیں گروہوں، اور لشکروں کی شکل میں) آگے

فرمایا گیا ہے "فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّاباً" مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد تم پوری یکسوئی اور اہتمام کے ساتھ اپنے مالک و پروردگار خداوند کی حمد و تسبیح اور اس سے مغفرت طلبی میں مشغول ہو جانا وہ بہت معاف کرنے والا اور مہربانی فرمانے والا ہے وہ اپنی شان کریمی اور رحیمی کے مطابق یقیناً مہربانی فرمائیگا۔ "اِنَّهٗ کَانَ تَوَّاباً" گویا اللہ تعالی کی طرف سے وعدہ ہے کہ مغفرت طلبی اگر صدق دل سے ہوگی تو ہماری طرف سے معافی یقینی ہے۔

حمد و تسبیح اور فتح مکہ؟

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اللہ کی حمد و تسبیح اور استغفار میں زیادہ اہتمام سے مشغول ہونے کا فتح مکہ سے کیا ربط اور جوڑ ہے۔ حضرات مفسرین نے لکھا ہے اور یہی واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ تھا کہ مکہ معظّمہ جو دنیا کا قلب اور ہماری اس زمین پر اللہ تعالی کا "دارالسلطنت" ہے اور جس میں وہ کعبہ ہے جس کو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہم السلام نے اللہ کے حکم سے اس لیے بنایا تھا کہ وہاں اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت ہو اور وہ دعوت توحید کا مرکز اور دنیا بھر کے اہلِ توحید کا قبلہ بنے، اس کو پھر یہ حیثیت حاصل ہو اور وہاں سے شرک و کفر کا خاتمہ ہو، اور پورے جزیرۃ العرب میں دین حق غالب ہو جائے۔ پھر وہاں سے عالمی پیمانے پر دین حق کی دعوت اور اعلاء کلمۃ اللہ کی جدو جہد کا سلسلہ جاری رہے۔ تو فتح مکہ سے اس اہم مقصد کی گویا تکمیل ہوگئی، اسی کے نتیجہ میں پورے جزیرۃ العرب میں دین حق غالب ہوا اور پورے عالم کے لیے دین حق کی دعوت اور اعلاء کلمۃ اللہ کی جدو جہد کی بنیاد قائم ہوگئی۔

تو جب رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ سب کچھ ہوگیا تب اس دنیا میں جو دارالمحن اور "سجن المومن" ہے آپکے قیام کی خاص ضرورت نہیں رہی۔ قرآن پاک ہی میں فرمایا گیا ہے "وَ لَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی" اور آخرت آپ کے لیے اس دنیا سے بلاشبہ ہزار درجہ بہتر ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَةِ" تو اس سورت کی اس آخری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ (جب اللہ کی مدد سے مکہ کی فتح کے ذریعہ آپ کا یہاں کا کام پورا ہو جائے) تو آپ سفر آخرت کی تیاری کی طرف زیادہ توجہ کریں اور

اسکے لیے دو باتوں کا خصوصیت سے زیادہ اہتمام کریں۔ایک اپنے رب کریم کی تسبیح وحمد جو اسکے انعامات کا شکر بھی ہے اور اپنے عجز و نیاز کا اعتراف و اظہار بھی اور اعلیٰ درجہ کی عبادت بھی۔اور دوسرے اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کی طلب۔

اِس درس ہی کے سلسلہ میں بار بار آپ حضرات کے سامنے عرض کیا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے ایسا کوئی عمل سرزد نہیں ہوتا جس کو اللہ تعالیٰ نے اور اس کی نازل کی ہوئی شریعت نے گناہ قرار دیا ہو، ان کے معصوم ہونے کا یہی مطلب ہے، لیکن اُن سے ازراہِ بشریت ایسی چیزیں عمل میں آجاتی ہیں جو ان کے مقام اور انکی شان عالی کے مناسب نہیں ہوتیں، عارفین کا مقولہ ہے "حسناتُ الابرار سیئات المقربین" ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

اِن کو ہماری زبان میں لغزش کہا جاسکتا ہے۔حضرات انبیاء علیہ السلام کو اِن لغزشوں کی اتنی فکر ہوتی ہے کہ ہم لوگوں کو اپنی معصیتوں کی بھی نہیں ہوتی اور وہ برابر اللہ تعالیٰ سے ان کی معافی اور مغفرت کی درخواست کرتے رہتے ہیں۔ صحیح بخاری شریف میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں دن رات میں سو دفعہ یا اس سے بھی زیادہ اللہ سے معافی اور مغفرت طلب کرتا ہوں تو یہ آپ کی مغفرت طلبی انہی لغزشوں کے احساس کی بنیاد پر ہی ہوتی تھی۔اس کے علاوہ آپ امت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور معافی طلب کرتے تھے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا حکم تھا، تو اِس سورۃ نصر کی اس آخری آیت میں جو استغفار کا حکم ہے اس میں امت کے لیے مغفرت کی طلب بھی شامل ہوسکتی ہے۔

آیت کی تعمیل میں آپ کا عمل

صحیح بخاری شریف اور صحیح مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی عمر شریف کے آخری دور میں یعنی فتح مکہ اور اس کے نتائج کے ظہور کے بعد اپنی نمازوں میں رکوع وسجود میں اللہ کی تسبیح وحمد اور استغفار کے جامع کلمے کثرت

سے پڑھتے تھے۔ "سُبۡحَانَکَ اَللّٰھُمَّ وَبِحَمۡدِکَ اَللّٰھُمَّ اغۡفِرۡ لِی". اور سُبۡحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمۡدِہٖ اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہَ وَاَتُوۡبُ اِلَیۡہِ. اور آپ کا یہ عمل اِس آیت کے حکم کی تعمیل ہی میں تھا۔

اس میں ہمارے آپ کے لیے اور سب امتیوں کے لیے سبق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو دینی و دنیوی نعمتیں نصیب ہیں (اور سب ہی کو کچھ نہ کچھ نصیب ہیں) اُن کا دھیان کر کے اللہ کے شکر اور حمد و تسبیح کا اور جو گناہ اور معصیتیں ہم سے ہوتی ہیں اُن کا خیال کر کے توبہ و استغفار کا خاص اہتمام کریں اور اس کی ایسی عادت ڈالیں کہ وہ گویا ہماری فطرت بن جائے اور اس حمد و تسبیح اور استغفار کے بہترین جامع کلمے یہی ہیں جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی اس حدیث میں ذکر کیے گئے ہیں۔ " سُبۡحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمۡدِکَ اَللّٰھُمَّ اغۡفِرۡلِی "...... اور "سُبۡحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمۡدِہٖ اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہَ وَ اَتُوۡبَ اِلَیۡہِ" اور بعض روایات میں یہ بھی ہے "سُبۡحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَ بِحَمۡدِکَ اَسۡتَغۡفِرُکَ وَاَتُوۡبُ اِلَیۡکَ" ان سب کلمات کا حاصل اور مطلب یہی ہے کہ میں اللہ کی تسبیح و حمد کرتا ہوں اور اُس سے اپنے قصوروں، گناہوں کی معافی اور مغفرت کی استدعا کرتا ہوں۔

تسبیح کا مطلب

پہلے بھی بار بار بیان کیا جا چکا ہے کہ تسبیح کا مطلب اپنے اس یقین اور عقیدہ کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی ہر عیب اور نقص سے پاک ہے اور حمد کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ تمام صفاتِ کمال کا جامع ہے اور ہر طرح کی تعریف اسی کے لیے ہے۔ اور استغفار میں اپنی قصور واری اور گناہ کاری کا اعتراف ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کی طلبگاری ہوتی ہے، ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ یہ کلمے ان کی زبان پر ایسے چڑھے ہوئے تھے کہ مجلس میں باتیں کرنے کے درمیان بھی بار بار ہم اُن سے سنتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ یہ اُن کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ یہ کلمے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص تبرک اور آپ کا بڑا قیمتی ورثہ ہیں۔ ان کی قدر و قیمت ہم آپ کو انشاء اللہ آخرت میں معلوم ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ان کلمات طیبات

کی قدر نصیب فرمائے۔ یہ بہت مختصر اور بہت ہلکے پھلکے ہیں۔ جن بھائیوں کو یاد نہیں ہیں وہ بس دو چار منٹ میں یاد کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ لَاۤاِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوبُ اِلَیکَ.



سورۃ اللھب

درس — ۵۵

(درس-۵۵)

سُوْرَةُ اللَّهَبْ

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ- بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ط مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا
كَسَبَ ط سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ہ وَّامْرَاَتُهٗ ط حَمَّالَةَ
الْحَطَبِ ہ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ہ (سورۂ لہب)

ترجمہ: ٹوٹ گئے ہاتھ ابولہب کے اور وہ خود ٹوٹ گیا (ختم ہوگیا)، اُسکے کچھ کام نہ آیا اُس کا مال اور نہ وہ جو اُس نے کمایا۔ وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ اور اس کی بیوی بھی، ایندھن لادے ہوئے۔ اس کی گردن میں رسّی ہوگی خوب بٹی ہوئی۔

تفسیر وتشریح

سابق سورہ سے ربط

یہ سورۂ لہب ہے، اس سے پہلے سورۂ نصر تھی، اس میں اللہ تعالیٰ کی اُس نصرت اور فتح مبین کا ذکر کیا گیا تھا جو اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور بشارت کے مطابق فتح مکہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اور جیسا کہ میں نے ذکر کیا تھا وہ یا تو فتح مکہ سے کچھ پہلے بشارت کے طور پر نازل ہوئی تھی یا فتح مکہ کے وقوع وظہور کے بعد رسول اللہ ﷺ کو یہ بتانے کے لیے کہ مِلّتِ ابراہیمی کے اِحیا اور بیت اللہ کی تطہیر اور اس کو پھر سے دعوتِ توحید کا مرکز بنانے کا جو اہم کام آپ سے لینا تھا وہ تکمیل کو پہنچ گیا اب آپ آخرت کی تیاری کی طرف زیادہ توجہ کریں۔ بہرحال سورۂ نصر رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری دور میں نازل ہوئی تھی جبکہ وہ نصرت اور فتح موعود یا تو آنکھوں کے سامنے آگئی تھی یا اس کے آثار ظاہر ہوگئے تھے اور اس کا ظہور قریب ہی تھا۔

اس کے بعد متصلاً یہ سورۂ لہب ہے، جو نبوت اور دعوتِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھی اُس میں بھی ایک خاص انداز سے خداوندی نصرت کی اور اُس وقت کی سب سے بڑی اسلام دشمن طاقت کے بالکل ٹوٹ پھوٹ جانے کی پیشین گوئی کے انداز میں اطلاع اور بشارت دی گئی تھی۔ جس کا بظاہر حالات اس وقت تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس سورت کا شانِ نزول

صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ کتب حدیث میں اور سیرت کی عام کتابوں میں بھی یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَ تَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" (جس میں آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ خاص طور سے اپنے قریبی رشتہ داروں اور قبیلہ والوں کو شرک و کفر کے نتیجہ میں آنے والے خداوندی عذاب سے آگاہی دیجیے اور ان کے دلوں میں آخرت کی فکر پیدا کرنے کی کوشش کیجیے جس سے وہ بالکل غافل ہیں۔ (سورہ شعراء آیت نمبر ۲۱۴) تو آپ نے صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر قبیلہ قریش کی مختلف شاخوں کو نام بنام نہایت بلند آواز سے گویا چیخ کر اس طرح پکارا جیسے کہ آپ ان کو کسی بڑے اور فوری خطرہ سے خبردار کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی یہ غیر معمولی پکار سن کر وہ لوگ جمع ہو گئے۔ آپ صفا پہاڑی کی چوٹی پر تھے اور سامنے اُس کے دامن میں قریش کے سرداروں اور ذمہ داروں کا مجمع تھا۔ آپ نے اُن سب کو مخاطب کر کے فرمایا، بتاؤ اگر میں تم سے کہوں کہ کوئی دشمن لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے اس پہاڑ کے دوسری طرف آ گیا ہے اور وہ تم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے۔ تو کیا تم میری اس بات کو سچ مانو گے، اور اس حالت میں جو کچھ کرنا چاہیے وہ کرو گے؟ سب نے کہا ہاں ہم آپ کی بات کو سچ مانیں گے کیونکہ ہم نے کبھی آپ کو غلط بات کہتے نہیں سنا۔ اس کے بعد آپ نے اُن سے فرمایا سنو! میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں ایک شدید عذاب سے (جو کفر و شرک کی موجودہ زندگی کے نتیجہ میں آنے والا ہے) آپ کا مقصد یہ تھا کہ اس عذاب شدید سے بچنے کی فکر کرو اور اپنے خالق و پروردگار خداوند کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کر لو۔ آپ کی یہ بات سن کر جو انتہائی خلوص اور دلسوزی کے ساتھ کہی گئی تھی، ابولہب نے نہایت گستاخانہ انداز میں کہا 'تبًّالک ألهٰذا جمعتنا" (جس کا مطلب ہے کہ ہلاکت و بربادی ہو تیرے لیے (تیرا ناس ہو)

کیا یہی سنانے کے لیے تو نے ہم سب کو جوڑا تھا) روایت میں ہے کہ اسی دور میں یہ سورۂ لہب نازل ہوئی، اس میں پیشین گوئی کے طور پر اعلان فرمایا گیا کہ اللہ تعالی کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ خود یہ ابولہب اس دنیا میں بھی تباہ و برباد ہوگا، اسکا ناس ہوگا، اور آخرت میں یہ دوزخ کا ایندھن بنے گا، اور اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ دوزخ میں ڈالی جائے گی جو اسلام دشمنی اور رسول اللہ ﷺ کی ایذا رسانی میں اسکی شریک و رفیق ہے۔

سورت کا مضمون

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں اس سورت کے نزول کا جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے یہ میں نے اس کا حاصل مطلب اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اب سورت کے الفاظ کی روشنی میں اس کا مضمون سمجھنے کی کوشش کریں۔ "تباب" کے معنی ہیں کسی چیز کا تباہ و برباد اور ضائع ہو جانا۔ تَبَّتْ اور تَبَّ اس سے نکلے ہیں۔ اور یدٌ کے اصل معنی ہاتھ کے ہیں۔ اور چونکہ انسان کے اعضا میں ہاتھوں کی خاص اہمیت ہے، آدمی زیادہ تر کام ہاتھوں ہی سے کرتا ہے اس وجہ سے کبھی کبھی ہاتھوں سے مراد اس کی ذات ہوتی ہے، قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے "ذَالِکَ بِمَا قَدَّمَتْ یَدَاکَ" (سورہ الحج آیت ۱۰) دوسری جگہ فرمایا گیا ہے "ذَالِکَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ" (سورہ آل عمران آیت ۱۸۳) ان آیتوں میں "یَدَاکَ" اور اَیْدِیْکُمْ سے مراد خود ہاتھوں والے آدمی ہیں۔

اس محاورہ کے مطابق "یَدَا اَبِی لَھَبٍ" سے مراد خود ابولہب کی ذات اور اسکی شخصیت ہے، اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مغرور اور اپنے وقت کا فرعون! ابولہب جس نے ہمارے رسول کی دعوت حق کے جواب میں "تَبًّا لَکَ" (تیرے لیے تباہی و بربادی ہو) کہا ہے۔ وہ خود سن لے اور سب سن لیں کہ اسکے لیے خداوندی فیصلہ ہو چکا ہے وہ خود تباہ و برباد ہوگا۔ آگے بطور تاکید کے فرمایا گیا ہے "وَتَبَّ" مطلب یہ ہے کہ اس کی تباہی بربادی یقینی ہے۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں تَبَّتْ اور تَبَّ دونوں ماضی کے صیغے ہیں۔ جب مستقبل میں ہونے والے کسی واقعہ کو ماضی کے صیغے سے بیان کیا جاتا ہے تو مطلب یہی ہوتا ہے کہ یہ بات ایسی یقینی ہے جیسے کہ ماضی میں ہو چکی۔ قیامت اور آخرت میں ہونے والے

واقعات کا ذکر قرآن مجید میں جابجا اسی طرح ماضی کے صیغوں سے کیا گیا ہے۔ مثلاً "وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ" (سورہ زمر آیت ۶۸) اس آیت میں "نُفِخَ" اور "صَعِقَ" ماضی کے صیغے ہیں اور قیامت میں ہونے والے واقعات کے لیے استعمال کیے گئے ہیں، یہ قرآن پاک کا عام انداز بیان ہے اور اس میں بڑی بلاغت ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے "مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ" اس کا مطلب سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ ابولہب بڑا دولت مند تھا، گویا مکہ کا ایک قارون تھا، اور اس دولتمندی اور اپنی دوسری ترکیبوں تدبیروں سے اُس نے عزت و وجاہت کا ایک خاص مقام قوم میں حاصل کرلیا تھا، اور یہ بھی اس کا کمایا ہوا سرمایہ تھا۔ جب کسی برخود غلط آدمی کو یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو اس میں غرور اور گھمنڈ آجاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا؟ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ابولہب کا مال اور اسکا کمایا ہوا سرمایہ اُس کے کچھ بھی کام نہ آئیگا اور اسکی تباہی و بربادی کا جو فیصلہ اللہ تعالی کی طرف سے ہو چکا ہے اس سے اس کو نہ بچا سکے گا۔

یہاں تک اس دنیوی زندگی ہی میں ابولہب پر آنے والی تباہی و بربادی کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور قطعیت کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ ہلاک و برباد ہوگیا اور اسکی دولتمندی اور اس کا سرمایہ اُس کے کچھ بھی کام نہ آیا۔ یعنی خداوند قہار کی طرف سے یہ فیصلہ ہو چکا جو مقررہ وقت پر سب کے سامنے آجائیگا۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد بہت بُری موت مرا، وہ ایسی چیچک میں مبتلا ہوا جس کو دیکھ کر گھن آئے اور دہشت ہو، اور اسکو چھوت والی بیماری سمجھنے کی وجہ سے کوئی پاس نہ جائے، وہ اسی حال میں مرگیا، روایات میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس کی لاش دو تین دن تک گھر ہی میں پڑی رہی اُسکے گھر والے بھی دور ہی دور رہے بالآخر کچھ حبشی مزدوروں سے وہ لاش گھر سے اٹھوائی گئی انھوں نے اسکو لے جا کر ایک گڑھے میں ڈال دیا اور اوپر سے پتھر ڈال کر ڈھک دیا۔ اُس کی دولتمندی اور عزت و وجاہت اور اسکی پارٹی اس بُرے انجام سے اس کو نہ بچا سکی۔ یہ سب دراصل اللہ تعالی کے ارشاد "تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ" کا عملی ظہور تھا۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اُس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مکہ کے اس قارون ابولہب کا ایسا انجام بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہوا اور سب نے دیکھا۔

بلاشبہ یہ پیشین گوئی بھی رسول اللہ ﷺ کی صداقت و نبوت کی روشن دلیلوں میں سے ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے "سَیَصْلیٰ نَاراً ذَاتَ لَهَبٍ" یہ ابولہب کے اخروی انجام کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ آخرت میں دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائیگا۔ "نار" کے معنی آگ کے ہیں اور اُس سے مراد دوزخ کی آگ ہے۔ اور "ذاتَ لهب" اسکی صفت ہے جس کے معنی ہیں شعلہ زن اور بھڑکتی ہوئی، اسمیں اُس آگ کی غیر معمولی شدت کی طرف بھی اشارہ ہے اور اسکو اُس کے معروف نام ابولہب سے بھی مناسبت ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے "وَامْرَأَتُهُ حَمَّا لَةَ الْحَطَبِ فِي جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَد" ابولہب کی بیوی جس کا نام اُمّ جمیل تھا اور وہ ابوسفیان کی بہن تھی، جیسا کہ میں نے کہا تھا وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی دشمنی اور ایذا رسانی میں ابولہب کی پوری شریک و رفیق تھی۔ بعض روایات میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ خاردار لکڑیاں اور جھاڑیاں آنحضرت ﷺ کے راستہ میں ڈالتی تھی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس طرح کی اور بھی کیا کیا حرکتیں کرتی ہوگی۔ اِن آخری دو آیتوں میں اُس کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ ابولہب کے ساتھ اس کی یہ بیوی بھی جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالی جائے گی۔ "حَماَّ لَةَ الْحَطَب" کا لفظی ترجمہ ہے، ایندھن کی لکڑیاں لادے ہوئے، بظاہر مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہونچانے کے لئے خاردار لکڑیاں لالا کر آپ کے راستہ میں ڈالا کرتی تھی، اُسکی مناسبت سے دوزخ میں اس پر یہ عذاب بھی مسلط کیا جائے گا کہ وہ اور اسکا شوہر ابولہب جس آگ میں ڈالے جائیں گے اس کو اور تیز کرنے کے لیے یہ ایندھن کی لکڑیاں لادلادکر لائے گی اور اس آگ میں ڈالے گی اور خود بھی اسی میں جلے گی۔

"فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِنْ مَسَد" کا مطلب یہ ہے کہ وہاں دوزخ میں اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی پڑی ہوگی۔ جنگل سے لکڑیاں لادکر لانے والی باندیوں کا یہ طریقہ تھا کہ جس رسی سے وہ لکڑیوں کا گٹھا باندھ کے لاتی تھیں وہ اُن کے گلے میں پڑی رہتی تھی، ظاہر ہے کہ یہ ایک ذلت کی نشانی بھی تھی، تو اس آیت میں ابولہب کی بیوی ام جمیل کے بارے میں (جو یقیناً گلے میں قیمتی ہار اور گلوبند وغیرہ پہنے رہتی ہوگی) فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں بجائے گلوبند اور

ہاروں کے اُس کی گردن میں لکڑیاں لانے والی باندیوں کی سی رسی پڑی ہوگی۔اور دوزخ کی آگ کے علاوہ اُس پر یہ ذلّت کا عذاب بھی مسلط ہوگا۔ علاوہ ازیں جن مجرموں کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے انکی گردن میں بھی مضبوط بٹی ہوئی رسی ہی ڈالی جاتی ہے، اوراسی کے ذریعہ اُن کو موت کی سزادی جاتی ہے۔تو اس سورۂ لہب کی ان آخری دو آیتوں (حَمَّا لَةَ الْحَطَبْ فِیْ جِیْدِ ھاَ حَبْلٌ مِنْ مَّسَد) میں ابولہب کی بیوی کی دوزخ میں جو حالت ہوگی اس کی گویا تصویر کھینچ کے دکھادی گئی ہے، جو یقیناً بڑی عبرتناک ہے۔

دشمنوں میں صرف ابولہب ہی کی کیا خصوصیت؟

قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے مخالفین ومکذبین کفار ومشرکین یا منافقین میں سے ابولہب کے سوا کسی کے لیے بھی نام لیکر دنیوی یا اخروی عذاب کی وعید نہیں سنائی گئی ہے۔نہ لعنت یا مذمت ہی کی گئی ہے، بلکہ اُن میں سے کسی کا نام کے ساتھ قرآن مجید میں ذکر ہی نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ آپ اور آپ کی دعوتِ توحید وایمان کا دشمن صرف یہ ابولہب ہی نہیں تھا قریش کے سرداروں اور سربرآوردہ لوگوں میں ابوجہل اور اُمیہؔ بن خلف وغیرہ بھی بدترین دشمنوں میں تھے، یہاں تک کہ آپ کو ختم کردینے کی سازش میں بھی یہ سب برابر کے شریک تھے۔لیکن قرآن پاک میں اِن میں سے کسی کا بھی نام ذکر نہیں کیا گیا، ان میں سے صرف ابولہب کا ذکر اس سورت میں کیا گیا ہے اور دنیا میں بھی اُس کی تباہی وبربادی کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور آخرت میں وہ اور اس کے ساتھ اُسکی بیوی جس طرح دوزخ کی آگ میں ڈالے بھونے یں گے اُس کا بھی گویا عام اعلان کیا گیا ہے۔ ہمارے مفسرین نے ابولہب کے ساتھ اس امتیازی برتاؤ کی مختلف وجوہات لکھی ہیں اور وہ سب بجائے خود صحیح ہوسکتی ہیں۔اس عاجز کے نزدیک اس کی سب سے اہم وجہ اور مصلحت یہ ہے کہ اِن مکذبین اور دشمنوں میں ابولہب آپ کا سب سے قریبی رشتہ دار تھا، وہ آپ کا چچا یعنی آپ کے دادا عبدالمطلب کا بیٹا تھا (عوام میں مشہور یہ ہے کہ ابوجہل آپ کا چچا تھا یہ صحیح نہیں ہے وہ دور کا رشتہ دار تھا، چچا یہ ابولہب تھا) اس سورۂ لہب میں جس طرح نامزد کرکے اس کا اور اسکے دنیوی اور اخروی عذاب کا ذکر کیا گیا اس

کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے اس بے لاگ قانونِ عدل کا اعلان ہوگیا کہ جنت و دوزخ اور ثواب و عذاب کا فیصلہ نسب اور قرابت داری کی بنیاد پر نہیں ہوگا بلکہ ایمان و عمل کی بنیاد پر ہوگا۔ قرآن پاک ہی میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبر کے باپ کے جہنمی ہونے اور اسی طرح حضرت نوحؑ کے بیٹے اور حضرت لوطؑ کی بیوی کے دنیا میں معذّب اور آخرت میں دوزخی ہونے کا صراحت سے جو بیان کیا گیا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس قانون عدل کا اظہار و اعلان ہے۔ حدیث شریف میں ہے آپ نے فرمایا "مَن بَطّأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ" (۱) مطلب یہ ہے کہ جو آدمی عمل کی کوتاہی کی وجہ سے پیچھے رہ جائے گا اُس کا نسب اس کو آگے نہیں لے جاسکے گا۔ اور مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی جگر گوشہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ایک دن فرمایا "یا فاطمة انقذی نفسک من النار فانی لا املک لکم من اللّٰہِ شیئاً" (مطلب یہ ہے کہ اے بیٹی فاطمہ اپنی نجات اور بخشش کے لیے خود ہی فکر کرلے مجھے اللہ کے فیصلے کے بارے میں کوئی اختیار نہیں) اسی طرح آپ نے اپنی پھوپھی حضرت صفیہؓ سے اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے بھی فرمایا۔ (۲)

بہر حال اس عاجز کے خیال میں قرآن پاک میں خصوصیت سے ابولہب کا نام لیکر دنیا میں اس کی تباہی و بربادی اور آخرت میں اس کے اور اسکی بیوی کے دوزخ کی آگ میں ڈالے جانے کا اعلان فرمائے جانے کی اہم وجہ اور مصلحت یہ ہے کہ کسی کے لیے اس غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے کہ ایمان و عمل کی کوتاہی کے باوجود کوئی شخص اپنے باپ یا بیٹے یا بیوی یا شوہر، یا چچا یا بھتیجے کی نیک عملی اور عند اللہ مقبولیت کی وجہ سے جنت حاصل کرلے گا۔ یہ وہ گمراہی ہے جس میں یہودی خاص طور سے مبتلا تھے، وہ کہتے تھے کہ ہم تو پیغمبروں کی اولاد ہیں، ہماری بخشش کے لیے بس یہ نسبت کافی ہے۔ قرآن پاک میں جابجا اس غلط عقیدہ کا رد کیا گیا ہے۔ اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے باپ، حضرت نوحؑ کے بیٹے اور حضرت لوطؑ کی بیوی، اور اس سورۂ لہب میں رسول اللہ ﷺ کے چچا ابولہب کے دوزخی ہونے کا اعلان فرما کر گویا اس پر آخری مہر لگادی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان و عمل کی یعنی اللہ و رسول کی فرمانبرداری کی توفیق عطا فرمائے اور

---

(۱).......... (۲) صحیح البخاری۔ کتاب التفسیر۔ سورۂ شعراء

ہر قسم کی گمراہیوں سے حفاظت فرمائے۔ اور جو کوتاہیاں ہوئیں یا آئندہ ہوں انکی مغفرت فرمائے۔ اور ہمارے لیے دنیا میں بھی خیر مقدر فرمائے اور آخرت میں بھی۔ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃً و فی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار.



سُورۃ الاخلاص

درس — ۵۶

(درس-٥٦)

سُوْرَۃُ الْاِخْلَاص

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ ہ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ہ لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ہ وَلَمْ یَکُنْ لَّه' کُفُوًا اَحَدٌ ہ (سورہ اخلاص)

ترجمہ: (اے پیغمبر) کہہ دو وہ اللہ ایک ہے۔ (یگانہ و یکتا ہے) اللہ بے نیاز ہے۔ (اس کو کسی کی احتیاج نہیں، اور سب اسکے محتاج ہیں) نہ اُس سے کوئی پیدا ہوا۔ اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ اور نہ کوئی ہستی اس کے ہمسر اور اسکے برابر ہے۔

تفسیر و تشریح

قرآن کا اختتامیہ

اللہ تعالی کی توحید خالص اور اس کی صفات کا مسئلہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تعلیم کا سب سے اہم اور مرکزی نقطہ رہا ہے۔ خاتم النبیین سیدنا محمد ﷺ اور آپ کی لائی ہوئی کتاب اللہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم کا مرکزی نقطہ بھی یہی توحید خالص اور صفات الٰہی کا مسئلہ ہے۔ پورے قرآن مجید میں مختلف پیرایوں میں اس کا بیان ہوتا رہا ہے۔ قرآن مجید جو سورۂ فاتحہ سے شروع ہوا تھا اب ختم ہو رہا ہے، سورۂ فاتحہ گویا اس کا افتتاحیہ تھا، اس میں اللہ تعالی کی صفات اور توحید خالص کا بیان تھا جو ہدایت و استقامت اور ہر طرح کی گمراہیوں سے حفاظت کی دعا پر ختم ہوا تھا۔ یہ سورۂ اخلاص گویا قرآن مجید کا اختتامیہ ہے جس میں بہت مختصر لیکن نہایت جامع الفاظ میں اللہ تعالی کی توحید اور صفات کا بیان فرمایا گیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن مجید کی

بنیادی دعوت وتعلیم کا جوہر اور خلاصہ ہے اور اس صفت میں یہ سورت منفرد ہے۔

اس سورت کا مضمون اور پیغام سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن میں رکھ لیجئے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی شرک اور خدانا آشنا قوم کو اُن کے باطل معبودوں، دیوتاؤں، دیویوں کی فرضی ہستیوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت و پرستش کی اور اُسی کو خالق و پروردگار اور کارساز ماننے کی دعوت دی تو وہ ان لوگوں کے لیے ایک بہت ہی عجیب بات تھی، قرآن مجید ہی میں اُن کا یہ قول نقل فرمایا گیا ہے "اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهاً وَّاحِداً اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ" (سورہ صٓ آیت ۵)۔ باپ دادا سے وراثت میں پائے ہوئے شرک نے ان کی عقلوں کو ایسا مسخ کر دیا تھا کہ یہ بات کہ اس ساری کائنات کا خالق و مالک پروردگار و کارساز بس ایک اللہ ہی ہے اور سب کچھ اُس کے اور صرف اسی کے قبضہ واختیار میں ہے اور صرف وہی عبادت اور پرستش کے لائق ہے، ان کے لیے ناقابل فہم ہوگئی تھی۔ حالانکہ یہ دنیا کی سب سے بڑی سچائی اور روشن حقیقت ہے۔ مشرکین کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی جو اہل کتاب تھے اپنے پیغمبروں اور ان کی لائی ہوئی آسمانی کتابوں کی اصل تعلیم و ہدایت کو بھلا کر طرح طرح کے مشرکانہ اوہام و خرافات میں اور خداوندی صفات کے بارے میں سخت گمراہیوں میں مبتلا تھے۔ عیسائی ایک کے بجائے تین خداؤں کے قائل تھے، عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور انکو اور انکی والدہ مریم صدیقہؑ کو خدائی میں شریک مانتے تھے۔ آج بھی تثلیث عیسائیت کا بنیادی عقیدہ ہے۔ یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اسکے علاوہ بھی طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا تھے۔

قرآن مجید میں سیکڑوں جگہ آفاقی اور انفسی دلائل و براہین اور انبیاء سابقین کی دعوت وتعلیم کے حوالوں کے ساتھ توحید اور خداوندی صفات کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سلسلہ میں مشرکین و اہل کتاب کے اوہام وخرافات کا غلط باطل اور خلاف عقل وفطرت ہونا واضح کیا گیا ہے۔ اب اس سورۂ اخلاص میں جس کو میں نے قرآن مجید کا ''اختتامیہ'' کہا ہے، چھوٹی چھوٹی چار آیتوں اور چار جملوں میں توحید اور صفات خداوندی کے بارے میں قرآن پاک کی دعوت وتعلیم کا خلاصہ اس طرح پیش کر دیا گیا اور بات ایسی دوٹوک کہی گئی ہے جس کے بعد کسی گمراہی اور غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس تمہید کے بعد الفاظ کی روشنی میں اس سورت کے مضمون و مدعا اور پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سورہ کا مضمون الفاظ کی روشنی میں

"قُلْ" یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو حکم ہے کہ اے ہمارے پیغمبر آپ لوگوں کو بتلا دیجئے اور اعلان کر دیجئے کہ "هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" روایات میں ہے کہ بعض لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تھا کہ آپ ہمارے تمام دیوتاؤں معبودوں کا انکار کر کے جس معبود کی عبادت اور بندگی کی دعوت دیتے ہیں اس کا تعارف کرائیے اور اسکی صفات بیان کیجئے! تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سورۂ اخلاص نازل ہوئی، اسمیں آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ آپ بتلا دیں، اعلان اور منادی کر دیں کہ میں جس معبود برحق کی عبادت اور بندگی کی دعوت دیتا ہوں وہ اللہ ہے۔ مشرکین عرب جو قرآن پاک کے اول مخاطب تھے زمین و آسمان اور اس پورے عالم کے خالق و پروردگار کے لیے اسم ذات کے طور پر اللہ ہی کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ اے پیغمبر تم بتلا دو اور اعلان کر دو کہ میں جس معبود برحق کی عبادت اور بندگی کی دعوت دیتا ہوں وہ وہی اللہ ہے جو تمہارے نزدیک بھی اس سارے عالم اور سنسار کا خالق اور پروردگار ہے۔ آگے اسکی صفت بیان فرمائی گئی "اَحَدٌ" یعنی وہ ایک اور یگانہ و یکتا ہے۔ اَحَد اور واحد کے معنی ایک کے ہیں لیکن اَحَد کے مفہوم میں یکتائی بھی شامل ہے تو اَحَد کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ایک اور صرف ایک ہی ہے اور یکتا و یگانہ ہے اسکی ذات وصفات میں کوئی اس کا شریک اور کوئی اس کے مثل نہیں، اسکے مفہوم میں یہ بات بھی آ گئی کہ وہ قدیم لم یزل ولا یزال ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اِس تین حرفی جملہ (هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ) میں اللہ تعالیٰ کا جامع مانع تعارف کرا دیا گیا اور اجمال کیساتھ اسکی تمام صفات کا بیان ہو گیا۔ اَحدیت تمام صفات کمال کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے آگے تین آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ اس کے بعض مضمرات کی صراحت اور وضاحت ہے اور آیت کے پہلے حرف "قُلْ" میں رسول اللہ ﷺ کی نبوّت ورسالت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔ مُفسرین نے لکھا ہے کہ اس تین حرفی جملہ میں اللہ تعالیٰ کی جو شان بیان فرمائی گئی ہے اس کی تفصیل کئی جلدوں میں لکھی جا سکتی ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے "اَللّٰهُ الصَّمَد" اہل لغت نے صمد کے کئی معنی بیان کئے ہیں، یہاں اس کا مفہوم ہے ایسی ذات جو سب سے بے نیاز ہو کسی کی اسکو حاجت نہ ہو اور سب اسکے

محتاج ہوں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص صفت ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک ومثیل نہیں اس میں ہر طرح کے شرک کا بھی رد ہو گیا۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ" مطلب یہ ہے کہ نہ اسکی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ کسی کا ہم جنس نہ اس کا کوئی ہم جنس یہ بھی اَحَدیت ہی کے ایک پہلو کا بیان ہے۔ مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، اور نصاریٰ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے اور اُن کے اور خدا تعالیٰ کے درمیان باپ بیٹے کا رشتہ قائم کرتے تھے، یہود حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا بتلاتے تھے، یہ شدید گمراہی اور اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی تھی، اس آیت میں ان سب گمراہیوں کا قلع قمع کیا گیا۔

آگے فرمایا گیا ہے "وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُواً اَحَد" کُفُواً کے معنی مماثل اور ہمسر کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے اعلیٰ وبالا ہے کوئی اسکے ہمسر اور اس کے برابر نہیں وہ خالق ہے، اس کے علاوہ سب مخلوق کا وہ رب ہے، اور سب اس کے بندے، وہ ابدی وازلی ہے اور اس کے علاوہ سب حادث وفانی۔ اور یہ بھی اسکی شانِ اَحَدِیت ہی کا تقاضا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس چھوٹی سی سورت کے چھوٹے چھوٹے چار جملوں میں اللہ تعالیٰ کی جو مثبت اور منفی صفات بیان کی گئی ہیں ان کے ذریعہ توحید اور صفات کا واضح بیان اور اللہ تعالیٰ کا پورا تعارف ہو گیا ہے۔ اس سورت نے بتلایا کہ معبود برحق اللہ اور صرف اللہ ہے، وہ یگانہ ویکتا ہے، کوئی اُس کا شریک ومثیل نہیں وہ ازلی ابدی ہے، وہ بالکل بے نیاز ہے اس کو کسی کی احتیاج نہیں اور سب اسکے محتاج ہیں نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا، وہ سب سے اعلیٰ وبالا ہے کوئی اس کا ہمسر اور اُسکے برابر نہیں، وہ خالق ہے اور سب مخلوق، وہ رب ہے اور سب اسکے بندے غلام اور محکوم۔ توحید وصفات کے بیان میں اس سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ سب اسی کی تفصیل اور مزید وضاحت ہو گی۔ اس معنوی عظمت اور جامعیت کے باوجود یہ بہت مختصر ہے، ہر شخص اسکو آسانی سے چند منٹ میں یاد کر سکتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کو قرآن پاک کا اختتامیہ بنایا گیا ہے۔ آگے کی دو سورتیں بھی گویا اس کا تتمہ ہیں۔

اس سورت کے خصائص وفضائل

اس درس کے سلسلہ میں بار بار یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی ہر آیت اور ہر سورت اس لحاظ سے کہ وہ کلام اللہ ہے یکساں قابل عظمت ہے۔اس کے باوجود مضامین کی خصوصیت کی وجہ سے بعض آیتوں اور بعض سورتوں کو خاص فضیلت اور عظمت حاصل ہے۔ آیتوں میں مثلاً آیۃ الکرسی جس میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اسکی صفاتِ کمال کا بیان فرمایا گیا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے اسکی خاص فضیلت بیان فرمائے۔اس طرح آپ نے مختلف سورتوں کے فضائل بیان فرمائے جن کا ذکر ان سورتوں کے درس میں کیا جا تا رہا ہے۔اس سورۂ اخلاص کے فضائل میں بہت سی حدیثیں حدیث کی کتابوں میں روایت کی گئی ہیں اور آپ نے اس سورت کے پڑھنے کی خاص طور سے ترغیب دی ہے اور اپنی نماز میں بھی آپ یہ سورت بکثرت اور خاص اہتمام سے پڑھتے تھے۔اس سلسلہ کی چند حدیثیں بھی سن لیجئے!

(۱) ایک حدیث میں ہے کہ ایک صاحب نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے اس سورت قُلْ ھو اللّٰہ احد سے بہت ہی محبت ہے مجھے یہ بڑی پیاری لگتی ہے، آپ نے فرمایا "اِنَّ حُبَّکَ اِیَّاھَا اَدْخَلَکَ الْجَنَّۃَ" (یقین کرو اس سورت سے تمہاری اس محبت نے تم کو جنتی بنا دیا، جنت میں پہنچا دیا۔)(۱)

(۲) ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ یہ سورت "قل ھو اللہ احد، الخ" پڑھ رہا ہے، تو آپ نے فرمایا "وَجَبَتْ" (واجب ہو گئی) حدیث کے راوی صحابی کہتے ہیں کہ میں نے حضور سے عرض کیا کہ کیا چیز واجب ہو گئی؟ آپ نے فرمایا اس شخص کے لیے جنت واجب ہو گئی۔(۲)

(۳) ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ (چند نفر کی ایک جماعت) کسی مہم پر روانہ فرمائی اور ایک صاحب کو ان کا امیر مقرر کر دیا، وہ صاحب جب نماز پڑھاتے تو قُلْ ھُوَ اللّٰہُ ہی پڑھتے۔جب یہ لوگ اس مہم سے واپس آئے تو ان کے ساتھیوں

---

(۱) یہ حدیث جامع ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت کی گئی ہے۔

(۲) یہ حدیث امام مالک اور امام ترمذی اور امام نسائی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے

نے حضورؐ سے اس کا ذکر کیا کہ یہ ہمارے امیر صاحب ہر نماز میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ ہی پڑھتے تھے۔ آپ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے اور ہر نماز میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ ہی کیوں پڑھتے تھے؟ چنانچہ ان لوگوں نے پوچھا تو ان امیر صاحب نے کہا ''لانهاصفة الرحمن وانا احب ان اقرأها'' (یعنی چونکہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان ہے اور مجھے ان سے خاص محبت ہے اس لئے میں نماز میں اسی کو زیادہ پڑھتا ہوں) آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''اخبروه ان الله يحبه'' (ان کو میری طرف سے بتلا دو کہ تمہارے اس عمل اور حال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرماتا ہے اور تم کو اللہ تعالیٰ کی محبوبیت نصیب ہے۔)(۱)

(۴) ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' قل هو الله احد تعدل ثلث القرآن'' (یعنی یہ سورہ تہائی قرآن کے برابر ہے)(۲) شارحین حدیث اور علماء نے اس کی توجیہ میں بہت کچھ لکھا اور کہا ہے کہ اس سورت کو تہائی قرآن کے برابر کس وجہ سے قرار دیا گیا ہے۔ میرے نزدیک زیادہ دل لگتی توجیہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے بنیادی مضامین تین ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی توحید وصفات کا بیان۔ دوسرے معاد یعنی آخرت کا بیان۔ تیسرے نبوت ورسالت اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ آنے والی شریعت کا بیان۔ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ پہلے مضمون پر پوری طرح حاوی ہے اس لئے اس کو تہائی قرآن فرمایا گیا ہے۔ واللہ اعلم



(۱) یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کی ہے۔

(۲) یہ حدیث امام مسلم نے حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت کی ہے۔

سُورۃُ الفَلَق

اور

سُورۃُ النَّاس

درس — ۵۷

(درس-۵۷)

سُوْرَةُ الْفَلَق

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أعُوْذُ باللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْم۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ط

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ٥ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ٥ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ
اِذَا وَقَبَ٥ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ٥ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا
حَسَدَ٥ (سورۂ فلق)

ترجمہ: اے پیغمبر کہئے کہ میں پناہ لیتا ہوں صبح نمودار کرنے والے خداوند کی، ہر اس چیز کے شر سے جو اُس نے پیدا کی ہے، اور (بالخصوص) رات کے اندھیرے کے شر سے جب وہ چھا جائے، اور گرہوں میں پھونک مارنے والیوں کے شر سے، اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔

تفسیر وتشریح

سورۂ اخلاص کا تتمہ

یہ سورۂ "فلق" ہے اس کے آگے سورۂ "الناس" ہے اور ان دونوں سورتوں پر قرآن مجید ختم ہے۔ میں نے اس سے پہلی سورت سورۂ اخلاص کے درس میں کہا تھا کہ سورۂ فاتحہ قرآن مجید کا افتتاحیہ تھا اور سورۂ اخلاص گویا اس کا اختتامیہ ہے، اور اسکے بعد کی دونوں سورتیں سورۃ الفلق اور سورۃ الناس گویا اس (سورۂ اخلاص) کا تتمہ ہیں۔ ان دونوں سورتوں میں ہر طرح کے شرور وآفات اور بلاؤں اور مصیبتوں سے اللہ تعالی سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے اور اس کے لئے خاص کلمات تلقین فرمائے گئے ہیں۔

پہلے الفاظ کی روشنی میں اس سورۂ فلق کا مفہوم اور مطلب سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

پہلا لفظ ''قُلْ'' ہے اسکے اصل اور اولین مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں۔اس لفظ ''قُلْ'' کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ ان کلمات کے ذریعہ جسمانی وروحانی، دنیوی ودینی ہر طرح کی آفات سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگا کریں، اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم وتلقین فرمائیں۔اصل دعائے استعاذہ اس لفظ ''قل'' کے بعد اَعُوْذُ کے لفظ سے شروع ہوتی ہے، لیکن ''قل'' کے لفظ کو بھی سورۃ کا جز قرار دیدیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ اسی طرح تلاوت فرماتے تھے۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جن الفاظ میں وحی آتی تھی آپ اُن الفاظ کو جوں کا توں تلاوت فرماتے اور اسی طرح دوسروں کو تعلیم وتلقین فرماتے تھے۔

''قُلْ'' کے بعد ہے ''اَعُوْذُ بِرَ بِّ الفلق'' جس کا لفظی ترجمہ ہے، میں پناہ لیتا ہوں صبح نمودار کرنے والے خداوند کی۔پناہ لینے اور پناہ مانگنے کا مطلب ہوتا ہے کسی سے دعا اور التجا کرنا کہ آنے والی آفتوں سے وہ اپنی حفاظت اور امان میں لے لے اور انکی زد سے ہم کو بچالے۔اس کے واسطے یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے ''رب الفلق'' کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ رات کی تاریکی کا پردہ چاک کر کے صبح کا نمودار کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت ورحمت کا وہ کرشمہ ہے جو روزانہ ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔(قرآن پاک ہی میں دوسری جگہ اُسکی اِسی شان اور صفت کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔''فالقُ الاِ صباح'')تو جس خداوند تعالیٰ کی قدرت ورحمت کا یہ کرشمہ ہم روزانہ دیکھتے ہیں۔بلاشبہ وہی اس کا مستحق ہے کہ ہر قسم کی آفتوں اور بلاؤں سے حفظ وامان کی اس سے دعا والتجا کی جائے۔

آگے فرمایا گیا ہے، ''مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ'' جس کا مطلب ہے کہ اُس کی تمام مخلوقات کے شر سے۔ظاہر ہے کہ اس ''مَا خَلَقَ'' (تمام مخلوقات) میں وہ سب چیزیں آگئیں، جن سے کسی قسم کا دینی یا دنیوی، جسمانی یا روحانی ضرر اور نقصان ہم کو پہنچ سکتا ہے۔

آگے خصوصیت کے ساتھ چند ایسی چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن سے اس دنیا میں ضرر، نقصان یا تکلیف پہنچنے کا عام طور سے اندیشہ کیا جاتا ہے اور بہت سے لوگوں کو پہنچتا بھی ہے اور وہ ایسی ہی ہیں کہ خصوصیت کے ساتھ اُنکے شر اور ضرر سے کامل قدرت ورحمت والے خداوند ہی کی پناہ مانگی جائے۔اسی سلسلے میں سب سے پہلے فرمایا گیا ہے۔''مِن شَرِّ غاَ سِقٍ اِذَا وَقَبَ'' غاَ سقٍ کے معنی رات کے اندھیرے اور تاریکی کے ہیں۔اور ''اِذَا وَقَبَ'' کا

مطلب ہے جب وہ چھا جائے۔ بہت سی بلائیں اور آفتیں وہ ہیں جو رات کی تاریکی میں آتی ہیں۔ زیرِ زمین رہنے والے زہریلے حشرات سانپ بچھو وغیرہ رات ہی میں باہر آتے ہیں۔ چوریاں اور ڈکیتیاں بھی زیادہ تر رات کے اندھیرے میں ہی ہوتی ہیں، شیاطین کو بھی اپنی کارروائیاں کرنے کا موقع زیادہ تر رات کی تاریکی ہی میں ملتا ہے۔ بہت سے گناہ چھپ چھپا کر رات ہی میں ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ ٹونے ٹوٹکے اور سفلی عمل جیسے کام کرنے والے بھی اِس طرح کا کام زیادہ تر رات ہی میں کرتے ہیں۔ بہر حال رات کی تاریکی کے ساتھ جو شرور اور آفات آتی ہیں اس آیت (وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ) میں ان سے خاص طور سے پناہ مانگی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ رات کی تاریکی بذات خود شر ہے۔ خود قرآن مجید میں رات کو انسانوں کے لیے راحت وسکون کا وسیلہ اور اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت بھی فرمایا گیا ہے۔ رات میں خاص کر اُس کے آخری حصہ میں رحمت خداوندی کا نزول ہوتا ہے، اس کو دعا کی قبولیت کا وقت بتلایا گیا ہے۔ بہر حال یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس آیت میں پناہ رات کی تاریکی سے نہیں بلکہ اُسکے شر سے مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

آگے دوسرے نمبر پر فرمایا گیا ہے "وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ" عُقَد عُقْدہ کی جمع ہے، اِس کے معنی گرہ کے ہیں، اور "نَفّٰثٰت" کے معنی ہیں پھونک مارنے والیاں یا پھونک مارنے والے، معلوم ہوا ہے کہ جادو اور ٹونے ٹوٹکے کرنے والے ایسا کرتے ہیں کہ کسی دھاگے وغیرہ میں گرہیں لگاتے ہیں اور کچھ شیطانی کلمات پڑھ پڑھ کے ان پر پھونکتے ہیں۔ اس کے بُرے اثرات ہوتے ہیں۔

معلوم ہونا چاہئے کہ جس طرح شیاطین کا وجود ایک حقیقت ہے، اور ان کے شیطانی اعمال کی بھی حقیقت ہے اور اُن کے اثرات ہوتے ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جادو اور ٹونے ٹوٹکے اور سفلی اعمال اور انکے اثرات کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جو کچھ ہوتا ہے باذن اللہ ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں جادو کے ضرر ہی کے بارہ میں فرمایا گیا ہے۔ "وَمَا هُمْ بِضَارِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ" (البقرۃ) اس آیت میں صراحت ہے کہ جادوگروں کے جادو یا سفلی عمل وغیرہ سے جو ضرر کسی کو پہنچتا ہے اور جو اثر کسی پر ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے اِذن وحکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ لہٰذا آدمی اس کی پناہ لیکر اس کی زد سے بچ سکتا اور محفوظ رہ سکتا ہے۔ تو اس آیت "وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ" کا مطلب یہ ہوا کہ میں اُن جادو

اور ٹونے ٹوٹکے کرنے والوں کے شر سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں جو گرہوں میں پھونک مار مار کے یہ شیطانی عمل کرتے ہیں، وہ مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی، "نَفّٰثٰتِ" جمع مؤنث ہے اس لیے اس کا ترجمہ اکثر مترجمین نے "پھونک مارنے والیاں" کیا ہے۔ لیکن وہ نفوس یا ارواح کی صفت بھی ہو سکتا ہے۔ اِس صورت میں وہ مَردوں اور عورتوں دونوں پر یکساں طور سے صادق ہوگا اور مضمون کے لحاظ سے یہی راجح ہے کہ اس کو عام سمجھا جائے۔

آخری آیت ہے "وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ" حسد کا لفظ ہماری اُردو زبان میں بھی مستعمل ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کسی کو اچھے حال میں دیکھ کر جلنا اور اسکی تدبیر اور کوشش کرنا کہ وہ اس اچھے حال میں نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑے کمینہ پن کی بات ہے۔ اور دنیا میں بہت سے شر اور فساد اس حسد کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ یہ حسد سخت ترین کبیرہ گناہ ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اور میں پناہ مانگتا ہوں حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔

"اِذَا حَسَدَ" (جب وہ حسد کرے) اس لئے فرمایا گیا کہ حسد کرنے والے کے حسد سے ضرر جب ہی پہنچتا ہے جب وہ جذبۂ حسد کی تسکین کے لیے عملی کاروائی کرے۔ جب تک وہ کوئی عملی کارروائی نہ کرے اُس وقت تک وہ خود ہی حسد کی آگ میں جلتا بھنتا رہتا ہے، اس کے حسد سے دوسرے کو ضرر اور نقصان اس وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ جذبۂ حسد کے تقاضے سے عملی کارروائی کرے۔ اس لیے فرمایا گیا "اِذَا حَسَدَ"۔

یہ تینوں چیزیں جن کے شر اور ضرر سے اس سورۃ الفلق میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالی کی پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی گئی ہے (۱۔ اندھیری رات کا چھایا ہوا اندھیرا۔ ۲۔ جادو، سفلی عمل اور ٹونے ٹوٹکے کرنے والے۔ اور ۳۔ حسد کرنے والوں کی حاسدانہ کارروائیاں)۔ ان سب کا شر اور ضرر جیسا کہ معلوم ہے عام طور سے جسمانی اور دنیوی ہوتا ہے لیکن ایمانی نقطہ نظر سے سب سے زیادہ خطرناک شر اور ضرر وہ ہے جو آدمی کے دین وایمان، اس کی روحانیت کو تباہ اور اس کی آخرت کو برباد کردے۔ اور اس کو کفر وشرک یا فسق وفجور میں مبتلا کر کے جہنمی بنادے، اور وہ شیطان کا شر ہے جو انسان کا ازلی دشمن ہے اور اس کو گمراہ کر کے جہنمی بنادینا اس کی سب سے بڑی تمنا اور اس کا خاص مشن ہے۔ آگے کی سورت سورۃ الناس میں اس کے شر سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی گئی ہے اور اسی پر قرآن مجید ختم ہوگیا ہے۔

(درس-۵۸)

سُوْرَةُ النَّاس

خطبۂ مسنونہ کے بعد

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْم۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ط

قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہ مَلِكِ النَّاسِ ہ اِلٰهِ النَّاسِ ہ مِنْ
شَرِّ الْوَسْوَاسِ لا الْخَنَّاسِ ہ الَّذِیْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ہ
مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ہ (سورۂ ناس)

ترجمہ: کہواے پیغمبر میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے رب کی۔ لوگوں کے بادشاہ کی لوگوں کے معبود کی۔ وسوسہ اندازی کرنے والے چھپ جانیوالے (شیطان) کے شر سے جو وسوسے ڈالتا ہے لوگوں کے دلوں میں۔ جنوں میں سے اور آدمیوں میں سے۔

تفسیر و تشریح

شیطان کے شر سے پناہ کی دُعا

اس سے پہلی سورت سورۃ الفلق کی طرح، اس سورۃ الناس میں بھی رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے شیاطین کے شر سے جو سب سے زیادہ خطرناک شر ہے اللہ کی پناہ مانگنے کے کلمات کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

الفاظِ دُعا کی باریکیاں

سورۃ الفلق میں پہلے بالعموم ساری مخلوق کے شر سے، اور اس کے بعد بالخصوص تین چیزوں کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کے کلمات کی تلقین فرمائی گئی تھی، اور وہاں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت "رَبِّ الفلق" کا ذکر کیا گیا تھا اور گویا اسی ایک صفت کے حوالہ سے ان سب چیزوں کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی تھی، اور اس سورۃ الناس میں صرف ایک چیز (وسوسہ

اندازی کرنے والے شیطان) کے شر سے پناہ مانگنے کے کلمات کی تلقین فرمائی گئی ہے اور یہاں اللہ تعالی کی تین صفات عالیہ کا ذکر کیا گیا ہے ۱ . "رَبِّ النَّاس، ۲ .مَلِکِ النَّاس، ۳. اِلٰهِ النَّاس" گویا ان تینوں صفات کے حوالہ سے شر شیطان سے اللہ تعالی کی پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے، اس میں واضح اشارہ ہے کہ شیاطین کی وسوسہ اندازی کا شر شدید ترین ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کے لیے بندے کو خاص طور سے اللہ تعالی کی ان صفات عالیہ کا سہارا لینا چاہیے اور اپنے کو اس خداوند تعالی کی حفاظت کے حصار میں دیدینا چاہیے جو ہم انسانوں کا رب ہے، پروردگار و مالک حقیقی ہے، بادشاہ اور فرمانروا ہے، اور الٰہ ہے یعنی معبود برحق اور ملجا و ماوا ہے۔

ان تین صفات میں پہلی صفت رَبِّ النَّاس ہے۔ اللہ تعالی کے رب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہی وجود بخشنے والا اور پرورش کرنے والا ہے اور حیات و بقا کی ساری ضروریات وہی فراہم کرتا ہے۔ ہر انسان بلکہ ہر مخلوق کا سب سے پہلا اور ہمہ وقتی تعلق اللہ تعالی کی اس صفتِ ربوبیت ہی سے ہے، اور وہ ہر لحہ اُس کی اِس صفت کے فیضان کا محتاج ہے اس لیے اس صفت کا ذکر سب سے پہلے کیا گیا۔

قرآن مجید سورۂ فاتحہ سے شروع ہوا تھا، وہاں بھی سب سے پہلے اللہ تعالی کا تعارف اس کی اسی صفت ربوبیت کے ذکر سے کیا گیا تھا، فرمایا گیا تھا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن". اور اب اِن دونوں سورتوں الفلق اور الناس پر قرآن پاک ختم ہو رہا ہے، یہاں بھی اللہ تعالی کی صفت ربوبیت ہی کا ذکر سب سے پہلے کیا گیا ہے۔(قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) یہاں اس دوسری سورت الناس میں رَبِّ الناس کے ساتھ دو صفتوں کا اور ذکر فرمایا گیا ہے ایک مَلِکِ النَّاس اور اِلٰهِ النَّاس. مَلِک کے معنی بادشاہ اور فرمانروا کے ہیں اور اِلٰہ کے معنی ہیں معبود، یعنی وہ ذات جسکی عبادت اور پرستش کی جائے۔ان تینوں صفات میں بہت قریبی تعلق ہے۔ جو ہستی حقیقی معنی میں لوگوں کی رب ہوگی، وہی حقیقی بادشاہ اور فرمانرواں بھی ہوگی، اور سب اُس کے زیر حکومت ہوں گے۔ اقتدار اعلیٰ اسی کا ہوگا۔ اور جس کی یہ شان ہوگی ظاہر ہے کہ وہی اور صرف وہی معبود برحق ہوگا جس کی عبادت اور پرستش کی جائے اور اپنی حاجتوں کے لیے اُس سے دعا کی جائے۔ اس طرح اس میں دعائے استعاذہ کے ساتھ بڑی بلاغت کے ساتھ عقیدۂ توحید کا بھی اقرار و اظہار ہے۔

آگے اس سورت میں جو دراصل دعائے استعاذہ ہے، شیطان کیلئے دو لفظ الوسواس الخناس استعمال فرمائے گئے ہیں اور اسکی وسوسہ اندازی کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے، فرمایا گیا ہے

"اَلَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُوْرِ النَّاسِ" وسوسہ اُس بُرے خیال اور گناہ کی اُس خواہش کو کہتے ہیں جو غیر محسوس طور پر شیطان کی طرف سے دل میں ڈالا جاتا ہے۔ الوسواس کا مطلب ہے وسوسہ اندازی کرنے والا، اور الخناس کا مطلب ہے چھپ جانے والا۔ یا پیچھے ہٹ جانے والا، شیطان کی وسوسہ اندازی عام طور سے پس پردہ ہی ہوتی ہے، وہ آدمی کو گمراہ کرنے یا اُس سے گناہ کرانے کیلئے کھل کر سامنے نہیں آتا اور اگر بالفرض انسانوں میں بھی ہو (جیسا کہ آگے کی آیت سے معلوم ہوتا ہے) تو وہ بھی وسوسہ اندازی کا کام علانیہ نہیں دھوکے فریب سے خفیہ طور پر ہی کرتا ہے اور بندہ اس کے شر سے جب ہی محفوظ رہ سکتا ہے جب اپنے کو اُس اللہ کی پناہ میں دیدے۔ جس سے کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہیں، ہر چیز ہر وقت اس کی نظر میں ہے، اور میں نے عرض کیا ہے کہ خناس کا مطلب پیچھے ہٹ جانے والا بھی ہوسکتا ہے، اور بعض حضرات نے اس کا یہی ترجمہ کیا ہے، تو یہ شیطان کی اُس حالت کی طرف اشارہ ہوگا جس کا ایک حدیث میں ذکر فرمایا گیا ہیکہ جب بندہ اللہ تعالی کی طرف متوجہ ہوتا اور اس کو یاد کرتا ہے تو شیطان دور ہٹ جاتا ہے۔ وہ ایسی ہی حالت میں وسوسہ اندازی کرتا اور کرسکتا ہے جب بندہ اللہ کی طرف سے غافل اور اس کو بھولے ہوئے ہو۔

"فی صدور النّاس" میں صدور صدر کی جمع ہے اور اُسکے اصل معنی سینہ کے ہیں لیکن یہاں اُس سے مراد دل ہے جس کا خاص محل سینہ ہے، گویا ظرف بول کر مظروف مُراد لیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں زیادہ تر یہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے "من الجنة والناس" مطلب یہ ہے کہ وسوسہ اندازی کرنے والے شیاطین جن کی وسوسہ اندازی کے شر سے اللہ سے پناہ مانگنے کی تلقین کی جارہی ہے، جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں بھی ہوتے ہیں۔

ہمارے اس زمانے میں تو یہ بات آنکھوں کے سامنے ہے کہ بہت سے انسان لوگوں کو گمراہی اور فسق و فجور میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ کتنی ہی گمراہیاں اور بداعمالیاں ہیں جو ایسے انسانوں ہی کے ذریعہ فروغ پارہی ہیں۔ بلکہ بہت سے تو دین کے داعی اور مصلح بن کر بندگان خدا کو صراط مستقیم سے ہٹا کر غلط راستوں پر ڈالتے ہیں، زیادہ تر زیغ وضلال ایسے انسانوں ہی کے ذریعہ پھیل رہا ہے یہ سب شیاطین الانس ہیں۔ اس سورت میں اُن شیاطین الجن کی وسوسہ اندازی کے شر سے بھی پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی گئی ہے جو عام طور سے نظر نہیں آتے اور اُن شیاطین الانس کی گمراہ کن کوششوں کے شر سے بھی جو بنی آدم ہی کی جنس سے ہیں۔ عارف رومی نے کہا ہے۔ ع

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

آخری بات

ان سورتوں پر قرآن کا خاتمہ ایک حُسنِ اعجاز ہے

میں نے اسی درس کے سلسلے میں بار بار کہا ہے کہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم کا مرکزی نقطہ توحید ہے۔اور سورۂ اخلاص (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ) اس دعوت و تعلیم کا نہایت مختصر الفاظ میں جامع خلاصہ ہے، اسی لیے اس کو قرآن پاک کا اختتامیہ بنایا گیا ہے۔اور اسکے بعد کی دونوں سورتیں (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس الخ) گویا اس کا تتمہ ہیں، اس کی وضاحت یہ ہے کہ آدمی توحید سے بھٹک کر شرک کا زیادہ تر اُس وقت مرتکب ہوتا ہے جب وہ کسی تکلیف اور مصیبت میں مبتلا ہو اور اللہ کے سوا کسی اور کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر اُس تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسکی مدد چاہے، اسکی پوجا کرے، اور اس پر نذریں چڑھائے۔یا پھر اُسی شیطان کے وسوسہ اور اِغوا سے شرک میں مبتلا ہوتا ہے جو بنی آدم کا ازلی دشمن ہے اور جس کا مشن ہی بندگان خدا کو شرک میں مبتلا کر کے جہنم بنانا ہے۔قرآن پاک میں کئی جگہ بیان فرمایا گیا ہے کہ جب شیطان کو اللہ کی نافرمانی اور سرکشی کے جرم میں مردود اور لعنتی قرار دیا گیا تو اُس نے اپنے اس عزم کا بڑے زور شور سے اظہار کیا کہ میں اِس آدم کی اولاد کو توحید کے راستہ سے ہٹا کر شرک میں مبتلا کروں گا اور ان کو بھی اپنے ساتھ جہنمی بناؤں گا۔ تو سورۃ الفلق میں تعلیم دی گئی کہ ہر طرح کی تکلیفوں اور بلاؤں سے محفوظ رہنے کے لیے اس اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ لی جائے جو رب الفلق ہے۔اور سورۂ الناس میں تعلیم دی گئی کہ شیاطین اور ان کے آلۂ کار اور ایجنٹ شیاطین الانس کے وسوسہ اور اِغوا کے شر سے بچنے کیلئے اس اللہ کی پناہ لی جائے جو رب الناس ہے، ملک الناس ہے اور الٰہ الناس ہے۔جس خداوند قدوس کی یہ صفات ہیں بس اس کی پناہ لے کر ہی انسان شیاطین کے شر سے محفوظ رہ سکتا ہے۔اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ ان دونوں سورتوں میں عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اس پر استقامت کا طریقہ تعلیم فرمایا گیا ہے۔اسی بنا پر میں نے عرض کیا تھا کہ یہ دونوں گویا سورۂ اخلاص کا تتمہ ہیں۔

اِن دونوں سورتوں کے عقیدۂ توحید کی حفاظت سے تعلق کا ایک دوسرا اہم پہلو یہ ہے

کہ ان میں اولاً اور براہ راست رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کہ آپ تمام تکلیفوں اور ہر طرح کی آفتوں، بلاؤں سے اور جادو وغیرہ کے اثرات سے اور حاسدوں کی حاسدانہ شرارتوں سے اور وسواس خناس شیطان کی وسوسہ اندازی کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے ان کلمات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے پناہ اور امان و حفاظت کی استدعا کیا کریں۔ اس طرح قرآن مجید کے خاتمہ پر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ جو اشرف الخلق اور سید المرسلین ہیں اور ''بعد از خدا بزرگ توئی'' کے مصداق ہیں آپ بھی ہر طرح کے شر ور و آفات سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی حفاظت و امان کے محتاج ہیں۔ خود اپنی حفاظت بھی آپ کے اپنے اختیار میں نہیں ہے پھر دوسری مخلوقات کا کیا ذکر اس عاجز کے نزدیک یہ بھی قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ اس کا خاتمہ سورۂ اخلاص اور ان دونوں سورتوں (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پر کیا گیا۔ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم کا اس سے بہتر خاتمہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

ان دونوں سورتوں کے خصائص اور فضائل

رسول اللہ ﷺ نے مختلف موقعوں پر ان دونوں سورتوں (مُعَوِّذَتَین) کی خاص فضیلتیں اور خصوصیت بھی بیان فرمائی ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت عُقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ آج اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ایسی آیات نازل فرمائی ہیں جن کی کوئی مثال نہیں، "قل اعوذ برب الفلق" اور "قل اعوذ برب الناس" (یعنی ان دونوں سورتوں کی آیات)۔ اور ایک روایت میں ہے کہ توراۃ، انجیل، زبور، اور قرآن میں بھی ان کے مثل کوئی سورت نہیں ہے۔ اور انہی عُقبہ بن عامرؓ کی ایک روایت ہے کہ ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ دونوں سورتیں تعلیم فرمائیں، اور پھر مغرب کی نماز میں آپ نے انہی دونوں سورتوں کی تلاوت فرمائی، اور ارشاد فرمایا کہ ان دونوں سورتوں کو سوتے وقت بھی پڑھا کرو اور سو کر اٹھتے وقت بھی۔

اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ان دونوں سورتوں کو ہر نماز کے بعد پڑھنے کیلئے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کی اس ہدایت پر عمل کرنے کی ہم کو بھی توفیق عطا فرمائے۔ بڑا مختصر، بہت آسان اور بڑا بابرکت عمل ہے۔ اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ جب رات کو

آرام فرمانے کے لیے بستر پر تشریف لاتے تو اپنے دونوں ہاتھ ملا کر (جس طرح دعا کے وقت ملائے جاتے ہیں) آپ "قل هو الله احد" اور "قل اعوذ برب الفلق" اور "قل اعوذ برب الناس" (یعنی یہ تینوں سورتیں) پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر پھونکتے اُس کے بعد وہ ہاتھ جہاں تک پہنچ سکتے اپنے پورے جسم مبارک پر پھیر لیتے، سر کی طرف سے اور جسم مبارک کے سامنے کے حصہ سے ابتدا فرماتے تھے۔ ایسا آپ تین دفعہ کرتے تھے۔ اس روایت میں "كُلَّ لَيْلَةٍ" کا لفظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضور کا روز مرّہ کا معمول تھا۔ گویا آپ نے اس کی تعلیم بھی دی اور اس پر آپ کا عمل بھی تھا۔

اور حضرت عائشہ صدیقہؓ ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی بیماری لاحق ہوتی تو آپ معوّذتین پڑھ کر اپنے اوپر پھونکتے تھے، پھر جب (مرض وفات میں) آپ کا مرض بڑھ گیا (اور آپ کے لیے خود پڑھنا اور یہ عمل کرنا مشکل ہو گیا) تو میں پڑھ کر آپ کے ہاتھوں پر پھونکتی تھی اور آپ ہی کے دست مبارک آپ کے جسم پر پھیر دیتی تھیں۔ اس امید پر کہ آپ کے دست مبارک کی برکت سے انشاء اللہ خاص نفع ہوگا۔

یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ حضرت صدیقہؓ کی پہلی روایت میں رسول اللہ ﷺ کا رات کو سونے کے وقت کا روز مرّہ کا معمول ذکر کیا گیا ہے اور اس آخری روایت میں بیماری کی حالت میں معوّذتین کے ذریعہ دم کرنے اور جسم مبارک پر ہاتھ پھیرنے کا ذکر ہے۔ اس کا خاص تعلق رات کے سونے کے وقت سے نہیں ہے۔

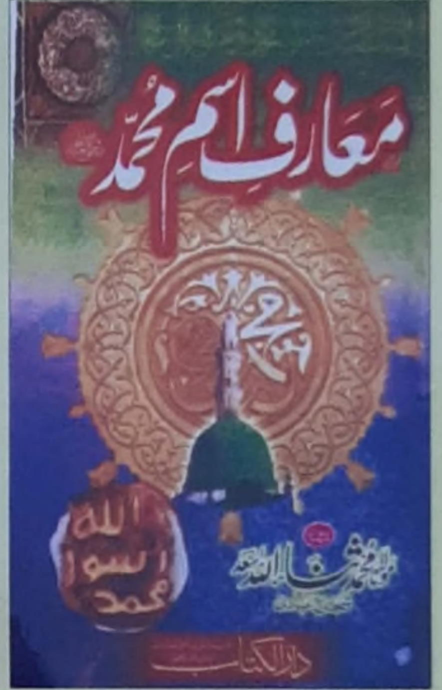
قرآن دُنیاوی تکلیفوں اور جسمانی بیماریوں کیلئے شفاء

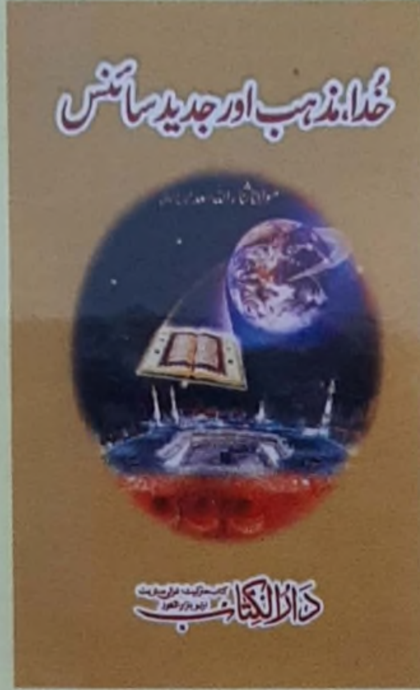
آخر میں گزارش یہ ہے کہ بلاشبہ قرآن مجید کے نزول اور اس کی دعوت و تعلیم کا خاص مقصد بندگان خدا کی ہدایت اور ان کے عقائد و افکار اور اخلاق و اعمال کی اصلاح و تربیت ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کلام الٰہی میں ہماری جسمانی بیماریوں اور دوسری تکلیفوں پریشانیوں کے علاج و شفا کا سامان بھی ہے، لیکن یقین شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان و یقین نصیب فرما کر اُس کی ہدایت اور برکات سے بہرہ یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

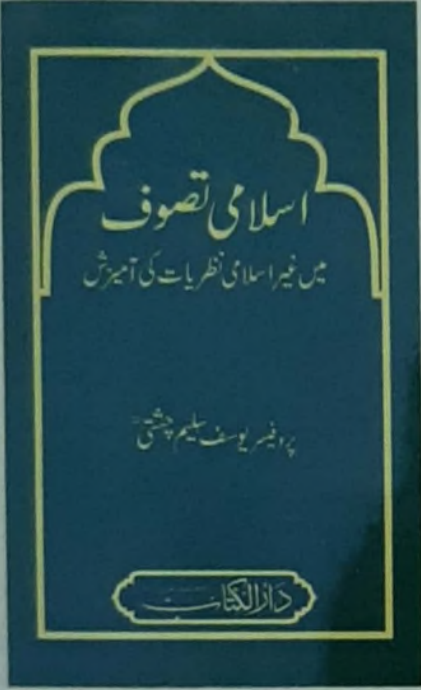
وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

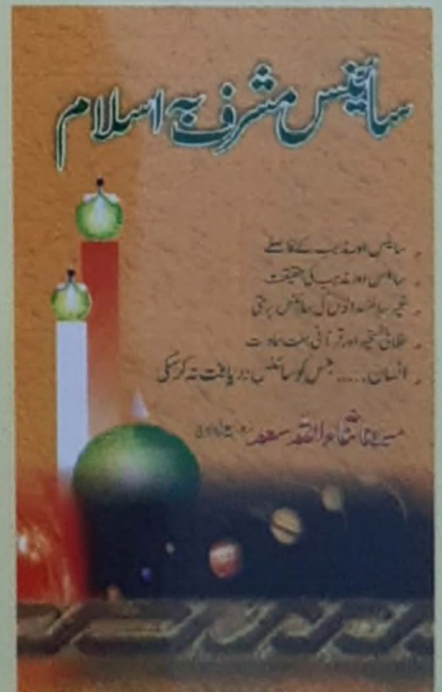
والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین

ہماری چند مطبوعات

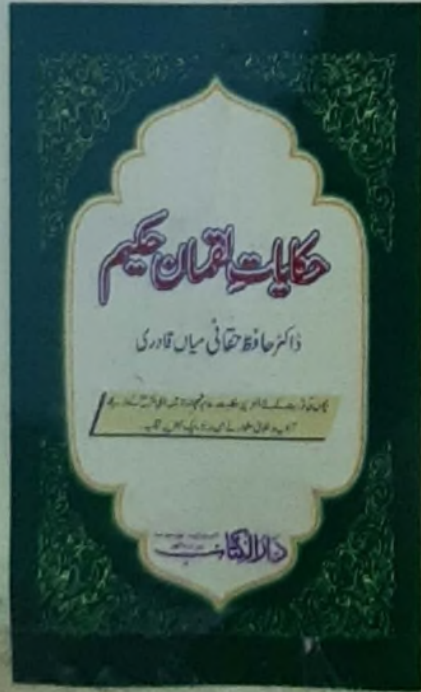












دارالکتاب
کتاب مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔
042-7235094